دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جولائی 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

11
چینی، نکتہ چینی
مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

18
کفن بردوش
ڈاکٹر سلیم عادل
دوست دشمن کی سرکشی سے لبریز
تیز رفتار ناول کا پُرتجسس انتخاب

43
چھوٹا چور
مریم کے خان
کھوٹے سکے کا کوئی نعم البدل نہیں... وہ کھوٹا ہی
رہتا ہے کھرے اور کھوٹے کا برمحل استعمال

55
کھیل اور کھلاڑی
سمیرا طارق
لہو کی گردش تیز کر دینے والے سنسنی خیز
لمحات سے آراستہ ایک دلچسپ کہانی

75
لاش کا پیغام
بشریٰ امجد
قاتل اناڑی اور مقتول کھلاڑی کے
درمیان ان دیکھی جنگ کا ٹکراؤ...

79
تعبیر
تنویر ریاض
ڈرامانگاری کی عکاسی ایک
پُرفریب کہانی کے پیچ و خم

92
جواری
احمد اقبال
زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے
والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

131
عامل گزیدہ
منظر امام
حسِ مزاح سے محظوظ ہونے والے
قارئین کے لیے ایک انوکھا اور شگفتہ پارہ

جلد 43 • شمارہ 07 • جولائی 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

---

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

137
کفّارہ
آصف ملک
کاروباری لین دین، دیانت، امانت اور خیانت
داری کے اسرار میں ڈوبی پُرحقیقت کہانی

151
شریکِ جرم
بابر نعیم
لبِ سڑک رونما ہونے والے جرائم
میں سے ایک جرم کا چشم کشا احوال

160
گرداب
اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی یا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195
یارانِ رفتگاں
عکسِ فاطمہ
بظاہر دوست نظر آنے والے موقع پاتے
ہی جان لینے سے دریغ نہیں کرتے

213
انکشاف
امجد رئیس
دبیز تہوں میں چھپے رازوں کا پینڈورا بکس
جس کے کھلنے کا آخری وقت آگیا تھا...

219
حق دار
جمال دستی
فرض اور قرض کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا
ایک معاملہ شناس افسر کی پُراثر کارکردگی......

226
ہشت پا محبت
احمد اقبال
سب کچھ بدلنے پر مجبور کر دینے والی محبت
کے ہشت پا پہلوؤں کو اجاگر کرتی تحریر...

259
خوف کے تاجر
کاشف زبیر
نیکی اور بدی کے راستوں پر گامزن
کرداروں کی باہمی کشمکش کا احوال

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیراعلیٰ

چیں بہ جبیں

عزیزانِ من... السلام علیکم!

موسم کے بدلتے مزاج کے اتار چڑھاؤ کے سنگ جولائی 2013ء کا جاسوسی آپ کی نذر ہے... انتخابات ہو گئے۔ نئی حکومت نے بخیر و خوبی اقتدار سنبھال لیا۔ پاکستان کا ہر شہری اپنے دل کی گہرائیوں سے نئی قومی اور صوبائی حکومتوں کی کامیابی کا خواہاں ہے لیکن مبارک سلامت کے اس شور میں دہشت گردوں نے ارضِ پاک کی خاک سے لے کر ہمالیہ کی برفانی وادیوں تک کو خون میں نہلا دیا ہے۔ پاکستانی ہی نہیں، غیر ملکی سیاح اور کوہ پیما بھی اس خونی کھیل کا نشانہ بنے ہیں۔ دہشت گردی کو انتقامی جنون کے حوالے سے جواز فراہم کرنے والے رُہنما بھی انگشت بدنداں ہیں کہ یہ کیا ہو گیا اور کیوں ہوا... ابھی تک سارے رُہنما ایک نکتے پر متفق نہیں ہو سکے... ایسے واقعات کی کھلی مذمت سے کنی کتراتے ہیں... ہمیں من حیث القوم کس کا انتظار ہے... دہشت گردی ہماری گلیوں اور محلوں میں آن گھسی ہے، اس کے انسداد کے لیے سب کو سینہ سپر ہونا پڑے گا۔ جزوی یا کلی لاتعلقی سے اب کام نہیں چلے گا... چند روز بعد ماہِ صیام کی مبارک ساعتوں کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس مقدس مہینے میں نیتوں کے خلوص کے ساتھ ہمیں سوچنا، سمجھنا اور عمل کرنا چاہیے... ہم حقوق اللہ بھی ادا کریں اور حقوق العباد کا بھی پورا خیال رکھیں۔ ہماری دعا ہے کہ اس ماہِ مبارک کی تقدیس انسانی لہو سے داغ دار نہ ہو...

اس دعا کے ساتھ محفل کا رخ کرتے ہیں... جہاں ہر قاری کے سوال در جوابوں میں دعاؤں اور دوا کا ذخیرہ موجود ہے...

ضلع اٹک سے سعدیہ بخاری کی پہلی پرواز" جاسوسی کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ (مبارک ہو... خوش آمدید) جاسوسی 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق خوب صورت لیکن خونی رنگ لیے ہوئے تھا۔ خطوط میں ٹاپ پر افتخار حسین اعوان تھے۔ دوسرے نمبر پر زویا اعجاز ویلڈن ڈیئر بہت اچھا انداز ہے لکھنے کا لیکن تبصرہ مختصر مختصر سا لگا، تفصیلی تبصرہ لکھا کریں۔ (کیوں... اختصار میں کیا قباحت ہے) کاظمی لیجیے آپ کی ایک اور پڑوسن گئیں۔ اب بتائیے اٹک اور اسلام آباد کا فاصلہ بتانے کے لیے آپ کون سی پہاڑی پر کھڑے ہوں گے؟ لیکن پلیز چھینک مارنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا ورنہ اٹک ڈوبے نہ ڈوبے، آپ ضرور پھسل جائیں گے پہاڑی پر سے۔ کاشف علی اینڈ محی الدین آپ دونوں کا دکھ بہت گہرا ہے اور ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ بابر عباس! آپ کو بیٹی کی پیدائش بہت بہت مبارک ہو۔ ماہ سسٹر! آپ ہمایوں کا ذکر نہ بھی کرو تو کیا فرق پڑنے والا ہے۔ بقول ہمایوں سعید ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ محسن علی موم شادی کے بعد ہی تو ایم اے ہاشمی صاحب کا ذوق بہتر ہوا ہے، ان کی زندگی اور قلم دونوں میں نکھار آ گیا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلے نمبر پر نواب صاحب کا نام دیکھ کر دل مچل گیا کہانی پڑھنے کو مگر للکار نے للکار کے پہلے ادھر سو، ادھر چل دیے۔ زبردست، آؤٹ اسٹینڈنگ قسط، سپر فائٹ ایکشن، بہترین اختتام۔ قفس گزیدہ میں پاک انڈیا تعلقات، انڈیا کی ازلی پاک دشمنی کے حوالے سے نواب صاحب کے مخصوص انداز نے کہانی کو منفرد اور دلچسپ بنا دیا۔ محبوب بے چارہ انڈیا کی روایتی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ کلپنا کے ساتھ بھی کچھ کم نہ ہوا۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ آبی قبر اگرچہ ملک دشمن عناصر کے حوالے سے مئی کے پہلے سرورق کا تسلسل تھی لیکن بوریت اور یکسانیت زدہ پھر بھی محسوس نہ ہوئی۔ زبردست اسٹوری تھی۔ دوسرا رنگ منظر امام کا جعلی موت اگرچہ مرکزی خیال اچھا تھا مگر اسٹوری میں دلچسپی کا مواد بہت کم تھا۔ گرداب کافی بہتر جا رہی ہے۔ چودھری کی شامت آنے کو ہے اینڈ پہ سسپنس کری ایٹ کر دیا گیا۔ شارٹ اسٹوریز میں کھلی آنکھ میں سراغ رساں اینڈریان مونک کی جانب سے کی گئی قتل کی تفتیش کے مختلف انداز نے خاصا محظوظ کیا۔ درست علاج مریم کے خان خاصے منفرد انداز میں آئے خاص طور پر اتنی سنگین کہانی میں مزاحیہ ٹچ دینا ان کے اپنے انداز سے ہٹ کر تھا جو کہ اچھا لگا۔ گمشدہ اور پرندہ کا انجام خاصا چونکا دینے والا تھا۔ چوتھا سال میں ہمفرے نے جان کیرے کو سراغ رسانی سونپ کر قدرتی طور پر اپنے قاتلوں کو پکڑوانے کا انتظام کر دیا۔ سراغ رسانی کے موضوع پر اچھی کاوش تھی۔"

شاہدرہ لاہور سے عبدالوہاب کی دلی تمنا" جاسوسی اس مرتبہ 3 جون کو دستیاب ہوا۔ سرورق پر تبصرہ کیے بغیر بڑھے محفل یاراں میں تو کرسی صدارت پر افتخار حسین اعوان کو براجمان پایا، مبارک باد قبول کیجیے۔ سید شکیل حسین! آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ آپ کے شیکسپیئر نے لوڈ شیڈنگ کا کوئی حل نہیں بتایا؟ سوہی خان! ہماری دعا ہے کہ آپ امتحان میں کامیاب ہوں اور کاشف علی صاحب کو ربِ کریم صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ سید محی الدین اشفاق صاحب کے والد محترم کی وفات کا دکھ ہوا، ربِ کریم آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبرِ عظیم سے نوازے۔ بابر عباس صاحب! بیٹی کی ولادت مبارک ہو۔ ماہا ایمان جی! کیا واقعی آپ مختلف ناموں سے خطوط لکھتی ہیں؟ راحی غارس صاحب! آپ کا تبصرہ اچھا تھا لیکن نام کچھ پسند نہیں آیا۔ وردہ شاہین اور ڈاکٹر عمران صاحب کو جاسوسی میں ویلکم۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے للکار کی آخری قسط پر نظر پڑی تو جھٹکا لگا۔ اتنا تو معلوم تھا کہ کہانی آخری مراحل میں ہے لیکن اتنی جلدی ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔ دوسرا شدید جھٹکا عمران کی موت کا ہوا۔ یقین جانیے وہ مر گیا وہ مر گیا کی گونج کانوں میں محسوس کی۔ عمران کی موت کی توقع بالکل نہیں تھی۔ آنکھیں غمگین ہو گئیں۔ جاسوسی کا جہان ویران سا لگنے لگا۔ للکار کا چمکتا دمکتا ستارہ غروب ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جواری للکار کی جگہ لے سکے گی یا نہیں؟ بہرحال للکار کی الوداعی قسط یادگار ثابت ہوئی۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب اس مرتبہ ایکشن میں تھی۔ اسماجی کو ماہ بانو اور اسلم کا خیال تو آ گیا لیکن کشور اور آفتاب اب بھی روپوش ہیں۔ ابتدائی صفحات کی کہانی قفس گزیدہ میں ایک کرکٹر انڈیا پہنچ گیا اور را کے جال میں پھنس گیا۔ سبق آموز کہانی تھی۔ دونوں رنگ بھی جاسوسی کے اعتبار سے پسند آئے۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ نظر ہیں۔ اس امید پر اجازت کہ میرا خط ضرور شاملِ اشاعت ہوگا۔" (انشاء اللہ)

کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کی چٹخارے دار باتیں "اس بار ڈائجسٹ لینے خود بک اسٹال پر گئی تاکہ جلد سے جلد پڑھ کے تبصرہ سپردِ قلم اور خط سپردِ خاک... ہاہاہا دیکھ لیں انکل جی جلدی میں، میں نے اپنا ہی خط سپردِ ڈاک کے بجائے سپردِ خاک کر دیا ہاہاہاہا... مجھے جلدی اس لیے ہوتی ہے کہ تبصرہ لیٹ ہونے کی صورت میں شاملِ اشاعت ہونے سے رہ جاتا ہے پھر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اب ذرا کہانیوں کی بات ہو جائے۔ محی الدین نواب کی قفس گزیدہ میں محبوب کا انجام بہت دردناک ہوا۔ ہندوستانی حسینہ سے ہمدردی کچھ زیادہ مہنگی پڑ گئی۔ آخر میں کیا نواب صاحب نے محبوب کو مار دیا کہ وہ زندہ رہا؟ کہانی اچھی رہی۔ ہائے... یہ ہائے للکار کی آخری قسط دیکھ کر بے ساختہ لبوں پر آئی۔ آخر مغل صاحب نے زیادتی کر دی نا للکار ختم کر کے۔ اتنی جلدی تو وائنڈ اپ نہ کرتے۔ اوپر سے عمران کی موت پر نینوں سے وہ سارے نیر بھی بہہ گئے جن پر جانے کب سے بند باندھ کے بیٹھی تھی۔ (چلو یہ تو اچھا ہوا) اف مغل صاحب! کتنی تکلیف ہوئی عمران کی موت سے کیا بتاؤں... ابھی مغل صاحب آپ ایک اور طویل سلسلہ عمران اور تابش کی جوڑی کو لے کر شروع کریں مگر خدارا اس کا انجام اس قدر دردناک نہ ہو۔ مجھے تو ڈپریس کر دیا عمو کی موت نے۔ ڈپریشن سے دھیان بٹانے کے لیے اگلی کہانی کی طرف بڑھی۔ کھلی آنکھ نے میری بھی آنکھیں کھول دیں۔ مونک تو بڑا ہوشیار نکلا۔ واہ جی، جائے وقوعہ پر پہنچے بغیر ہی کیس حل کر دیا۔ محبت اور جنگ، خاک و خون میں غلطاں و پیچاں، وہی محبت کی تکون، کمزور اور وسائل سے بھرپور علاقوں پر شہ زوروں کی چڑھائی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خوں ریزی بیان کرتی کہانی بھی اچھی رہی۔ ٹارگٹ کلر خود ہی ٹارگٹ کلرز کا شکار کی عملی تفسیر پرندہ کے عنوان سے پڑھی، گزارے لائق تھی۔ روایت بھی ٹھیک رہی۔ بازی کا انجام کچھ دلچسپ نہیں تھا۔ گمشدہ شاید نئی مصنفہ کی تحریر ہے۔ ماہ نور صاحبہ کی کاوش ٹھیک تھی۔ مریم کے خان کی درست علاج اچھی تھی جب اللہ بخش کو ڈاکو سردار کے علاج کے لیے لے کے جاتے ہیں، اس دوران کہانی کا اندازِ بیاں بہت دلچسپ ہو گیا تھا جیسے وہ خود باباؤں کا بھی بابا تھا اور اسے بابا کہہ رہا تھا... جیسے جملوں نے محظوظ کیا۔ چوتھا سال کیرے جان کے لیے کچھ زیادہ ہی ثمر آور ثابت ہوا۔ نقد پیسوں کے ساتھ ساتھ پکی نوکری کا بھی بندوبست ہو گیا۔ کھیل بھی دلچسپ رہی۔ اب دو دو ہاتھ ساتھیوں سے۔ سید شکیل حسین کاظمی، محسن علی موم اور ماہا ایمان کے تبصرے اچھے لگے۔ سوی خان کے لیے کامیابی کی دعا مگر 16 مئی تو گزر گئی۔ کاشف صاحب کو اللہ صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔ بابر عباس بیٹی کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ایم اے ہاشمی کے ساتھ تو واقعی بُرا ہوا۔ ان کا تبصرہ کسی اور کے نام سے چھپ گیا۔ وردہ آپ کو بھی اللہ کامیابی سے نوازے آمین۔ محی الدین اشفاق اللہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو اس صدمے کو جھیلنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے۔ کبیر عباسی آپ کی سسٹم کی بات سے صد فیصد اتفاق ہے کہ پورا نظام ہی دگرگوں ہے۔ ہر شخص اگر اچھائی کی ابتدا اپنے آپ سے کرے تو پورا معاشرہ سدھر جائے۔ اس طرح سسٹم بھی خود بخود بہتری کی طرف گامزن ہوگا۔"

میانوالی سے احسان سحر کی سحر انگیز باتیں "جاسوسی حسبِ معمول تھوڑا سا لیٹ 2 کو مل گیا۔ وجہ یہ ہے کہ جی ہمارا 30 مئی کو آپریشن ہوا تھا اور بستر پر ہوتے ہوتے دوسروں کے محتاج جو ٹھہرے... بہر حال پھر بھی مل گیا۔ ٹائٹل کا سرسری جائزہ لیا۔ صنفِ نازک خوابوں خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ستاروں کی محفل میں جہاں بہت سے ستارے چمک رہے تھے... پہلے نمبر پر چاند کا دیدار کیا یعنی کرسی صدارت والے افتخار حسین اعوان صاحب موجود تھے۔ مبارک ہو بھائی ایک ماہ چاند کا لقب مصنوعی ملنے پر... پڑوسیوں کے بارے میں بحث ہو رہی ہے... مجھو بالکل یہ سچ ہے کہ اچھے پڑوسی پھول کی طرح ہوتے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب کا خوب انداز دیکھا اور دل سے ہزاروں دعائیں نکلیں... اور آج کل ویسے بھی چیمپئنز ٹرافی کا آخری ایڈیشن ہو رہا ہے۔ جاسوسی نے ہمیں قفس گزیدہ کا تحفہ دے کر مزہ دوبالا کر دیا۔ روایت، پیٹر کی مہارت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ بہت ہی خوب صورت انداز سے قاتل کو بے نقاب کیا۔ بازی، ایسی منفرد اور سنسنی سے بھرپور کہانیاں بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ واقعی حقیقی جیت کے لیے یہ مصنوعی ہار کو گلے لگانا بہت ضروری تھا۔ گمشدہ، ایک چونکا دینے والی اسٹوری ثابت ہوئی مختصر مگر بھرپور احاطہ کیے ہوئے۔ للکار اور عمران کی جدائی ہمیشہ دل سے چمٹی رہے گی۔ عمران کا کردار جو آخر میں اور بھی متاثر کر گیا۔ دوستی اسی کا نام ہے۔ پھول اور خوشبو مرتے دم تک ساتھ ہی ہیں۔ عمران نے بھی آخر میں ثابت کر دیا کہ دوستی نبھانی ہے تو ایسے نبھاؤ۔ طاہر صاحب کا بہت بہت شکریہ۔ ایسی یادگار کاوش جاسوسی کے صفحات پر سجائی۔ کھلی آنکھ... مونک نے کافی مہارت اور صحیح معنوں میں سراغ رسانی کا عمدہ کردار ادا کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور واقعی ایسی مہارت سے سراغ لگانا بہت کم اور مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اینڈ تک قاتل کی تلاش کا سسپنس برقرار رہا۔ ویلڈن۔ گرداب اس ماہ کچھ اچھی رہی، زیادہ بوریت محسوس نہیں ہوئی اور کام اور مشن دونوں تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ملے۔ درست علاج، ڈاکٹر اللہ بخش نے نہایت خوب صورتی سے مہرداد کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جس کا وہ حق دار بھی تھا۔ چوتھا سال بھی شروع سے اینڈ تک کافی خوب صورت اور ہلکے پھلکے انداز کی تحریر ثابت ہوئی اور دلچسپی کا پیکر رہی۔ رنگوں کی بات ہو جائے تو دوسرا رنگ پہلے پڑھا کیونکہ اتنے عرصے بعد منظر امام رنگ میں نظر آئے اور اپنا رنگ بہترین انداز میں رنگنے میں کامیاب ہوئے۔ پہلا رنگ، آبی قبر یہ بھی ایسی ہی داستان تھی۔ پر مختلف اس طرح کہ لوٹنے والے غیر لوگ تھے اور آلۂ کار بننے والے ہمارے اپنے جو ہمیشہ ہی سے ایسا کرتے آئے ہیں اور شاید کرتے رہیں کیونکہ اب بھی ان لوگوں کے غلام ہیں۔ بے غرضی، دیانت، احساس اور یہ سب چیزیں ہم میں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اللہ پاک ہمارے حال پر رحم کرے۔ بہت عرصے پہلے جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر کہانی ہٹلر کی واپسی، دو تین حصوں میں شائع ہوئی تھی، وہ ہم پڑھ تو نہ سکے البتہ پرانے ڈائجسٹ میں دیکھی ضرور تھی۔ ہو سکے تو اسے دوبارہ لگائیں۔ ساجد امجد، سرور اکرام، مرحوم اقبال کاظمی، حسام بٹ، غلام قادر، نشور ہادی، نجمہ مودی، محمود احمد مودی، شگفتہ پروین، پروین زبیر، یہ سب بہت خوب اور جم کر لکھتے تھے پر افسوس اکثریت غائب ہے، پلیز ان کو واپس لائیں۔" (آپ کے ساتھ تو ہم بھی انہیں پکارتے رہتے ہیں... لیکن لگتا ہے ان مصنفین نے کان بند کر لیے ہیں)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی لب کشائی "جاسوسی اس بار 2 تاریخ ہی کو مل گیا۔ حیرت آمیز خوشی ہوئی اُمید ہے ماضی کی طرح ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بک اسٹالوں پر موجود ہوگا۔ اس ماہ کا سرورق گزارے لائق تھا۔ شاید ذاکر صاحب بھی شدید گرمی اور لوڈ شیڈنگ سے بیزار ہو گئے۔ اس ماہ مظفر آباد کے اعوان صاحب صدارت پر نظر آئے، مبارک باد۔ اس بار راولپنڈی کی راحی غارس صاحب کی وضاحت سے نام کا معاملہ حل ہو گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مغل صاحب کی للکار کی آخری قسط پڑھی۔ اختتام انتہائی المناک ہوا کہ عمران زندگی کی بازی ہار گیا مگر جگر کا عطیہ دے کر ایک مثال قائم کر گیا۔ امید ہے مستقبل قریب میں طاہر مغل صاحب ایسی ہی معرکۃ الآرا کہانیوں سے نوازتے رہیں گے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں عین جاسوسی کے معیار کی اور بے حد دلچسپ رہیں۔ دیسی کہانیوں میں مریم خان کی درست علاج سب سے اچھی رہی اور بدیسی کہانیوں میں مختار آزاد کی چوتھا سال۔ شمارہ کی اولین کہانی، محی الدین نواب صاحب کی قفس گزیدہ ایک گھسے پٹے موضوع پر ایک پھس پھسی تحریر تھی۔ نواب صاحب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اب وہ کچھ نئے موضوع پر اظہارِ خیال کریں۔ بے ادبی پر معذرت مگر سچ بات یہی ہے۔"

کبیر عباسی، شہزادہ کوہسار مری کا سر ہلا دینے والا تبصرہ "اس دفعہ ذاکر انکل نے فیس پاؤڈر بڑی وافر مقدار میں استعمال کر کے حسینہ کی بیوٹی کو نیا نکھار بخشا۔ حسینۂ عالم کا پوز بھی بہت متاثر کن تھا۔ شیشے میں لگی گولی اور خون کا نشان جاسوسی ڈائجسٹ کا ٹائٹل ہونے کا غماز تھا۔ نیچے موجود حسبِ معمول اپنی صنف کے دو بندے موجود تھے۔ ان کی تعداد ہمیشہ دو ہی کیوں ہوتی ہے، اس کا جواب ضرور دیجیے گا۔ (آپ کے ہمراہ ہمایوں سعید ہوتے ہیں نا) فہیم آپ کرم ایجنسی میں بیٹھ کر جاسوسی کی دیر آید پر رو رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ مری میں ہونے کے باوجود یہی صورتِ حال ہے۔ انکل جی ہماری محفل میں ناکام عاشقوں کی مقدار کافی زیادہ نہیں ہوتی جا رہی۔ اعجاز احمد کے بعد اس دفعہ فہد علی اور محسن کمال کو بھی اس درد میں مبتلا پا کر اس بار سر افسوس سے ہل گیا۔ ماہا ایمان! آپ شاہ جی کی پڑوسن نہیں ہیں اس لیے محتاط رہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو بالکل بے ضرر سے بندے ہیں جن سے ان کی پڑوسن تک محتاط نہیں رہتی۔ محی الدین اشفاق! خدا آپ کے والدِ محترم کی مغفرت کرے اور جملہ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ للکار کی آخری قسط پڑھنے کے بعد اس دفعہ ہم اس پر مکمل تبصرہ کر رہے ہیں۔ (یا اللہ خیر) اس تحریر کی جو بات ہمیں سب سے زبردست لگی، وہ انتہائی شاندار کردار نگاری تھی۔ عمران کے لازوال کردار کے علاوہ سلطانہ، جنگی چن، تابش، جاوا اور جلالی کے کردار ناقابلِ فراموش تھے۔ کردار نگاری کے علاوہ منظر کشی اور مکالمہ نگاری بھی بہت زیادہ متاثر کن تھی۔ جنگی چن کی درد کے حوالے سے فلاسفی اور کچھ دیگر فلاسفیوں کی وجہ سے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ البتہ واقعات دیوی اور پرواز سے کافی مماثلت رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہم واقعات کے حوالے سے اسے اوسط کا درجہ دیں گے۔ پلاٹ کافی گھسا پٹا تھا۔ وہی انتقام اور موروثی کا چکر۔ بہرحال مجموعی طور پر کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کی وجہ سے ہمیں یہ تحریر بہت پسند آئی۔ شیخ ابو یحییٰ کا سرورق کے رنگوں میں نیا نام پڑھ کر خوش امیدی کا دامن ہم نے پکڑ لیا۔ آبی قبر خوب صورت نام کے ساتھ دلچسپ واقعات لیے متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ خاص طور پر کہانی کا تانا بانا بہت دلچسپ انداز میں بُنا گیا۔ ویلڈن شیخ صاحب! امید ہے ان کے علاوہ اب مزید نئے رائٹرز کو سرورق کے رنگوں یا اولین صفحات پر پڑھنے کا موقع ملے گا۔ (یقیناً) کترنیں بس ٹھیک ہی رہیں، میں نے بھی اس دفعہ کچھ کترنیں ای میل کی تھیں مگر کہیں بھی اپنا نام نہ پا کر سر افسوس سے ہل... چلیں اب نہیں ہلاتے ورنہ لوگ گردن کے نٹ ٹائٹ کرنے کے مشورے دینے لگیں گے۔ خیر، انکل جی بتا تو دیا کریں کہ آپ میری کترنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور کیوں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔" (جب ملتی ہیں تو نام کے ساتھ ضرور شائع ہوتی ہیں، اب ملی ہی نہیں تو...)

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی خود شناسائی "یہ یکم جولائی انیس سو ستاسی کی ایک چمک دار اور روشن صبح تھی جب سرزمین پاکستان کو اس اعزاز سے نوازا گیا کہ یہاں ایک عظیم انسان کا جنم ہوا۔ کچھ ذاتی اور خاندانی ترجیحات کی بنا پر اس کا نام عظیم کے بجائے سید شکیل حسین کاظمی رکھا گیا۔ مگر آپ سب اسے عظیم ہی سمجھیں گے۔ المختصر یہ کہ آپ کے ہاتھ میں جب جاسوسی پہنچ چکا ہوگا تو کاظمی صاحب چھبیس سال کے ہو چکے ہوں گے۔ پیشگی مبارکباد کا پیشگی شکریہ۔ جون کی پانچ تاریخ وصل کا پیغام لے کے آئی جب جاسوسی کو ہمارے ہاتھوں نے بوسہ دیا۔ سرورق اپنی روایت کے عین مطابق تھا۔ چینی نکتہ چینی میں پہنچے تو حسبِ توقع آپ کا ابتدائیہ موجود تھا۔ سیاست اور ملکی حالات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ صدارت کا شرف آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان صاحب کے حصے میں آیا جو کہ اپنے نپے تلے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ اپنی پڑوسن کے متعلق آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس کے متعلق ہر دوسرا شخص پوچھتا ہے۔ زویا اعجاز اپنے خوبصورت اور پہلے کی نسبت قدرے طویل تبصرے کے ساتھ دوسری پوزیشن لینے میں کامیاب رہیں۔ سوی خان کے مختصر تبصرے نے بہت بڑے سانحے کی خبر دی۔ ہم سب کاشف علی میراں برادر کے غم میں شریک ہیں اور خالق کائنات سے دعا گو ہیں کہ وہ ان کو صبر کے ساتھ اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نواز دیں۔ اس کے بعد دوسری غمناک خبر یہ سے سید محی الدین اشفاق صاحب کے والدِ محترم کی رحلت کی تھی۔ بے شک یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے مگر اپنے پروردگار کی رضا میں راضی ہو جانا اللہ پاک کی بارگاہ میں درجات کی بلندی کا سبب ہے۔ اللہ پاک آپ کو صبر اور حوصلہ عطا کرے برادر۔ بہت مصروفیت کی وجہ سے رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ صرف تین کہانیوں کے مطالعے کا وقت ملا۔ بہر حال للکار کا انجام بخیر تو ہرگز نہیں ہوا اور اس کا ردِ عمل امید ہے تبصروں میں موجود ہوگا۔ تابش اور ثروت کو نہ ملاتے کوئی بات نہیں تھی۔ ذرا بھی دکھ نہ ہوتا مگر آپ نے تو عمران کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ تابش سے بھی اور ڈائجسٹ سے بھی۔ فرہاد علی تیمور، شانی، رستم، وجدان علی اور تنویر علی (ڈینی) کے بعد عمران دانش کا کردار مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ بے شک یہ عظیم اور لازوال کردار اب جاسوسی کے اوراق میں دفن ہو گیا ہے مگر قارئین کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ گرداب... پچھلی دفعہ کافی لوگوں نے ماہ بانو کو منظر پر لانے کا کہا مگر مجھے پتا تھا وہ منظر پر آنے کے بعد فوراً پس منظر پر چلی جاتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا اس دفعہ بھی۔ اب پتا نہیں اس غیاب کے پیچھے کیا کھچڑی پکی ہوگی، شاید وہ از خود غائب ہوئی ہو یا کوئی اور واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ اب اگلی قسط میں ہی پتا لگے گا۔ محی الدین نواب صاحب کی اولین صفحات پر قفس گزیدہ بہت عمدہ کہانی تھی۔ کرکٹ اور شوبز کے امتزاج کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا گیا تھا۔ حالانکہ انجام نے بہت افسردہ کر دیا تھا۔"

ایبٹ آباد سے محمد فیضان غنی کی رنجیدگی "یہ پہلا موقع ہے کہ میں جاسوسی میں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اس اُمید کے ساتھ کہ اسے چینی نکتہ چینی کی محفل میں تھوڑی سی جگہ مل جائے گی۔ اس بار جاسوسی جون کی 7 تاریخ کو ملا۔ ہاسٹل پہنچتے ہی لائٹ چلی گئی۔ مجبوراً موبائل کی فلیش لائٹ آن کر کے للکار کا صفحہ کھولا۔ آخری قسط دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس تیز ترین کہانی کے تیز ترین اختتام میں عمران کی وفات نے ایسا غمگین کیا کہ رات کا کھانا بھی بھول گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے جاسوسی صرف للکار کی وجہ سے ہی پڑھنا شروع کیا تھا اور اب اس کی عادت پڑ چکی ہے۔ میری زندگی بھی تابش کی ابتدائی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ طاہر جاوید صاحب کی اس تحریر سے میں نے خود کو کافی حد تک تبدیل کیا ہے۔ بارونداجیکی کے ولولہ انگیز فلسفے اور عمران کے گولڈن ڈائیلاگ دل میں اترتے

انتقال پُر ملال

ادارۂ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ کارکن جناب رضی الدین مشیتِ ایزدی سے انتقال کر گئے۔ ہم ان کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔

تھے۔ اب ان کے بغیر جاسوسی بہت سونا سونا لگے گا۔ تابش صاحب سے گلہ ہے کہ ان کو اپنے عزیز دوست کی وفات کے بعد اس کا مشن جاری رکھنا چاہیے تھا۔"

بھکر سے ثمر خان کی مبارک باد "اس دفعہ رسالہ بڑی دیر سے یعنی 9 تاریخ کو ملا۔ میں کسی بھی رسالے میں یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں۔ اس کو شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں۔ اب بات کرتے ہیں کہانیوں کی۔ قسط وار کہانیوں میں للکار بہت خوب تھی لیکن عمران کو مرنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ گرداب بھی اچھی جا رہی ہے۔ نئی کہانی جواری نام سے تو اپنے کام کی نہیں لگتی لیکن ابھی کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا۔ ایک بات پوچھنا چاہوں گا کہ یہ کہانی کتابی شکل میں بھی شائع ہوگی؟ کیونکہ میں نے صرف 7 یا 8 اقساط ہی پڑھی ہیں۔ میری طرف سے طاہر جاوید مغل کو دلی مبارک باد کہ انہوں نے یہ شاہکار تخلیق کیا۔"

ایم عزیر اسد کی چکوال سے رائے "لاہور سے وقتِ صبح نکلتے ہوئے زادِ راہ کے طور پر بک اسٹال سے ہم نے جاسوسی ڈائجسٹ کو اچک ہی لیا۔ سوچا سفر اچھا گزر جائے گا مگر جب سیدھا للکار کی آخری قسط پر پہنچے تو سحر زدہ سے سطر سطر پڑھتے آخری لفظ تک کو نچوڑ ڈالا۔ ذہن میں آتا ہے کہ اب کوئی بھی کہانی للکار کی جگہ نہیں لے سکتی مگر آتش فشاں اور دیوی وغیرہ کی طرح اس کی جگہ پر بھی خوب صورت تحریر سج جائے گی کیونکہ یہی جاسوسی کی شان ہے۔ اس کے بعد ہر دلعزیز رائٹر محی الدین نواب جن کی تحریر کافی عرصے بعد سامنے آئی۔ ابتدائی صفحات پر محبت اور غم کے ملے جلے رنگ بکھیر رہے تھے، کہانی بہت پسند آئی۔ پہلا رنگ ایک خوب صورت تحریر جس میں محبت کا کافی مختصر ذکر تھا مگر خوب لگا۔ اب آتے ہیں محفل کی طرف۔ افتخار حسین اعوان کرسی مبارک ہو۔ سومی جی آپ نے بہت دردناک خبر سنائی، بہت افسوس ہوا۔ عدنان یوسف کی شمولیت اچھی لگی۔ ایک اور بات وہ یہ ہے کہ محفل کے کافی سارے دوست ہاتھ دھو کے اور بعض تو منہ دھو کے ہمایوں سعید صاحب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حقیقتاً تو ان کے تبصرے بہت بھاتے ہیں۔"

کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں کے خدشات "مجھے اچھی طرح یاد ہے دو ماہ پہلے جب میں چینی نکتہ چینی میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور دل میں تشکر کے جذبات تھے۔ میں ایک سطر لکھتا اور ایک نظر جھولے میں سوئے اپنے پیارے بیٹے کی طرف دیکھتا تھا۔ کتنا پُرجوش تھا، میں کتنا خوش تھا۔ ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر بتاتا تھا کہ میں باپ بن گیا ہوں۔ 19 اپریل 2013ء جمعۃ المبارک کو عین نمازِ جمعہ کے وقت جب میں اپنی گود میں کھیلتے اپنے صحت مند لختِ جگر کو اپنی والدہ کو پکڑا کر ادائیگی نماز کے لیے گیا ہوں اور واپس آنے سے پہلے ہی میری گود خالی ہو گئی۔ وہ جو میری آنکھوں کا محور تھا، میرے دل کا سکون تھا، وہ جس نے اگلے دن چالیس دن کا ہو کر اپنی والدہ کے ہمراہ نہانا تھا، وہ اتنا جلد باز نکلا کہ عین 39 ویں دن جب ہم اگلے آنے والے دن کی تیاریاں کر رہے تھے، دل میں کیا کیا منصوبے بنا رہے تھے۔ رشتے داروں کے گھروں سے دعوتوں کے فون آ رہے تھے۔ صغیر کی پیدائش کی بھرپور خوشی میں اگلے دن مٹھائی تقسیم ہونی تھی۔ نہ آسمان گرا، نہ گردشِ شب و روز ٹھہری حتیٰ کہ نہ میری دھڑکن رکی، نہ سانسیں تھمیں اور وہ چلا گیا۔ شاید آپ کے پاس صفحات میں اتنی وسعت نہ ہو کہ میرا غم چھاپ سکیں مگر میں آپ لوگوں سے اپنا غم شیئر نہ کرتا تو میرا دل غم سے پھٹ جاتا۔ اللہ اولاد کا غم کسی کو نہ دکھائے۔ ڈائجسٹ میں صرف للکار کی آخری قسط کا ہی مطالعہ کیا۔ مغل صاحب کی تحریریں بلاشبہ جادو اثر رکھتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مغل صاحب کی للکار، دیوی کی وجہ سے میں لگاتار جاسوسی کا مطالعہ کرتا رہا مگر مغل صاحب نے للکار کے اینڈ میں خاصی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مغل صاحب نے ہمارے جذبات کی ذرا قدر نہیں کی۔ میں پوچھتا ہوں دیوی میں ستر بار رستم موت کے منہ میں جا کر آخری صفحے پر زندہ بچ گیا تھا تو للکار میں عمران کو کیوں مارا؟ مغل صاحب! آخر آپ نے اپنے کون سے جذبے کی تسکین کی ہے؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے ادارے نے مغل صاحب سے زبردستی للکار کو بند کروایا ہے۔ میں سخت ناراض ہوں اور ادارے سے اس بارے میں وضاحت طلب کرتا ہوں اور اگر وضاحت نہ ملی تو سمجھوں گا ادارہ اپنے قارئین کی قدر نہیں کرتا۔" (محترم پہلے تو ہماری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ بیٹے کی رحلت پر آپ کو جلد از جلد صبر عطا فرمائے۔ دوسرے ہر مصنف اپنی تحریر لکھنے میں آزاد ہوتا ہے۔ ہماری طرف سے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوششوں کو دخل ضرور ہوتا ہے، ختم کرنے پر نہیں۔ طاہر جاوید مغل صاحب نے اپنی مرضی سے للکار کا اختتام کیا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب وہی دے سکتے ہیں)

بالاکوٹ سے محسن علی موم کی منظر نگاری "حدِ نظر پھیلا ہوا سبزہ اوپر پہاڑوں پر سفید چاندی جیسی برف اور جھیل سیف الملوک کے کنارے بیٹھ کر جاسوسی پڑھنے کا مزہ، واہ واہ... میں اپنے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں اس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ خود ہی تصور کر لیں۔ (آپ کو ہمارے دل جلانے خوب آتے ہیں) آہ، ٹائٹل پر خوابیدہ حسن کے جلوے، نیچے موجود ڈپریشن زدہ آدمی جو کہ یقیناً حسینہ کے شوہر نامدار ہی ہیں کیونکہ شادی کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر رونا یہ کوئی نئی بات نہیں اور ساتھ میں موجود رقیبِ روسیاہ کی طنزیہ ہنسی اور اوپر موجود گولی کا نشان غرض ہر چیز وجودِ زن کی تباہ کاریاں کھول کھول کے بتا رہی تھی کہ بچنا ان چڑیلوں سے۔ کرسی صدارت پر افتخار حسین اعوان کو دیکھ کر جمہوری نکتۂ نظر ہم پر مزید عیاں ہو گیا، مبارک ہو جی۔ ماہا ایمان! اگر آپ کے یہ الفاظ اگر بدقسمتی سے آپ کے وہ سن لیں یقین جانیے کہ اپنا سر ہی پیٹ لیں اس لیے ان کے ضبط کو مت آزمائیں۔ اللہ ان کے حال پر رحم کرے اور انہیں صبر عطا کرے، آمین۔ سید محی الدین اشفاق جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں اور پیچھے بس ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ اللہ آپ کو صبر عطا فرمائے ہم آپ کے والد کے لیے دعا گو ہیں۔ کہانیوں میں للکار سے آغاز کیا اور آخر میں عمران کی موت نے غمزدہ کر دیا طاہر انکل نے ہیپی اینڈنگ نہیں کرنی تھی نہ کی لیکن عمران کو مار کے بیک وقت کہانی کو اچھا بھی کیا اور برا بھی اور خلافِ معمول پچھلی کہانیوں کے برعکس دو محبت کرنے والوں کو ملا دیا جس سے دل کو کچھ قرار ملا۔ ویسے تو عمران ایک فرضی کردار تھا لیکن اس جیسے انسان یقیناً دنیا میں موجود ہیں جو لوگوں میں محبت بانٹتے ہیں اور ہر جگہ ان کا نام مختلف ہے۔ گرداب اب کچھ بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اسما جی اب لمبے مکالموں سے پرہیز کر رہی ہیں۔ باقی کہانیوں میں کھیل اور آبی قبر دونوں ہی اپنے موضوع کے لحاظ سے دلچسپ تحریریں تھیں۔"

لاہور سے آفتاب احمد نصیر اشرفی کی شوخی "جناب طاہر جاوید مغل کی للکار نے انہیں اسما قادری کے گرداب میں ایسا پھنسایا کہ احمد اقبال کو ان کی مدد کے لیے اپنے جواری کو بھیجنا پڑا۔ جواری کی آمد کا سن کر مغل صاحب کی للکار مدھم ہوتی ہوئی بالآخر اپنے اختتام کو پہنچی۔ وطن کی محبت اور اس کے لیے کچھ کر گزرنے کا عزم و یقین وجہ بنا مغل صاحب کی للکار کا جس کے لیے جان کی بازی لگا دی عمران، تابش اور ان کی ٹیم نے اور جان ہار کر جانباز کہلایا عمران اور خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کی جانبازی کو تابش جیسے مردِ حق نے اور ساتھ ہی حق بھی ادا کر دیا اپنی دوستی اور محبت کا ثروت کو قبول کر کے۔ کیا دوست کسی دوست سے اتنی محبت بھی کر سکتا

ہے جتنی تابش کو عمران سے تھی؟ عمران کا کردار چھایا رہے گا۔ بھارت کی کمینگی اور کم ظرفی کا ثبوت تو ہمیں محی الدین نواب صاحب نے بھی دیا قفس گزیدہ کے ذریعے کہ کس سازش اور دھوکا دہی سے وہ ہمارے معصوم شہریوں کو جو سیاحت کی غرض سے بھارت جاتے ہیں اور اپنی غیر دانستہ اور بے ضرر غلطیوں کی وجہ سے ان کی ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ محبوب خان تو ایک مثال ہے، بھارتی بربریت کی ایسی ہزاروں مثالیں وہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری عقوبت خانوں میں بھری پڑی ہیں۔ سرورق پر تبصرہ بعد میں کریں گے، پہلے ذکر ہو جائے پہلے رنگ کا۔ حرص و طمع نے آخرکار قبر میں دفن ہونا ہی ہوتا ہے۔ بھلے وہ زمین میں بنے یا پانی کی تہ میں۔ ابو یحییٰ صاحب کی تحریر کی خوب صورتی یہ تھی کہ اس میں حب الوطنی کا جذبہ موجود تھا۔ عورت کے سامنے سرنگوں ہونے والے فراست جیسے لوگ دولت کے لالچ میں اپنی قوم اور ملک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ خیر و شر کی اس کشمکش کو ہی آبی قبر کا موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا رنگ جرم داستان تھا۔ جس کا موضوع بھی منظر امام صاحب نے ہرس و ہوس کو بنایا۔ ایک لاحاصل جرم جو درجن بھر لوگوں کی موت کا سبب بنا۔ انجام نہ صرف منفرد اور چونکا دینے والا تھا بلکہ سبق آموز بھی تھا۔ کھوج اور تلاش کے بعد عرق ریزی سے ترجمہ کی گئیں تحریروں میں روایت، بازی، کھلی آنکھ، محبت اور جنگ، پرندہ، چوتھا سال، کھیل... پرندہ اور روایت واجبی سی تھیں بقایا ہم پلہ تھیں۔ کاشف زبیر جنگ اور محبت کی صورت میں جو شہ پارہ لائے، اس نے ہمیں ان کا اور بھی گرویدہ بنا دیا ہے۔ سرورق بالکل پسند نہیں آیا ہمارے لیے کسی بھی خاتون کی خوب صورتی اس کے ہاتھ پاؤں کی دلکشی کی وجہ سے ہوتی ہے بھلا جس کے ہاتھ اور پاؤں نظر آتے ہی نہ ہوں، وہ کیسے جاذبِ نظر ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ اور رائے ہے لہٰذا خبردار محفل کے ساتھی چینی نکتہ چینی میں کوئی نکتہ چینی نہ کریں۔ ذاکر صاحب کبھی ہم مردوں کی بھی کوئی خوب صورتی اجاگر کر دیا کریں۔ کہیں تو ہم آپ کو اپنی تصویر روانہ کر دیں، شاید آپ کا ویژن مزید وسعت اختیار کر سکے۔"

کراچی سے سارہ کی مصروفیت "جون کا جاسوسی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگایا تو ہم نے دھڑکتے دل سے کھولا اور اندیشہ درست ثابت ہوا۔ مطلب یہ کہ للکار شاندار انداز میں اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالی۔ وہ بھی رات کے بارہ بجے کے بعد۔ ہر سطر پُرتجسس، ہر لفظ عمدہ تھا۔ پوری قسط انکشافات سے بھرپور تاریخی تحریر ثابت ہوئی۔ اختتام کی طرف بڑھتے بڑھتے سانس رکنے لگی۔ عمران کی زندگی کا آخری سین آیا تو میں دم بخود بیٹھی تھی۔ بہت گہرا سناٹا پھیل گیا میرے آس پاس۔ اس کی موت کئی لوگوں کو زندگی دے گئی۔ کیا تھا اگر عمران نہیں مرتا؟ لیکن نہیں، سچی بات ہے اس سے اچھا کلائمیکس اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے کردار تخلیق کرنے میں مغل انکل کو ملکہ حاصل ہے اور ایسے شان دار قسم کے اینڈ سے ہماری جان کو آزمانے کا ہنر بھی مغل انکل کے ہی پاس ہے۔ بہرحال اتنی عمدہ داستان کے لیے مغل انکل تعریف کے صحیح معنوں میں حق دار ہیں۔ سرورق کے دونوں رنگ میں آبی قبر حرص و طمع کے بھنور میں پھنسے لوگوں کی عبرت انگیز داستان لگی۔ جعلی موت پرانے کاسٹیوم کی مرمت جیسی تھی۔ ماہر سراغ رساں کی کھلی آنکھ سے جرم و سراغ بینی کے کئی پہلو بے نقاب ہوئے۔ قفس گزیدہ تازہ ترین حالات کا تجزیہ ثابت ہوئی لیکن پھر وہی انڈیا اور پاکستان کی تاریخ کے صفحات میں گم ہو جانے والی ایک اور لو اسٹوری؟ نہیں آئی پسند... باقی اسٹوریز مصروفیت کی وجہ سے زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی فکر مندی "طویل عرصے تک محفل سے دور رہا مگر جاسوسی کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا رہا مگر اس مرتبہ للکار کے اختتام نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ جاسوسی 5 جون کو دستیاب ہوا۔ سرورق پر ذاکر انکل نے حالاتِ حاضرہ کی زبردست عکاسی کی تھی۔ یعنی نفسانفسی کا عالم تھا۔ کوئی پریشان تھا تو کوئی اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا جبکہ مس ماہ جبیں شاید چیمپئنز ٹرافی کے ہنگاموں سے بے نیاز اپنی الیکشن کی تھکن اتار رہی تھی۔ مظفر آباد سے افتخار حسین اعوان نے وزارت کا منصب سنبھالا تو ڈپٹی کی کرسی زویا اعجاز نے سنبھالی، دونوں کو مبارک باد۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ واہ کیا اینڈ کیا ہے طاہر انکل نے۔ حسبِ روایت ایک حساس اور جذباتی و دکھی اختتام۔ عمران جیسے کردار کی موت کا بالکل یقین نہیں آیا اور نہ ایک قسط پہلے ایسی ویسی کوئی امید تھی۔ جاوا اور یوسف کا انجام بہت اچھا ہوا اور تابش کو اس کی محبت آخرکار مل گئی۔ گرداب میں شہریار اور سلو کی کامیاب کارروائیاں جاری ہیں اور ایکشن اور ایکسائٹمنٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ شاید اسی ایکسائٹمنٹ میں اسما جی بھی کچھ گڑبڑ کر رہی ہیں۔ محی الدین نواب کافی عرصے بعد آئے اور زبردست دھماکا کیا۔ واقعی سیکڑوں قیدیوں کے تبادلے کے باوجود ہمارے بے شمار پاکستانی ایسے ہیں جو بھارت کے قیدی ہیں مگر ان کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اس کے علاوہ منظر امام کی جعلی موت بھی اچھی تحریر تھی۔ واقعی آج کل کے معاشرے میں جان سے ارزاں شے شاید کوئی اور نہیں اور دولت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ تنویر ریاض کی روایت میں فلیچر کی روایت پسندی نے ہی اس کی موت کا سامان کر دیا مگر پیٹر نے بھی کمال عقل مندی سے اس کیس کو حل کر دیا۔ ماہ نور کی گمشدہ کی چند لائنیں پڑھیں تو محسوس ہوا کہ یہ پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ مزید کچھ مطالعے پر یہ شک یقین میں بدل گیا۔ مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب یہ کہانی نظر سے گزر چکی ہے۔"

ایم احمد ہاشمی بونیر سے لکھتے ہیں "4 تاریخ کو ڈاکیا نے شمارہ ہاتھ میں تھما دیا۔ سرورق حسینہ بھی غالباً عمران کی موت کا سن کر صدمے سے بدحال تھی۔ آزاد کشمیر سے افتخار حسین صدارتی کرسی پر بیٹھے تھے، مبارک۔ خط بہترین تھا۔ باقی سب دوستوں کو داد دیتا ہوں جنہوں نے مجھے اصلی نام سے پہچانا۔ شکیل کاظمی صاحب! کم ظرفی ہے آپ کی کہ آپ پڑوسن بے چاری کا دل دکھاتے ہیں۔ جب وہ مناسب مشورے دیتی ہے تو اس کے پیچھے یقیناً وہ اسی خوب صورت وجہ کی منتظر ہوگی کہ کب شکیل کے دل میں رحم آ جائے اور اس کی بات پر عمل کریں۔ فہد علی صاحب! آپ کا اندازہ درست ہے۔ بس قسمت کی بات ہے۔ بابر عباس بھائی! ایک ماہ کی خوشی بھی کافی ہے اس دیس میں۔ للکار داغِ مفارقت دے گئی۔ خیر للکار کی جدائی سہہ سکیں گے لیکن عمران کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔ طاہر جاوید صاحب نے عمران کے پرستاروں کا دل توڑا ہے گو کہ بعد میں انہوں نے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کی اپنی سی کوشش کی، تابش اور ثروت کو ایک کیا لیکن یہ خوشی عمران کی موت کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ گرداب میں شہریار پتا نہیں کب ڈاکٹر تک پہنچے گا۔ ماہ بانو پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی۔ رنگوں میں پہلا رنگ زبردست تھا۔ دوسرا رنگ بھی ٹھیک تھا۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ لالچ بری بلا ہے لیکن پھر بھی کوئی باز نہیں آتا۔ نواب صاحب سیاسی بساط سجائے بیٹھے تھے۔ رائٹر نے انڈین سیاست دانوں کی مکاریوں سمیت پاکستان کے خلاف چھپی سازشوں کا تلخ چہرہ بھی دکھایا۔ اپنے مفادات کی خاطر ایک بے گناہ پاکستانی کو اذیت دے کر انہوں نے دشمنی کا پکا ثبوت دیا۔ چھوٹی کہانیوں میں محبت اور جنگ اچھی تھی۔"

پیر بابا سے صبا گل کی گل کاری "شمارہ 5 جون کو ملا۔ سرورق خوب صورت تھا۔ صدارت افتخار حسین کے حصے میں آئی۔۔۔ مبارک۔ شکیل کاظمی صاحب کا خط بہت اچھا تھا۔ بھائی میرے، آپ کی اوٹ پٹانگ پڑوسن آپ کی صحت کے لیے مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ تو شکر ہے آپ اس کے کسی مشورے پر عمل نہیں کرتے ورنہ شیکسپیئر کو بھول جاتے۔ بس اچھا ہی ہے کہ پڑوسن سے بات کر کے ہاشمی صاحب کی طرح وہ خوب صورت وجہ سامنے لائیں۔ بابر عباس! بیٹی مبارک ہو۔ ایم اے ہاشمی جی! آپ کا اندازہ درست ہے لیکن اصلیت چھپانے کی مجھے کیا ضرورت۔ والد صاحب کی وفات کے بعد ہم حال ہی میں پیر بابا شفٹ ہو گئے ہیں۔ محی الدین اشفاق! اللہ آپ کے والد کی مغفرت فرمائے۔ للکار نے مایوسیوں کی تاریکیوں میں دھکیل دیا۔ طاہر صاحب اچھے رائٹر ہیں لیکن جب ایسا کرتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عمران تو زندہ دلوں کی دھڑکن تھا۔ تاریکی میں روشنی تھا۔ کہانی ختم ہونے پر اتنی اداس نہیں جتنا عمران کی موت نے دکھی کر دیا۔ آخر اس کو مار کے آپ کو کیا ملا مغل صاحب! یہ اگر بے وفائی نہیں تو کیا ہے؟ مانتے ہیں کہ حقیقت نہیں فسانہ ہے لیکن پھر بھی برداشت سے باہر ہے۔ اب ہماری امیدیں گرداب سے وابستہ ہو گئی ہیں لیکن اسماجی آج کل بہت سست ہیں۔ اسماجی! خدارا کہانی پرانی ڈگر پر لے آئیں۔ ابتدائی کہانی، کہانی کم اور حقیقت زیادہ لگی۔ بھارت کی بدنما سیاست کی صحیح ترجمانی تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ اچھا تھا اور پچھلے مہینے سے میں مسلسل سر درد کی شکار ہوں۔ دواؤں سے افاقہ نہیں ہوتا۔ سب سے دعا کی درخواست ہے۔" (اللہ تعالیٰ جلد شفا دے)

فیصل آباد سے سمیرا صدیق کی درخواست "آپ کا ہر صفحہ روزِ روشن کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے جیسے پڑھتے جائیں، قاری کی پیاس بجھنے کے بجائے بڑھتی ہے۔ اگر آپ کا جاسوسی ڈائجسٹ نہ ملے تو ایسے لگتا ہے کہ پھیپھڑوں میں آکسیجن کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ ہر کہانی کا ہر کردار جیتا جاگتا اور آنکھوں کے سامنے چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بہت سی کہانیاں ایسی گزریں کہ ایسے لگا جیسے میری زندگی کی آپ بیتی ہو۔ جیسے میرے خیالات، حالات و واقعات کو کسی اور نے الفاظ میں ڈھال دیا ہو۔ میری زندگی کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جنہیں قلم سے تحریر کروں تو شاید میرے پاک وطن سے ایک آلائش کم ہو جائے جو سب آلائشوں کی جڑ ہے۔ میرے ساتھ قسمت نے عجیب کھیل کھیلے ہیں۔ میں اپنے حالاتِ زندگی کو ناول کی شکل دے چکی ہوں۔ مجھے لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ مجھے ایک موقع دیں تو میں اپنے ٹیلنٹ کو ضائع ہونے سے بچا سکتی ہوں میں نے جوش و جذبے سے بھرپور اور تھرل والے دو ناول لکھے ہیں ان کا پلیٹ فارم صرف آپ کا جاسوسی ڈائجسٹ ہے۔ پلیز معزز ایڈیٹر صاحب! مجھے ایک موقع دے کر میرے ٹیلنٹ کو زنگ آلود ہونے سے بچائیں۔ پلیز، پلیز مجھے ایک موقع دیں تاکہ میں اپنے خیالات کو بذریعہ قلم لوگوں تک پہنچاؤں، شکریہ۔" (ناول ہمیں ارسال کر دیں۔ پڑھنے کے بعد ہی کچھ بتا سکیں گے)

گھارو سے سومی خان کی امیدیں "اس بار جاسوسی 4 جون کو ملا۔ کڑکتی دھوپ، گرمی اور لوڈشیڈنگ کے عذاب کے ساتھ۔ پر جب ہاتھ میں جاسوسی ہو تو یہ سب عذاب بھول جاتے ہیں۔ تبصروں پر اس بار اول نمبر پر افتخار اعوان براجمان تھے۔ مبارک ہو جی۔ یکم جولائی کو کاظمی صاحب کی سالگرہ ہے۔ کاظمی صاحب! اللہ آپ کو لمبی عمر دے اور بہت سی خوشیاں بھی دے، آمین۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے پیپرز اچھے ہوئے۔ اب تو رمضان کی آمد آمد ہے۔ سب دوستوں کو ایڈوانس میں رمضان مبارک ہو۔ للکار کا اینڈ ہو گیا۔ ہمارے عمران کو مار دیا گیا۔ بہت افسوس ہوا۔ پر جو بھی ہے مغل انکل ایک اچھے رائٹر ہیں۔ بہت سی کہانیوں کی طرح للکار بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ گرداب اس بار تھوڑی ایکشن میں تھی۔ اب یہ اسٹوری بھی بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ مریم کے خان کی اسٹوری درست علاج پسند آئی۔ اللہ بخش نے مہرداد کو اس کے انجام کی بہت خوب سزا دی۔ سرورق میں دوسرا رنگ اچھا لگا۔ اب انتظار ہے احمد اقبال کے قلم سے لکھی ہوئی جواری کا۔ امید ہے یہ ایک اچھی اسٹوری ہو گی۔"

ناظم آباد سے ادریس احمد خان کی تعریفیں "جون کا جاسوسی بروقت مل گیا۔ سرورق پر حسینہ نازنینا خوابِ خرگوش میں مشغول اور دیگر دو اشخاص اپنے حال میں مست تھے۔ اندر چینی نکتہ چینی میں اداریہ سے مستفید ہوئے اور سرفہرست اعوان صاحب کو مبارک باد۔ اپنے نامے پر نظر پڑی، دیگر دوست بھی نظر آ رہے تھے اور اپنی اپنی آرا سے محفل کو چار چاند لگا رہے تھے۔ آخرکار للکار کا اختتام ہو گیا اور روایتی انداز میں ہوا مگر کہانی کا تقاضا بھی تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کو اتنی عمدہ اور جامع تحریر لکھنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ محی الدین نواب کی قفس گزیدہ بھی بہت اچھی لگی۔ متعصب ہندوؤں کا کردار بھی بہتر طریقے سے اجاگر کیا جو حقیقت سے قریب تر تھا اور اس کا واحد حل کہ عداوت کا جواب محبت جو کہ پاکستان اور پاکستانی عوام بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ کبھی تو تعصب کی آندھی تھمے گی۔ کبھی تو انتقام کی آگ پر برف پڑے گی انشاء اللہ۔ گرداب بھی آخری مراحل میں رواں دواں ہے اور شہریار، سلوا اپنے بدترین دشمنوں سے ان کے ہی ملک میں برسرپیکار ہیں۔ دشمنوں کی خطرناک چالیں اور حربے اور دونوں کے سامنے عبث ہیں۔ بازی گمشدہ نے بھی اچھا تاثر دیا۔ کھلی آنکھ میں بہترین ذہنی صلاحیتیں اور کاوش سے کام لے کر جرم کا سراغ لگا لیا۔ محبت اور جنگ، پرندہ، درست علاج بھی اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ چوتھا سال، کھیل بھی دلچسپ لگیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے آخری صفحات پر دو کہانیاں آبی قبر اور جعلی موت دونوں ہی خوب صورت اور منفرد تھیں، پسند آئیں۔ آبی قبر میں فراست نے عورت کے مکر و فریب میں آ کر اپنی عاقبت بھی خراب کی اور موت کی وادی میں سو گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے اور جعلی موت میں خود ہی دولت کے لالچ میں قاتل بنے اور خود ہی مقتول بن گئے۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی اداسی "3 جون کی ایک گرم صبح جاسوسی نے باقاعدہ ہمارے کمرے میں آ کر اپنا دیدار کروایا۔ معصومیت سے بھرپور اور مسکراہٹ سے محروم ایک خوب صورت چہرہ اپنی جانب توجہ دلانے میں کامیاب رہا۔ نیچے ایک لٹکے سے انکل نہ جانے کیوں اتنے خوش ہو رہے ہیں۔ کونے میں ایک اور موصوف بھی سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ سب سے پہلے کاشف علی میراں سے ڈھیروں تعزیت، اللہ آپ کو صبر دے اور مزید نیک اور صالح اولاد سے نوازے۔ افتخار حسین اعوان صاحب! بڑا حوصلہ ہے آپ کا جو اتنے بدبودار تیل استعمال کرنے والی آپ کو غضب ڈھاتی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے بھابی جی سے دلی ہمدردی ہے۔ زویا اعجاز کو خط شائع ہونے پر مبارک ہو۔ فہد علی جنجوعہ! آپ تو ہاتھ دھو کر (عقل سے) پیچھے ہی پڑ گئے۔ حالانکہ میں نے تو بہت سادہ اور سیدھی سی بات کی تھی جو آپ کی سمجھ شریف میں نہیں آئی۔ کبیر عباسی صاحب بائے گاڈ میں آپ کے نقشِ پا پہ نہیں چل رہی اور آپ کے تجربے کم تجربے کو چیلنج بھی نہیں کر رہی۔ ڈاکٹر عمران فاروق صاحب! آپ کی زبان کے پیچ کھولنے کے لیے بھی پیچ کش موجود ہے۔ اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہیں آپ۔ محسن علی موم جاے! کتنے عادی ہو نا بے عزتی کرواتے کے۔ کسی ماہ بخش دو تو تمہیں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ فی الحال تو اس بے چینی کا علاج یہ ہے کہ رات کو بستر جھاڑ کے سویا کرو۔ ادریس احمد خان! آپ کے ہاں کیا اچھے ٹوتھ پیسٹ دستیاب نہیں ہیں۔ محی الدین اشفاق کو والد کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اللہ آپ کو صبر عطا کرے، صبر کیجیے۔ انور یوسف زئی صاحب آپ نے تو ہمیں شرمندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن ہم عادت سے مجبور طویل تبصرہ کرنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ دریا کو کوزے میں بند کرنا مجھے نہیں آتا۔ مغل صاحب! حق ادا کر دیا کہانی لکھنے کا، بہت ہی زبردست اینڈ رہا۔ دو دن میں کچھ اور پڑھنے کے قابل ہی نہ رہی۔ سچ کہوں تو تابش سے ساری کہانی میں مجھے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ بس عمران، عمران اور عمران۔ انڈینز کو پچھاڑ کے پاکستان تک پہنچنا بہت ہی تھرلنگ رہا۔ یہ کہانی مدتوں تر و تازہ رہے گی صرف عمران کی وجہ سے۔ گرداب میں شہریار اور سلو بھی خاصی ہلچل مچاتے پھر رہے ہیں انڈیا میں۔ اینڈ پہ ماہ بانو کا غیاب سامنے آیا۔ رومانس کوسوں دور ہے۔ پہلی طویل تحریر محی الدین نواب کی قفس گزیدہ بھی انڈیا کے مناظر و حالات و واقعات پر مشتمل تھی۔ محبوب جیسے نہ جانے کتنے ہیں جو ہندوؤں کے بے وجہ عتاب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ شیخ ابو یحییٰ کی آبی قبر سنسنی خیز تحریر تھی۔ فراست انجانے میں را کے چیلوں کا شکار بن گیا۔ مجبوری میں ارم کو بینک لوٹنے میں ان کی مدد کرنی پڑی۔ زیر و بم اچھے تھے تحریر کے۔ منظر امام صاحب کی جعلی موت میں تو ایک کے بعد ایک موت ہو گئی۔ زر کا لالچ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مختصر تحریروں میں ہمیشہ کی طرح کاشف زبیر کا انتخاب محبت اور جنگ اول رہی۔"

احمد پور شرقیہ سے مشتاق احمد کی اچھی باتیں "میں جاسوسی کا کئی سال سے خاموش قاری ہوں لیکن جو چیز یہ خط لکھنے پر مجھے مجبور کر رہی ہے، وہ للکار کی آخری قسط ہے جو پوری قسط میں نے رو رو کے پڑھی ہے۔ واہ انکل طاہر جاوید مغل صاحب! کیا بات ہے آپ کی کہانی بنانے کی اور گرداب بھی اچھی جا رہی ہے۔ قفس گزیدہ اچھی کہانی تھی۔ آبی قبر یہ بھی بہت اچھی کہانی تھی اور جعلی موت بھی اچھی کہانی تھی۔ درست علاج بھی اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر نے ڈاکو کا اچھا علاج کیا۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھ رہا ہوں۔"

کلول، ضلع بھکر سے قیصر اقبال گچہ کی آمد "عزیزانِ جاسوسی! یہ ہماری جاسوسی میں پہلی انٹری ہے (خوش آمدید) اگر کسی کو محفل میں ہمارا آنا برا لگا ہو تو وہ محفل سے واک آؤٹ کر سکتا ہے کیونکہ ہم تو انشاء اللہ محفل میں ان رہنے کے لیے آئے ہیں۔ جون کا جاسوسی، سرورق پر بند آنکھوں، کھلے ہونٹوں والی لڑکی اور ہونٹوں پر ٹپکتا خون۔ گرمیوں میں لال مشروب تو پیا جاتا ہے، خون پینے کی وضاحت زویا اعجاز کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ خطوط کی محفل میں افتخار اعوان کا تبصرہ تو ایویں سا تھا پھر بھی مبارک باد۔ ادریس احمد خان تقریر کرتے ہوئے نظر آئے وہ بھی بغیر مجمع کے۔ سو ان کو چھوڑتے ہیں ان کے حال پر۔ جنجوعہ صاحب! یہ کیا جناب آپ نے نام نہاد ماہا ایمان کو کھسیانی بلی سے تشبیہ دے دی۔ فہیم اللہ خان اپنے خط میں دونوں جانب (صنفِ نازک، صنفِ وجاہت) لیپا پوتی کرتے نظر آئے۔ محسن علی موم صاحب! اچھا کیا کہ دوست کا منہ نہیں چوما، اس بے چارے کے منہ پر موم لگ جاتا۔ ماہا صاحبہ کو اپنوں کا فخر شاید باقی دنیا سے کچھ وکھری قسم کا ہے۔ اور سید بادشاہ سے محتاط رہنے کی ضرورت نہیں وہ اولڈ از گولڈ کے قائل نہیں ہیں اور محفل کے ساتھیو! اپنے دل تھام لو کیونکہ ماہا صاحبہ اور صبا گل نے آپس میں ایک دوسرے کا کچا چٹھا کھولنا شروع کر دیا ہے۔ راجی غارس صاحب! آپ کا کچا چٹھا پڑھا، اچھا لگا۔ کبیر عباسی صاحب، مطلب یہ ہوا کہ ماہا ایمان 1971ء میں جنگ کی پیداوار ہیں۔ تبھی تو جنگی قسم کا مزاج پایا ہے۔ کہانیوں میں اچھا ہوتا کہ لکی مین اس دفعہ بھی موت کو شکست دے دیتا۔ گرداب میں شہریار اور سلوا انڈیا میں قدم جماتے ہوئے اور اپنے مقصد کی تکمیل میں کوشاں اور ایک بار پھر ماہ بانو کی مشکلات۔ رنگوں میں پہلا رنگ آبی قبر بہت ہی اچھا لگا۔ وطنِ عزیز کے خلاف غیر ملکی سازشیں اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے کرنل عارف اور سارم جیسے جیالے، سارم کا کردار بہت اچھا لگا۔ دوسرا رنگ جعلی موت منظر امام کے ہاتھ سے لکھی گئی۔ ان کی سابقہ کہانیوں کی طرح بے تکی، جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ پہلی کہانی نواب صاحب کے قلم کی جولانیوں کا ثبوت قفس گزیدہ، بھارت کی ازلی پاکستان دشمنی کا ثبوت۔ ماہ نور کی مختصر کہانی گمشدہ میں آخرکار شہلا بیگم کو بیٹے کا چاہے کسی بھی حال میں تھا گمشدہ بٹن تو ملا۔ تنویر ریاض کی روایت اچھی کہانی تھی۔ مریم کے خان کی درست علاج میں اللہ بخش نے مہرداد کو واصلِ جہنم کر کے بالکل درست علاج کیا۔ مجموعی طور پر جون کا جاسوسی ہر لحاظ سے پسند آیا۔"

راجن شاہ لیہ سے توکل عباس شاہ کی تمنائیں "میں تقریباً آٹھ سال سے جاسوسی کا قاری ہوں۔ پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ تین جون کو جاسوسی کا دیدار ہوا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پر جا کے للکار ماری۔ طاہر جاوید مغل نے للکار میں رنگ ہی بھر دیا۔ یقین جانیے آنکھیں نم ہو گئیں۔ (ہمیں اندازہ ہے) عمران کی موت نے بہت رلایا۔ گرداب بھی اچھی جا رہی ہے۔ محی الدین نواب کی کہانی نے دل جیت لیا۔ چھوٹی کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ ایک درخواست تھی کہ ہر شمارے میں طاہر جاوید مغل اور نواب صاحب کی ایک ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ اور ہاں ایک خواہش ہے کہ للکار کی اسٹوری پر فلم بنائی جائے تو ہٹ ہو گی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

اعجاز احمد راحیل، ساہیوال۔ فوجی علی ڈنوہری، دریا خان ولی کوٹ لالو۔ حافظ نثار احمد، لاہور۔ وقا محمود، کراچی۔ ساحل دعا بخاری، محبوب شاہ مزرقا، گلگت بلتستان۔ انجینئر عمیر شہزاد بنگش، پشاور۔ علی حسین، مانسہرہ۔ سائرہ ملک، لاہور۔ فیصل حیات، بھلوال۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ملک عتیق مظہر، گجرات۔ ملک سعید، چکوال۔ مہر اختر عباس تھراج، جابر حسین، کبیر والا۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ سارہ راجپوت، راولپنڈی۔ تابی اور بالو، صفدر آباد۔ عامر رسول، راولپنڈی۔ محمد یوسف، کراچی۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ ڈاکٹر محمد رؤف اسلم، سرگودھا۔ اظہر حسین بچار، ہزاری جتوئی۔ اسفندریار ظفر، بدین۔ صدف ضیاء، ڈاکٹر عمران فاروق، جھنگ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ اصل باز آفریدی، کراچی۔ عبدالشکور، تحصیل جتوئی۔ بابر عباس، ساجد میر، گلیانہ روڈ کھاریاں۔

عزیز قارئین اس دفعہ ہمیں ڈاک معمول سے ہٹ کر موصول ہوئی ہے۔۔۔ ہم ان تمام محبت کرنے والوں کے تہِ دل سے مشکور ہیں۔۔۔ جنہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمارے لیے خطوط ارسال کیے۔۔۔ ساتھ ہی افسوس ہے کہ جگہ کی کمیابی کی وجہ سے تمام خطوط شائع نہ ہو سکے۔۔۔ اور للکار کے حوالے سے آپ لوگوں کی جو رائے، تبصرے اور تجاویز تھیں وہ ہم نے کوشش کی ہے کہ وہ شائع ہو جائیں۔۔۔

کفن بردوش

ڈاکٹر سلیم عادل

کچھ لوگ اس دنیا کو شکار گاہ سمجھتے ہیں... جو ہر قدم پر شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں... کام چور اور تن آسان لوگ محنت تو نہیں کرسکتے لیکن راتوں رات دولت مند بن جانے کے خواب ضرور دیکھتے ہیں... چیتے جیسی چُستی اور لومڑی جیسی چالاکی اختیار کرنے والے شکاریوں کا وحشت و بربریت سے بھرپور ایڈونچر... ان کے نزدیک کسی کو بھی لوٹنا سب سے آسان کام تھا... لوٹ مار کی ان مہمات میں انسانی جان سب سے ارزاں تھی...' تعلیم... تہذیب اور اخلاق سے دور امریکا کے ساحلوں اور ویرانوں میں بُنی کہانی کے دلچسپ و سنسنی خیز لمحات جو آپ کو آخری سطروں تک کہانی پڑھنے پر پابند کردیں گے...

محبت کی دلفریب رنگینیاں... نفرت کی بھڑکتی چنگاریاں...

دوست دشمن کی سرکشی سے لبریز تیز رفتار ناول کا پُرتجسس انتخاب

سمندر کے ساتھ ساتھ اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا جس کے سبب وہ ساحل جہاز رانی یا دوسرے مقاصد کے لیے بیکار تھا۔ وہاں بسنے والے بھی روزگار نہ ہونے کی وجہ سے کہیں دور چلے گئے تھے۔ اُتھلے ساحل پر تا حدِ نظر ویرانی ہی ویرانی نظر آتی تھی۔ وہ چھوٹی سی بادبانی کشتی میں آرام سے پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ ہوا کے دوش پر کشتی سمندر میں اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کا رخ ساحل کی طرف ہوگیا جہاں کنارے پر

چوبی شہتیروں اور تختوں سے ایک گھاٹ بنا ہوا تھا۔ گھاٹ کے ساتھ ہی ایک اونچی چٹان پر سرخ پتھروں سے بنی ہوئی عمارت کے خستہ و شکستہ آثار نظر آرہے تھے۔ گھاٹ سے لکڑیوں کا زینہ اوپر تک چلا گیا تھا۔ کھنڈروں میں ایک نیم شکستہ برجی میں تانبے جیسی رنگت اور سیاہ بالوں والی ایک حسین لڑکی تقریباً نیم برہنہ حالت میں بیٹھی اس کشتی بان کو دیکھ کر بے تابانہ انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو امریکی نوجوان نے اپنی شکار کی ہوئی تین مچھلیاں فضا میں لہرا کر لڑکی کو اپنی کامیابی کا اشارہ دیا۔ جواب میں لڑکی نے اس کی طرف ایک پُرجوش فضائی بوسہ اچھال دیا۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا اور فضا میں پھیلے ہوئے سفید پرندوں نے ساحل کو سحر انگیز بنایا ہوا تھا۔ اسی دوران میں چٹان کے عقب سے ایک گھڑسوار نمودار ہوا اور چٹان کے دامن میں ایک اوٹ میں چھپ گیا۔ سر پر جمے ہوئے بڑے سے میکسیکن ہیٹ نے اس کا چہرہ تقریباً چھپا لیا تھا۔ اس کی نگاہیں سمندر کی سطح پر بڑھتی ہوئی کشتی پر مرکوز تھیں۔

دھیرے دھیرے کشتی گھاٹ سے آلگی۔ نوجوان رسا تھام کر گھاٹ پر چڑھا اور اسے کھونٹے سے باندھنے لگا۔ اس کی پشت ساحل کی طرف تھی۔ اچانک فضا رائفل کے فائر سے گونج اٹھی اور وہ نوجوان الٹ کر پانی میں جاگرا، برجی میں بیٹھی ہوئی لڑکی وہ منظر دیکھ کر ہذیانی انداز میں چیخی اور جوزف... جوزف پکارتی ہوئی دیوانہ وار کئی... سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی کنارے تک پہنچ گئی۔

نوجوان نے پانی سے سر باہر نکالا۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے فائر کا دھماکا ضرور سنا مگر گولی اسے نہیں لگی تھی۔ ماہر نشانے باز نے رسے کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ اسے باندھنے کے لیے زور لگا رہا تھا، رسا ٹوٹتے ہی توازن کھو کر پانی میں جاگرا۔

لڑکی ساحل کے اُتھلے پانی میں دوڑتی ہوئی بہت تیزی سے نوجوان تک پہنچی جو اپنے بالوں سے پانی جھٹک کر گردوپیش میں کچھ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ لڑکی والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی۔

اسی اثنا میں گھڑسوار بھی وہاں تک آپہنچا۔ اس نے آتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ہائے جوزف... کیسے ہو... بہت اچھے لگ رہے ہو... اپنی اس تصویر سے بہت بہتر!“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک سال خوردہ پوسٹر لہرایا۔ اس پوسٹر پر جوزف کی بڑی سی تصویر کے اوپر جلی حروف میں تحریر تھا۔ ”مطلوب ہے... زندہ یا مردہ... جوزف کارپینٹر... انعام پانچ ہزار ڈالر۔“

یہ ڈیڑھ سو برس پہلے کا امریکا تھا جہاں جرائم اور لاقانونیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ سب کچھ نہایت فرسودہ تھا۔ میڈیا نام کی کسی شے کا وجود نہیں تھا۔ اس وسیع برِاعظم میں بڑے بڑے غیرآباد علاقے تھے۔ میکسیکو کی سرحد سے آزادانہ آمدورفت ہوتی تھی۔ خاص طور پر امریکا کا مغربی علاقہ خطرناک مجرموں کی پناہ گاہ تھا۔ ان کو پکڑنا پولیس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ مجرموں کو اشتہاری قرار دے کر بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ لگوا دیتے تھے۔ انعام کی رقم مجرم کی نوعیت کے مطابق مقرر کی جاتی۔ اس رقم کے لالچ میں انسانوں کے شکاریوں کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ یہ ماہر نشانچی اور گن فائٹر انعامی رقم کے لالچ میں ہر طرف اشتہاری مجرموں کی بُو سونگھتے پھرتے تھے۔ اس دور میں دس پانچ ہزار ڈالر کی رقم بہت خطیر ہوا کرتی تھی جو پل بھر میں کسی مفلوک الحال گن فائٹر کو معززاور امیر بنا سکتی تھی۔

سیاہ بالوں والی لڑکی جذباتی انداز میں جوزف کی خیریت دریافت کررہی تھی، اسی لمحے گھڑسوار نے اپنی دھواں اگلتی ہوئی ونچسٹر رائفل کی نال سے اپنا میکسیکن ہیٹ اوپر کیا اور اس کا حسین و جمیل، دودھیا چہرہ سامنے آگیا، سنہری زلفیں ہیٹ کی قید سے آزاد ہوکر اس کے شانوں پر لہرانے لگیں۔ گھوڑے کی پشت پر وہ اپنے نیم برہنہ اور مردانہ لباس میں براجمان تھی مگر اس کی آنکھوں میں موت جیسی سردمہری رچی ہوئی تھی۔

اس نے نخوت آمیز انداز میں اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دی پھر سرد اور سفاکانہ لہجے میں بولی۔ ”واہ جوزف... تو یہ ہے تمہاری ننھی سی جنت۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں جوزف کو سہارا دینے والی، سیاہ بالوں والی لڑکی پر مرکوز ہوگئیں۔ ”خوب... میں تو سمجھتی تھی کہ پری زادیوں کے بال سنہرے ہوتے ہیں مگر...“ اس نے طنزیہ پیرائے میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جوزف گھڑسوار حسینہ کو پہچان چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی عینک سنبھالتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

”میری...! یہ تم ہو... مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔“

سیاہ بالوں والی نے حیرت سے پہلے جوزف اور پھر گھڑسوار میری کی طرف دیکھا اور مجروح لہجے میں بولی۔ ”جوزف...! کیا تم واقعی اسے جانتے ہو؟“

جوزف نے سر جھکا لیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی برآمد نہ ہوسکا۔

سیاہ بالوں والی اسے سہارا دیتی رہی۔ جوزف اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران میں میری نے ایک پل کے لیے بھی ان دونوں پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

جونہی جوزف اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، میری نے اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی رائفل کا رخ ان دونوں کی طرف کرلیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ”تم دونوں نے پانی میں بہت موج کرلی... اب باہر آجاؤ... اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر... شاباش، جلدی کرو!“

چند منٹ بعد وہ تینوں طویل سیڑھیاں عبور کرکے چٹان پر بنی ہوئی کھنڈر جیسی عمارت کے ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے جہاں سر پر کھلا آسمان نظر آرہا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے کمرے کی چھت اور دیواروں کے بعض حصے غائب ہوچکے تھے لیکن چھت کے چوبی شہتیر ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھے۔

میری نے اپنے شانے سے جھولتے ہوئے چرمی تھیلے میں سے لمبی سی زنجیر نکالی جس کے دونوں سروں پر ہتھکڑیاں موجود تھیں۔ اس نے ایک ہتھکڑی کو اچھال کر زنجیر کو ایک شہتیر پر سے گزارا، ایک ہتھکڑی جوزف کی داہنی کلائی میں لگائی اور دوسرا سرا سیاہ بالوں والی لڑکی کی بائیں کلائی میں باندھ دیا۔

زنجیر کافی لمبی تھی لیکن شہتیر بھی کم اونچا نہیں تھا۔ جوزف کا دایاں اور سیاہ بالوں والی کا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا بلکہ لڑکی کو کھچاؤ سے بچنے کے لیے پنجوں کے بل اچک کر کھڑا ہونا پڑا تھا۔

کچھ فاصلے پر فرش میں گوشت بھوننے والی ایک بڑی سی انگیٹھی نصب تھی۔ ان دونوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر میری نے اطمینان سے ان کے سامنے ہی جوزف کی شکار کی ہوئی مچھلیاں آگ پر بھونیں اور انہیں چٹ کرنے لگی۔ مچھلی کھاتے ہوئے بھی اس کی تقریر جاری تھی۔

”جوزف! حیرت کی بات ہے، تمہیں یہ داستانوی قسم کا عشق ہوا بھی تو کس سے، ایک سیاہ بالوں والی سے؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سیاہ بالوں والیوں کی ایک چیز تمہارے لیے ہمیشہ سے ہی ناقابلِ برداشت رہی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ مجھے یاد نہیں آرہا۔ کیا تم بتاؤ گے؟“ یہ کہتے ہوئے میری اپنے چہرے پر گہری سوچ کا مصنوعی تاثر لاتے ہوئے میکسیکن لڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی اور ناک سکیڑ کر کچھ سونگھا اور اچانک بولی۔ ”آں، ہاں یاد آیا۔ سیاہ بالوں والی لڑکیوں کی بدبو۔“

میکسیکن لڑکی کے لیے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے پورے زور سے میری کے منہ پر تھوک دیا۔

میری اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی اور یوں بھی وہ سیاہ بالوں والی میکسیکن لڑکی کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ تھوک سیدھا اس کے چہرے پر گرا اور پھیل گیا۔

میری ایک دم خاموش ہوگئی۔ شعلہ بار نظروں سے میکسیکن لڑکی کو گھورتے ہوئے اس نے اپنے دستانے سے چہرہ صاف کیا اور رائفل اٹھالی۔

جوزف سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میری نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کا دستہ میکسیکن لڑکی کے چہرے پر اس زور سے رسید کیا کہ وہ آواز نکالے بغیر بے ہوش ہوکر ہتھکڑی سے جھول گئی۔

جب سیاہ بالوں والی میکسیکن لڑکی کو ہوش آیا تو دنیا اس کے سامنے الٹی ہوچکی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے علم ہوا کہ دنیا الٹی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ خود الٹی ہوگئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور دونوں پاؤں آپس میں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے ذریعے اسے عمارت کے مرکزی داخلی راستے کی چھت کے ایک شہتیر سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔

اس کا سر زمین سے کوئی پانچ فٹ بلندی پر تھا اور اس کے لمبے گھنے سیاہ بال زمین سے کچھ ہی اوپر تھے۔ چونکہ وہ الٹی لٹکی ہوئی تھی، اس کی باچھوں سے رستا ہوا خون اس کی دونوں آنکھوں کے نزدیک پہنچ کر جم گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کی پیشانی سے ہوتے ہوئے اس کے سیاہ گھٹاؤں جیسے بالوں میں جذب ہورہے تھے۔

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے جوزف کا چہرہ دکھائی دیا جو اس کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

جوزف نے اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اپنا ہاتھ آہستگی سے اس کے زخمی چہرے پر پھیرا اور بولا۔ ”ڈولورس! میری جان خدا حافظ... گھبرانا نہیں۔ میں لوٹ آؤں گا۔“

اتنے میں میری کی کڑک دار آواز گونجی۔ ”لڑکی! اس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ جملہ یہ ہر جوان لڑکی سے کہتا ہے۔“ ساتھ ہی اس نے نہایت نفرت سے جوزف کو رائفل کی نال سے ٹہوکا دیا اور کہا۔ ”چلو، گھوڑے پر کاٹھی ڈالو... میرے ساتھ چلو۔“

کچھ دیر بعد جوزف ایک گھوڑے کی پیٹھ پر ایسے بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ جوزف کو اس طرح باندھنے کے بعد میری اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی۔ جوزف کے گھوڑے کے ساتھ ایک اور رسی بندھی ہوئی تھی جس کا سرا میری نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

جوزف بولا۔ ’’میری! میں تم سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میری کا جواب بہت مختصر تھا۔ دونوں گھوڑے اپنے سواروں سمیت آہستہ آہستہ عمارت سے دور جا رہے تھے۔

نگاہوں سے اوجھل ہونے سے پہلے ڈولورس کی آواز ویرانے میں گونجی۔

’’جوزف! میں ڈھونڈ نکالوں گی... تم دونوں کو۔ میں قسم کھاتی ہوں۔‘‘

جوزف نے اُداسی اور مایوسی سے آخری مرتبہ پلٹ کر دور ہوتی ہوئی عمارت کی طرف دیکھا اور پھر چہرہ سیدھا کر لیا۔

☆☆☆

اس عمارت سے کچھ دور ایک سنگلاخ پہاڑ کی چوٹی پر ایک میدان جیسی سطح پر برّاعظم امریکا کا خطرناک ترین سانپ ریٹل اسنیک سرسراتا ہوا ایک سایہ دار جگہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس گرمی اور دھوپ میں اس کی جبلت اسے سائے کی طرف لے جا رہی تھی۔

یہ مختصر سا مصنوعی سایہ بمشکل ایک مربع گز پر محیط تھا۔ سانپ اس سائے کے نزدیک پہنچ کر ایک لحظہ کو رکا اور پھر اس سائے میں داخل ہونے لگا لیکن ابھی اس کا صرف سر ہی اس سائے میں داخل ہوا تھا کہ ایک بجلی سی کوندی۔ دو فٹ لمبے بھاری چھرے کا پھل تیزی سے نیچے آیا اور سانپ کا سر اس کے جسم سے الگ ہو کر کئی فٹ دور جا گرا۔

لکڑی کے فریم اور موٹے کپڑے کے بنے ہوئے اس مختصر سے سائبان کے نیچے بیٹھے ہوئے شخص نے سانپ کو مار ڈالنے کے بعد چھرے کو ایک پتھر پر رگڑ کر صاف کیا۔

اس شخص کے بائیں ہاتھ میں ایک دوربین تھی اور سر پر اس زمانے کے رواج کے برعکس ہیٹ کے بجائے پی کیپ نما ٹوپی دھری ہوئی تھی۔ اس شخص سے ذرا پیچھے ایک گھوڑا اور ایک گدھا بندھے کھڑے تھے۔ گدھے کے اوپر ترپال میں لپٹا ہوا کچھ سامان تھا۔

اس نامعلوم شخص نے سانپ سے فارغ ہو کر دوربین آنکھوں سے لگائی اور نشیب میں دیکھا۔ اسے دو گھڑسوار آگے پیچھے درمیانی رفتار سے سفر کرتے نظر آئے۔ یہ جوزف اور میری تھے۔

☆☆☆

’’ناقابلِ یقین۔‘‘ جوزف نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’پانچ سال بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے اور ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔‘‘

میری کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولا۔ ’’میری! سچ بتاؤ، ظاہر ہے میں تمہیں اتفاقاً تو نہیں ملا اور تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ ڈولورس وہاں زیادہ دیر تک ٹکی نہیں رہے گی۔‘‘

میری بدستور خاموش رہی تو جوزف پھر بولا۔ ’’میری! اب یہ نہ کہنا کہ تمہیں ڈولورس کے بھائیوں کے بارے میں علم نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔‘‘

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر تھوک نگلنے کے بعد بولا۔ ’’ڈولورس کے تین بھائی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان چاروں کی ماں تو ایک ہے لیکن باپ الگ الگ ہیں۔ کسی کو یقینی طور پر یہ علم نہیں کہ کس کا باپ کون تھا... میں نے سنا ہے کہ ان کی ماں نے چار شادیاں کی تھیں۔ ایک سیاہ فام، دو مختلف نسلوں کے ریڈ انڈین اور ایک فرانسیسی مشنری! یہ تینوں بھائی ہمیشہ ایک دوسرے کو ولدیت کے حوالے سے مذاق میں ذلیل کرتے رہتے ہیں۔‘‘ جوزف ہنسا اور پھر بولا۔

’’میری معذرت کے ساتھ۔ یہ تینوں میرے خونخوار ترین سالے ہو سکتے ہیں۔‘‘

☆☆☆

سمندر کے کنارے تین گھڑسوار آرام و سکون سے اپنے گھر یعنی پرانی سرخ پتھروں سے بنی ہوئی کھنڈر نما عمارت کی طرف جانے والے پتھریلے راستے پر رواں دواں تھے۔ ان میں سے ایک بہت لمبا اور دُبلا تھا۔ اس کی مونچھیں لمبی اور نوکدار تھیں اور داڑھی کے نام پر تقریباً ایک فٹ لمبے بالوں کی لٹ ٹھوڑی سے نیچے پیٹ تک لٹک رہی تھی۔

دوسرا گھڑسوار درمیانے قد اور زرد چہرے کا مالک تھا۔ چہرے پر زخم کا نشان اور سامنے کا ایک ٹوٹا ہوا دانت اس کی جھگڑالو طبیعت کی چغلی کھا رہا تھا۔

تیسرا گھڑسوار سب سے زیادہ عجیب و غریب تھا۔

چھوٹے قد اور موٹے جسم کا مالک۔ آنکھوں پر چھوٹی سی عینک لگائے وہ گھوڑے پر بیٹھا نہیں بلکہ الٹا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھوڑے کے ایک طرف اور باقی دھڑ دوسری طرف تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی بنی ہوئی ایک گول سی بوتل تھی جس میں گھر میں کشید کی ہوئی شراب تھی جسے وہ مسلسل پیے جا رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کی لگام اس کے درمیانے قد والے ساتھی کے ہاتھ میں تھی جو اسے اور اس کے گھوڑے کو ساتھ کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔

یہ عجیب اور بے ڈھنگا گروپ عمارت کے نزدیک پہنچا تو انہیں الٹی لٹکی ہوئی ڈولورس نظر آئی۔

یوان نامی دُبلے اور لمبے شخص نے آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھا کہ کہیں اسے دیکھنے یا سمجھنے میں غلطی تو نہیں ہوئی۔ گھوڑے کی پشت پر الٹے لیٹے ہوئے موٹے فلپ نے ایک نظر الٹی لٹکی ہوئی ڈولورس کو دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل کو دیکھا۔ اسے لگا کہ شراب نوشی کی زیادتی اسے کچھ الٹا سیدھا دکھا رہی ہے۔

صرف درمیانے قد والے زرد رو پاچو نے فوراً اور بے ساختہ آواز دی۔ ’’ڈولورس۔‘‘

کچھ دیر بعد ڈولورس ان کے اس کھنڈر گھر کی ایک کھلی چھت والے حصے میں ایک بڑی میز کے ساتھ اسٹول پر بیٹھی تھی۔ یوان اس کے چہرے اور سر کے زخم صاف کر چکا تھا اور اب اس کے سر پر پٹی لپیٹ رہا تھا۔ پاچو اور فلپ ایک کونے میں بیٹھے آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

یوان نے ڈولورس سے پوچھا۔ ’’تمہارے خیال میں وہ سنہرے بالوں والی لڑکی کہاں سے آئی تھی؟‘‘

ڈولورس بولی۔ ’’میں کیا جانوں... لیکن ایک بات صاف ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔‘‘

یوان بولا۔ ’’میں تو کہتا ہوں کہ اسے بھول جاؤ۔ اچھا ہے اسی بہانے خود ہی جان چھوٹ گئی۔‘‘

ڈولورس پٹاخ سے بولی۔ ’’اور میں کہتی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔‘‘

یوان نے ڈولورس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑا ہونے کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ سمجھ دار تھا اور سب کا غیر رسمی لیڈر بھی۔ لیکن ڈولورس اس کی لاڈلی بہن تھی اور اس کی ضد کو رد کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

یوان نے کچھ سوچتے ہوئے کونے میں بیٹھے پاچو اور فلپ کی طرف دیکھا۔ پاچو غصے میں فلپ سے کہہ رہا تھا۔

’’یہ بات دوبارہ کہہ کر دیکھو۔‘‘ فلپ کے ہاتھ میں شراب کی وہی بوتل تھی اور وہ مسلسل پیے جا رہا تھا۔

وہ منہ صاف کر کے بولا۔ ’’میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ جوزف ہمارے خاندان کے ساتھ منہ کالا کرنے والا پہلا غیر ملکی تو نہیں ہے۔‘‘ ایک ہچکی لے کر وہ پھر بولا۔ ’’خاص کر جبکہ تم یہ جانتے ہو کہ ہماری ماں نے تمہیں کس سے حاصل کیا۔‘‘

’’بکواس بند کرو۔‘‘ پاچو غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا بولا۔ ’’وہ تم تھے جس کو ہماری ماں نے جنا تھا، اس سرخ کتے کے ساتھ منہ کالا کرنے کے بعد۔‘‘

یوان جو اب تک یہ سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا، بولا۔ ’’خاموش ہو جاؤ تم دونوں، کتے... اور گھوڑے تیار کرو۔ ہم نکل رہے ہیں۔‘‘

فلپ ایک ہچکی لے کر بولا۔ ’’ابھی؟‘‘

’’ہاں، ابھی۔‘‘ یوان بولا۔ ساری بے غیرتی اور بے شرمی کے باوجود ان تینوں کے دلوں میں اپنی اکلوتی بہن کے لیے محبت موجزن تھی۔

☆☆☆

’’میری! یہ ناممکن ہے۔ مجھے گھوڑے پر بیٹھ کر نیند پوری کرنے کی عادت نہیں رہی۔ پانچ برس ہو گئے ہیں لو... میں گھوڑے سے اُتر رہا ہوں۔‘‘

یہ کہہ کر جوزف گھوڑے سے اُتر گیا لیکن میری گھوڑے پر سوار رہی۔ ’’تو پھر مجھے تمہیں گولی مارنی پڑے گی۔‘‘ ساتھ ہی میری کے ہاتھ میں کولٹ کا لمبی نال والا ریوالور نظر آنے لگا۔

لیکن جوزف اس سے خوف زدہ ہوئے بغیر بولا۔ ’’میری! رہنے دو۔ تم بخوبی جانتی ہو کہ اس ویرانے میں فائر کی آواز کتنی دور تک جا سکتی ہے۔‘‘

میری کچھ دیر تک گھوڑے پر بیٹھی جوزف کو دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا اور گھوڑے سے اترتے ہوئے بڑبڑائی۔ ’’تمہاری قسمت اچھی ہے کہ گھوڑے بھی تھک چکے ہیں۔‘‘

گھوڑے سے اُتر کر میری نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ جگہ اسے بہت عجیب سی لگی۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی اور دنیا میں آ گئی ہو۔ اجاڑ اور لامتناہی ویران جگہ میں ایک پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس کے سامنے ایک غار کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن نہیں یہ غار نہیں تھا۔ یہ پورا پہاڑ کھوکھلا تھا اور یہ غار نما سوراخ غالباً اس میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔

یہ کھوکھلا پہاڑ اصل میں ایک پرانا آتش فشاں تھا جو اپنا سارا زور صرف کر کے بے جان ہو چکا تھا اور اب ایک عظیم الشان ہال کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کی اونچائی پچاس سے سو فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ اس سارے منظر کو پی کیپ والا شخص دوربین سے دیکھ رہا تھا۔

میری اور جوزف اپنے گھوڑوں کو ساتھ لیے اس کھوکھلے پہاڑ میں داخل ہوئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر میری حیران رہ گئی۔ پہاڑ تو اپنی آتش فشانی سے فارغ ہو چکا تھا لیکن اس کے باقیات ایک گرم پانی کے چشمے اور تالاب کی صورت میں موجود تھے۔ تالاب میں نیم گرم صاف پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ نے عجیب جادوئی اور رومانوی سا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے میری بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہاں آ کر بے وقوفی کا ثبوت دے رہی ہوں۔ مجھے کیسے یقین آئے کہ تمہاری ڈولورس کے تینوں بھائی تمہیں ڈھونڈتے ہوئے سیدھے یہاں نہیں آ جائیں گے۔ کیا وہ اس جگہ کو جانتے ہیں؟“

جوزف جھٹ بولا۔ ”نہیں نہیں، انہیں اس جگہ کا بالکل پتا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے جوزف کا چہرہ دوسری طرف تھا ورنہ میری اس کے چہرے پر موجود شرارتی مسکراہٹ ضرور دیکھ لیتی۔ ویسے وہ جوزف سے غافل نہیں تھی۔

اس ہال نما کھوکھلے پہاڑ کے اندر تالاب کے پاس پتھر کے قدرتی ستون زمین سے پہاڑ کی چھت تک گئے ہوئے تھے۔ اس میں سے ایک ستون نما چٹان کے ساتھ میری نے جوزف کو بٹھا کر رسی سے باندھ دیا۔

جوزف کے دونوں بازو اس کے جسم کے ساتھ لگ گئے تھے اور وہ صرف اپنی ٹانگوں اور سر کو حرکت دے سکتا تھا۔ اس کو باندھنے کے بعد میری نے اطمینان سے اپنے کپڑے اتارے اور بے لباسی کی حالت میں تالاب میں کنارے والے حصے کے ساتھ لیٹ گئی۔

نیم گرم پانی نے اس کے حسین جسم کو گدگدایا اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اس کے باوجود میری اپنی دانست میں اردگرد سے غافل نہیں تھی۔ اس کا بھرا ہوا کولٹ ریوالور اس کے ہاتھ کے پاس ہی پڑا تھا۔

لیکن ایک چیز اس کے مشاہدے میں آنے سے بچ گئی تھی۔ اس کھوکھلے پہاڑ کی چھت میں تقریباً تین فٹ چوڑا ایک قدرتی سوراخ تھا اور اس پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا وہ پُراسرار شخص اسی سوراخ میں سے دوربین کے ذریعے نیچے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پی کیپ بدستور اس کے سر پر تھی۔

☆☆☆

”لعنت ہے۔“ یوان نے زمین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کے پاؤں اور گھوڑوں کے سموں کے نشان یہاں آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔“

ڈولورس اور اس کے تینوں بھائی اس وقت اسی ویرانے کے ایک حصے میں جوزف اور میری کے نقشِ پا تلاش کر رہے تھے۔ ”ان کو ڈھونڈنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے ان کی بدبو کی مدد سے۔“ اس ماحول میں بھی موٹا فلپ گھٹیا مذاق سے باز نہیں آیا۔

پاچو نے جواب دیا۔ ”اس کا کوئی امکان نہیں۔ وہ خبیث جوزف ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور نہاتا تھا۔“

یوان بولا۔ ”بکومت، جب تم جوزف کا نام لیتے ہو تو ڈولورس کو تکلیف ہوتی ہے۔“

لیکن... ڈولورس کا دھیان کہیں اور ہی چلا گیا تھا۔ جوزف کے نہانے کا ذکر سن کر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

”ہاں... مجھے پتا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ کہاں ہوں گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کچھ کہے سنے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تربیت یافتہ جنگلی گھوڑا چند لمحوں میں ان تینوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تینوں بھائیوں نے بغیر کچھ کہے اپنے گھوڑوں کو ڈولورس کے گھوڑے کے پیچھے ڈال دیا۔

☆☆☆

پہاڑ کی چھت پر پی کیپ والا شخص سوراخ کے نزدیک الٹا لیٹا ہوا تھا اور دوربین سے اندر کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چٹانی ستون سے بندھے ہوئے جوزف نے میری کو مخاطب کیا۔ ”میری! اب جبکہ صورتِ حال پُرسکون ہو چکی ہے۔ میں تم سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“

میری اس وقت خاصے خوش گوار موڈ میں تھی۔ نیم گرم پانی نے جسم سے ساری گرد اور مٹی صاف کر دی تھی اور اس کی تمام تھکن دور ہو گئی تھی۔ بولی ”ہاں، پوچھو۔“

جوزف بولا۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟“

”میں کیا چاہتی ہوں؟“ میری بڑی ترنگ میں بولی۔ ”سب سے پہلے میں تم سے طلاق چاہتی ہوں۔ اس کے بعد تمہارے سر پر جو انعام ہے... پانچ سال سے... پانچ ہزار ڈالر وہ چاہتی ہوں اور اس کے علاوہ ہم دونوں کے مشترکہ سونے میں سے اپنا حصہ، وہ تم نے یقیناً میکسیکو میں کہیں چھپا رکھا ہے۔“

☆☆☆

اس عظیم الشان کھوکھلے پہاڑ کے نزدیک پہنچ کر ڈولورس بولی۔ ”اس پہاڑ کے اندر میں اور جوزف کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ہم اس کے اندر بہتے گرم چشمے کے پانی میں نہایا کرتے تھے اور پھر... پھر۔“ یہ کہہ کر ڈولورس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ”اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑا سا سوراخ ہے۔ ایک قسم کی قدرتی چمنی۔“

یوان نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس کی نظریں پہاڑ کی چوٹی کی طرف جم گئیں۔ ”بہت اچھا، پاچو اور... فلپ۔ تم رسی لو۔ چھت کے سوراخ سے نیچے اترو۔“ ڈولورس بولی۔ ”میں اور یوان سامنے والے راستے سے اندر جائیں گے۔“

اس وقت ڈولورس ایک نازک سی لڑکی کے بجائے ایک خطرناک شکاری دکھائی دے رہی تھی جس کی آنکھوں میں بلی جیسی چمک تھی۔

”جو حکم باس۔“ پاچو نے کہا اور فلپ کو ساتھ لے کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

”میری!“ جوزف ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”جہاں تک طلاق کا تعلق ہے تو پانچ سال کی جدائی اور ان حالات کے پس منظر میں تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن... لیکن یہ دولت اور رقم کا ذکر ہمارے درمیان... کہاں سے آ گیا میں حیران ہوں تم ایسی تو نہیں تھیں اور تم ایک کرائے کی قاتل بھی نہیں تھیں۔“

میری نے ایک قہقہہ لگایا اور زہریلے لہجے میں بولی۔ ”تم کیا توقع رکھتے ہو جوزف! ہر کوئی تبدیل ہو سکتا ہے۔ مثلاً تمہارا ایک سیاہ بالوں والی کے عشق میں گرفتار ہو جانا...“

اس سارے نظارے کو پی کیپ والا اوپر بیٹھا دوربین کے ذریعے دیکھ رہا تھا۔ دوربین میں میری کا گرم پانی سے دھلا ہوا لباس سے مکمل طور پر بے نیاز جسم سونے کی طرح دمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

پی کیپ والا اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ اور کسی کے زور سے ہچکی لینے کی آواز سنائی دی۔ پی کیپ والے نے چیتے کی سی پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑی اور کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔

اس کی موجودگی سے لاعلم، فلپ اور پاچو اس سوراخ کے نزدیک پہنچ گئے۔

موٹا فلپ ہانپتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان بولا۔ ”وہ ایک ریڈ انڈین تھا۔ بغیر دانتوں والا جس سے ہماری ماں نے یوان کو حاصل کیا تھا۔“

دراصل یہ فلپ کی گفتگو کا طریقہ تھا۔ مذاق ہو یا غصہ نکالنے کا موقع۔ وہ اپنے کسی بھائی اور اس کے متوقع باپ کی شان میں اسی قسم کی تقریر شروع کر دیتا تھا۔

اچانک پاچو بولا۔ ”ارے یہ ہے وہ چوٹی والا سوراخ۔“

فلپ بولا۔ ”ہاں... ہاں یہی ہے اور سنو۔ ان دونوں کے لڑنے کی آوازیں یہاں تک آ رہی ہیں۔“

پاچو بولا۔ ”ہاں اور تم نے اپنا بھونکنا بند نہ کیا تو تمہاری آواز بھی ان تک پہنچ جائے گی۔“

اس کے ساتھ ہی پاچو نے فلپ کے ہاتھ سے شراب کی بوتل جھپٹ کر ایک طرف پھینک دی۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑے رسی کے گچھے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”فلپ، تمہاری چار من کی لاش کو تو یہ رسی برداشت نہیں کر سکے گی۔ اس سوراخ میں رسی کے ذریعے میں ہی اتروں گا۔“

اس کے بعد پاچو نے رسی اپنی کمر کے گرد مضبوطی سے باندھی اور رسی کا گچھا فلپ کو پکڑا دیا اور بولا۔ ”یہ رسی آہستہ آہستہ ڈھیلی کرتے جانا اور ہاں... اگر تم نے میرے اس کھوکھلے پہاڑ کے فرش تک پہنچنے سے پہلے رسی چھوڑی تو میں واپس آ کر یہی رسی تمہارے سؤر جیسے جسم میں داخل کر دوں گا اور تم جانتے ہو کہ کہاں سے داخل کروں گا، سمجھے؟“

اس کے ساتھ ہی پاچو رسی کے ذریعے سوراخ سے پہاڑ کے اندر اترنے لگا۔ فلپ نے رسی اپنی گردن کے پیچھے سے گزار کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھی تھی اور اسے آہستہ آہستہ ڈھیل دیے جا رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ پاچو اور رسی کی طرف تھی۔ چنانچہ جب اس کے پیچھے پی کیپ والا شخص چھرا بلند کر کے پہنچا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔

☆☆☆

رسّی کے ذریعے پاچو کافی نیچے پہنچ چکا تھا۔ اس کے نیچے سیدھ میں تالاب تھا اور تالاب میں سے نکلی ہوئی ایک

چھوٹی سی نوکدار پتھریلی چٹان۔

ہوا میں معلق پاچو نے ایک ہاتھ سے رسی تھام کر خود کو متوازن کیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا ریوالور نکال کر اس کا رخ تالاب میں بیٹھی ہوئی میری کی طرف کیا اور بلند آواز سے بولا۔ ”سنہرے بالوں والی چڑیل۔ اے... اے اپنے پستول سے دور رہو۔“

میری چھت سے نازل ہوتے پاچو کو دیکھ چکی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے کولٹ ریوالور سے چند انچ دور تھا اور ابھی پاچو کافی بلندی پر تھا۔ میری یہ اندازہ لگا رہی تھی کہ اگر وہ جھپٹ کر اپنا ریوالور اٹھالے اور پاچو اس پر فائر کردے تو اس کشکشی حالت میں اس کا نشانہ درست لگنے کا کتنا امکان ہے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے سے ایک گرجدار آواز آئی۔ ”ہاں، ہاں کوشش کرو اپنے پستول کو اٹھانے کی اور میرا کام آسان کردو۔“

میری نے سامنے دیکھا تو دراز قد یوان کھڑا نظر آیا جس کے دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور تھے۔ اس کے پاس ہی شعلہ بار نگاہوں سے گھورتی ہوئی ڈولورس کھڑی تھی۔

اس وقت میری کو اپنی مکمل برہنگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ احساس تھا تو یہی کہ بازی پلٹ چکی تھی اور اس صورتِ حال سے کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا۔

عین اسی لمحے پہاڑ کی چھت پر کھڑے پی کیپ والے شخص نے چھرے کا بھرپور وار کیا اور موٹے فلپ کا سر تن سے جدا ہو کر اسی سوراخ میں جا گرا۔

رسی ڈھیلی ہوئی تو پاچو نیچے کی طرف گرا۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھنا چاہا لیکن اسی اثنا میں وہ خود سر کے بل تالاب کے بیچ ابھری ہوئی نوکدار چٹان پر گرا اور اس کی کھوپڑی کے ٹکڑوں سے اس کا بھیجا نکل کر تالاب کے گرم پانی میں پھیل گیا۔ اس کے ایک لمحے بعد فلپ کا بے سر کا دھڑ پاچو کے بے جان جسم سے کچھ دور اسی تالاب میں آگرا۔ اس کا سر پہلے ہی تالاب میں گر چکا تھا۔

ان دونوں کے گرنے کے چھپاکے اور دھماکے کافی زوردار تھے۔ یوان نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اسے صحیح صورتِ حال کا فوری طور پر اندازہ نہیں ہو سکا لیکن اسے فوراً میری کا خیال آگیا اور اس نے دوبارہ تالاب کی طرف دیکھا، میری اپنے ریوالور سمیت نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔

پانی پر میری کا ہیٹ تیرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ”اوہ... وہ کتیا کہاں چلی گئی؟“ یوان نے گھبرا کر اپنے دونوں ریوالور سیدھے کیے اور تالاب میں اور اس کے آس پاس دیکھنے لگا۔

اچانک اس مقام سے دس فٹ دور تالاب میں سے میری کا ہاتھ بلند ہوا جس میں اس کا لمبی نال والا کولٹ دبا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری کا اوپری دھڑ برہنہ حالت میں ہی تالاب سے برآمد ہوا۔

یوان نے اپنے دونوں ریوالوروں کا رخ میری کی طرف کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میری کے کولٹ نے دھواں اور آگ اگلی۔

کھوکھلے پہاڑ کے پیٹ میں گولی چلنے کا دھماکا اور اس کی گونج کسی توپ کے گولے سے کم نہیں تھی۔ بڑے بور کی گولی نے یوان کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے اور وہ آواز نکالے بغیر تالاب کے کنارے پر ڈھیر ہو گیا۔

ڈولورس اس صورتِ حال سے بے خبر اپنے خنجر سے جوزف کی رسی کاٹنے میں مشغول تھی لیکن دھماکے کی آواز سنتے ہی اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے یوان خون میں لت پت تالاب کے کنارے.. گرتا نظر آیا۔

وہ چلّائی۔ ”یوان۔“

ڈولورس کی آواز سن کر میری نے اپنے کولٹ کا رخ ڈولورس کی طرف کیا۔ کھوکھلے پہاڑ میں ایک اور دھماکا گونجا۔ ساتھ ہی ڈولورس نے اپنا خنجر پوری قوت سے میری کو کھینچ مارا۔ خنجر کا پھل اپنی آدھی لمبائی تک میری کے پیٹ میں دائیں طرف دھنس گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ کر تالاب میں جا گرا اور وہ تالاب کے کنارے اس طرح ڈھیر ہو گئی کہ اس کی ٹانگیں تالاب میں تھیں اور دھڑ کنارے پر۔

ڈولورس بھی اپنی دائیں چھاتی ہاتھ سے دبائے اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

جوزف کی رسی کٹ چکی تھی۔ اس نے زور لگا کر اپنے آپ کو آزاد کیا اور منظر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے اپنے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ ”ڈولورس! میری...“ اور اس کے بعد اس نے اردگرد پڑی ڈولورس کے تینوں بھائیوں کی لاشیں دیکھیں۔

☆☆☆

کھوکھلے پہاڑ سے کچھ فاصلے پر میدان میں تازہ بنی ہوئی تین قبروں کے پاس جوزف ہاتھ میں بیلچہ پکڑے افسردہ کھڑا تھا۔ یہ قبریں اسی نے بنائی تھیں اور ان قبروں میں یوان، فلپ اور پاچو ابدی نیند سو رہے تھے۔

میری کا بے ہوش جسم لکڑی کے ایک بھدّے سے اسٹریچر سے منسلک تھا جو میری کے گھوڑے کے پیچھے بندھا تھا۔ ڈولورس قبروں کے پاس ایک بڑے پتھر پر اپنے جسم کو ایک بڑی سی چادر سے لپیٹے بیٹھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کے ہوش و حواس ابھی تک کام نہیں کر رہے تھے۔

جوزف آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈولورس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر الفاظ کو مجتمع کرتا رہا۔ ”ڈولورس! میری بات غور سے سنو۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اتنا بڑا سانحہ پیش آگیا۔ لیکن اب جبکہ میری یہاں آچکی ہے، میں مزید یہ جھوٹ نہیں بول سکتا کہ مجھے اپنے ماضی کے حساب کتاب چکتا نہیں کرنے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

ڈولورس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ بولا۔ ”میں، میری کو بارڈر کے پار امریکا لے جا رہا ہوں۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس۔ میری کی چلائی ہوئی گولی نے تمہاری چھاتی پر صرف ایک رگڑ لگائی ہے لیکن تمہارا پھینکا ہوا خنجر خطا نہیں گیا۔ میری شدید زخمی ہے اگر اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔“

”اور... اور میں... میں؟ تم مجھے یہاں مرنے کے لیے یونہی چھوڑ جاؤ گے؟“ ڈولورس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

جوزف خاموشی سے گھوڑے پر سوار ہوا، میری کے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں تھامی اور مڑ کر بولا۔ ”ڈولورس! گھر واپس چلی جاؤ۔ میرا انتظار کرو۔ میں لوٹ کر آؤں گا...“

جوزف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دونوں گھوڑے آگے پیچھے دھیمی رفتار سے چل پڑے۔ میری اسٹریچر سے بندھی ہوش و حواس سے بیگانگی کے عالم میں اپنے گھوڑے کے پیچھے گھسٹتی ہوئی آرہی تھی۔ اسٹریچر بہت آرام دہ تھا اور گھوڑوں کی رفتار بھی دھیمی تھی۔

جوزف نے اداسی سے مڑ کر ڈولورس کو دیکھا اور بولا۔ ”خدا حافظ۔“

کچھ دیر تک دونوں گھوڑے اپنے سوار اور زخمی مسافر سمیت نظر آتے رہے اور پھر گرد کے بادلوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ڈولورس ابھی تک ہذیانی حالت میں بڑبڑا رہی تھی۔ ”مجھے... مجھے... مرنے کے لیے چھوڑ گیا، چھوڑ گیا۔“

اچانک ڈولورس کے حساس کانوں نے ایک آہٹ سنی۔ وہ جس ٹیلے پر بیٹھی تھی، اسی ٹیلے کے پیچھے اسے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چند ثانیوں بعد ایک گھڑسوار موڑ مڑ کر سامنے آیا۔ اس نے سر پر ایک پی کیپ پہن رکھی تھی۔ اس کے گھوڑے پر لکڑی اور موٹے کپڑے سے بنا ہوا سائبان نصب تھا۔ جب وہ ذرا آگے آیا تو ڈولورس کو اس کے گھوڑے کے پیچھے بندھا ایک گدھا نظر آیا جس پر کچھ عجیب سا سامان احتیاط سے ایک ترپال میں لپٹا نظر آرہا تھا۔ گھڑسوار کے ہاتھ میں ایک ونچسٹر رائفل دبی ہوئی تھی۔

گھوڑے سے اُتر کر اس نے ڈولورس کو رائفل کی نال سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولا۔ ”شاباش! اٹھو۔ اپنے بھائیوں کی قبروں کے پاس چلو۔ پہلے یہ بیلچہ اٹھاؤ۔ ایک اور قبر کھودو۔ جلدی، میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔“

ڈولورس نے بیلچہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگی۔

پی کیپ والا پاس ہی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اپنا دو فٹ لمبا چھرا اس نے پاس ہی زمین میں گاڑ دیا۔

ڈولورس قبر کھودتی جا رہی تھی اور پی کیپ والا شخص اسے جوزف کی زندگی کی کہانی آہستہ آہستہ بڑی تفصیل سے سناتا جا رہا تھا۔

کہانی ختم ہوئی تو قبر بھی تیار ہو چکی تھی۔ پی کیپ والا بولا۔ ”خیر، تو یہ تھی جوزف کارپینٹر کی کہانی۔ تم سمجھ چکی ہو کہ تم جتنی بھی کوشش کر لیتیں اسے زیادہ عرصہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی تھیں۔“ اس کے بعد وہ چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ”خیر، اب تم کم از کم لاعلمی کی حالت میں تو نہیں مرو گی ۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات تمہارے لیے کچھ سکون کا باعث ضرور ہو گی۔ اور ہاں، بس اور مت کھودو۔ تم نے اس کام کے لیے کافی گہرا گڑھا کھود لیا ہے۔“

اس وقت تک ڈولورس تقریباً دو فٹ گہری انسانی قبر تیار کر چکی تھی... اور ہاتھ میں بیلچہ پکڑے گڑھے کے اندر ہی کھڑی تھی۔

پی کیپ والا اٹھا، ایک ہاتھ میں رائفل سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے زمین میں گڑا ہوا چھرا نکال کر ڈولورس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس وقت ڈولورس کی اس کی طرف پشت تھی اور وہ جھکی ہوئی بیلچے کی مدد سے قبر کی... مٹی

کوٹھیک کررہی تھی۔ اپنے بھائیوں کی موت کے صدمے سے نڈھال، زخمی اور دبلی پتلی سی لڑکی سے اس کہنہ مشق مسلح شخص کو کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔ اس کے دماغ میں یہی سوچ تھی۔

اور جب ڈولورس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پھرکی کی طرح گھوم کر لوہے کا بھاری بیلچہ اس کی کھوپڑی پر پوری قوت سے رسید کیا تو کسی اور سوچ کو اس کے دماغ میں آنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

☆☆☆

جوزف کا گھوڑا ہلکی رفتار سے سفر کررہا تھا۔ اس کے پیچھے میری کا گھوڑا اپنے پیچھے اسٹریچر سے بندھی میری کو لیے چلا آرہا تھا۔ ان ہلکوروں سے میری کی آنکھ کھلی لیکن ابھی وہ ہوش اور بے ہوشی کے سنگم پر تھی۔ اس کی نگاہوں میں پانچ برس پہلے کے واقعات ایک فلم کی طرح چلنا شروع ہوگئے۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کسی اور کی زندگی کے واقعات دیکھ رہی ہو۔

امریکا کی جنوب مغربی سرحد کے نزدیک واقع ایک قصبے میں دو نوجوان گھڑسوار داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری ایک عورت تھی۔ دونوں بہت خوش لباس تھے۔ عورت اپنے قیمتی ریشمی لباس سے کسی اعلیٰ خاندان کی باعزت خاتون نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھتری تھی جو دھوپ سے بچاؤ کے کام آسکتی تھی۔

اتنے میں کسی بات پر ہنس کر مرد نے مڑ کر عورت کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں پر لگی چھوٹی گول شیشوں والی عینک واضح ہوگئی۔ یہ جوزف کارپینٹر تھا اور وہ نوجوان عورت میری تھی۔

دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قصبے کے مرکزی بازار میں داخل ہوئے۔

قصبے کے تھانے میں دفتر کے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہوا شخص سر پر پی کیپ جیسی ایک ٹوپی پہنے اور دائیں آنکھ سے دوربین لگائے سڑک پر آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب جوزف اور میری اپنے گھوڑوں پر سوار اس سے کچھ فاصلے سے گزرے تو پی کیپ والا شخص دوربین سے انہیں دیکھنے لگا۔

تھانے سے کچھ دور سڑک کے پار قصبے کا واحد بینک تھا جس میں رقم کے علاوہ سونا اور دیگر قیمتی اشیا لاکروں میں رکھی جاسکتی تھیں۔ تھانے کو بینک کے نزدیک بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بینک کی حفاظت رہے۔

پی کیپ والے کی دوربین میری کا جائزہ لے رہی تھی۔ میری تو خیر چیز ہی دیکھنے کی تھی اور اپنے قیمتی لیکن مختصر اور نیم برہنہ لباس میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ دوربین سے اس کا نظارہ کرتے ہوئے اچانک پی کیپ والے کی نظر میری کی برہنہ ران پر پڑی اور اس میں ایک چھوٹی سی بیلٹ میں اڑسا ہوا ننھا سا پستول ڈیرنجر (Derringer) نظر آیا۔ یہ بہت چھوٹے سائز کے پستول کو کہتے ہیں۔ اس زمانے کے امریکا میں یہ پستول خواتین اور بوڑھے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس زمانے میں بھی اسلحہ امریکا میں عام تھا لیکن ایک حسین، نازک اور خوش لباس خاتون کے پاس ہتھیار کی موجودگی اس پی کیپ والے شخص یعنی اس قصبے کے شیرف ٹرکو کے لیے کان کھڑے کرنے کا باعث تھی۔

شیرف ٹرکو نے اپنی پی کیپ گھما کر الٹی کی اور سر گھما کر اپنے نائب کو پکارا۔ ”اے! ذرا وہ مطلوب اشتہاری مجرموں کی تصویروں والے پوسٹر لانا۔ ہاں ہاں وہی جن پر ابھی تک انعام ہے۔“

اسی اثنا میں جوزف اپنے گھوڑے سے اُتر کر کسی باعزت جنٹلمین کی طرح ”خاتون“ میری کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دے رہا تھا اور یہ سب بینک کے دروازے کے سامنے ہورہا تھا۔

اسی دوران میں شیرف کے نائب نے اشتہاری پوسٹروں کا پلندہ شیرف کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے شیرف؟“

”آں، ہاں۔“ شیرف ٹرکو نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے..... آج ہی صبح نزدیکی سونے کی کان سے پورے ایک ماہ کا نکلا ہوا سونا بینک میں جمع کروایا گیا ہے۔ اگر آج ہی کی شام نامی گرامی ڈاکو قصبے میں آجائیں تو کوئی حیرت کی بات تو نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر ٹرکو ان پوسٹروں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک پوسٹر پر آکر اس کی نظر اور ہاتھ دونوں رک گئے۔

پوسٹر پر ایک نوجوان کی تصویر تھی جو عینک لگائے ہوئے تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ ”جوزف کارپینٹر مطلوب ہے۔ انعام پانچ ہزار ڈالر۔“

شیرف نے ایک بار پھر دوربین آنکھ سے لگائی اور دونوں نوواردوں کا جائزہ لیا جو بینک میں داخل ہورہے تھے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ہوں، مجھے معلوم ہوگیا تھا بڑا شکار آیا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ڈپٹی سے مخاطب ہوا۔ ”برخوردار! اسلحہ باہر نکالو۔“

”بھاری والا؟“ ڈپٹی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں، بھاری والا۔ شکار بھی بھاری والا ہے۔“ ٹرکو نے جواب دیا۔

☆☆☆

بینک کے اندر جوزف کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کولٹ کا رخ کیشیئر کی طرف تھا۔ چونکہ یہ بینک بالکل تھانے کے سامنے تھا اس لیے اس کی حفاظت کے لیے کسی گارڈ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور اندر بھی عملہ بہت کم تھا۔

کیشیئر نے کانپتے ہاتھوں سے سونے سے بھرا ہوا لکڑی کا ڈبا جوزف کی طرف بڑھا دیا۔

کچھ فاصلے پر میری ہاتھ میں اپنا ڈیرنجر پکڑے کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اچانک باہر سے ایک چنگھاڑ سے مشابہ آواز آئی۔ ”جوزف کارپینٹر۔“

میری نے گھبرا کر کھڑکی کی جانب دیکھا اور باہر کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ج... جوزف۔“

باہر شیرف ٹرکو تن کر کھڑا تھا۔ اس کے نائب نے پاس ہی زمین پر ایک بڑے سائز کی گیٹلنگ گن (GATLING GUN) نصب کررکھی تھی۔ یہ امریکا کی پہلی مشین گن تھی جو 1861ء میں ایجاد کی گئی تھی اور اس میں لوہے کی بیس نالیاں ایک بنڈل یا دائرے کی صورت میں نصب ہوتی تھیں جن سے یکے بعد دیگرے بیس ہولناک فائر کیے جاسکتے تھے۔

شیرف ٹرکو پھر دہاڑا۔ ”جوزف کارپینٹر! میں، شیرف ٹرکو تم سے مخاطب ہوں۔ مقابلے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے پاس گیٹلنگ گن ہے... جو میرے ایک اشارے پر تمہارے جسم کو شہد کا چھتا بنادے گی۔ کیا خیال ہے؟ مقابلہ کرنا چاہتے ہو یا شرافت سے اچھے بچوں کی طرح کہنا مان کر دونوں ہاتھ اٹھائے باہر آتے ہو؟“

جواب میں خاموشی، لیکن صرف چند لمحوں کی۔ اس کے بعد جوزف کا جواب ڈائنامائٹ کی جلتی ہوئی چھڑی کی صورت میں آیا۔ ڈائنامائٹ کی چھڑی کا جلتا ہوا فیتہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کا اندازہ شیرف ٹرکو اور اس کے ڈپٹی کو فوراً ہی ہوگیا۔ انہوں نے جوزف کی صلاحیتوں کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔

ڈائنامائٹ کی اسٹک کو دیکھتے ہی ٹرکو اور ڈپٹی نے گیٹلنگ گن کو چھوڑ کر دائیں بائیں چھلانگیں لگادی تھیں۔

ابھی وہ مشکل سے ڈائنامائٹ کی رینج سے باہر نکلے تھے کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ گیٹلنگ گن کے پرخچے اڑ گئے۔ بینک کی پختہ عمارت کو تو نقصان نہیں پہنچا لیکن بینک کی کھڑکی اپنے چوکھٹے سمیت اکھڑ کر بینک کے اندر آگری۔ ساتھ ہی شیشے کی کرچیاں بینک کے اندر پھیل گئیں۔

اب یہ میری کی بدقسمتی تھی کہ وہ کھڑکی کے قریب ہی کھڑی تھی۔ دیوار کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے اسے براہِ راست کوئی چوٹ تو نہیں آئی لیکن دھماکا اس کے اتنا نزدیک ہوا تھا کہ اس کے ہوش و حواس گم ہوگئے۔

جوزف نے میری کو اور سونے سے بھرے ہوئے ڈبے کو سنبھالا اور فوراً باہر نکل آیا۔ میری کو دھکیل کر اس کے گھوڑے پر سوار کرایا اور خود اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ سونے والا ڈبا اس کے پاس تھا۔ ادھر شیرف ٹرکو دھماکے سے سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا لیکن دھوئیں اور گرد کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

”شیرف مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔“ ڈپٹی کی کسی کونے سے آواز آئی۔ جواب میں شیرف ٹرکو دھاڑا۔

”جوزف! کتے... کسی غلیظ سانپ کی اولاد۔“ لیکن جوزف گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا ان کی پہنچ سے نکل چکا تھا۔

اچانک جوزف کو احساس ہوا کہ میری اس کے ساتھ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے میری کا گھوڑا بھی ڈائنامائٹ سے متاثر ہوا تھا اور بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ میری کا حال بھی اپنے گھوڑے سے مختلف نہیں تھا۔ دھوئیں اور گرد کے بادلوں میں جوزف کو اس کا احساس ہی نہیں ہوسکا تھا۔ میری نے ایک آدھ مرتبہ جوزف کو آواز بھی دی لیکن اس کی آواز اتنی نحیف تھی کہ جوزف کو معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ جوزف نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری شیرف ٹرکو کے شکنجے میں تھی۔ ”جوزف۔“ ٹرکو چیخا۔ ”اب کیا کروگے؟“

میری کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ ”جو... جوزف۔“

جوزف چند لمحے کے لیے کشمکش میں آگے اور پیچھے دیکھتا رہا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میری نے جو آخری منظر دیکھا، وہ یہ تھا کہ جوزف نے واپس آنے کے بجائے آگے جانے کو ترجیح دی۔ مڑ کر ایک بار شیرف کے شکنجے میں مجبور میری کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میری! اپنا خیال رکھنا، میں لوٹ کر آؤں گا۔“

اس کے بعد گھوڑے کے ٹاپوں اور گرد میں میری کو

کچھ نظر نہ آیا۔ یوں بھی وہ ہوش سے مکمل طور پر بیگانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''نہیں جوزف نہیں۔'' میری کو اچانک ہوش آیا تو اسے اردگرد کا ماحول اجنبی محسوس ہوا۔ وہ ایک بڑے سے چادر نما کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کے اردگرد ایک وسیع وعریض پتھریلا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ کچھ دور جوزف پانی کے ایک چھوٹے سے تالاب میں ایک کپڑے کو گیلا کرنے کے بعد نچوڑ رہا تھا۔ میری کی چیخ سن کر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ میری چیخ کر بولی۔

''تم... تم... گندے، کمینے بے وفا، دھوکے باز... تم کیوں واپس نہیں آئے؟ تم کبھی واپس نہیں آئے۔ کیوں؟ کیوں چھوڑ گئے مجھے دشمنوں کے پاس۔ کیوں... کیوں؟'' یہ کہہ کر میری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جوزف اس کے پاس آ کر بولا۔

''میری! شانت ہو جاؤ۔ تم ایک گھنٹے سے بڑبڑا رہی تھیں۔ میں نے کچھ دیر یہاں رک کر آرام کرنے کا سوچا۔ جب کچھ ٹھنڈ ہو گی تو دوبارہ چل پڑیں گے۔'' یہ کہہ کر جوزف نے میری کے زخم کی طرف دیکھا۔ ''میری! میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟ تمہارے زخم سے پھر خون بہنے لگا ہے۔ تم اسی طرح اچھل کود کرتی رہو گی۔ آرام سے نہیں بیٹھو گی تو تمہیں ڈاکٹر کی نہیں گورکن کی ضرورت پڑ جائے گی۔'' جوزف نے گیلا کپڑا میری کے ماتھے پر رکھا اور بولا۔ ''اب ضرورت ہے تمہیں کچھ کھلانے کی۔ میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا۔

''جوزف یہ ایکٹنگ بند کرو اور میری بات کا جواب دو۔'' جوزف کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر میری بولی۔ ''کیوں جوزف! کیوں مجھے چھوڑ گئے؟ کیوں واپس نہ آئے تم؟''

''ہوں۔'' جوزف نے ہنکارا بھرا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کیسے اتنی احمق اور سست ہو گئیں کہ اس کمینے شیرف ٹرکو کے ہتھے چڑھ گئیں؟''

''کیا؟'' میری غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن تکلیف سے کراہ کر پھر لیٹ گئی۔ ''خبیث! تم اس کے لیے مجھے الزام دے رہے ہو؟ تمہارے اس ڈائنامائٹ نے میرے گھوڑے کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔ اِن حالات میں اُن کتوں کے لیے مجھے پکڑ لینا ایسا ہی تھا جیسے درخت سے ٹپکے ہوئے سیب کو اٹھا لینا۔ یقین کرو۔ تم بہت خوش قسمت ثابت ہوئے تھے۔ جب تک وہ سب شیرف کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئے رات ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے تمہارے پیچھے جانے کا ارادہ صبح تک ملتوی کر دیا۔ مجھے انہوں نے حوالات میں ڈال دیا۔ پورے دو دن اور دو راتیں میں حوالات میں بند رہی اور دعائیں مانگتی رہی کہ وہ تمہیں نہ پکڑ پائیں اور جب میں نے بالآخر ان سب پولیس والوں کو تمہارے بغیر واپس آتے دیکھا تو یقین کرو، میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ تم نے مجھے کہا تھا نا کہ اپنا خیال رکھنا، تو میں اپنا خیال رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن لیکن پھر... پھر شیرف ٹرکو مجھ سے تفتیش کرنے کے لیے اندر آیا...''

یہ کہہ کر میری نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔

''جوزف! تمہیں معلوم ہے اس شخص نے کس طرح مجھ سے تفتیش کی؟ اس حوالات کے کمرے میں ساری رات میری عزت کی دھجیاں اڑا کر اور اس سے اگلی رات اس کے ڈپٹی کی باری تھی۔ میں ان کے لیے مفت کا مال تھی جس پر انہوں نے دل کھول کر عیش کیا۔'' جوزف خاموشی سے سنتا رہا۔ میری پھر بولی۔

''اب تم یہ بتاؤ کہ اس کالے بالوں والی کتیا نے کیسے تمہیں یہ بات بھلا دی کہ تمہاری بیوی تمہارے انتظار میں جیل میں سڑ رہی ہے؟''

☆☆☆

جوزف کچھ دیر خاموشی سے اپنی جلائی ہوئی آگ پر سلاخوں سے گوشت بھونتا رہا پھر بولا۔ ''ہوں۔ اب میری باری ہے۔ خیر ڈولورس کے بارے میں تم نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست نہیں ہے.... ہوا یوں کہ جب میں نے تمہیں ٹرکو کے شکنجے میں دیکھا تو مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ ظاہر ہے مسئلے کا یہ حل نہیں تھا کہ میں بھی خود کو ٹرکو کے حوالے کر دیتا۔ جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا وقت تھا۔ تمہیں بچانے کا کوئی اور طریقہ ہونا چاہیے تھا۔ مجھے وہ طریقہ سوچنے کے لیے مہلت چاہیے تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں تمہارے بغیر فرار ہو رہا تھا۔ مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا، میں جانتا تھا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں تھا لیکن میری مجھے تم پر غصہ تھا۔ اتنا سارا سونا ہم نے کامیابی سے لوٹ لیا تھا جو ہماری باقی ساری زندگی عیاشی سے گزارنے کے لیے کافی تھا اور تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ میرے دماغ میں صرف ایک بات تھی۔ میری کو بچانا ہے۔ اس احمق میری کو بچانا ہے لیکن پہلے اس سونے کو محفوظ جگہ پر رکھ کر۔

''میں گھوڑے کو بگٹٹ بھگاتا جا رہا تھا۔ ندی، نالوں، جنگلوں، میدانوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا... میں ایک ویران سی جگہ پہنچا جہاں ایک تنگ سا برساتی نالا تھا۔ اس کے دونوں طرف پتھر اور مٹی کی دس دس فٹ اونچی قدرتی دیواریں تھیں۔ میں نے گھوڑا اس نالے میں ڈال دیا۔ اچانک مجھے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور کسی نے ایک طرف کی دیوار سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ حملہ اتنا اچانک اور تیز تھا کہ میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا نہ رہ سکا۔ نیچے پانی اور کیچڑ تھا جس کی وجہ سے مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ گھوڑا آگے بھاگ گیا اور سونے سے بھرا ڈبا ایک طرف جا گرا۔ میں نے سامنے دیکھا تو یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ مجھ پر حملہ کرنے والا ایک قدآور بھیڑیا تھا جو اپنی سرخ سرخ آنکھیں نکالے، رال ٹپکاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک آواز آئی۔ ''بونینزا! یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو اس طرف والی پہاڑی دیوار کے پاس ایک دبلے پتلے، لمبی مونچھوں والے بوڑھے کو کھڑے پایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی طرز کی توڑے دار ہاکن (HAWKIN) رائفل دبی ہوئی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ جسیم بھیڑیا نہایت فرمانبرداری سے میرے سامنے سے ہٹ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ایسی فرمانبرداری تو میں نے کسی پالتو کتے میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

''اس ٹھنڈے پانی سے باہر نکل آؤ اور اپنا ڈبا بھی اٹھا لو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' بوڑھا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ وہ بوڑھا مجھے اس ویرانے میں بنے ہوئے لکڑی کے ایک بڑے سے کیبن میں لے گیا۔ مجھے ایک پرانا لیکن آرام دہ موٹا کمبل اوڑھایا اور شراب کا ایک پیالا تھما دیا۔ مجھے جھجکتے دیکھ کر بولا۔ ''کیا بات ہے؟ جب بھی کوئی شخص بونینزا کی وجہ سے میرے غریب خانے پر آتا ہے تو میری گھر میں کشید کی ہوئی شراب سے انکار نہیں کرتا۔ تم کیوں نہیں پی رہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بھیڑیے کو دیکھ کر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''بس اگر تمہارا یہ بھیڑیا مجھے اسی طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا تو تمہاری یہ شراب میرے حلق سے سیدھی میری پتلون میں پہنچ جائے گی۔''

''ارے نہیں احمق۔'' بوڑھا ہنستا ہوا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بے چارہ تمہیں نہیں دیکھ رہا۔ یہ تمہارے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شراب کو دیکھ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر بوڑھے نے ایک پیالے میں تھوڑی سی شراب انڈیلی اور بھیڑیے کے آگے رکھ دی۔ بھیڑیا فوراً پیالے میں سے لپ لپ شراب پینے لگا۔ بوڑھا بولا۔ ''میرا بونینزا ایک ہفتے میں پوری ایک بوتل شراب پی لیتا ہے۔''

☆☆☆

اس کی طولانی گفتگو سن کر میری چلائی۔ ''بکومت جوزف! مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ کیا دنیا میں کوئی شرابی بھیڑیا بھی ہوتا ہے؟ اور، اور وہ آدم بیزار بوڑھا کون تھا؟'' یہ کہتے کہتے میری کو کھانسی آئی اور منہ کا نوالہ نیچے گر پڑا۔

''میری!'' جوزف نے سرزنش کی۔ ''کھاتے وقت بات نہ کیا کرو۔ مجھے کہانی پوری کرنے دو۔''

''بوڑھے کا نام جاسپر تھا۔ یہ شخص 1848ء میں کوینگ نامی ایک جرمن شخص کے ساتھ مل کر زمین میں سونے کی کان تلاش کر رہا تھا۔ تم جانتی ہو کہ اس زمانے میں سونے کی تلاش کی بھیڑ چال شروع ہو چکی تھی اور جب سے کیلی فورنیا کی ریاست امریکا کے قبضے میں آئی تھی، لوگ سونے کی تلاش میں پاگلوں کی طرح زمین کی کھدائی کیے جا رہے تھے۔ جس زمین پر جاسپر اور کوینگ کھدائی کر رہے تھے، انہوں نے کافی مہنگے داموں خریدی تھی۔ کئی ماہ گزر گئے لیکن انہیں سونا نہیں ملا۔ ایک شام جب وہ دونوں تھک کر کان سے واپس آئے تو جاسپر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے اپنا حصہ یعنی اس زمین میں اپنا شیئر کوینگ کو بیچ ڈالا۔ اب یہ جاسپر کی بدقسمتی اور کوینگ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے اگلے روز ہی کھدائی میں کوینگ نے سونے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ دریافت کر لیا۔ جس پر جاسپر نے اپنا حصہ واپس لینے کی بہت کوشش کی لیکن کوینگ نے اسے ٹھینگا دکھا دیا۔

''دل برداشتہ ہو کر جاسپر اس علاقے سے دور نکل گیا اور اس مقام پر جہاں میں اسے ملا، ڈیرے ڈال دیے اور سونے کی دوبارہ تلاش شروع کر دی۔ دوسری طرف کوینگ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا اور جاسپر کی اس جگہ سے 15 میل دور ایک اور کان کا مالک بن گیا۔ 15 سال کوشش کرنے کے باوجود جاسپر کو سونے کا کوئی ذخیرہ نہیں ملا۔

''نہ جانے اس بوڑھے شخص جاسپر میں ایسی کیا بات تھی کہ میں نے اس پر مکمل اعتماد کر لیا۔ میں نے اپنا سونے سے بھرا ڈبا اسے دکھایا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں نے وہ سونا کیسے حاصل کیا۔ سونے کو دیکھ کر جاسپر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جاسپر سونے کو دیکھ کر کچھ سوچتا رہا پھر اچانک بولا۔

”جوزف! جہاں تک میں تمہاری بات کو سمجھا ہوں، تم یہ چاہتے ہو کہ اس سونے کو کسی محفوظ مقام پر چھپا دیا جائے تاکہ تم اپنی بیوی کو رہا کروانے کے لیے جاسکو...... میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ کیوں نہ اس سونے کو دوبارہ بینک میں رکھ دیا جائے۔“

”میں نے حیران ہو کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس وقت میں، جاسپر اور اس کا بھیڑیا، تینوں شراب کے نشے میں دھت تھے۔ میں یہی سمجھا کہ بڈھا نشے میں کچھ الٹا سیدھا بول رہا ہے۔ میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔“

☆☆☆

ابھی جوزف یہاں تک پہنچا تھا کہ میری بولی۔ ”جوزف! احمق... اب یہ نہ کہنا کہ تم اس بڈھے کی باتوں میں آگئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری تصویر والے پوسٹر ہر جگہ لگے ہوئے تھے اور وہ تمہیں شہر میں بلکہ بینک میں جانے کا مشورہ دے رہا تھا اور پھر وہ بڈھا کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟ ہاں جاسپر تو اگر تم شہر میں گن گن لینے جاتے تو وہ پیچھے سے سارا سونا ہڑپ کر جاتا۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ سونے کا کتنا بڑا عاشق تھا۔“

جوزف مسکرایا۔ ”اس کی ترکیب ذہانت پر مبنی تھی۔ جاسپر کے منصوبے کے مطابق مجھے اس بات کی تشہیر کرنی تھی کہ وہ میرا ماموں ہے، میں ایک دور افتادہ علاقے سے اس سے ملنے آیا تو اس نے مجھے سونے کا ایک ڈبا تحفے میں دیا جو میں بینک میں رکھوانا چاہتا ہوں۔ یہ سونا ماموں جاسپر کی زمین سے نکل رہا ہے۔ جاسپر کی سونے کی کان کا قصہ سن کر کوئینگ کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ قصہ مختصر جاسپر نے میرے لمبے بال تراش دیے، مونچھیں بالکل صاف کر دیں... یوں میری شناخت ناممکن ہوگئی۔ جاسپر نے مزید احتیاط یہ کی کہ میرا گھوڑا وہیں رکھ لیا اور مجھے قصبے میں جانے کے لیے اپنا خچر دے دیا تاکہ میرے پہچانے جانے کا کوئی امکان نہ رہے۔ اس خچر کی سواری ایسی سواری تھی جس نے مجھے پچھلے سارے تجربے بھلا دیے۔ کبھی وہ اچانک رک جاتا اور کبھی اچانک ایسے بھاگ پڑتا کہ میں نیچے گر جاتا۔ تھوڑی سی اونچائی آتی تو مجھے اتر کر اسے گھسیٹ کر ساتھ لے جانا پڑتا۔ خیر اس طرح گرتے پڑتے، گھسٹتے گھسیٹتے میں اس خچر سمیت ایل براوو نامی قصبے میں پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں بینک میں کچھ ”رکھنے“ گیا تھا۔ میں بینک کی قطار میں لگ گیا۔ قطار میں کھڑے کھڑے میں نے سب گاہکوں کو اس سونے کے بارے میں کہانی سنانی شروع کر دی۔ اکثر لوگ جاسپر کو جانتے تھے۔ میری کہانی سُن کر لوگوں کی آنکھوں میں حیرت، حسد اور غصے کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کیشیئر اتنے سارے خالص سونے کو دیکھ کر حیران اور پریشان لگ رہا تھا۔ خیر، اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے سونے کا وزن کیا اور کاغذی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک طریقے سے ہوگیا۔ بینک کے ملازم نے مجھے رسید بنا کر دے دی جس پر بینک کی پکی مہر موجود تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں خوشی سے چھلانگیں مارنا شروع کر دوں۔ میں نے رسید سنبھالی اور باہر کا رخ کیا... لیکن... باہر جانا میری قسمت میں نہیں تھا۔ بینک کے داخلی دروازے تک پہنچنے تک میں اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر چہرہ سیدھا کیا تو بڑے بور کے لمبی نال والے کولٹ ریوالور کی نال میری ناک سے ٹکرائی اور اسی نال کے ٹہوکے سے میں واپس بینک کے اندر پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر میری پتلون گیلی ہوتے ہوتے رہ گئی کہ اس ریوالور کا ہیمر چڑھا ہوا تھا اور ایک خفیف سے جھٹکے یا ریوالور بردار کی انگلی کی ذرا سی جنبش سے میرے سر اور چہرے کے پرخچے اڑ سکتے تھے۔ ساتھ ہی ایک دہاڑ سنائی دی۔

”الو کے پٹھے، واپس جاؤ اندر۔“ اپنی تمام تر خوفناکی کے باوجود یہ آواز زنانہ تھی۔ یہ ڈولورس سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ پھر چنگھاڑی۔ ”امریکن سٔورو! اپنے ہاتھ اوپر کرو فوراً۔“

”میں نے تھر تھر کانپتے ہوئے سامنے دیکھا۔ سیاہ بالوں والی ایک نقاب پوش لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جو ابھی میرے چہرے اور ناک کا حال پوچھ چکا تھا۔

”نقاب میں چھپے چہرے اور بھدّے سے لباس کے باوجود اس کی جسمانی خوب صورتی اور روشن سیاہ آنکھوں سے نظریں ہٹانا مشکل تھا۔

”اس کے ساتھ تین نقاب پوش مرد کھڑے تھے۔ بینک میں موجود سب لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اونچے کر رکھے تھے۔ نہ جانے ایک بدبخت احمق گاہک کو کیا سوجھی۔ شاید اسے ہیرو بننے کا شوق چرایا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر اس کا رخ ان چاروں کے ٹولے کی طرف کرنے کی کوشش کی۔ ان کہنہ مشق گن فائٹروں کے سامنے اس احمق کی کیا اوقات تھی۔ ان چاروں کی جوابی کارروائی ایک قتل عام تھا۔ انہوں نے اپنا سارا

بارود بینک میں کھڑے گاہکوں پر برسا دیا۔ بینک کے ملازمین تو کاؤنٹروں کے پیچھے ہونے کی وجہ سے بچ گئے لیکن گاہکوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ اس قدر دھماکا خیزی کے بعد ان کے لیے وہاں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ پولیس کسی بھی لمحے وہاں آسکتی تھی۔ انہوں نے مجھے وہیں کھڑے کھڑے ہلاک اس لیے نہیں کیا کہ انہیں اپنے فرار کے لیے ایک یرغمالی بلکہ بکرے کی ضرورت تھی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آئے تو اسے کیا محسوس ہوتا ہوگا۔ ڈاکے تو ہم نے بھی بے شمار ڈالے تھے لیکن کبھی قتل عام نہیں کیا تھا۔ کبھی گولی چلائی بھی تو صرف اپنے تحفظ کے لیے... مگر... مگر... یہ لوگ؟

”ان سب نے اپنے اپنے گھوڑے سنبھالے۔ مجھے موٹے نقاب پوش نے اپنے گھوڑے پر آگے ایک بوری کی طرح لادا۔ ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال میری گدی پر مسلسل رکھی اور اپنے گھوڑے کو باقیوں کے ساتھ مسلسل بھگایا۔ اس طرح کی گھڑسواری کا تجربہ بھی مجھے حاصل ہوگیا۔ اس وقت میرے ذہن میں واحد خیال یہ پچھتاوا تھا کہ میں نے اور جاسپر نے کسی اور بینک کا انتخاب کیوں نہ کیا۔ کوئی ایسا بینک جو میکسیکو کی سرحد کے اتنا نزدیک نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت تھا۔

”کچھ دیر بعد ہم ریو گرینڈ نامی دریا پر پہنچ گئے۔ تم جانتی ہو کہ یہ دریا امریکا اور میکسیکو کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے نہایت سکون سے دریا کو کم گہرے بلکہ تقریباً خشک حصے سے عبور کیا۔ اب ہم میکسیکو میں تھے۔ امریکن قانون اور امریکن پولیس کا یہاں کوئی اختیار نہیں تھا۔ یوں بھی اگر اختیار ہوتا بھی تو ظاہر ہے وہ میری حفاظت سے زیادہ مجھے پھانسی پر لٹکانے کے لیے استعمال ہوتا۔ کچھ دور پہنچ کر میرے صیادوں نے گھوڑے روک لیے اور اپنی بندوقوں اور پستولوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ اب انہیں میری ضرورت نہیں تھی۔ انسانی جان کی ان کے نزدیک جتنی قدر و قیمت تھی، وہ میں بخوبی جانتا تھا۔

”میں مرنے کے لیے تیار ہوگیا لیکن ابھی میری موت نہیں آئی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ڈولورس مسکرائی۔ اس مسکراہٹ سے پہلے وہ اپنا نقاب اتار چکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میں یہ بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ چند لمحے پہلے وہ مجھے جان سے مارنے کو تیار تھی۔ یہ مجھے تبھی اندازہ ہوگیا تھا کہ جب وہ مسکراتی تھی تو ظالم سے ظالم شخص کا دل بھی موم ہو جاتا تھا۔ ڈولورس اپنے بھائیوں سے بولی۔ ”اے، ذرا ایک لمحے کے لیے صبر کرو۔“ اس کی نقرئی آواز اس آواز سے بہت مختلف تھی جو میں نے بینک میں سنی تھی۔

”میکسیکو کے اس حصے میں جہاں ریو گرینڈ دریا سمندر میں گرتا ہے، سمندر کے کنارے سرخ پتھروں والی اسی پرانی متروک عمارت کو یہ لوگ رہائش کے لیے استعمال کرتے تھے جہاں سے تم نے مجھے پکڑا تھا۔ باہر سے کھنڈر نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے اتنی بدحال نہیں ہے۔

”شروع شروع میں حالات میرے لیے خراب تھے۔ ڈولورس کے کہنے پر اس کے بھائی مجھے زندہ چھوڑ کر اپنے ساتھ تو لے آئے تھے لیکن ان کے نزدیک میری حیثیت ایک قیدی یا غلام سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ مجھ سے ہر قسم کی مشقت لیتے تھے۔ دریا سے پانی بھرنے سے کپڑے دھونے تک ہر کام مجھ سے لیا جاتا اور وہ بھی ہر وقت کڑے پہرے میں۔ میں نے کئی بار فرار کی کوشش کی لیکن ڈولورس کے بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت پہرا دے رہا ہوتا تھا اور وہ بھی ایسے کہ مجھے علم نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش کی تو موٹا فلپ سمندر کے کم گہرے پانی میں چھپا میری نگرانی کر رہا تھا۔ اس دن تو وہ مجھے مار ہی ڈالتا اگر ڈولورس ایک مرتبہ پھر بیچ میں نہ آجاتی۔

”خیر، میں سچ کہوں گا۔ ڈولورس کے تینوں بھائی، فلپ، پاچو اور یوان بُرے لوگ تھے لیکن اس کے باوجود ہم نے کچھ اچھے اور دلچسپ دن بھی گزارے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری ان سے دوستی ہوگئی۔ پھر انہیں مجھ پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ ایک مرتبہ جب وہ ڈاکے کی ایک مہم پر گئے تو مجھے اور ڈولورس کو گھر میں چھوڑ گئے۔ اس دن میں سمندر کے کنارے لکڑی کے پلیٹ فارم پر بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈولورس کنارے کے پاس تین فٹ گہرے پانی میں فطری لباس میں نہا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ آئی جو پتھر کو موم کر سکتی تھی۔ اس دن میں نے پہلی مرتبہ ڈولورس کے ساتھ آخری درجے کی بے تکلفی اختیار کی۔

”اس عمل میں مجھے اس کے بھائیوں کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ غیرت اور عزت کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ تینوں اپنی بہن سے بہت محبت کرتے

تھے اور اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے میرے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتی تو وہ اسے بھی اپنا فرض سمجھتے کہ اپنی بہن کی اس خواہش کو بھی پورا کرواتے۔

”پھر... وہ بینک... وہ سونا... میرا فرار... تم... وہ سب کچھ بہت دور لگنے لگا۔ وہاں حال تھا۔ سورج تھا۔ سمندر تھا اور ڈولورس تھی۔ وقت کے ساتھ مجھے ڈولورس سے اور سمندر سے محبت ہوگئی۔

”تو یہ ہے میری کہانی۔ اب تمہاری تسلی ہوگئی؟ تم خود فیصلہ کرلو کہ کتنا قصور میرا تھا اور کتنا قصور ان حالات کا جن پر میرا کوئی زور نہیں تھا۔“ میری کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر جوزف بولا۔ ”میری! تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے؟“

☆☆☆

اس وقت دونوں سفر میں تھے۔ میری کی حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ جوزف نے گھوڑے کی کاٹھی پر لکڑی کی کھپچیاں جوڑ کر ایک سہارا سا بنا دیا تھا جس کی وجہ سے میری گھوڑے پر قدرے آرام دہ حالت میں سوار تھی۔ میری کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر جوزف پھر بولا۔

”میری! کچھ کہو نا۔“

میری مزید کچھ دیر خاموشی سے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”کہنے کو بہت کچھ ہے جوزف... میں یہ یاد کر رہی تھی کہ جس وقت تم اپنی اس سیاہ بالوں والی ہیروئن کے ساتھ رومیو جولیٹ کھیل رہے تھے، اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔“

☆☆☆

میری یہ کہہ کر خاموش ہوگئی اور ماضی کی بھیانک یادوں میں کھوگئی۔ اس کے دماغ میں عدالت نما کمرا آیا جہاں وہ ایک مجرم کی حیثیت سے جج اور جیوری کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔

”میری کارپینٹر۔“ جج نے اپنی اونچی آواز میں اعلان کیا۔ ”تم پر لگائے گئے تمام الزامات درست ثابت ہوتے ہیں لیکن یہ عدالت اس حقیقت کو بھی سامنے رکھتی ہے کہ تم نے ساری زندگی کسی کو قتل کیا اور نہ ہی کسی قتل میں مددگار رہی ہو۔ چنانچہ یہ عدالت میں تمہیں عورتوں کی جیل میں 5 سال قید بامشقت کی سزا سناتی ہے۔“

☆☆☆

”جوزف! پانچ سال... میری زندگی کے پانچ سال لیکن تم نے کہا تھا نا کہ میں لوٹ آؤں گا اور تمہارے اس وعدے کے بھروسے پر میں جیتی رہی اور وہ سب لوگ... وہ میری خوف ناک ساتھی قیدی عورتیں۔ وہ جیل کے عملے کی ظالم عورتیں۔ وہ سب مجھے نہیں توڑ سکیں۔ مجھے تم پر اعتبار تھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں لوٹ آؤں گا لیکن... لیکن تم نہیں لوٹے۔ 5 سال گزر گئے۔ مجھے چکی چلاتے، بوجھ اٹھاتے 5 سال۔ راتوں کو جاگ کر بیٹھتے تمہارا انتظار کرتے۔ تم نہیں آئے اور پانچ سال گزر گئے میری رہائی کا دن آپہنچا۔ جیل کی ہتھنی جیسی منتظم نے میرے وہی پانچ سال پرانے کپڑے اور میری چھتری اٹھا کر میرے منہ پر مارنے کے انداز میں مجھے پکڑا دیے۔ میں باہر آگئی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ جیل کا دروازہ میرے پیچھے بند ہوگیا۔

”سامنے دیکھا تو صرف ویرانہ اور تنہائی نظر آئی۔ میں بنا سوچے سمجھے بنا کسی ارادے کے آگے چل پڑی۔ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ ”اے رکو۔“ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ غروب ہوتے سورج کے پس منظر میں مجھے ایک گھڑسوار کی پرچھائیں دکھائی دی جو ہلکی رفتار سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو اس کی منحوس پی کیپ سے میں نے شیرف ٹرکو کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے گھوڑے پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے ایک سائبان سا نصب کر رکھا تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کے پیچھے رسی سے ایک گدھا بندھا آرہا تھا جس پر واٹر پروف کپڑے میں کوئی عجیب سی لمبی سی چیز بندھی ہوئی تھی۔ اس گدھے کے پیچھے رسی سے ایک اور گھوڑا بندھا آرہا تھا جو سوار کے بغیر تھا۔

”میں نے اس سارے منظر کو حیرت سے دیکھا۔ ٹرکو میرے نزدیک پہنچا اور بولا۔ ”میں نے سوچا کہ جیل سے باہر کسی کو تمہارا استقبال کرنا چاہیے۔ خواہ وہ مجھ جیسا قابلِ نفرت شخص ہی کیوں نہ ہو۔“ میں نے اپنی چھتری ہتھیار کی طرح سامنے کی اور کہا۔ ”ٹرکو! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تمہاری باتیں سننے کے بجائے میں واپس جیل جانے کو ترجیح دوں گی۔“

”اوہو۔“ ٹرکو نے اطمینان سے ایک سگار سلگایا اور بولا۔ ”اتنے غصے میں تو نہ آؤ۔ یہ سوچو کہ میں نے کتنی محنت سے تمہارے لیے ایک ملازمت کا بندوبست کیا ہے تاکہ تم اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکو۔ یہ لو، یہ تمہاری ملازمت کا کنٹریکٹ ہے۔ تنخواہ نیچے لکھی ہے۔“ یہ کہہ کر ٹرکو نے ایک بڑا سا کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے اس کاغذ کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ وہی پانچ سال پرانا پوسٹر تھا جس پر تمہاری تصویر چھپی ہوئی تھی اور ساتھ میں لکھا تھا۔ ”جوزف کارپینٹر! مطلوب ہے۔ زندہ یا مردہ۔ انعام پانچ ہزار ڈالر۔“ اس کے بعد ٹرکو نے پیچھے بندھا ہوا خالی گھوڑا آگے کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس پر ایک نیا زنانہ شکاری لباس، ایک بڑا میکسیکن ہیٹ، ایک نئی ونچسٹر رائفل، چمڑے کے ہولسٹر میں ایک نیا کولٹ ریوالور لدے ہوئے تھے۔

”اور ہاں۔“ ٹرکو بولا۔ ”میں نے کچھ ہوم ورک کر رکھا ہے پہلے سے۔ تمہارا شکار میکسیکو میں ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے اختیار اور یہاں کے قانون سے باہر... لیکن کوئی بھی چیز، کوئی بھی قانون، ایک رد کی ہوئی مظلوم عورت کو بارڈر پار کرنے اور اپنے شوہر کو واپس لانے سے نہیں روک سکتا۔ ایسا شوہر جو قانون سے، اپنے ملک سے اور اپنی بیوی سے فرار ہوچکا ہے۔“ یہ کہہ کر ٹرکو نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ ”قصہ مختصر! جب تم اسے دریا عبور کر کے امریکی کنارے پر لے آؤ گی تو تمہارا کام ختم۔ میں اسے تم سے لے لوں گا۔ اس طرح تمہیں انعام مل جائے گا۔ مجھے کامیابی مل جائے گی اور جوزف کو پھانسی کا پھندا۔“ اس کے بعد ٹرکو ڈرامائی انداز میں گدھے کے پاس گیا اور ایک جھٹکے سے اس پر رکھے ہوئے سامان پر سے موٹا کپڑا ہٹا دیا۔ کپڑے کے نیچے میں نے خوفناک گیٹلنگ گن کو گدھے پر نصب دیکھا۔

”اور ہاں۔“ ٹرکو بولا۔ ”اگر تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں تم سے زیادہ پیچھے نہیں ہوں گا۔ ایک ٹورسٹ کی حیثیت سے لیکن جیسا کہ تم دیکھ چکی ہو، یہ ٹورسٹ مسلح ہوگا۔“

ٹرکو ایک لمحے کو رکا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ تمہارا شکار... تمہارا بھگوڑا شوہر، میکسیکو میں تنہا نہیں ہے... میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ گئی ہو۔“

☆☆☆

”کیا؟“ ابھی میری کی کہانی یہاں تک پہنچی تھی کہ جوزف نے ہڑبڑا کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس وقت وہ اور میری دریا کے درمیان تھے۔ ان کے پیچھے میکسیکو تھا اور سامنے امریکا۔ ”میری! اور... اور تم مجھے یہ سب اب بتا رہی ہو۔ جب ہم بارڈر پر ہیں اور ٹرکو بارڈر کے اس طرف امریکا میں اپنی گیٹلنگ گن کے پیچھے مستعد بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔ میری! کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔“

جوزف نے دریا کے بیچ میں گھوڑا روک کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”میرے خدا! اب میری سمجھ میں آیا کہ فلپ اور پاچو کیسے ہلاک ہوئے۔ یہ ٹرکو تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو وہ خون خرابا نہ ہوتا۔ وہ تینوں تمہیں قابو کرلیتے اور میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے دیتا۔ اپنی تمام ترکمینگی کے باوجود وہ تینوں میری اتنی بات ضرور مان لیتے۔ مجھے یقین نہیں آرہا میری! تم مجھ سے ناراض تھیں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ تم مجھے سزا دینا چاہتی تھیں۔ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے لیکن تم مجھے گرفتار کر کے چلیں اور وہ بھی ٹرکو کی آلۂ کار بن کر اور مجھے گرفتار کر کے ٹرکو کے حوالے کرنے کے لیے... میری! یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اور اب تم مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں بارڈر کے اس پار خاموشی سے تمہارے ساتھ چلا جاؤں تاکہ تم مجھے ٹرکو کے حوالے کردو۔ میری! مجھے موت قبول ہے لیکن... لیکن...“

اچانک جوزف کو احساس ہوا کہ وہ خود سے باتیں کر رہا ہے۔ میری کا گھوڑا خالی تھا۔ میری گھوڑے کے پاس دریا کے اتھلے پانی میں منہ کے بل گری ہوئی تھی۔ اتنے گہرے زخم کے ساتھ یہ سفر اس کی طاقت سے باہر تھا۔ یہاں تک بھی وہ اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے سہارے پہنچ پائی تھی۔ جوزف گھوڑے سے اتر کر میری کے پاس کھڑا ہوگیا۔ پہلے تو اسے لگا کہ میری ناٹک کر رہی ہے تاکہ وہ اسے چھوڑ کر واپس میکسیکو کا رخ نہ کرے لیکن نزدیک جاکر اسے اندازہ ہوا کہ میری کی حالت واقعی خراب ہے اور اسے چھوڑ کر جانے کا مطلب ہے اسے موت کے حوالے کرنا۔ اگر ایسا ہوگیا تو کیا وہ کبھی خود کو معاف کرسکے گا؟ کیا وہ ڈولورس کو معاف کرسکے گا؟

جوزف نے سامنے دیکھا۔ امریکا اس کی نگاہوں کے سامنے تھا پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر پیچھے میکسیکو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”خدا حافظ میکسیکو۔ میں لوٹ آؤں گا۔“

☆☆☆

بارڈر کے پار امریکا کے ایک ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرے میں۔ جوزف دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ کمرے میں ایک لیڈی ڈاکٹر اپنا بیگ سنبھالے کھڑی تھی۔ اس ہوٹل کے سامنے ایک اور عمارت تھی اور اس کی چھت پر ایک پُراسرار آدمی برابر والی عمارت کی چھت سے کود کر پہنچا۔ رات کا وقت تھا لیکن اس نامعلوم شخص کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوربین اور سر پر رکھی ہوئی پی کیپ دور سے نظر آسکتی تھی۔ اس شخص نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی کی طرف فوکس کیا۔

اس وقت ڈاکٹر میری سے کہہ رہی تھی۔ ”خدا تمہیں اپنے پاس بلانے لگا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ دوا باقاعدگی سے کھاتی رہو۔ تمہارے زخم کی میں نے مرہم پٹی کردی ہے۔“

”ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔“ میری مسکرا کر بولی۔

ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد جوزف کمرے کی کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میری بولی۔ ”جوزف! تمہیں بتاؤں؟ میں نے ٹرکو کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، میں اسے کینسل کرتی ہوں۔“ جوزف نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”ٹھیک ہے میری! میں تمہارا شکرگزار ہوں لیکن میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ میں واپس میکسیکو چلا جاؤں۔“ ابھی الفاظ جوزف کے منہ میں ہی تھے کہ میری نے اپنے سرہانے لٹکے ہوئے چمڑے کے ہولسٹر سے اپنا کولٹ ریوالور نکالا اور اس کا رخ جوزف کی طرف کیا۔ ہوٹل کے بند کمرے میں کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا۔

جوزف ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہا۔ گولی اس کے کان سے دو انچ کے فاصلے سے گزرتی ہوئی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

ساتھ والی عمارت پر پی کیپ والا شخص دوربین سنبھالے لکڑی کے ایک تختے کے پیچھے کھڑا تھا۔ گولی سیدھی لکڑی کے اس تختے سے ٹکرائی اور تختہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اس شخص سے ٹکرایا جو اس وقت ایک شہتیر پر پاؤں ٹکائے کھڑا تھا۔ اس جھٹکے سے اس کا توازن بگڑا اور وہ چھت سے گر پڑا۔ تقریباً بیس فٹ نیچے لکڑی کی چھت والا ایک کمرا تھا جسے عمارت کے مکین بھوسا وغیرہ ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے۔ لکڑی ٹوٹنے کے دھماکے، بھوسے اور گردوغبار کے بادلوں نے یک دم ماحول کے سکون کو درہم برہم کردیا۔

☆☆☆

ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے چونک کر دیکھا کہ ہوٹل کے نئے مہمان قیامت خیز رفتار سے سیڑھیاں اترتے دروازے کی طرف لپک رہے تھے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ٹرکو ہی تھا؟ تمہاری گولی اسے لگی ہے؟“ جوزف بھاگنے کے ساتھ ساتھ سوال بھی کرتا جا رہا تھا۔

میری اطمینان سے بولی۔ ”اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو خود جا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟“ اصطبل کا دروازہ کھولتے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے جوزف کے ذہن میں یہی بات تھی۔ ”میں نے اس کم بخت بارڈر کو پار کیوں کیا؟ خیر، اب کرنے کو ایک ہی کام رہ گیا ہے۔“

گھوڑے پر سوار ہوتے ہی جوزف نے اسے ایڑ لگائی۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ میری چیخ کر بولی۔ ”جوزف! میکسیکو جنوب کی طرف ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ جوزف بولا۔ ”لیکن ہمارا سونا شمال کی طرف ہے۔“ میری نے اپنا گھوڑا جوزف کے گھوڑے کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر آج برسوں بعد مسکراہٹ نظر آئی تھی۔

☆☆☆

ساتھ والی عمارت میں رہنے والی موٹی عورت نے گھبرا کر اپنے شوہر سے کہا۔ ”جاؤ نیچے دیکھو! کہیں وہ لومڑی دوبارہ تو نہیں آ گئی؟“

اس کا شوہر نیچے پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں دو نال والی شاٹ گن تھی۔ ”میرے خیال میں یہ لومڑی تو نہیں ہو سکتی۔ ہماری بھوسے کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ مرغی خانے کی چھت بالکل بیٹھ گئی ہے۔“

موٹی عورت نے کھڑکی سے جھک کر زور سے کہا۔ ”احمق! بک بک بند کرو اور دیکھو تو سہی کون ہے؟“

”اچھا اچھا۔“ بے چارہ دبلا پتلا زن مرید شوہر بولا اور ٹوٹی ہوئی کوٹھڑی میں جا پہنچا۔ ”اے کوئی ہے؟“ اسے زمین پر گری ہوئی ٹوٹی ہوئی دوربین اور ایک کچلی ہوئی پی کیپ نظر آئی۔ آہٹ سن کر اس نے لالٹین اونچی کی تو اسے لکڑی اور بھوسے کے ڈھیر پر سے کوئی اٹھتا دکھائی دیا۔ ”ک... ک... کون ہو تم؟“

اسے بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھی ایک سیاہ بالوں والی میکسیکن لڑکی نظر آئی جس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا لیکن اس نے ہاتھ میں لمبی نال والا کولٹ ریوالور مہارت سے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر چٹان جیسی سختی تھی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز میں چیتے کی سی خون خواری تھی۔ ”الو کے پٹھے، جاؤ اپنی موٹی اور بدبودار بیوی کے پہلو میں واپس گھس جاؤ ورنہ دوسرا سانس نصیب نہیں ہوگا۔“

یہ کہہ کر ڈولورس اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ وہ گری تو کافی بلندی سے تھی لیکن لکڑی کی چھت اور اس کے نیچے بھوسے کے ڈھیر کی وجہ سے اسے معمولی خراشوں کے سوا کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہاں ٹرکو کی دوربین کے ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس کی مخصوص نشانی پی کیپ بھی اپنے اصل مالک کی طرح تاریخ کا حصہ بن چکی تھی۔ ویسے اس کے جسم پر کوٹ بھی ٹرکو کا تھا اور اس کے علاوہ ٹرکو کا سارا مال واسباب یعنی رائفل، چھرا، ریوالور، گھوڑا، گدھا اور سب سے بڑھ کر گیٹلنگ گن اسے مالِ غنیمت کے طور پر مل گئے تھے۔ شیرف ٹرکو اپنی ساری چالاکی، مہارت اور خطرناکی سمیت اس چوتھی قبر میں ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا جسے اس نے ڈولورس سے کھدوایا تھا۔

ڈولورس کے رسید کیے ہوئے بیلچے نے ٹرکو کا سر کھول دیا تھا اور اس کا بھیجہ باہر نکل آیا تھا۔ اس کے پھڑکتے لاشے کو اس قبر میں دھکیل کر ڈولورس نے اوپر مٹی ڈالنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ اور اب... ڈولورس خطرناک حد تک مسلح ہو کر جوزف اور میری کی جستجو میں تھی۔

☆☆☆

”جوزف! ہم یہاں بعد میں بھی آ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ فرض کرو اگر میری چلائی ہوئی گولی ٹرکو کو نہ لگی ہو تو؟“ میری نے یہ کہہ کر چاروں طرف نظر دوڑائی وہ اس وقت ایک برساتی نالے میں سفر کر رہے تھے جس کے کنارے قدرتی دیواریں سی بنی ہوئی تھیں۔ سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی کا ایک خستہ حال کیبن نما مکان تھا۔ یہ جوزف کے مہربان جاسپر کا علاقہ تھا۔ جوزف اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تو مجھے لازمی آنا تھا۔ یوں بھی تم یہاں پُرسکون اور محفوظ رہو گی۔ جب تک میں بینک جا کر اپنا سونا نکال کر لاؤں، تم جاسپر کے ساتھ گپ شپ لگانا۔“

میری نے جاسپر کے گھر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”لگتا ہے جاسپر کے گھر نے مدتوں سے عورت کی صورت نہیں دیکھی۔“ جوزف، جاسپر کو آوازیں دیتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جھاڑیاں اور گھاس اگ آئی تھی جس سے دروازہ کھولنے میں کچھ دقت ہوئی۔ اس نے کیبن کے اندر جھانکا تو اسے خالی پایا۔ یوں بھی دروازے کے آگے خودرو جھاڑیوں اور گھاس کے اگنے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کیبن کافی عرصے سے زیرِ استعمال نہیں ہے۔ ابھی جوزف کیبن میں جھانک رہا تھا کہ پیچھے سے میری کی ہلکی سی آواز آئی۔ ”جوزف! اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے میں نے جاسپر کو ڈھونڈ لیا ہے۔“ جوزف نے مڑ کر میری کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو کچھ فاصلے پر اسے پتھر سے ٹیک لگائے ایک انسانی ڈھانچا پڑا نظر آیا۔ ڈھانچے کی گود میں ایک ہاکن رائفل ٹکی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے جسم پر گہرے بھورے رنگ کے لباس کے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ ہاکن رائفل اور لباس کی مدد سے جوزف کو اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ جوزف کچھ کہے بغیر مڑا لیکن میری کو اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آ گئے۔

”سنو۔“ میری آہستہ سے بولی۔ ”تم آرام کرو۔ تمہارے دوست کا دھیان میں رکھ لوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے کیبن کے اندر پڑا ہوا بیلچہ اٹھایا اور کیبن کے پیچھے قبر کی جگہ دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میری، جاسپر کے ڈھانچے کو دفنا کر فارغ ہوئی تو اس نے کیبن میں جا کر کپڑے بدلے اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھانکا۔ جوزف گردوپیش سے بے نیاز ایک پتھر پر بیٹھا بارش میں بھیگ رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے مسلسل شراب پی رہا تھا۔ یہ شراب اسے کیبن سے ہی ملی تھی۔ میری کا دل دکھ سے بھر آیا۔

جوزف آخر اس کا شوہر تھا۔

حالات نے کچھ وقت کے لیے اس کی محبت کو نفرت میں بدل دیا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ محبت اور نفرت کے بیچ صرف ایک لکیر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس لکیر کو پار کرنے سے محبت، نفرت میں اور نفرت محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج، اس وقت، اس بھیگے موسم میں، اس اُداس اور افسردہ ماحول میں، میری اس لکیر کو پار کر کے واپس محبت کے دیس میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ ”جوزف! اندر آ جاؤ۔ تمہارے وہاں بیٹھنے اور فلو کا شکار ہو جانے سے وہ واپس نہیں آ جائے گا۔“

☆☆☆

کیبن کے اندر کے گرم ماحول نے جوزف کی طبیعت اور مزاج پر اچھا اثر ڈالا۔ ”میری... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

”لیکن مجھے تو یہ سب بالکل صاف سمجھ میں آ رہا ہے۔“ میری ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تم نے جاسپر کو کہا تھا نا کہ اس کے سونے کی دریافت والی کہانی بہت جلد پورے علاقے میں پھیل جائے گی۔ تو ایسا ہی ہوا ہوگا۔ کہانی پھیل گئی۔ سونے کی اس جھوٹی خبر پر یقین کر کے لٹیرے اس خیالی سونے کو لوٹنے کے لیے پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں بے چارہ جاسپر ان کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔“

جوزف چونکا۔ ”تو... تو... یہ میرا قصور ہی ہوا نا۔ سونے کی دریافت کی جھوٹی کہانی میں نے ہی پھیلائی تھی۔“

”جوزف! اب خوامخواہ خود کو الزام مت دو۔“ میری جھنجلا کر بولی۔ ”یہ جاسپر کی اپنی فرمائش تھی۔“ ”چلو اب اپنے کپڑے اتارو۔ میں انہیں یہاں آگ کے سامنے ڈالتی ہوں۔ ہم رات یہیں گزاریں گے اور تم دیکھنا کل ایک نیا دن ہوگا۔“

جوزف بولا۔ ”میری! لیکن مجھے...“

”ششش۔“ میری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب کوئی بات نہیں ہوگی۔“

جوزف نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میری کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری اس کے سامنے اپنے فطری لباس میں کھڑی تھی۔ میری اس کی بیوی تھی اور وہ اس کے جسم کا مالک تھا لیکن پانچ سال بعد اسے اس طرح دیکھ کر یوں لگا جیسے میری اسی وقت اس کی زندگی میں آئی ہے۔ کچھ دیر بعد جب دونوں ہم آغوش تھے تو انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کھڑکی کے باہر سے کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔ خیر، اس مرتبہ انہیں دیکھنے والا ان کا دشمن نہیں تھا۔ یہ ایک درندہ تھا لیکن انسان سے کم خطرناک اور زیادہ وفادار تھا۔ یہ جاسپر کا بھیڑیا بونینزا تھا جو جاسپر کے مرنے کے بعد دوبارہ آوارہ اور بے گھر ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کیبن سے اپنی وابستگی چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

صبح، ہر چیز بارش سے دھل کر نئی ہو گئی تھی۔ پانچ سال بعد جوزف اور میری کے دلوں میں آئے ہوئے فاصلے بھی دھل گئے تھے اور دونوں ایک نئی زندگی کی شروعات کے لیے تیار تھے۔

اپنے گھوڑے کو تیار کرتے ہوئے میری نے دیکھا کہ جوزف کیبن کی کھڑکی کے پاس جھکا ہوا تھا اور اسی حالت میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ میری نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”کمر میں موچ آگئی ہے یا تم چاہتے ہو کہ تمہارا گھوڑا بھی میں تیار کروں؟“

جوزف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کھڑکی کے قریب بھیڑیے کے قدموں کے نشان دیکھ لیے تھے۔ وہ کیبن میں واپس پہنچا اور الماری میں سے جاسپر کی شراب کی ایک بوتل نکالی۔ ”جوزف! اب آ بھی چکو تم تو کچھوے بن گئے ہو۔“ میری بھنّا کر بولی۔

”ایک منٹ ٹھہرو میری۔“ جوزف مسکرایا اور اس نے تھوڑی سی شراب ایک گہری پلیٹ میں انڈیلی اور کیبن سے باہر کچھ فاصلے پر زمین پر رکھ دی اور بڑبڑایا۔ ”بے چارے کو کئی سالوں سے سوائے پانی کے کوئی چیز پینے کو میسر نہیں آئی ہوگی۔“

میری بولی۔ ”کون؟ تمہارا مطلب ہے وہ شرابی بھیڑیا؟ رہنے دو جوزف۔“

جوزف ہنسا۔ ”نہیں میری! مجھے یقین ہے کہ رات کو بونینزا ہمیں دیکھ کر یہاں آیا تھا لیکن حیرت ہے کہ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ جاسپر کے مرنے کے بعد وہ دوبارہ آدھا جنگلی تو بن ہی گیا ہوگا۔“

میری ہنسی۔ ”گھبراؤ نہیں، شراب بھی گھڑ سواری کی طرح ہے۔ کوئی ذی روح اسے بھول نہیں سکتا۔ خیر اب بتاؤ کہ سونا کس طرح واپس لینا ہے اور ہم میں سے کون ہتھیار نکال کر ہینڈز اپ بولے گا؟“

”میری!“ جوزف نے اچانک گھوڑا روکا اور سنجیدگی سے بولا۔ ”کوئی ہینڈز اپ نہیں۔ کوئی گولی نہیں۔ کوئی بندوق نہیں۔ بہت ہو چکا۔ میں نے اس رسید کو پانچ سال سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور وہ اب بھی میری جیب میں ہے اور میں اسی رسید کے ذریعے وہ سونا بینک سے واپس لے لوں گا۔“

میری نے عجیب سی شکل بنائی تو جوزف بولا۔ ”اور کوئی بحث نہیں۔ ہم بینک کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ صرف پندرہ منٹ بعد ہم ایک نئی اور پُرسکون زندگی کی شروعات کر رہے ہوں گے۔“

میری کے منہ سے نکلا۔ ”کاش! ایسا ہی ہو۔“

☆☆☆

جوزف اور میری نے اپنے گھوڑے بینک کے باہر چھوڑے اور بینک کے اندر پہنچ گئے۔ جوزف نے چھوٹے قد کے کلرک کو فوراً پہچان لیا جو سامنے بیٹھا ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ جوزف نے اس کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”آپ مجھے بھول تو نہیں گئے؟ میں پانچ برس پہلے آپ کے پاس آیا تھا۔ یاد آیا؟ چار میکسیکن ڈاکوؤں نے یہاں ڈاکا ڈالا تھا۔ ایک یرغمالی کو ساتھ لے گئے تھے، وہ یرغمالی میں تھا۔“

”ارے... ارے...“ کلرک کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر مسکراہٹ آگئی۔ ”بالکل بالکل۔ جناب! میں نے آپ کو پہچان لیا۔ ویسے آپ کے بال اور مونچھیں بہت بڑھ گئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر۔ ان ڈاکوؤں کا تو کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔“

جوزف بولا۔ ”مجھے بھی خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔ خیر، آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس روز یہاں اپنا سونا جمع کروانے آیا تھا۔ میں اسے نکلوانے آیا ہوں۔ رسید میرے پاس ہے۔“

بینک والے نے رسید دیکھی اور کہا۔ ”جی ہاں، ہر چیز ٹھیک ہے لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ وہ میں اب اس بینک کا منیجر ہوں اور نیا کلرک یہ میرے بائیں طرف بیٹھا ہے۔“ ساتھ ہی ٹھنگنے نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اور اس کلرک کے ہوتے ہوئے آپ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں کہ یہاں ڈاکا پڑ جائے گا۔ یہ کلرک یہاں آنے سے پہلے شیرف ہوا کرتا تھا۔“ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ساتھ بیٹھے ہوئے کلرک نے سر گھما کر جوزف اور میری کی طرف دیکھا تو میری کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ کلرک دراصل ٹرکو کا ڈپٹی شیرف تھا اور یہ وہی تھا جو پانچ برس پہلے اس دوسرے بینک کے سامنے ٹرکو کے حکم پر گیٹلنگ گن سنبھال کر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری کو اپنی عزت کی اڑتی دھجیاں بھی یاد آ گئیں۔

جوزف نے چونکہ اس دن کسی کو نزدیک سے نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ اس شخص کو نہیں پہچان پایا تھا اور نہ ہی اسے صورتِ حال کا صحیح ادراک ہو سکا تھا۔ جب میری گلا پھاڑ کر چلائی۔

”جوزف! ایک طرف ہٹو“ تو وہ کچھ سمجھا تو نہیں لیکن فوراً ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بینک کلرک یعنی ٹرکو کے سابق ڈپٹی شیرف کے ہاتھ میں ریوالور چمکتا نظر آیا۔

میری اس سے زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سیدھا کرتا، میری کے کولٹ نے آگ اگلی اور گولی اس کی پیشانی سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی اور وہ آواز نکالے بغیر کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔

اگلے ہی لمحے میری نے بینک منیجر کا گریبان پکڑا اور اسے کاؤنٹر پر سے ہی اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ ریوالور کی نال اس کی پشت سے لگائی اور کہا۔ ”چلو، اب والٹ کی طرف چلو۔“

جوزف گھگیا کر بولا۔ ”میری تم نے وعدہ کیا تھا کہ کوئی خون خرابا نہیں کرو گی۔“

میری نے کوئی جواب نہیں دیا اور منیجر کو گھسیٹ کر

MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074

بذریعہ ڈاک

معقول فیس میں ہُنر مند بنیں

موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے

ہنر سیکھیے روزگار لیجیے

صبح 9 بجے تا شام 5 بجے

Registered with CBR
Govt. of Pakistan

اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اس کا سرٹیفکیٹ آپ کے پاس موجود نہیں ہے سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپکی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ ہم آپکا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کرینگے۔ نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر خط لکھ کر تفصیلات منگائیں

ڈیجیٹل ٹیکنیشن | لیبارٹری ٹیکنیشن | کشیدہ کاری | لیڈیز ٹیلرنگ | حکمت | ڈسپنسر | ایکوپنکچر | [illegible] | جینٹس ٹیلرنگ | میڈیکل اسسٹنٹ | ای سی جی ٹیکنیشن | U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی | ڈریس ڈیزائنر | میگنیٹو تھراپی | مڈوائفری | معالج حیوانات | بیوٹی سلمنگ | فیملی پلاننگ | کیمیکل | عینک سازی | شمسی توانائی | [illegible] | بزنس منیجمنٹ
یوگا | انٹیریئر ڈیکوریشن | [illegible] | ایریبک | بیوٹی پارلر | ائر ٹکٹنگ | مہر سازی | کوکنگ بیکنگ | [illegible] | سروئیر | کمپیوٹر | کمپیوٹر ہارڈ ویئر
میٹل ورکر | ابتدائی طبی امداد | ہوٹل منیجمنٹ | [illegible] | امپورٹ ایکسپورٹ | جینٹس بیوٹی سیلون | آٹو الیکٹریشن | شارٹ ہینڈ | [illegible] | [illegible] | جنریٹر ٹیکنیشن | اردو عربی خطاطی
فارمیسی | ہومیو پیتھک کورس | [illegible] | [illegible] | لیتھ مشین ٹیکنیشن | انگلش لینگویج | ٹیکسٹائل ڈیزائننگ | فلاور میکنگ | ویلڈنگ | الٹراساؤنڈ | فنِ مصوری | میجک
ایکسرے ٹیکنیشن | فزیو تھراپی | ڈائنگ بلیچنگ | آٹو سروسنگ | [illegible] | جیولری میکنگ | بلڈنگ سپروائزر | فش فارمنگ | کورین لینگویج | پائپ فٹنگ سپروائزر | موبائل فون ریپئرنگ | فائر فائٹنگ
باڈی بلڈنگ | خراد کا ہنر | اسٹیل فکسنگ | جدید مرغبانی | باغبانی | سیٹ ڈیزائنر | نیٹ ورکنگ | مونٹیسوری ٹیچنگ | [illegible] | چائلڈ کیئر کورس | ٹیلی کمیونیکیشن | [illegible]

دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

والٹ کے دروازے کے پاس لے آئی۔ ''چلو دروازہ کھولو۔ یہ کیا؟ تم کانپ کیوں رہے ہو؟ جان بوجھ کر دیر کررہے ہو؟''

''نن... نہیں۔'' منیجر ہکلایا۔

ادھر جوزف رو دینے والی آواز میں بولا۔ ''میری... میری... میرے پاس رسید تھی۔''

والٹ کا دروازہ کھل گیا منیجر پھر ہکلایا۔ ''سیفٹی ڈپازٹ باکسز اوپر ہیں۔'' لیکن میری اور جوزف سامنے زمین پر پڑے ہوئے خزانے کے ڈھیر کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ سونے کی اشرفیاں، اینٹیں، بیش قیمت جڑاؤ تلواریں، ہیرے، جواہرات۔ دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنے میں منیجر اوپر سے جوزف کا سونے والا ڈبا نکال لایا اور بولا۔ ''یہ لیں اپنا سونا۔ کیا آپ رسید پر دستخط کرنا پسند کریں گے؟''

میری ہنسی۔ ''جوزف! کاغذی کارروائی تم سنبھالو۔ میں ذرا اِدھر اُدھر دیکھ لوں۔ شاید کوئی چیز مجھے پسند آجائے۔''

چند منٹ بعد میری اکھاڑے ہوئے پردے میں خزانے کے بڑے حصے کو گٹھڑی کی صورت میں باندھے گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھی۔ یہ گٹھڑی اس نے جوزف کے حوالے کردی۔

یہ عجیب و غریب گروپ بینک کے مرکزی ہال میں اس طرح آیا کہ سب سے آگے ہاتھ اٹھائے ہوئے بینک کا منیجر تھا۔ اس کے پیچھے اس کے سر پر ریوالور کی نال لگائے ہوئے میری چلی آرہی تھی اور سب سے پیچھے جوزف گٹھڑی کو گھسیٹتا ہوا آرہا تھا لیکن اس کی تقریر جاری تھی۔

''میری! اس بار تم نے تمام حدیں پار کرلی ہیں اور اس وزن کی وجہ سے مجھ سے تیز چلا بھی نہیں جارہا۔''

میری غصے سے بولی۔ ''جوزف! تم چپ نہیں رہ سکتے؟''

جوزف چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ ''یہ سب گھوڑوں پر کیسے لادا جائے گا؟''

یہ گروپ بینک کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جو اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ اچانک ایک زوردار آواز کے ساتھ اس دروازے کی کنڈی اپنی جگہ سے اکھڑ کر بینک منیجر کے منہ پر لگی اور وہ بغیر آواز نکالے بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ یہ کنڈی دروازے پر پڑنے والی ایک زوردار لات کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔

کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پانچ خطرناک نظر آنے والے آدمی کھڑے تھے۔ سب سے آگے ایک دراز قد اور سخت چہرے والا شخص تھا اور اس کے ہیٹ پر شیرف کا مخصوص نشان یعنی دھات کا بنا ہوا ستارہ چمک رہا تھا۔

جوزف نے اس شخص کو فوراً پہچان لیا، یہ شخص ہنری ڈاج تھا۔ ایک بدنام زمانہ قاتل اور مجرم۔ لیکن اس وقت ایک پولیس افسر کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

جوزف کو معلوم تھا کہ اس زمانے کا یہ بھی ایک طریقہ کار تھا کہ بدنام قاتلوں اور مجرموں کو معافی دے کر انہیں پولیس افسر بنا دیا جاتا تھا تاکہ ایسے لوگ اپنی صلاحیت، خطرناکی اور مہارت کو قانون شکنی کے بجائے قانون کی حفاظت کے لیے استعمال کریں۔ بہت سے مجرم اس طرح شیرف بن گئے تھے۔ یہ طریقہ کسی حد تک کامیاب بھی تھا لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ اس قسم کے شیرف اپنی فطرت اور اصلیت کے مطابق ظالم اور تشدد پسند ہوتے تھے اور موقع ملنے پر قانون اور اختیارات سے تجاوز کرتے تھے۔ خاص طور پر ایسے موقع پر مجرموں کو گرفتار کرنے کے بجائے موقع پر ہلاک کردیتے تھے اور بعد میں یہ رپورٹ دیتے تھے کہ ملزم نے ''پولیس مقابلہ'' کی کوشش کی تھی۔

ہنری ڈاج بھی اسی قبیل کا پولیس والا تھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہوئے باقی چار پولیس والے بھی اسی قسم کے تھے۔ سب کے سب رائفلوں اور پستولوں سے مسلح تھے۔

ہنری ڈاج گرجا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہوگیا جوزف کارپینٹر اور ڈاکو حسینہ۔ سب کچھ زمین پر رکھ دو۔ اپنی بندوقیں بھی اور ہاتھ اوپر کرلو۔ یہ تمہیں پہلی اور آخری وارننگ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی جدید ساخت کی سلائیڈ ایکشن بارہ بور کی شاٹ گن کو ہلاتے ہوئے ہنسا۔ ''اور مجھے گنتی صرف پانچ تک آتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ان سب پولیس والوں نے اپنے اپنے ہتھیاروں کا رخ میری اور جوزف کی طرف کیا اور ہنری نے گنتی شروع کردی۔ ''ایک۔'' جوزف نے ان سب کی طرف دیکھا۔ اسے اپنا اور میری کا انجام بخوبی نظر آرہا تھا۔ ان کے ہتھیار ڈالتے ہی یہ پانچوں پولیس والے انہیں بھون ڈالتے۔ اگر جوزف اور میری ہتھیار نہ ڈالتے تو بھی ان کا انجام یہی ہوتا۔

''دو۔'' ہنری بولا۔ ''تین۔''

اب ہمیں کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ میری نے سوچا۔ اچانک میری کی نگاہ ہنری کے پیچھے باہر گلی میں کھڑی ایک عورت پر پڑی۔ فاصلے کی وجہ سے اس کی شکل تو نظر نہیں آرہی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک بہت بڑی

لمبی اور عجیب سی لوہے کی چیز اسے صاف نظر آرہی تھی۔ اس وقت اسے اس عورت کا پہلو نظر آرہا تھا۔ اس عورت نے اپنے جسم کے گرد بڑا سا چادر نما کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔

یہ عورت چونکہ ہنری ڈاج کے ٹولے کے پیچھے تھی اور تھی بھی کافی فاصلے پر، چنانچہ ہنری ڈاج کو اس کی موجودگی کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اپنی گنتی آگے بڑھاتا رہا۔ ''چار۔''

اچانک اس عورت نے پہلو بدلا اور اپنے جسم سے لپٹی ہوئی چادر اتار پھینکی اور اس کے منہ سے چنگھاڑ سے مشابہ آواز نکلی۔ ''پانچ۔'' یہ ڈولورس تھی اور اس کے ہاتھوں میں پچیس سیر وزنی دس خوفناک نال والی گیٹلنگ گن تھی جو ایک پٹے کے ذریعے اس کے جسم سے منسلک تھی۔

ہنری ڈاج چونکا اور اس نے مڑنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ ڈولورس نے بائیں ہاتھ سے گن کا میگزین سنبھالا اور دائیں ہاتھ سے اس کا ہینڈل پوری قوت سے گھما دیا۔ پوری گلی اور بینک کی عمارت گیٹلنگ گن کی دھڑ دھڑاہٹ سے لرز گئی۔ ہنری ڈاج اور اس کے تمام ساتھی خون میں لت پت ایک دوسرے کے اوپر نیچے ڈھیر ہوگئے۔

''جوزف! نیچے لیٹ جاؤ۔'' میری ایک طرف چھلانگ مارتے ہوئے چیخی۔

جوزف پہلے ہی نیچے لیٹ چکا تھا۔ مشین گن کی اندھی گولیاں کسی کا لحاظ نہیں کرتیں۔ دھواں بینک کی عمارت کے اندر پھیل گیا تھا۔

یکایک ڈولورس کی دھاڑ سنائی دی۔ ''جوزف! اپنا پستول پھینک دو اور باہر آجاؤ۔''

''اور میں؟'' میری سامنے آکر پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''میں یقین سے کہتی ہوں کہ تم چاہتی ہو کہ میں اپنی گن نہ پھینکوں اور اپنے پاس ہی رکھوں؟''

''ہاں میری! تم ٹھیک سمجھی ہو۔'' ڈولورس گلوگیر آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں چھائی ہوئی سرخی اور وحشت جوزف کو دور سے نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

ڈولورس اور میری گلی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ اچانک دونوں نے اپنے چہرے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کیے اور چلنا شروع ہوگئیں۔ دس دس قدم چلنے کے بعد دونوں رکیں اور ایک بار پھر اپنا اپنا رخ تبدیل کیا۔ اب وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں اور ان کے درمیان بیس قدم کا فاصلہ تھا۔

یہ روایت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ عزت، غیرت

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جولائی 2013ء کی جھلکیاں

استاد ادب

سرگودھا کی سرزمین سے ادب کا پرچم بلند رکھنے والی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

فنکار

کراچی کے اس مصور کا تذکرہ جو بیوی کو پالینے کی جستجو میں جرمنی جا پہنچا

ہمت مرداں

زندگی کی آس کی خاطر کیا کیا جتن کیے

محسنہ

ایک عجب انداز کی سچ بیانی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ''ترکی نمی دانم''، لہو رنگ سرگزشت ''سراب''، فلم نگری کی ان کہی روداد ''فلمی الف لیلہ'' اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں!

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گرویدہ ہوجائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

یا محبت کے نام پر دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کیا کرتے تھے اور اس جنگ کو ڈوئیل کہا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں یہ جنگ تلواروں سے کی جاتی تھی۔ بعدازاں یہ پستولوں سے کی جانے لگی۔ تاریخ میں ایسے تمام ڈوئل مردوں کے درمیان ہوئے تھے۔ جوزف آج پہلی مرتبہ دو عورتوں کے درمیان ہونے والا ڈوئل دیکھنے جارہا تھا۔ اور جیتنے والی کا انعام... وہ خود یعنی جوزف کارپینٹر تھا۔ وہ بینک کے دروازے پر خزانے کی گٹھڑی سنبھالے کھڑا تھا۔ گلی میں اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔ گیٹلنگ گن کے لرزہ خیز دھماکے سن کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔ قصبے کی پولیس نفری ڈولورس کے ہاتھوں پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔

جوزف نے اپنے دائیں طرف دیکھا۔ سیاہ بالوں والی ڈولورس، آنکھوں میں لوہے جیسی سختی اور عزم لیے بائیں ہاتھ سے گیٹلنگ گن کا میگزین سنبھالے اور دائیں ہاتھ میں اس کا ہینڈل تھامے کسی چٹان کے مانند کھڑی تھی۔

جوزف نے بائیں طرف دیکھا۔ گوری، اجلی رنگت اور سونے کے تاروں جیسے بالوں والی میری قدرے سکون سے کھڑی تھی اور اس کا ہاتھ ہولسٹر میں لٹکے ہوئے کولٹ ریوالور کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے واضح عزم جھلک رہا تھا۔

جوزف اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ان کے بیچ آنے لگا لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ اس کے دائیں طرف گیٹلنگ گن کی دھڑدھڑاہٹ گونجی اور بائیں طرف کولٹ کے لگاتار چھ فائروں کی آواز گونجی۔ اگر جوزف خود گھٹنوں کے بل نہ بیٹھ جاتا تو دونوں طرف کی اس فائرنگ سے اس کا چھلنی ہوجانا یقینی تھا۔

اس نے اپنے دائیں بائیں ڈولورس اور میری کو لڑکھڑا کر منہ کے بل گرتے دیکھا۔ ان تمام ذہنی جھٹکوں کے باوجود جوزف نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے کیونکہ اسی میں اس کی بقا تھی۔

☆☆☆

1870ء میکسیکو کے شمال مغربی حصے کے ایک اجاڑ ساحلِ سمندر کا منظر۔ آنکھوں کو لبھا رہا تھا۔ سمندر کے اس کنارے پر اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ تھا جو سمندر میں بھی دور تک چلا گیا تھا۔ ایک اونچی چٹان پر پرانی سرخ پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت کے کھنڈرات دیکھے جاسکتے تھے۔ لگتا تھا کہ اس عمارت کو بھی صدیوں سے یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اکثر حصے سلامت اور رہائش کے قابل تھے سمندر کے کنارے پر لکڑی کا ایک پلیٹ فارم تھا جہاں کشتی باندھنے کی جگہ تھی۔ وہیں سے ایک طویل زینہ عمارت تک جاتا تھا اور یہی زینہ اس عمارت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا۔ ساحل سے کچھ دور سمندر میں ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی میں گول شیشوں والی چھوٹی سی عینک لگائے ایک امریکی نوجوان بڑے آرام سے پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ کشتی کا رخ کنارے کی طرف تھا۔ نوجوان نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تین مچھلیاں دور سے ہلا کر اپنا انتظار کرتی ہوئی دو نگاہوں کو دکھائیں۔ ٹھنڈی ہوا اور آسمان پر اڑتے ہوئے سفید پرندوں نے ایک خوب صورت اور دل لبھانے والا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ کنارے پر کشتی باندھنے کے بعد جوزف نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مچھلیاں ایک بار پھر اپنی منتظر دو نگاہوں کو دکھائیں۔ یہ نگاہیں مرحوم جاسپر کے پالتو بھیڑیے بونینزا کی تھیں جو اب جوزف کے ساتھ رہنے کے لیے آگیا تھا۔

"بونینزا کیسے ہو؟" جوزف نے بونینزا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج تو سمندر شیشے کی طرح شفاف تھا۔ اس کے بعد جوزف نے انگیٹھی پر مچھلیاں بھوننی شروع کیں۔ ایک بڑا سا ٹکڑا بونینزا کے آگے پھینکا اور بولا۔ "مجھے بتاؤ کہ یہ ٹھیک طرح سے پک گئی ہے یا نہیں۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر شراب پئیں گے کچھ دیر بعد جوزف نے پکی ہوئی گرما گرم مچھلیاں ایک ٹرے میں سجائیں اور اونچی آواز میں بولا۔

"خواتین! کھانا تیار ہے۔" عمارت کے مرکزی ہال کے ایک کونے میں رکھی ایک بڑی میز کے پاس میری اور ڈولورس کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تاش کے پتے تھے اور میز پر ہیرے جواہرات اور سونے کی اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میری کی دونوں کلائیوں، بائیں ٹانگ اور پیشانی پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ڈولورس کا آدھا چہرہ پٹی میں چھپا ہوا تھا اور بایاں بازو گلے میں ایک پٹی کے ذریعے لٹک رہا تھا۔ وہ بلند آواز سے بولی۔

"ایک منٹ ٹھہرو جوزف! ہم اپنے کھیل کے درمیان میں ہیں۔" میری بولی۔

"چلو اس راؤنڈ کو ختم کرتے ہیں۔" ڈولورس نے میری کی طرف دیکھا۔

"تم بلف کررہی ہو۔"

میری نے مسکرا کر ڈولورس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نفرت کے بجائے محبت تھی۔ "نہیں ڈولورس! تم غلط کہہ رہی ہو۔ میرے پاس زبردست پتے ہیں۔" وہ ہنسی اور پھر بولی۔ "یہ دیکھو، دو ملکائیں اور ایک غلام۔"

چھوٹا چور

مریم کے خان

جس طرح کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا... اسی طرح کوئی جرم بھی چھوٹا نہیں ہوتا... جرم صرف جرم ہوتا ہے... مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ چھوٹا چور ہے... جرم بھی چھوٹے کرتا ہے... لمبا ہاتھ مارنے سے اجتناب کرتا ہے... اور تھوڑے کو بہت سمجھ کر قناعت کرلیتا ہے... ایک ادنی چور کے ڈکیتی کے دوران میں پیش آنے والے دلچسپ و تحیر آمیز واقعات کی سنسنی خیز روداد...

کھوٹے سکے کا کوئی نعم البدل نہیں... وہ کھوٹا ہی رہتا ہے... کھرے اور کھوٹے کا برمحل استعمال...

میں نے بہت احتیاط سے کھڑکی کا سلائڈنگ پٹ نکالا اور اسے اندر قالین پر رکھ دیا۔ اس دوران میں ذرا سی آہٹ بھی نہیں ہوئی پھر میں پھرتی سے چوکھٹ پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اندر آتے ہی سب سے پہلے پٹ کو دوبارہ اس کی جگہ لگا دیا۔ یہ کھڑکی پنسلوانیا کے شہر ہیرس برگ کے پاس ایک پوش علاقے میں واقع عالی شان ولا کی تھی۔ تقریباً دس ایکڑ پر پھیلے اس ولا میں وہ سب کچھ تھا جس کی خواہش ایک انسان کرسکتا ہے۔ تقریباً دو درجن کمروں پر مشتمل

شاندار پیلس، نصف درجن گاڑیوں کی گنجائش والا گیراج، ٹینس کورٹ، اولمپک سائز سوئمنگ پول، منی گالف کورس اور بھی بہت کچھ تھا۔ یہ ولا مسز انگرام نامی خاتون کا تھا۔ وہ بیوہ تھی اور اس کا شوہر جوزف انگرام اس کے لیے چین اسٹورز کا ایک بہت بڑا بزنس چھوڑ کر مرا تھا۔ وہ بے اولاد تھی اس لیے بلین ڈالرز کی یہ ساری دولت مسز انگرام کو ملی تھی۔ لارینا انگرام تقریباً چالیس برس کی خوب صورت عورت تھی۔ ظاہر ہے وہ خوب صورت نہ ہوتی تو اس سے عمر مین تیس سال بڑا انگرام اس سے شادی کیوں کرتا؟

اس سے پہلے کہ یہ کہانی آگے بڑھے میں اپنا تعارف کرادوں۔ میرا نام جونی اسٹیل ہے اور اپنے مخصوص حلقے میں لٹل تھیف یعنی چھوٹے چور کے نام سے مشہور ہوں۔ اپنا یہ نام میں نے خود رکھا ہے کیونکہ میں ہمیشہ چھوٹا ہاتھ مارتا ہوں۔ ایسے کاموں سے گریز کرتا ہوں جس سے میں بلاوجہ نظروں میں آجاؤں اور پولیس میرے پیچھے پڑ جائے۔۔۔ کیونکہ میں جن لوگوں کو ان کی قیمتی چیزوں سے محروم کرتا ہوں، وہ عام طور سے بہت دولت مند ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کا اثر رسوخ بھی ہوتا ہے۔ اگر میں ان کو بہت زیادہ نقصان پہنچاؤں تو اس کا امکان ہے کہ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جائیں اور میں پکڑا جاؤں۔ مجھے اس معاملے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے کہ میں ہمیشہ قانون کی گرفت سے دور رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ آدمی چاہے کتنا ہوشیار مجرم کیوں نہ ہو، غلطی ضرور کرتا ہے اور وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس لیے مجرم کو قانون سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے آج تک جیل جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میرا طریقۂ واردات بہت سادہ ہے۔ میں نے مرمت اور سروسز کے بے شمار کورس کر رکھے ہیں۔ میں سچ مچ ان تمام کاموں میں مہارت رکھتا ہوں۔ میں پلمبنگ سے لے کر پیانو کی مرمت تک کوئی درجن بھر کام کرسکتا ہوں۔ میں نے ایک سروس مہیا کرنے والی فرم بھی بنا رکھی ہے اور اخبارات و انٹرنیٹ پر اس کے اشتہار باقاعدگی سے دیتا ہوں۔ جب کوئی ضرورت مند کسی کام کے سلسلے میں رابطہ کرتا ہے تو میں پہلے اس کی مالی حیثیت کا پتا چلاتا ہوں۔ اگر وہ دولت مند ہوتا ہے تو کام کی حامی بھر لیتا ہوں ورنہ انکار کردیتا ہوں۔ کام کے دوران میں ان دولت مندوں کے گھروں کا پوری طرح جائزہ لے لیتا ہوں اور حفاظتی انتظامات میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی رخنہ تلاش کرلیتا ہوں۔ جیسے مسز انگرام کے گھر پیانو کی مرمت کے دوران میں نے اس کھڑکی کو تاڑ لیا اور پھر اس کا فکس پٹ اس طرح فکسنگ سے نکالا کہ بہ ظاہر وہ اپنی جگہ موجود تھا لیکن میں معمولی سی کوشش سے اسے نکال سکتا تھا۔۔۔ کیونکہ یہ سرکتا نہیں تھا اس لیے جب تک کوئی اس کے ساتھ زور آزمائی نہ کرتا، اسے علم نہیں ہوتا کہ پٹ نکلا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ منسلک الارم وائر کو اس طرح ناکارہ بنایا کہ بہ ظاہر وہ اپنی جگہ لگی ہوئی تھی۔

میں زیادہ لالچ نہیں کرتا۔ سال میں سات آٹھ وارداتیں میرے گزارے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ان سے مجھے اتنا مل جاتا ہے کہ میں مزے سے اپنا گزارہ کرنے کے ساتھ مستقبل کے لیے بچا بھی رہا ہوں۔ میرا اصول ہے کہ ہر واردات سے ملنے والی رقم کا تیس فیصد آنے والے وقت کے لیے محفوظ کرلوں۔۔۔۔ مسز انگرام کی دولت بے پناہ تھی۔ اس کا اظہار اس ولا کی ایک ایک چیز سے ہوتا تھا۔ وہاں کچھ بھی کم قیمت یا کم معیار کا نہیں تھا۔ ایک ایک چیز اعلیٰ ترین معیار کی اور بہت قیمتی تھی۔ وہاں دیواروں پر جو عام تصاویر لگی تھیں، ان کی مالیت ہی لاکھوں ڈالرز میں تھی۔ ڈیکوریشن پیس بھی ہزاروں ڈالرز مالیت کے تھے۔ میں نے جس پیانو کی مرمت کی تھی، وہ خالص برما ٹیک کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کی مالیت ڈیڑھ لاکھ ڈالرز تھی۔ میں کوشش کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ مجھے اس میں سے کیا لے جانا چاہیے اور کیا نہیں۔ بہرحال، یہ کام میں نے واردات والی رات پر چھوڑ دیا۔

مسز انگرام یہاں صرف ایک بٹلر کے ساتھ رہتی تھی لیکن ولا کی سیکیورٹی مکمل تھی۔ اگر میں بھی اندر سے کارروائی نہ کرتا تو آسانی سے داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ بٹلر اس کا ڈرائیور بھی تھا اور جب وہ کہیں باہر جاتی تو بٹلر ہی اس کی کار ڈرائیو کرتا۔ آج رات بھی مسز انگرام باہر ہوتی۔ وہ براڈوے کی ایک پارٹی میں شرکت کے لیے سرِشام ہی ولا سے روانہ ہوگئی۔ اسے تقریباً سو میل دور جانا اور پھر واپس آنا تھا اس لیے امید تھی کہ اس کی واپسی رات دو تین بجے سے پہلے نہیں ہوگی۔ میں ولا کی حدود میں داخل ہوا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ میں اپنا کام کرکے نصف رات سے پہلے یہاں سے رخصت ہوجاؤں گا۔ میں نے اپنی کار جو اصل میں چوری کی تھی، یہاں سے ایک میل دور ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ کوئی اس پر شک نہیں کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ولا میں کہاں کہاں کیمرے لگے ہیں۔ میں ان سے بچتا ہوا عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سیاہ لباس اور چہرے پر نقاب کی موجودگی میں، میں شناخت کے خطرے سے محفوظ تھا۔ اگر کوئی کیمرا اتفاقیہ مجھے دیکھ لیتا، تب بھی میری شناخت ممکن نہیں تھی۔

اندر داخل ہوکر میں نے سب سے پہلے ولا کے اوپری حصے کا رخ کیا جہاں بیڈرومز تھے۔ مجھے امید تھی کہ مسز انگرام کے بیڈروم سے مجھے کوئی نہ کوئی بیش قیمت زیور یا ایسی ہی کوئی قیمتی چیز مل جائے گی۔ وہ بہت قیمتی ڈائمنڈ واچ پہنتی تھی۔ اسے جیولری کا بھی شوق تھا۔ لیکن اگر مجھے ایسی کوئی چیز نہ ملتی، تب بھی اس ولا میں قیمتی اشیا کی کمی نہیں تھی۔ بس مجھے ذرا وزن اٹھا کر لے جانا پڑتا اور میں وزن اٹھانے سے بچتا تھا۔ میں سیڑھیوں کے پاس آیا اور اوپر جانے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک باہر کہیں روشنی لہرائی اور میں پھرتی سے فرش پر لیٹ گیا۔ روشنی ولا کی طرف آنے والے ڈرائیو وے پر لہرائی تھی اور چند لمحے بعد میرے کانوں نے کسی گاڑی کی آواز سنی۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ کسی وجہ سے مسز انگرام واپس آگئی ہے۔ میں نے فرش سے سر اٹھا کر دیکھا تو سیاہ وین سے چار افراد اترتے دکھائی دیے۔ انہوں نے میری طرح سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے میری طرح چہرے پر نقاب لگا رکھے تھے۔ انہوں نے وین سے بڑے سائز کے بیگ اتار کر اپنے شانوں پر لادے اور براہِ راست مرکزی دروازے کی طرف آئے۔

لاک کھلنے کی آواز آتے ہی میں پھرتی سے حرکت میں آیا اور دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اِدھر میں گھومنے والی سیڑھی سے اوپر پہنچا، اُدھر وہ چاروں اندر آگئے۔ یہ سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون تھے۔ میں چھوٹا چور تھا اور وہ بڑے چور تھے۔ وہ جس طرح سے اندر آئے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ انہوں نے تمام حفاظتی انتظامات ناکارہ بنانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ کوئی الارم نہیں بجا تھا۔ میں سیڑھیوں پر رکا ہوا تھا۔ اندر آنے کے بعد کسی نے دوسروں کو ہدایات دیں۔ ”میک! تم اور جان اوپر جا کر دیکھو۔ میں اور روز نیچے دیکھتے ہیں۔“

یہ سنتے ہی میں دوبارہ حرکت میں آگیا۔ دبے قدموں دوڑتے ہوئے اوپر کی منزل میں آیا۔ یہاں کئی کمرے تھے لیکن بدقسمتی سے سب لاک تھے۔ میں لاک کھول سکتا تھا مگر وقت نہیں تھا۔ میں باری باری سب کمروں کے دروازے چیک کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر ایک کمرے کا دروازہ کھلا ملا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ یہ چھوٹا سا بیڈروم تھا۔ چھوٹا ان معنوں میں کہ یہاں سارے کمرے بہت بڑے تھے ورنہ اصل میں تو یہ میرے گھر کے نصف کے برابر تھا۔ وہ اوپری منزل پر آگئے تھے۔ کمرے میں چھپنے کے لیے دو جگہیں تھیں۔ ایک بڑی سی وارڈروب لیکن میں نے بیڈ کے نیچے خلا کا انتخاب کیا۔ اس کا امکان کم تھا کہ کوئی بیڈ کے نیچے جھانکے گا۔ البتہ وارڈروب میں جھانکنے کا امکان تھا۔ میری طرح وہ بھی دروازے چیک کرتے آرہے تھے اور وہ پروفیشنل لگ رہے تھے کیونکہ میری طرح خاموشی سے آرہے تھے۔ بالآخر وہ اس کمرے تک پہنچے۔

ان میں سے ایک اندر آیا اور میں نے سانس بھی روک لی۔ اس نے کمرے کی روشنی جلائے بغیر اپنے پاس چھوٹی ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا اور پھر۔۔۔۔ وارڈروب کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا اور اسے بند کرکے بیڈ کی طرف آیا تو میرا دم خشک ہوگیا۔ اس کے پاؤں بیڈ کے پاس رکے تھے اور پھر وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ نیچے جھانکتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھی نے دھیمی آواز میں کہا۔

”چیک کرلیا؟“

”ہاں۔“ وہ بولا اور کھڑا ہوگیا۔ ”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

”آؤ نیچے چلیں۔۔۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔“

وہ کھڑا ہوا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔ میں نے لمبا سانس لیا جو کب سے میرے سینے میں دبا ہوا تھا۔ اچھے خاصے خنک موسم میں مجھے پسینا آگیا تھا۔ میں کچھ دیر اپنے اعصاب پر قابو پاتا رہا۔ جب میں پُرسکون ہوگیا تو میں نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور مجھے فیصلہ کرنے میں ایک منٹ لگا۔ فیصلہ یہ تھا کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے یہاں آنے والوں سے بھی خطرہ تھا اور اگر ان کی کسی غلطی سے پولیس آجاتی تو ان کے ساتھ میں بھی بلاوجہ پکڑا جاتا۔ بے شک میں چور کی حیثیت سے یہاں آیا تھا لیکن مجھے ڈاکو کی حیثیت سے پکڑے جانا منظور نہیں تھا۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، سوائے ایک چھوٹے چاقو کے۔۔۔ جبکہ آنے والے یقینی طور پر مسلح تھے۔ چاقو سے بھی میں اپنے کام میں مدد لیتا تھا اور میں نے اسے کبھی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں نیچے جا چکے ہیں تو میں بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ میرا اوزاروں والا بیگ میرے سینے پر بندھا ہوا تھا۔ اسے پشت پر بھی باندھا جاسکتا ہے لیکن میں سینے پر باندھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس طرح اسے اتارے بغیر میں جو چیز چاہوں، نکال

سکتا ہوں۔ میں نے چاقو نکال لیا۔ شاید پہلی بار میں اسے اوزار کے بجائے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا سوچ رہا تھا۔ یقین ہونے کے باوجود میں نے احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر راہداری میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند کر کے میں واپس کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا لیکن جب میں نے اس کے پردے سرکائے تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس پر شیشہ فکس تھا اور اس کے نچلے حصے میں باریک الارم وائر موجود تھی۔ اگر اسے توڑا جاتا تو فوراً الارم بج جاتا اور پولیس کو یہاں آنے میں پانچ منٹ بھی نہ لگتے۔

میں باہر نکلا اور دوسرے کمروں پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ پہلے لاک کمرے کا دروازہ اپنے اوزاروں سے کھولا۔ کوئی بھی تالا کھولنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اصل کام تالے کی شفاف اور نرم چمک دار سطح پر آنے والے نشانات کو روکنا ہے۔ چابی کے علاوہ دوسرے طریقے سے تالا کھولا جائے تو اس پر نشانات آتے ہیں اور ان سے پتا چل جاتا ہے کہ تالا غلط طریقے سے کھولا گیا ہے۔ مگر اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے میں نے نشانات کا خیال کیے بغیر تالا کھول لیا۔ اندر داخل ہونے پر یہ ایک اسٹڈی ثابت ہوئی تھی جس میں چاروں طرف دیوار گیر الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ یہاں بھی کھڑکی میں شیشہ فکس تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرا مسز انگرام کا بیڈروم تھا۔ کم سے کم وہاں کی آرائش، ڈریسنگ ٹیبل کی قیمتی اشیا اور بیڈ کے ساتھ دراز پر مسٹر اور مسز انگرام کی شادی کی تصویر سے یہی لگ رہا تھا۔ میں نے کمرا اندر سے لاک کیا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر میں خوش ہوا تھا کہ کھڑکی کے پٹ کھولے جا سکتے تھے۔ میں نے تھوڑا سا پٹ کھولا اور نیچے جھانکا تو کھڑکی کے ساتھ مشکل سے چھ سات انچ کا چھجا تھا اور فرش اس سے کوئی بیس فٹ نیچے تھا۔ اس سے چھلانگ لگانے یا گرنے کی صورت میں میری کوئی ہڈی ٹوٹنے کا امکان بہت روشن تھا اور اس کے بعد میں ڈاکوؤں سے بچ جاتا تو پولیس مجھے آکر اٹھاتی پھر بھی یہاں سے نکلنا تو تھا۔ میں واپس آیا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر سوائے پرفیومز اور میک اپ کے سامان کے کچھ نہیں تھا۔ اگر موقع ہوتا تو میں پرفیوم ہی لے جاتا۔ اس میں ہر پرفیوم ہزاروں ڈالرز مالیت کا تھا لیکن ابھی موقع نہیں تھا۔ کسی چھوٹی اور قیمتی شے کی تلاش میں، میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھولیں۔ مسز انگرام جیسی دولت مند خواتین کے پاس خاص جیولری تو یقیناً ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ گھر میں پہننے کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں بیڈروم میں ہی رکھتی ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی چیزیں جیسے بریسلیٹ، انگوٹھیاں اور ٹاپس بھی خاصے قیمتی ہوتے ہیں۔ میرا گزارہ ان سے بھی چل جاتا۔ دوسری دراز میں مجھے مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔ ان میں چار انگوٹھیوں کا ایک سیٹ تھا۔ پلاٹینیم کی ان انگوٹھیوں میں چھوٹے لیکن درجۂ اول کے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور ان کی قیمت کم سے کم بیس سے پچیس ہزار ڈالرز تھی۔ دو عدد جڑاؤ بریسلیٹ اور ایک سچے موتیوں کا ہار نکلا۔ میں خوش ہو گیا۔ ہار کی مالیت ہی پچاس ساٹھ ہزار ڈالرز تھی۔ یہ بڑے اور... سچے موتی تھے۔ ایک ٹاپس کا سیٹ تھا لیکن بہت چھوٹا اور کسی قیمتی پتھر کے بغیر تھا۔ میں نے اسے نہیں چھیڑا۔ یہ ساری چیزیں میرے بیگ کی مخصوص پاکٹ میں آگئیں۔ میں خوش تھا کہ مجھے خالی ہاتھ نہیں جانا پڑ رہا تھا۔ یہ ساری چیزیں چالیس سے پچاس ہزار ڈالرز میں بک سکتی تھیں۔

میں کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر نکل آیا۔ چھجے پر کھڑے ہو کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ کتنی تنگ اور خطرناک ہے۔ معمولی سی جنبش میرا توازن بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے چوکھٹ تھام کر پہلے کھڑکی اس طرح بند کی کہ جب تک اسے چھیڑا نہ جاتا، یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کھلی ہے یا بند ہے۔ پھر میں چھجے پر آگے سرکنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ کہیں مجھے کوئی پائپ یا ایسی کوئی چیز مل جائے گی جس کی مدد سے میں زمین پر اتر سکتا تھا۔ ایک بار میں نیچے اتر جاتا تو یہاں سے نکلنا آسان تھا مگر ابھی میں سرک رہا تھا کہ ولا کے سامنے والے حصے میں پھر روشنی لہرائی۔ کوئی گاڑی پورچ کی طرف آرہی تھی اور میں اسی حصے کی طرف تھا۔ بدقسمتی سے عمارت بالکل سفید رنگ کی تھی اور اگر کوئی اوپر دیکھتا تو میرا سیاہ وجود اسے بالکل صاف دکھائی دیتا۔ میں واپس سرکنے لگا۔ ویسے بھی جہاں تک میری نظر جاتی تھی، مجھے کوئی پائپ یا ایسی چیز نظر نہیں آئی تھی جس سے میں نیچے اتر سکتا۔

کار یقیناً مسز انگرام کی تھی۔ یہ بہت بیش قیمت... مرسیڈیز تھی۔ کار رکی اور بٹلر نے اتر کر دروازہ کھولا اور سہارا دے کر مسز انگرام کو اتارا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تبھی وہ غیر متوقع طور پر واپس آگئی تھی۔ بٹلر طویل قامت اور مضبوط جسامت کا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ مسز انگرام کو سہارا دے کر اندر لے گیا جہاں یقیناً ڈاکو ان کے منتظر ہوں گے۔ میں راستے میں آنے والی کھڑکیوں کو چیک کر رہا تھا کیونکہ میں واپس مسز انگرام کے بیڈروم میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ کچھ دیر بعد میں واپس مسز انگرام کے بیڈروم والی کھڑکی کے پاس تھا۔ جیسے ہی میں کھڑکی کے پاس پہنچا، مجھے اندر سے مسز انگرام کی آواز آئی۔ "تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ میرے بٹلر کو کچھ ہوا تو...؟"

"تو تم ہم سب کو خود الیکٹرک چیئر پر بٹھا دو گی۔" اندر موجود ڈاکو نے اس کا مذاق اڑایا۔ یقیناً بٹلر کے ساتھ کچھ برا ہوا تھا۔ میں نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی مگر سائلنسر لگے ہتھیاروں کا استعمال خارج از امکان نہیں تھا۔

"نہیں، یہ کام پولیس کرے گی۔" مسز انگرام نے سرد لہجے میں کہا۔

"مسز انگرام! فضول باتوں سے گریز کرو۔" یہ یقیناً ڈاکوؤں کے باس کی آواز تھی جس نے سب کو ولا کی تلاشی کا حکم دیا تھا۔ "اپنی دوا لو اور نیچے چلو۔"

کھڑکی پر پردے تھے اس لیے میں اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ کسی قدر کھلی رہ جانے والی کھڑکی سے ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً مسز انگرام کو دوا لینے کے لیے یہاں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ شاید دوا گھر میں رہ جانے سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ دولت مندوں کے امراض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں ایک ایسے ارب پتی سے واقف ہوں جسے الرجی ہونے کی صورت میں اس کی سانس رکنے لگتی ہے اس لیے وہ آکسیجن کی بوتل اپنے پاس رکھتا ہے۔ ممکن ہے مسز انگرام کو بھی ایسا ہی کوئی مرض ہو۔ وہ شاید دوا لے رہی تھی۔ اچانک اس نے مشتعل لہجے میں کہا۔

"تم لوگ ڈاکو نہیں چور ہو... میری دراز سے بھی چیزیں نکال لی ہیں۔"

"ہم نے کچھ نہیں نکالا۔" باس نے کہا۔ "ہم ان معمولی چیزوں کے لیے نہیں آئے۔"

"اس دراز میں میری کچھ جیولری رکھی تھی۔ معمولی قیمت کی ہے لیکن اس میں ایک سچے موتیوں کا ہار جوزف کی نشانی ہے۔ یہ اس نے شادی کے بعد دیا تھا۔ پلیز، وہ مجھے واپس کر دو۔ تمہارے لیے اس کی کوئی خاص قیمت نہیں ہے۔"

"تمہیں یقین ہے وہ زیورات اسی دراز میں تھے؟" باس نے پوچھا۔

"یقیناً میں چند گھنٹے پہلے خود یہاں رکھ کر گئی تھی۔"

باس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا اور ظاہر ہے انہوں نے انکار کیا۔ مجھے صرف باس کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ کسی مواصلاتی آلے سے ان سے رابطہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے مسز انگرام سے کہا۔ "وہ انکار کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس بیڈروم میں قدم بھی نہیں رکھا۔ تم نے خود دروازہ چابی سے کھولا ہے۔"

"تب کون کر سکتا ہے؟" مسز انگرام بولی۔ "مجھے وہ ہار بہر صورت چاہیے۔"

"میں نے کہا نا میرے ساتھیوں میں سے کسی نے یہاں سے کچھ نہیں لیا ہے، اس لیے تم ڈراما کرنے کے بجائے نیچے چلو۔"

"میں تم سے کوئی تعاون نہیں کروں گی۔" وہ ضدی لہجے میں بولی۔ "جب تک میرا ہار مجھے واپس نہیں مل جاتا۔"

"ہار کا فیصلہ بعد میں کریں گے، پہلے نیچے تو چلو۔" باس نے کہا اور مسز انگرام کی مزاحمت کے باوجود اسے کھینچ کر لے گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں حرکت میں آیا اور جلدی سے کھڑکی کا پٹ کھولا اور اندر کود گیا۔ باہر اچھی خاصی سردی تھی اور مستقل ساکت رہنے سے جسم اکڑ گیا تھا۔ کھڑکی کو اندر سے بند کر کے میں سوچنے لگا کہ اب باہر جانے کا کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ شکر ہے باس نے کسی اور چور کے بارے میں نہیں سوچا۔ لیکن کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ وہ سوچ بھی سکتا تھا اور اگر وہ اس نقطۂ نظر سے تلاشی لیتے تو اس پورے ولا کو صحیح سے کھنگالتے اور مجھے پکڑ لیتے۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا اس لیے میں بیڈروم سے ملحق واش روم میں آیا۔ میں نے واش بیسن سے پانی پیا اور ابھی ٹشو پیپر لے کر منہ صاف کر رہا تھا کہ بیڈروم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کوئی بولا۔

"اس عورت نے باس کا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔ بھلا یہاں کون آسکتا ہے؟ ہم نے پورا ولا تو دیکھ لیا ہے۔ وہ خود کہیں اپنا ہار رکھ کر بھول گئی ہے اور اب ڈراما کر رہی ہے۔"

"لیکن ہو سکتا ہے کوئی آ ہی گیا ہو... جیسے ہم آئے ہیں۔" دوسرے نے جواب دیا۔ یہ وہی دونوں تھے جو پہلے بھی یہاں آئے تھے۔ "اب ٹھیک سے دیکھنا ہے، ایک ایک جگہ چیک کرنی ہے۔"

انہوں نے بیڈروم کی تلاشی شروع کی اور میری جان پر بن گئی۔ وہ اب بول رہے تھے اور ان کی گفتگو کا مرکز مسز انگرام اور اس کا حسن و جمال تھا۔ اگرچہ گفتگو خاصی مخربِ اخلاق تھی لیکن اس کی وجہ سے مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کہاں تھے اور اب کس طرف آرہے تھے۔ ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے اس صورتِ حال سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ایک نے دوسرے سے واش روم چیک

کرنے کو کہا، میں تیزی سے حرکت میں آیا۔ مشکل سے مجھے دس سیکنڈ کا وقت ملا تھا اور وہ اندر آیا۔ اندر آتے ہی اس کی نظر واش بیسن کی طرف گئی اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”مل گیا؟“

”کون؟“ اس کا ساتھی عجلت میں اندر آیا۔

”یہ۔“ اس کے ساتھی نے واش بیسن پر رکھا سچے موتیوں کا ہار اٹھایا۔ ”میں کیا کہہ رہا تھا... اس عورت نے خود کہیں رکھ دیا ہے اور اب تجوری کھولنے سے بچنے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔“

دوسرے نے بھی سکون کا سانس لیا کہ ان کی تلاش جلد ختم ہوگئی۔ ”بس چلو کام ہوگیا ہے۔“

وہ واش روم سے نکلے تو میں نے دوسری بار رکا ہوا سانس خارج کیا۔ یہ ترکیب بروقت میرے ذہن میں آئی تھی۔ اگر مجھے ٹب کے پردے کے پیچھے جانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو میں پکڑا جاتا۔ اس پُرتعیش واش روم میں آئینوں کا استعمال بہت زیادہ تھا اور معمولی سی حرکت بھی فوراً نظروں میں آجاتی۔ جب وہ کمرے سے نکل گئے تو میں بھی باہر آیا۔ اب میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا لازمی تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ ان لوگوں کو شک ہو جاتا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر پہلے میری تلاش کرتے۔ وہ بڑا مقصد لے کر آئے تھے اور اس میں ناکامی کا ایک فیصد امکان بھی نہیں چھوڑتے۔ میں بیڈروم سے نکلا اور اوپری منزل پر دوسرے دروازے دیکھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ انہوں نے بھی سارے دروازے چیک کیے ہوں گے لیکن ایک بار شک ہو جاتا تو وہ دروازے کھلوا کر بھی دیکھ سکتے تھے۔ اب تو مسز انگرام سے انہیں سارے کمروں کی چابیاں بھی مل گئی ہوں گی مگر اوپر سوائے بیڈروم اور اس کمرے کے کوئی کمرا نہیں کھلا تھا جہاں میں بیڈ تلے چھپا تھا۔ باقی ایک لاؤنج اور اسٹڈی تھی۔ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، میں فوراً پکڑا جاتا۔

ظاہر ہے مسز انگرام اپنی بیش قیمت چیزوں سے بھرے ولا کو ایسے ہی چھوڑ کر نہیں چلی جاتی تھی کیونکہ یہاں حفاظت کا مکمل انتظام تھا۔ اوپری منزل سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نچلی منزل پر یہ راستے تھے لیکن وہاں ڈاکو موجود تھے۔ اوپر جانے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں عام طور سے اپنے بیگ میں ایک رسی کا لچھا رکھتا ہوں لیکن بدقسمتی سے آج میں وہ گھر میں بھول آیا تھا۔ دو دن پہلے میں نے بیک یارڈ میں باربی کیو کیا تھا اور یہ رسی وہاں کام میں آئی تھی۔ میں اسے بیگ میں واپس رکھنا بھول گیا تھا ورنہ میں اس کی مدد سے بیڈروم والی کھڑکی سے نیچے اتر جاتا۔ بیڈروم میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے رسی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا۔ میں سیڑھیوں تک آیا۔ پہلے سن گن لی مگر فی الحال اس طرف خاموشی تھی۔ مجھے تجوری والی بات یاد آئی۔ اس ولا میں ایک عدد تجوری تھی لیکن مجھے اس بارے میں علم نہیں تھا۔

مسز انگرام جیسی امیر عورت کے گھر میں تجوری اور اس میں قیمتی مال و دولت کی موجودگی عین ممکن تھی۔ چونکہ میرا بڑے پیمانے پر ہاتھ مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے تجوری جیسی کسی چیز کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں کی تھی۔ سن گن لینے کے بعد میں دبے قدموں نیچے آیا۔ سچے موتیوں کا ہار دینے سے میری عارضی بچت ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ مسز انگرام انکار کرتی کہ اس نے ہار واش روم کے بیسن پر نہیں چھوڑا تھا اور ڈاکوؤں کے باس کو اس کا یقین آجاتا اور وہ پھر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ اس سے پہلے مجھے یہاں سے فرار کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

میں نیچے آیا اور پہلے مرکزی ہال کا معائنہ کیا۔ یہاں کسی کھڑکی پر سرکنے والا شیشہ نہیں تھا۔ داخلی دروازہ جس سے ڈاکو اور پھر مسز انگرام اندر آئی تھی، میں اس طرف آیا اور شکر ہے ہینڈل گھمانے سے پہلے نیچے دیکھ لیا۔ دونوں پٹوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی چند انچ کی سیاہ ڈبیا چپکی تھی اور جب میں نے جھک کر اسے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ چھوٹا سا پلاسٹک بم تھا لیکن اتنا طاقت ور تھا کہ مہاگنی کے دروازے کے پرخچے اڑا سکتا تھا اور ظاہر ہے جو پاس کھڑا ہوتا اس کے بھی پرخچے اڑ جاتے۔ اگر پٹ کھولا جاتا تو بم کسی ایک سطح سے الگ ہوتا اور فوراً پھٹ جاتا۔ اس بم کو دیکھتے ہی میرے اندر خطرے کا الارم بجنے لگا۔ یہ خاص طور سے میرے لیے لگایا گیا تھا اور اس طرح لگایا تھا کہ میں اسے دیکھ لوں اور فرار کے ارادے سے باز رہوں۔ ڈاکوؤں نے یہ کام کیوں کیا تھا، اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کا کام مکمل ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنے نہ پاؤں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کام چھوڑ کر مجھے تلاش کرتے اس لیے انہوں نے یہ بندوبست کیا تھا۔

بم کی دریافت کے بعد میں محتاط ہوگیا۔ اس طرح کے اور ٹریپ بھی ہوسکتے تھے جن میں میں پھنس جاتا اور ڈاکو اپنا کام کر کے آرام سے نکل جاتے۔ میں پھنس جاتا یا مارا جاتا۔ میں دبے قدموں مرکزی ہال سے نکلا اور اس کمرے کی طرف بڑھا جس کی کھڑکی سے میں اندر آیا تھا۔ وہاں سے نکلنا آسان تھا اگرچہ اب مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا جب میں نے دیکھا کھڑکی کے ساتھ فکس ہو جانے والا دھاتی لاک لگا دیا گیا تھا۔ ایک بار لگ جانے کے بعد اسے کاٹ کر ہی نکالا جا سکتا تھا اور میرے پاس دھات کاٹنے والا کوئی اوزار نہیں تھا۔ فرار کے راستے محدود ہوتے جا رہے تھے۔ میں کوئی شیشہ توڑ کر بھی فرار کی کوشش کر سکتا تھا لیکن اس میں ڈاکوؤں اور پولیس دونوں جانب سے خطرہ تھا۔ مجھے ایک میل دور جانا تھا اور یہ سارا راستہ ایک طویل سڑک سے گزرتا تھا جس کے دونوں طرف چھپنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میرا واسطہ پولیس سے... پڑ سکتا تھا بشرطیکہ ڈاکو مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع دیتے۔

میں نے محسوس کیا کہ جلد بازی میں اٹھایا گیا کوئی جذباتی قدم مجھے کسی بڑی مشکل میں پھنسا سکتا تھا یا میں دنیا سے ہی رخصت ہو جاتا۔ دونوں باتیں مجھے قبول نہیں تھیں۔ مجھے اب تک ڈاکو اور مسز انگرام نظر نہیں آئے تھے، جب میں اس کمرے سے واپس نکلا تو مجھے راہداری کے سرے پر ایک کسی قدر کھلے کمرے کے دروازے پر روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ مگر اس دروازے کے پاس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نے راہداری میں قد آدم سائز کے ایک گل دان کے پیچھے جگہ سنبھالی اور اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سی اور چپٹی سیاہ رنگ کی کوئی چھ انچ لمبی، چار انچ چوڑی اور دو انچ اونچی کھلونا کار نکالی۔ یہ اصل میں اسپائی کھلونا تھا اس میں چھوٹا سا کیمرا اور مائک لگا ہوا تھا اور ریموٹ کی مدد سے یہ سو گز کی دوری تک کام کرتی تھی۔ ایک بار اس کی بیٹری چارج ہونے کے بعد یہ ایک گھنٹے کام کرتی تھی۔ اسے آپ زمینی ڈرون بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ مجھے خاصی مہنگی پڑی تھی لیکن اس نے اپنی افادیت کئی مواقع پر ثابت کی تھی۔ اسے کنٹرول کرنے والا آلہ آئی فون کے سائز کا تھا۔ اس کی چار انچ کی اسکرین پر گاڑی کے کیمرے کی ویڈیو آتی تھی۔ ایک چھوٹا سا وائرلیس ہینڈ فری آواز بھی سناتا تھا۔ میں نے گاڑی آن کر کے فرش پر چھوڑ دی، وہ بے آواز چلتی ہوئی کھلے دروازے تک پہنچی۔

فوراً ہی مجھے ایک بڑے ہال کا منظر دکھائی دیا جس میں ایک طرف عظیم الشان دیوار گیر تجوری تھی۔ تجوری کے دروازے کے سامنے شوپیس والا ریک تھا جو اب دو حصوں میں تقسیم تھا۔ تجوری اس کے پیچھے چھپی تھی۔ ہال کے دروازے کے ساتھ ہی ایک خوب صورت شیشے کی میز تھی۔ میں گاڑی کو اس کے نیچے لے گیا اور پھر اسے یوں سیٹ کیا کہ پورے کمرے کا منظر صاف دکھائی دینے لگا لیکن کوئی گاڑی کو آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تجوری کے سامنے چاروں ڈاکو اور مسز انگرام موجود تھی۔ اس کا بٹلر ایک طرف کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ فی الحال ایسی کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ تجوری کھولی جا رہی ہے۔ اس کے بجائے وہ مسز انگرام سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ہینڈ فری کان سے لگایا تو فوراً ہی ان کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ باس کہہ رہا تھا۔

”مسز انگرام! تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہی ہو۔ تجوری کا کمبی نیشن لاک بتادو۔“

”مجھے کمبی نیشن بتانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم لوگ مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟“

”تمہیں مار کر ہمیں کیا ملے گا؟ ہم تمہیں باندھ جائیں گے اور یہاں سے نکلنے کے بعد پولیس کو تمہارے بارے میں کال بھی کردیں گے۔“

”تمہیں خطرہ ہوگا کہ میں تمہیں بعد میں شناخت کر سکتی ہوں۔“

”تم نے نہ تو ہمارے چہرے دیکھے ہیں اور نہ ہی ہمارے بارے میں جانتی ہو اس لیے تم ہمیں کیسے شناخت کر سکتی ہو؟“

”میں تمہیں تمہاری آواز سے شناخت کرسکتی ہوں۔“

باس ہنسا۔ ”ہمیں معلوم ہے اس ولا میں کیمرے اور مائک لگے ہیں، ہماری آوازیں بھی ریکارڈ ہو رہی ہیں اس لیے ہم بندوبست کر کے آئے ہیں، یہ ہماری اصل آوازیں نہیں ہیں۔“ باس نے کہتے ہوئے اپنی ہائی نیک جرسی کا گلا نیچے کیا تو اس کے گلے پر ایک سیاہ پٹی چپکی دکھائی دی۔ ”یہ ہماری آوازیں بدل رہی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ مکمل پروفیشنل تھے اور اس ڈاکے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ باس نے بات جاری رکھی۔ ”اس لیے تم ہماری فکر مت کرو اور تجوری کا کمبی نیشن لاک بتادو۔“

مسز انگرام کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ وہ پارٹی کے لیے جدید تراش کا مختصر سا لباس پہن کر تیار ہوئی تھی اور اس میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھی۔ باس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”تب ہمیں تجوری کھولنے کے دوسرے طریقے پر عمل کرنا پڑے گا۔ ہم بلاسٹ کر کے اسے کھولیں گے۔ لازمی بات ہے پولیس کے پاس الارم بجے گا اور جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو پولیس ہمارا راستہ روکے گی اور راستہ صاف کرنے کے لیے ہم تمہیں ساتھ لے

جائیں گے۔ اگر پولیس نے کوئی ایکشن لیا تو سب سے پہلے تم ماری جاؤ گی۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو؟"

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ تم یہاں سے نکل سکو گے۔" مسز انگرام نے سکون سے کہا۔ "میں نے سچ کہا ہے، یہاں کوئی اور شخص موجود ہے اور وہ یہاں سے نکلتے ہی پولیس کو کال کرے گا۔"

"وہ یہاں سے نہیں نکل سکے گا۔ ہم نے تمام ایسے راستوں پر ٹریپ لگا دیے ہیں۔ جب ہم یہاں سے جائیں گے تو وہ پولیس کے ہاتھ آئے گا۔"

میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان کے فرار کے بعد پولیس آتی اور میں اس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ انہوں نے مجھے اس جگہ قید کر دیا تھا اور اطمینان سے ڈاکے میں مصروف تھے۔ باس کے ہاتھ میں ایک خاصا لمبا سا پستول تھا اس پر یقیناً سائلنسر لگا ہوا تھا۔ بٹلر ہوش میں تھا کیونکہ وہ سر ہلا رہا تھا لیکن اس کا سر بار بار آگے جھک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ مسز انگرام نے اس کی طرف دیکھا۔ "اسے طبی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر اس کا خون بہتا رہا تو یہ مر جائے گا۔"

"تم اسے مردہ سمجھو۔" باس نے کہا اور اچانک پستول کا رخ بٹلر کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ ہلکی سی ٹھس کی آواز آئی، بٹلر کا سر جھٹکے سے پیچھے گیا اور پھر وہ جھول گیا۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ میں اچھل پڑا اور مسز انگرام چلائی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟"

"تمہیں اس کی بہت فکر ہو رہی تھی اور اس لیے تم اپنی فکر نہیں کر رہی تھیں۔" باس کہتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔ "بہتر ہے تم اپنی فکر کرو۔ اب تمہیں خطرہ ہے۔"

گاڑی کے کیمرے کا رزلٹ بہت اچھا تو نہیں تھا لیکن مسز انگرام کے چہرے کے تاثرات واضح تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ان کی بات مانتی یا نہیں مانتی ہے تو دونوں صورتوں میں مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ اگر مسز انگرام ان کی بات مان لیتی اور ان کو کمبی نیشن لاک بتا دیتی تو وہ شاید اسے چھوڑ جاتے لیکن ساتھ ہی اس بات کو یقینی بناتے کہ میں یہاں سے نہ نکل سکوں۔ اس صورت میں وہ خطرے میں پڑ جاتے اور اتنے بڑے ڈاکے میں کامیابی کے بعد وہ یقیناً کسی خطرے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اگر مسز انگرام انکار کرتی اور انہیں دھماکے کی مدد سے تجوری کھولنا پڑتی تو اس صورت میں پولیس آجاتی اور انہیں راستہ صاف کرنے کے لیے مسز انگرام کو... یرغمال بنانا پڑتا۔ اس صورت میں بھی میں ہی مارا جاتا۔ وہ نکل جاتے اور میں پولیس کے ہاتھ آجاتا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ مجھے ڈاکوؤں کا ساتھی تسلیم کر لیا جاتا۔ مسز انگرام سوچ میں پڑ گئی۔ باس اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مسز انگرام کیا فیصلہ کرتی ہے اور جواب میں باس اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے مفاد کا سوچ رہے تھے اور مجھے اپنے مفاد کا سوچنا تھا۔ میرا مفاد اسی میں تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ اگرچہ باس نے بتا دیا تھا کہ انہوں نے میرے فرار کے تمام راستے بند کر دیے تھے لیکن میں نے پھر بھی اپنا اطمینان کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی کو اسی جگہ چھوڑا اور گملے کے پیچھے سے نکل کر تمام ممکنہ راستوں کو چیک کیا۔ مگر سچ مچ نیچے سے باہر جانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ حد یہ کہ فائر ایگزٹ بھی بند تھا۔ بلکہ اس کے مضبوط فولادی دروازے کو کھولنا بھی ممکن نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا تھا۔ جب میں راستہ تلاش کر رہا تھا، تب بھی میرا ذہن صورتِ حال میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مسز انگرام کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ تجوری کا کمبی نیشن بتانے سے گریز کرے۔ اس طرح ڈاکو تجوری اڑانے پر مجبور ہو جاتے۔ پولیس آتی اور ڈاکو تب بھی مسز انگرام کو یرغمالی کے طور پر زندہ رکھتے۔

میں جھنجلا گیا۔ ابھی میری جان اور آزادی پر بنی ہوئی تھی اور میں مسز انگرام کی بہتری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکو تجوری اڑانے سے ہر ممکن گریز کرتے کیونکہ اس صورت میں پولیس آجاتی اور یہ بات غیر یقینی تھی کہ پولیس انہیں مسز انگرام سمیت جانے دیتی۔ پولیس کے پاس نگرانی اور تعاقب کرنے کے بہت سے ذرائع تھے، وہ ہیلی کاپٹر منگوا سکتے تھے اور ڈاکوؤں کو اندازہ بھی نہ ہوتا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف کمانڈو ایکشن ہو سکتا تھا۔ پولیس اسنائپر انہیں دور سے شوٹ کر سکتے تھے۔ میں نے ایک چکر اوپر کا لگایا مگر کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں چکر لگا کر واپس آیا اور اس بار ایک لیدر صوفے کے عقب میں جگہ سنبھالی اور تجوری والے ہال کا معائنہ کیا۔ وہاں ڈاکوؤں نے مسز انگرام پر تشدد کا آغاز کر دیا تھا اور پہلے مرحلے میں اسے لباس سے محروم کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا لباس نہ ہونے کے برابر تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا اور وہ ہراساں لگ رہی تھی۔ باس کہہ رہا تھا۔

"تم تجوری کھولو گی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں ہر ایک منٹ بعد تمہارے چہرے پر بلیڈ سے کٹ لگاتا رہوں گا۔ نصف درجن کٹ لگنے کے بعد تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔"

"تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔" وہ ہمت سے بولی۔

باس نے اس کا جملہ اَن سنی کر کے بات جاری رکھی۔ "اگر تم نے یہ سہہ لیا تو اگلے مرحلے میں اسی طرح ایک ایک منٹ بعد تمہارے خوب صورت ہاتھوں کی انگلیاں کٹتی رہیں گی۔ اس کے بعد باری تمہارے پیروں کی آئے گی لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوگا۔ اس کے بعد بھی میرے پاس بہت سے آپشن ہوں گے۔ کیا تم اتنا سب کچھ برداشت کر سکو گی؟"

مسز انگرام خاموش رہی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہے۔ باس نے پھر کہا۔ "اس تجوری میں کتنی مالیت کی رقم اور قیمتی چیزیں ہوں گی؟ سو ملین، دو سو ملین یا بہت زیادہ ہوئیں تو پانچ سو ملین ڈالرز کی مالیت ہو گی۔ تمہارے پاس اس سے کہیں زیادہ دولت ہے۔ اس لیے اس دولت کی خاطر اپنا جسم اور جان مت گنواؤ۔"

مسز انگرام بولی۔ "پلیز... مجھے سوچنے کے لیے پانچ منٹ دو۔"

"ٹھیک ہے، تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں اور اس کے بعد میں اپنی کارروائی شروع کر دوں گا۔"

میں نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا لیا تھا اور میرا ذہن تیزی سے اس مصیبت سے چھٹکارے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے مسز انگرام نے پانچ منٹ کی مہلت اصل میں میرے لیے طلب کی تھی۔ سوچتے ہوئے ایک لائحہ عمل ذہن میں واضح ہونے لگا اور میں اس کے پہلے حصے پر عمل کرنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ وقت کم تھا اور مجھے تیزی سے کام کرنا تھا۔ میں نے اپنا بیگ اتار کر ایک آڑ میں رکھا اور اس میں موجود باریک فولادی تار کی ریل نکال کر کام میں لگ گیا۔ کام بہت احتیاط کا متقاضی تھا ورنہ سارا کھیل بگڑ جاتا اس لیے میں وقت کی کمی اور خطرے کے باوجود پوری احتیاط سے کام کر رہا تھا۔ میری ہر ممکن کوشش کے باوجود پانچ منٹ کا وقت گزر گیا اور میرے کانوں نے مسز انگرام کی چیخ سنی۔ میں نے جلدی سے ریموٹ نکال کر دیکھا۔ باس نے اس کے چہرے پر چاقو سے کٹ لگایا تھا اور خون بہہ کر اس کی گردن اور اس سے نیچے جا رہا تھا۔ باس کے ساتھی ہنس رہے تھے۔

"ایک منٹ بعد دوسرا کٹ...." باس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں نے ریموٹ سے گاڑی واپس لی اور اسے لے کر تیزی سے مرکزی ہال کے داخلی دروازے تک آیا۔ دروازے کے دونوں طرف بڑے سائز کے آرائشی گل دان رکھے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی ایک گل دان کی آڑ میں رکھی، دروازے پر زور سے ہاتھ مار کر واپس بھاگا اور اسی بڑے سے آرائشی گملے کی آڑ لی جہاں پہلے بھی چھپا ہوا تھا۔ مرکزی دروازے سے سب سے قریبی آڑ یہی تھی۔ ویسے لیدر کا صوفہ بہترین آڑ تھی لیکن وہ اس جگہ سے دور تھا۔ دروازے پر ہاتھ مارنے کی آواز خاصی اونچی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ ڈاکوؤں کے کانوں تک پہنچی ہو گی اور ان کی طرف سے ردِعمل ہو گا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب کچھ دیر بعد ہی ہال کی طرف سے دو مسلح ڈاکو نمودار ہوئے۔ انہوں نے خودکار رائفلیں یوں اٹھا رکھی تھیں جیسے انہیں کسی بہت خطرناک دشمن کا سامنا ہو اور وہ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کرنے کے لیے تیار ہوں۔

میں نے ریموٹ سنبھالا اور گاڑی کو پوری رفتار دی۔ وہ جب گل دان سے ٹکرائی تو اتنی آواز پیدا ہوئی جو ان کے کانوں تک آئی تھی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے ان کا شک پختہ کرنے کے لیے گاڑی کو ایک بار پھر پیچھے کیا اور اسے دوبارہ گملے سے ٹکرایا۔ انہوں نے رائفلیں اس طرف کر لیں اور محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ جب میں نے تیسری بار گاڑی ٹکرائی تو انہوں نے آواز کے مخرج کا اندازہ کر لیا تھا اور اب ان کی توجہ کا مرکز وہی گل دان تھا جس کے پیچھے گاڑی تھی۔ میں گاڑی کو ذرا اور پیچھے لے گیا تاکہ وہ فوراً ہی ان کی نظر میں نہ آئے اور اسے دیکھنے کے لیے انہیں اور آگے آنا پڑے۔ اس بار میں نے گاڑی کو دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بڑے گول پلر کی آڑ میں تھی۔ آواز مسلسل آئی تو وہ مزید محتاط ہو گئے۔ ان میں سے ایک آگے تھا اور وہ دروازے کے زیادہ پاس بھی تھا۔ دوسرا اس سے کچھ ہی دور تھا۔ مجھے اس کی فکر تھی، میں چاہتا تھا کہ وہ مزید پاس ہو جائے۔ وہ دو قدم اور آگے آیا تو میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور باریک فولادی تار کھینچ لیا۔ یہ پچاس پاؤنڈز والا تار تھا اور اس نے کام کیا۔ تار کھینچتے ہی دروازے کے پٹوں سے چپکا بم الگ ہو گیا اور ایک شدید دھماکا ہوا۔ مجھے کانوں پر ہاتھ رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے میرے کان سن ہو گئے۔ سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔

جب میری سماعت بحال ہوئی تو میں نے پھرتی سے بچ جانے والی تار سمیٹی اور اسے بیگ میں ڈالا۔ اس دوران میں اندر سے باس اور اس کا دوسرا ساتھی نمودار ہوئے۔ میں ایک حد سے زیادہ نہیں جھانک سکتا تھا اس لیے مجھے دروازے کے قریب دو ڈاکوؤں کا انجام معلوم نہیں ہوا۔ باس آگے آیا اور اس نے ایک ناقابلِ بیان گالی دی۔ اس کا اشارہ اپنے ساتھیوں کی طرف تھا۔ ”دونوں... مر گئے۔“

”یہ اسی... کا کام ہے۔“ دوسرے نے خاکسار کا ذکر کیا۔ ”وہ نکل گیا ہے باس۔“

”تلاش کرو اسے۔“ باس نے دہاڑ کر حکم دیا۔ وہ واضح طور پر مشتعل تھا۔ ”جہاں نظر آئے اسے شوٹ کر دینا۔“

”باس! وقت کم ہے، پولیس آنے والی ہوگی۔“

”بکو مت۔“ وہ پھر دہاڑا۔ ”اس کو قتل کیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

وہ صحیح معنوں میں میرے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں تباہ ہونے والے دروازے سے باہر نکلے کیونکہ ان کے خیال میں میں دروازہ کھلتے ہی یہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ان کے جاتے ہی میں گل دان کی آڑ سے نکلا۔ اپنا بیگ میں حسب سابق پہن چکا تھا اور دبے قدموں تجوری والے ہال کی طرف بڑھا۔ وہاں مسز انگرام فرش پر بیٹھی تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کے ساتھ پاؤں بھی باندھ دیے تھے۔ چہرے پر تقریباً دو انچ لمبے کٹ سے اب خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میرا حلیہ ان ڈاکوؤں سے مختلف تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور اپنی گھڑی کی اسٹاپ واچ چلاتے ہوئے مسز انگرام سے کہا۔

”مسز انگرام! میں وہی چور ہوں جس کے بارے میں تم سب مشکوک تھے۔ میں نے ڈاکوؤں کا ٹریپ تباہ کر دیا ہے۔ دو ڈاکو مارے گئے ہیں اور بچ جانے والے دو ڈاکو مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہیں اور ان کا پلان ناکام ہو گیا ہے کیونکہ کچھ دیر میں پولیس یہاں ہو گی۔ اب تمہارے پاس ایک منٹ ہے کہ مجھے تجوری کا کمبی نیشن بتا دو۔ صرف تجوری ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم ان ڈاکوؤں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ تمہیں بھی مار دیں گے۔ اب تمہارے پاس صرف تیس سیکنڈ ہیں۔“ میری نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ ”ایک منٹ پورا ہوتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے پولیس کی آمد تک میں ان سے بچنے میں کامیاب رہوں گا البتہ تم ماری جاؤ گی۔ اب دس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔“

مسز انگرام نے سر ہلایا تو میں لپک کر تجوری کے پاس پہنچا اور جیسے جیسے وہ کمبی نیشن بتا رہی تھی، میں اسے ملاتا جا رہا تھا۔ تیس سیکنڈ میں تجوری کا دروازہ کھل گیا۔ یہ اچھی خاصی بڑی تجوری تھی جس میں میں اور مسز انگرام آسانی سے آ سکتے تھے۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور اندر لے آیا۔ اس میں روشنی کا انتظام تھا جو دروازہ کھلتے ہی کام کرنے لگتا تھا۔ اندر آتے ہی میں نے دروازہ کھینچا لیکن اسے ایک ملی میٹر کے فرق سے بند ہونے سے روک دیا۔ اگر باہر سے کوئی دیکھتا تو اسے تجوری بند نظر آتی۔ جب تک وہ دروازہ کھینچ کر اس کی تصدیق نہ کرتا، اسے معلوم نہ ہوتا کہ تجوری کھلی ہوئی ہے۔ ایک خاص حد تک دروازہ بند کرنے کے بعد اس کا اسپرنگ سسٹم حرکت میں آ جاتا تھا اور وہ اسے خود بہ خود کھینچ کر بند کر دیتا۔ دروازہ بند ہونے سے روکنے کے لیے میں نے چاقو اٹکا دیا تھا اس لیے میں مسز انگرام کی بندشیں کاٹنے سے قاصر تھا۔ یہ پلاسٹک کی خود بہ خود لگ جانے والی ہتھکڑیاں تھیں، انہیں صرف کاٹ کر اتارا جا سکتا تھا۔ تجوری میں شیلفس پر بے شمار کرنسی نوٹ اور دوسری چیزیں رکھی تھیں لیکن میری توجہ ان کے بجائے باہر کی طرف تھی اور میں اس کے لیے تیار تھا کہ اگر وہ تجوری کا دروازہ چیک کریں تو میں چاقو ہٹا لوں۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ خود بہ خود لاک ہو جاتا۔ اس کے بعد اسے باہر سے کمبی نیشن لاک ملا کر ہی کھولا جا سکتا تھا۔ اسے اندر سے کھولنے کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے مسز انگرام سے پوچھا۔

”اگر اسے بند کر دیا جائے تو اندر دم گھٹنے کا امکان ہوگا؟“

”میں نہیں جانتی۔“ اس نے کسمسا کر کہا۔ ”پلیز! مجھے کھول دو۔“

”میرے پاس بس یہی ایک چاقو ہے۔“ میں نے معذرت کے ساتھ غلط بیانی کی۔ میرے بیگ میں کئی کاٹنے والے اوزار تھے لیکن فی الحال میں مسز انگرام کو اسی حالت میں رکھنا چاہتا تھا۔ ”اگر میں نے اسے نکالا تو دروازہ خود بہ خود بند ہو جائے گا۔“

ایک منٹ بعد باہر سے باس اور اس کے ساتھی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ”یہ کہاں گئی؟“ باس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”وہ بھاگ گئی باس۔“ دوسرا خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”پولیس آنے والی ہوگی، اس سے پہلے ہمیں یہاں سے

نکلنا ہوگا۔“

”نہیں، ہم تجوری اڑا سکتے ہیں۔“

”کیسے باس؟ اب ہم دو ہیں۔“ اس کا ساتھی بولا۔ ”سوراخ کرنے میں اور دھماکا خیز مواد لگانے میں کم سے کم دس منٹ لگیں گے۔ اتنی دیر میں پولیس آ جائے گی۔“

میں خوش ہو رہا تھا کہ ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ مگر باس کی تجویز خطرناک تھی۔ اگر وہ سوراخ کر کے تجوری کا لاک سسٹم دھماکا خیز مادے سے تباہ کرتے تو ساتھ ہی ہم بھی مارے جاتے یا زخمی ہو سکتے تھے۔ باس نے اپنے ساتھی کا احتجاج مسترد کرتے ہوئے اسے ویلڈنگ ٹارچ سے تجوری میں سوراخ کرنے کا حکم دیا۔ وہ جو بڑے بیگ لائے تھے، ان میں ویلڈنگ ٹارچ اور اس کا سامان تھا۔ مسز انگرام کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اگر وہ تجوری کا دروازہ کھلا پاتے تب بھی ہمارے لیے موت تھی اور اگر وہ اس میں سوراخ کر کے دھماکا کر کے کھولتے تب بھی ہماری بچت کا امکان بہت کم تھا۔ یہاں تجوری میں کوئی آڑ نہیں تھی جو ہمیں دھماکے سے بچاتی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ویلڈنگ ٹارچ کا استعمال کرتے یا تجوری کے پاس آتے، دور سے پولیس سائرن کی آواز آنے لگی۔

”پولیس۔“ باس کے ساتھی نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ ”باس... نکلو یہاں سے۔“

انہوں نے اپنا سامان بھی وہیں چھوڑا اور عجلت میں نکل بھاگے۔ ان کا منصوبہ مکمل طور پر ناکام رہا تھا۔ ان کے دو ساتھی مارے گئے تھے اور اب انہیں پولیس کا سامنا کرنا تھا۔ میں نے مسز انگرام سے کہا۔ ”تم نے درست کہا تھا۔ تمہاری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے زیورات میں نے نکالے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی وجہ سے میں بھی پھنس گیا۔“

”تم کون ہو؟“ مسز انگرام نے اس بار دلچسپی سے پوچھا۔ اس کا خوف کم ہو گیا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ وہ کس حالت میں ہے۔

”ایک چھوٹا چور۔“ میں نے حقیقت سے کام لیا۔ ”تمہیں کچھ دیر یہاں رکنا پڑے گا جب تک پولیس تمہیں آ کر نہیں نکال لیتی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”تم مجھے اس تجوری میں بند کر جاؤ گے۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے صرف شانے اچکائے اور باہر نکل کر تجوری کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتی رہ گئی لیکن جیسے ہی تجوری کا دروازہ مکمل طور پر بند ہوا، اس کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ یعنی تجوری اندر سے ساؤنڈ پروف تھی اور اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس میں ہوا کی آمد و رفت کا انتظام بھی نہیں تھا لیکن اندر اتنی ہوا ضرور تھی کہ وہ ایک آدھ گھنٹے زندہ رہ سکتی تھی اور اگر میں یہاں سے نکل جاتا تو پولیس کو کال کر کے اس کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ میں نے تجوری کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ تجوری سے نکل کر میں نے باہر کا رخ کیا۔ اسی اثنا میں باہر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے خودکار رائفلوں سے گولیاں چلیں اور اس کے بعد پستول اور شاٹ گنز کی آوازیں آنے لگیں۔ گویا باس اور اس کے ساتھی کا پولیس سے مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ اچھی بات تھی۔ کچھ دیر پولیس کی توجہ ان کی طرف رہتی اور مجھے نکلنے کا موقع مل سکتا تھا۔

مرکزی داخلی دروازے کے ساتھ مارے جانے والے دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی تھیں اور ان کی حالت بری تھی۔ بم طاقتور تھا اور وہ لوگ اپنے ہی ٹریپ کا شکار ہوئے تھے۔ میں لاشوں اور ملبے سے بچتا ہوا باہر آیا۔ مین گیٹ کی طرف جانے کے بجائے دائیں طرف موجود باغ سے گزرتا ہوا ولا کی چار دیواری تک آیا۔ یہ سڑک کے ساتھ گزرنے والی چار دیواری تھی اور یہاں میں نے فرار کا متبادل بندوبست کر رکھا تھا۔ اگر میں کسی وجہ سے مین گیٹ کی طرف سے فرار نہ ہو پاتا تو اس وقت کے لیے میں نے دیوار کے ساتھ ایک رسی کی سیڑھی لگا رکھی تھی۔ سیڑھی کوئی دس فٹ اونچی دیوار پر رکھی تھی۔ میں دیوار کے پاس آیا اور ٹٹول کر وہ باریک ڈوری تلاش کی جو دیوار کے ہم رنگ تھی اور اسے کھینچا تو اوپر رکھی سیڑھی نیچے گری۔ اس پر چڑھ کر میں دیوار تک پہنچا۔

یہاں تین فٹ تک خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ میں نے بیگ سے کٹر نکال کر باڑھ کو کاٹا۔ اس کام میں دو منٹ لگے۔ رسی کی سیڑھی میں نے باڑھ کو سہارا دینے والے اینگل آئرن سے باندھی تھی۔ سیڑھی کو دوسری طرف لٹکا کر میں آرام سے نیچے پہنچ گیا۔ باڑھ کو کاٹنے سے بھی یقیناً الارم بجا ہو گا لیکن اب اس کی پروا کون کرتا کیونکہ پولیس پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں سڑک کے کنارے لگی ہلکی پھلکی جھاڑیوں کے ساتھ اس طرف بھاگنے لگا جہاں میں نے اپنی کار چھوڑی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں رک گئی تھیں اور خودکار رائفلیں خاموش تھیں۔ بس اِکا دُکا پستول اور شاٹ گن کے فائر ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکو مارے گئے تھے

یامزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔ راستے میں دو بار مجھے پولیس کاروں کی آمد کی وجہ سے کنارے پر لیٹ کر چھپنا پڑا۔ جب پولیس کاریں سائرن بجاتی ہوئی میرے پاس سے گزر جاتیں تو میں اٹھ کر دوبارہ دوڑنا شروع کر دیتا۔

اس وقت عجلت میرا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس سے میں نظر میں آسکتا تھا۔ مسئلہ مسز انگرام کی زندگی کا تھا۔ اگر تجوری میں آکسیجن ختم ہوجاتی تو وہ دم گھٹ کر مرجاتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بلاوجہ موت کا شکار بنے۔ دس منٹ بعد میں اپنی چوری کی کار کے پاس تھا۔ انجن اسٹارٹ کرنے میں کچھ وقت لگا کیونکہ تاریں ملا کر اسٹارٹ کرنا پڑا تھا۔ یہ پوش علاقہ تھا اس لیے مجھے اوکین فون بوتھ کوئی پانچ میل بعد ملا۔ مسز انگرام کو تجوری میں قید ہوئے بیس منٹ ہوچکے تھے۔ میں نے ریسکیو کا نمبر ملایا اور آپریٹر کے کچھ کہنے سے پہلے بولا۔ ”آپریٹر! میری بات غور سے سنو یا ریکارڈ کر لو۔۔۔ میں بات دوبارہ دہراؤں گا نہیں۔“ میں جانتا تھا کہ آپریٹر نے فوری ریکارڈنگ شروع کر دی ہوگی۔ وہ بولی۔

”اوکے کیری آن۔“

میں نے تجوری کا کمبی نیشن نمبر واضح الفاظ میں بتایا اور بولا۔ ”یہ مسز انگرام کی تجوری کا لاک کمبی نیشن ہے۔ وہ اس وقت تجوری میں بند ہے۔ پولیس پہلے ہی اس کے ولا تک پہنچ چکی ہے اور وہاں موجود ڈاکوؤں پر قابو پا چکی ہوگی۔ اسے فوری طور پر اطلاع کرو، اس سے پہلے کہ مسز انگرام دم گھٹنے سے مرجائے۔“ میں نے مسز انگرام کے ولا کا پتا اور فون نمبر بتائے۔ ”کیا تم میری بات سمجھ گئی ہو؟“

”یس مسٹر! تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

جواب میں میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں نے اپنا کام کر دیا تھا۔ باہر آکر میں نے چوری کی کار بھی وہیں چھوڑی اور پیدل روانہ ہوگیا۔ چہرے سے نقاب میں پہلے ہی اتار چکا تھا۔ باہر آکر ہاتھوں پر چڑھے باریک سوتی دستانے بھی اتارے اور دونوں چیزیں بیگ میں رکھ لیں۔ بیگ کی خاص جیب میں مسز انگرام کی ڈریسنگ سے نکالے ہوئے زیوارت تھے اور ان میں وہ سچے موتیوں کا بیش قیمت ہار بھی شامل تھا جو میں نے ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے واش بیسن پر رکھ دیا تھا۔ واپس ملنے پر مسز انگرام نے اسے گلے میں پہن لیا تھا اور جب میں اسے اٹھا کر تجوری میں لے جارہا تھا تو میں نے صفائی سے ہار اس کے گلے سے اتار لیا تھا۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہار اس کے لیے کسی کی نشانی تھا لیکن اب اس پر میرا حق بن گیا تھا۔ میں نے اس کی زندگی ہی نہیں بچائی تھی بلکہ اس کی تجوری میں موجود رقم اور قیمتی ترین زیورات کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ حالانکہ میں چاہتا تو اس میں سے جو چاہتا لے سکتا تھا لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے، میں چھوٹا چور ہوں۔

خوش قسمتی سے پولیس نے بروقت مسز انگرام کی تجوری کو کھول لیا، جب وہ آکسیجن کی کمی سے انتقال کرنے والی تھی۔ ڈاکٹر نے مصنوعی تنفس دے کر اس کی جان بچالی تھی۔ جب اس کی حالت سنبھلی اور وہ پولیس کو بیان دینے کے قابل ہوئی تو اس نے تفصیل سے ڈاکوؤں کے بارے میں بتایا لیکن اس نے میرے بارے میں پولیس کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ حالانکہ وہ سخت مشکوک تھے کہ کوئی ایک فرد تھا جو ولا سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور اسی نے ریسکیو کو کال کر کے مسز انگرام کے بارے میں اطلاع دی تھی کہ وہ اپنی ہی تجوری میں بند ہے۔ یہی نہیں، وہ تجوری کا نمبر بھی جانتا تھا۔ لیکن مسز انگرام نے پولیس کے ایسے ہر سوال کا جواب لاعلمی میں دیا تھا جس سے میری شخصیت پر روشنی پڑ سکتی تھی۔ حالانکہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور پولیس کو بتا دیتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن شاید اس طرح وہ میرے احسان کا صلہ دینا چاہتی تھی جو میں نے اس کی جان اور مال بچا کر کیا تھا۔ دو مہینے بعد جب میں اس کے پیانو کی سروس کرنے گیا تو اس کے چہرے پر زخم کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا اور وہ پہلے کی طرح حسین اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے گلے میں وہی سچے موتیوں کا ہار تھا۔ اس واقعے کے دوسرے دن اس نے ٹی وی انٹرویو میں اپیل کی کہ اس کے شوہر کی نشانی اس کا ہار کہیں گم ہوگیا ہے۔ جس شخص کو ملے، وہ بلاتکلف اس کے پاس لے آئے یا سامنے آئے بغیر اسے پہنچا دے، وہ جس طرح کہے گا، ہار کی مالیت کی رقم اسے ادا کر دی جائے گی۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ ہار کی مالیت۔۔۔ ایک لاکھ بیس ہزار ڈالرز تھی اور میں اسے بیچتا تو مجھے پچاس سے زیادہ نہیں ملتے۔ اس لیے میں نے چانس لیا اور ہار اسے کوریئر کر دیا۔ ایک دن بعد ہیرس برگ کے ایک نواحی ہل اسٹیشن پر ایک مخصوص جگہ مجھے لفافہ مل گیا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار ڈالرز کے ساتھ الگ سے مزید ایک لاکھ ڈالرز تھے۔ میں کچھ زیادہ ہی فائدے میں رہا تھا۔

* * *

کھیل اور کھلاڑی

سمیرا طارق

کھلاڑی کی کارکردگی اور مہارت کھیل کا لطف دوبالا کر دیتی ہے... مگر ہر کھیل، کھیلنے کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں... جنہیں پورا کرنا ضروری ہوتا ہے... ایک ایسے ہی کھلاڑی کے گرد گھومتی کہانی... جو انسانی جان سے کھیلنے کا شوق رکھتا تھا... انسانی ذہن کی گراوٹ اور کج روی کا شکار ہونے والے شکار کی چالبازیاں...

لہو کی گردش تیز کر دینے والے سنسنی خیز لمحات سے آراستہ ایک دلچسپ کہانی

”مام، مجھے پھر آج محسوس ہوا کہ کوئی گندی نظروں سے مجھے گھور رہا ہے۔“ نوخیز آشا پڑعیون نے تولیے سے اپنے مختصر بال خشک کرتے ہوئے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ وہ ابھی ابھی اولمپکس کا کوالیفائنگ راؤنڈ جیت کر آئی تھی۔ اس کے جسم پر سوئمنگ کاسٹیوم تھا جس پر اس نے بڑا سا تولیا لیا ہوا تھا۔ تاہم دمکتی ہوئی پنڈلیاں اب بھی عریاں تھیں۔

رانی پڑعیون نے خود سے آدھ فٹ اونچی بیٹی کو پچکارا۔ ”تیرا وہم ہے پگلی! وہاں سیکڑوں لوگ تھے اور ان مردوں کی نظر تو ہوتی ہی گندی ہے۔ تُو کیوں فکر کرتی ہے۔ تجھے کوئی گھور تو سکتا ہے مگر انگلی تک نہیں لگا سکتا۔“

آشا کی اجلی پیشانی پر الجھن کی لکیر برقرار رہی۔ ”اگر یہ وہم ہے تو صرف کسی مقابلے کے دوران میں ہی کیوں محسوس ہوتا ہے؟ کسی اور وقت کیوں نہیں ہوتا؟“

رانی نے بیگ میں سے اس کے کپڑے نکالے۔ ڈریسنگ روم میں وہ دونوں تنہا تھیں۔ ”وہاں ہزاروں لوگ ہوتے ہیں، کوئی ایک تو ہوتا نہیں ہے تجھے گھورنے والا۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔

شرم کے احساس سے آشا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ تیزی سے ابھرتی ہوئی سوئمر تھی۔ وہ ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ سیاہ سوئمنگ کاسٹیوم میں جب وہ مچھلی کی طرح سوئمنگ پول میں تیرتی تھی تو دیکھنے والوں پر قیامت گزر جاتی تھی۔

”مگر مام! اس طرح میری توجہ متاثر ہو رہی ہے۔ بے شک میں نے کوالیفائنگ راؤنڈ جیت لیا ہے مگر پریکٹس اور مقابلے کے وقت میں دو اعشاریہ پانچ سیکنڈ کا فرق ہے... آئی ایم، لیٹ مام۔“

رانی متفکر ہوگئی۔ وہ خود بھی کبھی بہت اچھی سوئمر رہی تھی مگر ٹائیفائیڈ بخار کے سبب اس کا کیریئر جلد ہی اختتام پذیر ہوگیا تھا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر اس نے بیٹی میں ڈھونڈلی تھی۔

آشا کو ٹی شرٹ پہننے میں مدد دیتے ہوئے رانی نے اس کا کندھا چوما۔ ”میں کچھ کرتی ہوں بیٹا!“

آشا ننھی سی بچی کے مانند ماں سے لپٹ گئی۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مام!“

رانی نے اسے تھپکا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆☆☆

کھلاڑی اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ آشا پڑ عیون، مختصر سے سیاہ سوئمنگ کاسٹیوم میں ابھی تک اس کی پتھریلی سبز آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ اس کا بے داغ کندن کے مانند دمکتا جسم، چہرے پر لپکتی دوشیزگی کی چمک... کھلاڑی آنکھیں بند کر کے نفاست سے ترشے پاؤں کے ناخنوں سے چمکتے ہوئے سیاہ بالوں تک اسے بڑی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

آج بھی تماشائیوں کے اسٹینڈ میں، سب سے پہلی رو میں بیٹھ کر اس نے اپنی نگاہوں کا مرکز آشا کو بنا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے کھلاڑی خود کو بھی بھلا بیٹھتا تھا۔ ان لمحوں میں نہ جانے نگاہوں کا کون سا جادو متحرک ہوتا تھا کہ کھلاڑی نے آشا کو بے چین ہوتے اور متلاشی نظروں سے تماشائیوں کے اسٹینڈ کی جانب دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ فوراً ہی اس نے آشا پر سے نظر ہٹالی تھی۔ آشا کی نظر اس پر سے بھٹکتی ہوئی گزری تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ خود پر قابو رکھنے میں کامیاب نہ ہوتا تو آشا بڑی آسانی سے اس خاص نگاہ کو پہچان جاتی۔

کھلاڑی دل ہی دل میں محظوظ ہوا۔ اس کی خاص نگاہ آشا کو ڈسٹرب کر رہی تھی۔ شکار کے ساتھ کھیلنے میں ہی تو مزہ تھا۔ سنسنی لہر در لہر اس کے وجود سے ٹکرانے لگی۔

تصور ہی تصور میں اس نے آشا کے کندنی وجود سے اٹکھیلیاں شروع کر دیں۔ تصور مجسم ہونے لگا۔

ابھی تک آشا اس کی پہنچ سے دور تھی۔ اس کی سیکیورٹی پر مامور لوگ اعلیٰ تربیت یافتہ اور بے حد چوکس تھے۔ کھلاڑی کسی ”رخنے“ کی تلاش میں تھا۔ اس نے آشا کے گرد جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اسے خود پر یقین تھا کہ آشا جلد ہی اس کے قبضے میں ہوگی۔

حیوانی جذبات اسے مغلوب کر رہے تھے۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔ ایک گھر میں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا تھا۔ اس کی تربیت اور فطرت اسے ہوٹلوں سے دور رکھتی تھی۔ دبئی میں شام اتر چکی تھی۔ وہ فیری بوٹ سروس کے ذریعے انجینئرنگ کے شاہکار، سمندر کے بیچوں بیچ آباد ہونے والے پام سٹی میں آگیا۔ ہر طرف روشنیوں کا سیلاب، بے فکرے سیلانیوں کے قہقہے۔ اس جنت میں تاریک گوشے بھی تھے۔ کھلاڑی ایسے ہی تاریک گوشوں کی تلاش میں تھا۔ اس کے شکار کے لیے ایسی جگہیں مناسب تھیں۔ وہ ہمیشہ شکار یہیں سے ڈھونڈتا تھا۔ ہوٹلوں وغیرہ میں لگے خفیہ کیمرے اس کے لیے مشکل پیدا کر سکتے تھے۔

کچھ دیر کی تلاش کے بعد اسے کامیابی کے امکان نظر آنے لگے۔ وہ ایک دراز قامت بھرے بھرے جسم کی طوائف تھی۔ شوخ میک اپ اور جسم پر چپکا ہوا میرون میکسی نما لبادہ، اس کے جسمانی نشیب و فراز کو قیامت خیز انداز میں نمایاں کر رہا تھا۔

ایک پھولی ہوئی توند اور کانٹوں جیسی سیاہ مونچھوں والا ادھیڑ عمر شخص اس سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھا۔ ایک ڈرائیور ٹائپ بنگالی دو قدم پیچھے مؤدب کھڑا تھا۔

ڈیل آخری مراحل میں تھی۔ لڑکی کے چہرے پر نیم رضامندی دیکھ کر کھلاڑی نے ٹانگ اڑائی۔ ”میں ایک نشاط انگیز شب کے بدلے میں تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔“

لڑکی نے چونک کر نو وارد کو دیکھا۔ پہلے سے موجود شخص کے چہرے پر تپش نظر آنے لگی۔ لڑکی نے شستہ انگریزی میں کہا۔ اس نے مجھے دو ہزار درہم کی آفر کی ہے... تم کیا کہتے ہو؟“ اپنے جسم کو خطرناک زاویے سے نمایاں کرتے ہوئے اس نے سودے بازی کا آغاز کیا۔

یہ سارا معاملہ ساحل کے ایک نیم تاریک گوشے میں ہو رہا تھا۔

اس نے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھیری۔ ”اس سے ڈبل یا جتنا تم چاہو۔“

لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے کھلاڑی کا ہاتھ تھام لیا۔

”اوکے...“

وہ شخص بڑبڑاتا اور کھلاڑی کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”کہاں لے چلو گے؟“ لڑکی نے اپنا بوجھ کھلاڑی پر منتقل کرتے ہوئے لہجے کو پُرخمار بنایا۔

”میں تو ٹورسٹ ہوں... تم بتاؤ کہاں چلیں؟“

لڑکی کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے چمک ابھری۔ اسے مزید نوٹوں کی جھلک نظر آئی تھی۔ ”قریب ہی ایک شاندار ہوٹل ہے۔ وہاں میری سیٹنگ ہے، پندرہ فیصد ڈسکاؤنٹ مل جائے گا۔“

کھلاڑی نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”ڈسکاؤنٹ پر لعنت بھیجو... ہوٹلوں کی بھیڑ بھاڑ مجھے پسند نہیں ہے۔“

لڑکی ایک خیال آنے پر مزید خوش ہوگئی۔ ”تم افورڈ کر سکتے ہو تو میرے ایک جاننے والے کے پاس لگژری بوٹ ہے۔ سمندر کے عین درمیان بوٹ کے عرشے پر ہم میٹریس ڈال لیں گے۔ ٹھنڈی سمندری ہوا اور ہمیں دیکھنے والا ستاروں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔“

کھلاڑی کے چہرے پر نیم رضامندی نظر آئی۔ ”مگر بوٹ کا عملہ...“

لڑکی نے پُرجوش انداز میں اس کی بات کاٹی۔ ”اس کی فکر نہ کرو۔ میں کہہ دوں گی۔ ناخدا کے ساتھ ایک بنگالی لڑکا ہوگا... ہمیں سرو کرنے کے لیے۔“

کھلاڑی نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے جیسا چاہا تھا اس سے بڑھ کر ہو رہا تھا۔ نوجوان عورت بھی بے حد خوش تھی۔ بوٹ کے کرائے سے بھی اسے ٹھیک ٹھاک کمیشن ملنا تھا۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ لگژری بوٹ ساحل سے دور گہرے پانی میں لنگر انداز تھی۔ اس کی بیشتر بتیاں گل تھیں۔

کھلاڑی اور نوجوان طوائف... جس نے اپنا نام آریان بتایا تھا عرشے پر دراز تھے۔ ان کے گرد بیئر کی خالی بوتلیں اور کھانے پینے کی دیگر بچی کھچی اشیا بکھری ہوئی تھیں۔

آریان نیم مدہوش تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس مدہوشی کو مزید ہوا دے رہی تھی۔

کھلاڑی کی حیوانی بھوک مٹ چکی تھی مگر خون کی پیاس اور بھڑک اٹھی تھی۔ زیریں عرشے سے وہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر عرشے پر آیا تو اچانک ہی سولہ، سترہ سالہ بنگالی لڑکا اس کے سامنے آگیا۔ ”کچھ چاہیے صاحب؟“

”پائلٹ کہاں ہے؟“ کھلاڑی نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

بنگالی لڑکے کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ سفاک اور خنک آواز نے جیسے اس کی توانائی ضبط کر لی تھی۔ وہ بمشکل بولا۔ ”او... پر... کیبن... مم... میں سوتا ہوگا صاحب!“

نیم تاریکی میں لپک کر کھلاڑی نے اس کی گردن میں بازو ڈال دیا۔ وہ بچہ بھلا کہاں مزاحمت کر پاتا... وہ تڑپ کر ٹانگیں چلانے لگا۔ کھلاڑی نے مخصوص جھٹکا دیا۔ گردن کا مہرہ ٹوٹنے کی واضح آواز ابھری اور بنگالی بچے کی تڑپتی ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ کھلاڑی نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ دھپ سے نیچے گرا اور جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔

کھلاڑی سیڑھیاں چڑھ کر پائلٹ کیبن میں آیا۔ بوٹ کے مالک اور ناخدا کی اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ ایک بے حد موٹا ایرانی تھا۔ کھلاڑی نے جب بھی اسے دیکھا تھا، اس کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس ہی دیکھا تھا۔

پائلٹ کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کیبن میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور اس کی روشنی میں موٹا ایرانی نیچے چٹائی پر سویا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پورا کیبن اس کے خراٹوں سے گونج رہا تھا۔

کھلاڑی نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ مردوں کے مقابلے میں نسوانی چیخیں، نازک جسموں کی کانٹ چھانٹ اسے زیادہ مرغوب تھی اس لیے وہ ہمیشہ عورتوں کو ہی نشانہ بناتا تھا۔ طوائفیں آسان شکار ثابت ہوتی تھیں۔

قریب جا کر وہ پوری قوت سے گھٹنے کے بل موٹے ایرانی کے پیٹ پر گرا۔ ایرانی یوں اچھلا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ آنکھیں ابل پڑی تھیں اور چیخنے کے لیے منہ کھلا تھا کہ کھلاڑی کی چوڑی ہتھیلی اس کے منہ پر آجمی۔ بلند آہنگ چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

ایرانی نے ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس کے چربیلے جسم میں خاصی طاقت تھی مگر کھلاڑی نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ منہ دبائے دبائے گھٹنے کی پسلیوں میں لگنے والی پے در پے ضربوں نے ایرانی کی مزاحمت نصف سے بھی کم

کردی۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ اس کے سینے پر سوار تھا... پھر اس کی مزاحمت دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ حلق سے نکلنے والی خرخراہٹ بھی دھیمی پڑ گئی۔ اگلے چند منٹوں میں اس نے دم توڑ دیا۔

کھلاڑی اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا تو حیرت انگیز طور پر اس کی سانسیں ہموار تھیں۔ گینڈے جیسی جسامت کے ایک مضبوط مرد کو محض ہاتھوں سے گلا دبا کر ہلاک کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی... وہ واپس پلٹا۔ بوٹ کے کچن میں اپنا پسندیدہ چھریوں کا سیٹ دیکھ کر اس کے چہرے پر موجود غیر انسانی تاثر اور نمایاں ہو گیا۔ عجیب سی چمک تھی جس نے اس کے چہرے کے پُرکشش نقوش کو چھپا لیا تھا۔ چھریوں کا سیٹ لے کر وہ زیریں عرشے پر آیا۔ بوٹ کے واحد پُرتعیش... بیڈروم کا راستہ زیریں عرشے سے ہی جاتا تھا۔

آریان جاگ گئی تھی اور اس نے بنگالی لڑکے کو آواز دی تھی۔ نشہ ٹوٹنے کی بیزاری اس کی آواز سے نمایاں تھی۔ کھلاڑی نیم تاریکی میں اسے طویل سائے کی طرح نظر آیا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟ اور یہ عبدل کہاں ہے؟“ اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

”عبدل سے کہہ کر میں نے بیئر وغیرہ بیڈروم میں رکھوا دی ہے۔ آؤ بیڈروم میں چلیں... پھر دن چڑھے تک سوتے رہیں گے۔“

آریان اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی برہنگی کی اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ عبدل کو بھی وہ شراب لانے کے لیے ہی پکار رہی تھی۔ مطلوبہ سامان کی بیڈروم میں دستیابی کا مژدہ سنتے ہی عبدل اس کے ذہن سے اتر گیا۔ اس نے قدم اٹھایا تو لڑکھڑا گئی۔ کھلاڑی نے جلدی سے آگے بڑھ کر نہ صرف اسے سنبھالا بلکہ کندھے پر ڈال لیا۔ اس نے مخمور انداز میں ہنستے ہوئے اس کی کمر پر گھونسا مارا... اسی دوران اس کی نظر اس کے دوسرے ہاتھ میں موجود چرمی مخصوص شکل کے تھیلے پر پڑی۔ ”یہ کیا ہے؟“

”سرپرائز!“ کھلاڑی نے پاؤں کی ٹھوکر سے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔

آریان ہنسی۔ ”مجھے تو یہ چھریوں کا سیٹ لگ رہا ہے... کہیں تم کوئی جنونی قاتل تو نہیں ہو؟“

کھلاڑی نے اسے بیڈ پر گرایا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے۔“

اس دفعہ آریان کھو کھلے انداز میں ہنسی۔ ”مذاق اچھا کر لیتے ہو... اب بتا بھی دو، کیا ہے اس تھیلے میں؟“

اس نے بیڈروم کی روشنی آن کی۔ ”خود دیکھ لو!“ اور تھیلا بیڈ پر اچھال دیا۔

روشنی کے سبب آریان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند لمحے بعد جب اس کی آنکھیں روشنی کی قدرے عادی ہوئیں تو بند کیا ہوا تھیلا اس کے قریب کھلا ہوا تھا اور مختلف انداز کی چھریاں چمک رہی تھیں۔

آریان کا باقی ماندہ نشہ ایک پل میں ہرن ہو گیا اور بیڈروم جیسے گردش کرنے لگا۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر ٹانگیں جیسے بے جان ہو گئیں... اس کے سامنے عجیب انداز میں چمکتا ہوا قطعی غیر انسانی چہرہ تھا... سبز پُرکشش آنکھیں جیسے سکڑ کر خون آشام بھیڑیے میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

آریان اپنی ہمت مجتمع کر کے زور زور سے چلّانے لگی۔ کھلاڑی کے اطمینان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اس نے بستر کی چادر سے ایک طویل پٹی پھاڑتے ہوئے کہا۔ ”کہو تو دروازہ کھول دوں؟ شاید اس طرح تمہاری آواز بنگالی لڑکے اور موٹے تک پہنچ جائے۔“

آریان کو لگا... وہ بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس کے سامنے وہی جنونی قاتل تھا جو کچھ دن پہلے ہی ایک طوائف کو بہیمانہ انداز میں قتل کر چکا تھا۔ ”تت... تم نے ان کے ساتھ کیا... کیا؟“

”ایک کی گردن توڑ دی تھی... دوسرے کا گلا دبا دیا تھا۔“ وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

آریان کی چیخیں نکل گئیں۔ کھلاڑی کی وحشت دوچند ہو گئی... یہی چیخیں تو اسے مرغوب تھیں۔

جان کا خوف تو چوہے کو بھی بلی سے بھڑ جانے پر آمادہ کر لیتا تھا... آریان تو اچھی خاصی صحت مند لڑکی تھی۔ اس نے لپک کر تھیلے میں سے ایک چھری نکال لی۔ ”خبردار! مجھ سے دور رہنا ورنہ آنتیں نکال دوں گی۔“ اس کی آواز قطعی طور پر اس کے ارادوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ چھری والا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔

کھلاڑی اب بھی مطمئن تھا۔ اس نے چادر میں سے دو طویل پٹیاں پھاڑ لی تھیں۔ آریان چھری تانے بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اس کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

کھلاڑی نے بازو پھیلائے۔ ”آؤ... مجھے مار کر یہاں سے نکل سکتی ہو تو نکل جاؤ۔“ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ آریان نے اپنی تمام تر توانائیوں کو یکجا کر کے بے حد تیزی سے اس کے پیٹ پر وار کیا۔ چھری بجلی کی طرح لکیر بناتی ہوئی اس کے پیٹ پر چمکی تھی۔

کھلاڑی نے اس سے دگنی پھرتی دکھائی... اس نے اپنی چیتے جیسی پتلی مگر مضبوط کمر کو کھڑے کھڑے بل دیا۔ آریان کا چھری والا ہاتھ اس کے پہلو سے رگڑ کھاتا ہوا گزر گیا۔ یہ ٹائمنگ اور اندازے کی درستگی کا کمال مظاہرہ تھا۔

آریان اپنی جھونک میں آگے کی طرف جھکی۔ کھلاڑی نے اس کی گردن بغل میں دبا کر اسی کے ”مومینٹم“ کو استعمال کیا... آریان کی ٹانگیں اوپر کی طرف اٹھیں اور قلابازی کھا کر وہ بیڈ پر جا گری۔ چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کھلاڑی نے پل بھر میں اسے جا لیا۔ آریان نے چیختے چلّاتے ہوئے بھرپور مزاحمت کی... اس نے ٹانگیں چلائیں اور کچھ بن نہ پڑا تو اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔

زوردار مزاحمت، چیخنا چلّانا... کھلاڑی کو کھیلنے پر اکسا رہا تھا... سرخ سا نشہ تھا جو بڑی تیزی سے اسے گرفت میں لے رہا تھا۔ اس کے پے در پے دو تھپڑوں نے آریان کی مزاحمت صفر کر دی۔ آریان کا چکراتا ہوا سر معمول پر آیا تو اس کے دونوں ہاتھ مختلف سمتوں میں بیڈ سے بندھے ہوئے تھے اور کھلاڑی نوک دار چھری اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

”خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر... کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ بے شک اپنے پیسے واپس لے لو! مجھے جانے دو... خدا کے لیے۔“ آریان کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ نکلے تھے۔

اس کے سامنے انسان تو تھا نہیں... ایک آسیبی درندہ تھا۔ اس منت و سماجت کا اس پر خاک اثر ہوتا۔ اس کا چھری والا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا... آریان خوف و تکلیف کی شدت سے چیخی۔ اس کے سینے سے پیٹ تک طویل کٹ لگ گیا تھا... جس سے تیزی سے سرخ خون بہنے لگا۔

خون کی سرخی کھلاڑی کی پتھریلی آنکھوں میں نشہ بن کر تیرنے لگی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔ بیڈروم کی بند فضا آریان کی تکلیف میں ڈوبی چیخوں، سسکیوں اور آہوں سے تھرتھرا اٹھی۔ اس کا پورا جسم اور چہرہ خونی لکیروں سے بھر گیا تھا۔ یہ بڑے ماہرانہ کٹس تھے جو زیادہ گہرے نہیں تھے۔ صحت مند سرخ خون اس کے جسم کے ہر حصے سے بہہ رہا تھا۔ بیڈ کا میٹریس بڑی تیزی سے اس خون میں بھیگتا جا رہا تھا۔

آسیبی درندہ جامے سے باہر آ گیا تھا۔ وہ آریان کے زخم زخم جسم سے لپٹ گیا اور لمحوں میں اس کے خون سے لت پت ہو گیا۔

جریانِ خون کے سبب آریان پر غشی سی طاری ہو گئی۔ اس کے حلق سے ڈراؤنی سی خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی... زندگی کا دامن چھوٹ رہا تھا... موت اسے لینے کے لیے پہنچ گئی تھی۔ کھلاڑی کچھ دیر اپنا مکروہ کھیل کھیلتا رہا۔ آریان کی مزاحمت دم توڑتے ہی اس کی دلچسپی بھی ختم ہونے لگی۔

آریان کو چھوڑ کر وہ کھڑا ہوا تو آریان کی آنکھوں میں ابھی زندگی کی چمک تھی مگر تیزی سے معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آنکھیں اب بھی اس سے جان بخشی کی اپیل کر رہی تھیں۔ خوف و دہشت بھی جیسے ان آنکھوں میں مجسم ہو کر رہ گئے تھے۔

کھلاڑی نے انگڑائی لی... خون کا نشہ پورا ہو چکا تھا۔ اب اسے بھرپور نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ دم توڑتی آریان کو چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا۔ سمندری ہوا میں ایک دو گہرے سانس لے کر اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ نیم گرم سمندری پانی میں وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ وہ کم از کم تین منٹ بعد سطح پر ابھرا۔

جسم کو اچھی طرح خون سے صاف کر کے وہ دوبارہ سے بوٹ پر آ گیا۔ اپنے کپڑے اور جوتے پہن کر اس نے کچن کے فریج سے یخ بستہ انرجی ڈرنک کا ٹن نکالا اور پائلٹ کیبن میں آ گیا۔ موٹے ایرانی کی لاش جوں کی توں موجود تھی۔

اس نے بڑے اطمینان سے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا اور ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بوٹ کو گودی میں اس کی مخصوص جگہ پر لنگرانداز کر کے اس نے نیچے جا کر اطمینان کیا... آریان دم توڑ چکی تھی۔ خون بھی خشک ہونا شروع ہو گیا تھا۔

وہ سیٹی پر اپنی پسندیدہ دھن بجاتا ہوا گودی سے باہر آ گیا جہاں فوراً ہی اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ خوش تھا کہ بوٹ میں وہ ایک ”شاہکار“ تصویر چھوڑ آیا ہے۔

☆☆☆

کمپیوٹر سے نکلے درجنوں اخبارات کے پرنٹ نریش سنگھ نے ”را“ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر آر کے شرما کی میز پر آہستگی سے رکھتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”سر! میرا خیال ہے، ہم ڈھونڈ سکتے ہیں اسے۔“

شرما نے عینک کے اوپر سے اپنے ماتحت نوجوان کو دیکھا۔ وہ لوگ گزشتہ پانچ ماہ سے ایک کیس پر کام کر رہے تھے مگر کامیابی ہنوز دور تھی۔

اس نے فائل بند کر کے عینک اتاری۔ ”تمہارے

چہرے کی چمک تو واقعی کسی کلیو کی نشاندہی کر رہی ہے... بیٹھو!"

"بالکل سر... یہ دیکھیں۔" سریش نے نشست سنبھالتے ہی اخبارات پھیلائے۔ شرما نے دوبارہ سے چشمہ لگالیا۔

چند ہی لمحوں میں شرما نے نظریں اخبارات سے ہٹالیں۔ "بے شک یہ وہی ہے... یہ خون میں لتھڑے، کٹے پھٹے نسوانی جسم اسی کے قدموں کے "نشان" ہیں مگر یہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ جن ملکوں میں یہ وارداتیں ہوئی ہیں، ہم وہاں ٹامک ٹوئیاں مار چکے ہیں۔ تم کون سا نیا سراغ لے کر آئے ہو میرے پاس؟" آخر میں شرما کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہوگیا۔

سریش کے اطمینان میں چنداں فرق نہیں آیا۔ اس نے چند منتخب پرنٹ کھولے۔ "یہ اسپورٹس کے صفحات دیکھیں سر!"

شرما کا سر پھر جھک گیا۔ ہوشربا حسن اور قیامت خیز جسم کی مالک تیزی سے ابھرتی ہوئی بھارتی سوئمر آشا ہر صفحے پر نمایاں تھی۔ اس کی ماں رانی پڈعیون کی بھی چھوٹی تصاویر تھیں۔

شرما، رانی پڈعیون کو ایک ارب پتی بیوہ کے طور پر جانتا تھا جو اپنی بیٹی کے کیریئر کے لیے بے حد جذباتی تھی۔ شرما نے اخبارات سے نظریں ہٹاتے ہوئے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ "یار! کچھ منہ سے بھی بولو... میں آشا کے عشاق میں سے نہیں ہوں۔"

سریش نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے معلوم ہے سر! آپ کو دکھانے کا مقصد تھا کہ گزشتہ تین ماہ سے آشا جہاں بھی کسی مقابلے میں شرکت کی غرض سے گئی ہے، وہیں طوائفوں کے لرزہ خیز قتل ہوئے ہیں۔"

شرما سیدھا ہو کر بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے ماتحت کے لیے تحسین ابھری۔

لحاتی وقفے کے بعد سریش نے مزید کہا۔ "تازہ ترین واردات دبئی میں ہوئی ہے اور آشا بھی دبئی میں ہے۔" سریش کے لہجے میں سرسراہٹ نمایاں ہوئی۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ آشا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے اور عین ممکن ہے اس کی نظر آشا پر ہو۔"

شرما نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "بالکل ممکن ہے۔ وہ شاداب جسم والی لڑکیوں اور عورتوں کو بے حد پسند کرتا ہے۔ ضرور وہ آشا کے چکر میں ہے۔ اب تک وہ آشا کے گرد اپنا جال بُن چکا ہوگا۔" شرما نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ آشا کو انڈر کور کر کے ہم پہنچ سکتے ہیں اس تک۔"

اپنے آفیسر کو کھڑا ہوتے دیکھ کر سریش بھی کھڑا ہوگیا۔ ان کے اگلے پچاس منٹ بے حد مصروف گزرے تھے۔ فراغت میسر آئی تو سریش نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔

"سر! اجازت ہو تو ایک سوال پوچھ لوں؟"

شرما نے اثبات میں سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔

سریش نے قدرے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ "میں نے اس کی فائل دیکھی ہے۔ اس میں اس کے بارے میں ساری تفصیل موجود ہے مگر یہ معلومات نہیں ہے کہ وہ ہے کون؟ اس کا کوئی بیک گراؤنڈ... اس نے اعلیٰ درجے کی کڑی تربیت کہاں سے حاصل کی؟ یہ سب اوجھل ہے۔"

شرما نے کرسی کی بیک سے سر ٹکایا۔ اس دوران میں کافی سرو کر دی گئی۔ کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے شرما نے اپنے ماتحت کو دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

سریش نے ایک لحظہ سوچا، سوال غیر متوقع تھا۔ "ISI؟"

شرما کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ بھی تربیت کا اعجاز تھا۔ سریش کی سوچ کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتی تھی۔

شرما نے نفی میں سر ہلایا اور سرسراتے لہجے میں کہا۔ "وہ، را ہی کی تخلیق کردہ "بلا" ہے۔ خیال رہے یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔"

سریش کو جھٹکا سا لگا۔ خود کو سنبھال کر اس نے ہونٹوں پر فرضی ٹیپ چپکائی۔ وہ مزید جاننے کا منتظر تھا۔

لحاتی وقفے کے بعد شرما پھر گویا ہوا۔ "وہ "را" کے بہترین ایجنٹوں میں سے تھا۔ مزاجاً خون آشام تو وہ پہلے سے تھا... تربیت نے اسے بہت آگے کی چیز بنا دیا مگر اسے تربیت دینے والے اس کی خون آشامی کو کنٹرول میں نہیں رکھ سکے۔ رفتہ رفتہ وہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ حد آگئی جس کے بعد اسے "تلف" کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ "را" ہی کی ایک خاتون آفیسر اس کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس کے بعد سے وہ لاپتا ہے اور ہم "جال" لیے اس کے تعاقب میں ہیں۔"

"جال نہیں رائفل کہیں سر!" سریش نے تصحیح کی۔

☆☆☆

رانی پڈعیون اور آشا کا سیکیورٹی انچارج سلیم شاہ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ آشا پر کئی بااثر سیاست دان اور مافیائی ڈان قسم کے لوگ رال ٹپکا چکے تھے۔ اس لیے رانی نے اس کی سیکیورٹی کا فول پروف انتظام کیا ہوا تھا۔ آٹھ بہترین تربیت یافتہ گارڈز ہمیشہ اس کے قریب رہتے تھے۔ ان آٹھ افراد کی کمان سلیم شاہ کرتا تھا... جو خود بھی ریٹائرڈ ایس ایس جی کمانڈو تھا۔

سلیم شاہ اور اس کی ٹیم گزشتہ آٹھ ماہ سے ان ماں، بیٹی کے ساتھ تھے۔ اس دوران میں سلیم شاہ اور رانی پڈعیون میں بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی جو تمام حدود پار کر چکی تھی۔ دونوں ہی تنہا تھے اور ایک دوسرے کی تنہائی کے ساتھی تھے۔

وہ لوگ جس سیون اسٹار میں مقیم تھے، اس کی چھٹی منزل دو لگژری سوئٹس پر مشتمل تھی جو مکمل طور سے ان کے تصرف میں تھی۔ رانی خود بھی ہوٹل کے بھاری اخراجات برداشت کر سکتی تھی مگر وہ یہاں دبئی کی رائل فیملی کے ایک بزنس ٹائکون کے مہمان تھے۔ شیخ نائر نے حال ہی میں ایک پُرتعیش بحری جہاز خریدا تھا جس کی رونمائی کی تقریب چند ہی دنوں میں ہونے والی تھی۔

شیخ نائر نے اس شاندار تقریب کو اچھوتا رنگ دینے کے لیے ایک مقابلے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ مقابلہ دنیا کی چند گنی چنی خوبصورت اور متناسب اعضا کی حامل سوئمر کے درمیان تھا۔ ساحل سے شروع ہو کر گہرے پانی میں لنگر انداز پُرتعیش بحری جہاز تک سب سے پہلے پہنچنے والی سوئمر نے جہاز کا افتتاحی فیتہ کاٹنا تھا۔ اس کے علاوہ فاتح کو شیخ نائر بنفسِ نفیس قیمتی ہیروں پر مشتمل تاج پہناتا... دیگر بھی کئی انعامات تھے۔

دونوں ماں بیٹی کی دلچسپی کا محور انعامات سے زیادہ بین الاقوامی سطح کی سوئمرز تھیں۔ اس بات کو لے کر دونوں ہی بے حد پُرجوش تھیں۔

سلیم شاہ ساری صورتِ حال جاننے کے بعد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھٹی حس... خاص طور پر نسوانی چھٹی حس کا وہ قائل تھا۔ ضرور کوئی ایسا شخص گزشتہ چند ماہ سے آشا کے تعاقب میں تھا جس کی نگاہوں کی تپش وہ محسوس کرتی تھی۔ یہ شخص کوئی بے ضرر قسم کا عاشق بھی ہو سکتا تھا جو تماشائیوں کے اسٹینڈ میں بیٹھ کر آشا کو محض گھورنے پر اکتفا کرتا تھا اور کوئی جنونی قسم کا عاشق بھی... جو گھورنے سے آگے بڑھ سکتا تھا۔

بہرحال اس شخص کی ثابت قدمی پریشان کن تھی۔ کئی ملکوں میں آشا کے ساتھ سفر کرنے سے جہاں اس کی ثابت قدمی ثابت ہوتی تھی، وہاں اس کے وسائل کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ یقیناً وہ کوئی مال دار اور بارسوخ شخص تھا جس کے لیے مختلف ملکوں کے ویزے کا حصول اور سفری اخراجات کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

سلیم شاہ نے سینے میں مقید سانس آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بے بی سے بات کرنا ہوگی۔"

رانی کے چہرے پر سختی ابھری۔ "قطعی نہیں، وہ پہلے ہی ڈسٹرب ہے۔ اسے اپنے کھیل پر ہی توجہ مرکوز رکھنے دو۔"

سلیم شاہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "مجھے اس کے احساسات اسی کی زبانی سننے دو۔ یہ مسئلہ اس کے ساتھ مسلسل تین ماہ سے ہے یا ماضی قریب میں بھی وہ ان نگاہوں کی چبھن محسوس کر چکی ہے؟"

رانی کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی ہو۔ مجھے خود بات کرنے دو بے بی سے ورنہ کوئی مسئلہ ہو گیا تو میں ذمے دار نہیں ہوں۔"

رانی تذبذب کا شکار ہوگئی۔

"کم آن یار! میں کوئی پولیس آفیسر ہوں اور نہ ہی بے بی قتل کی مشتبہ ملزم ہے۔ وہ میری بیٹی جیسی ہے۔ میں پورا خیال رکھوں گا کہ اس کے ذہن پر میرے سوالات سے کوئی بوجھ نہ پڑے۔"

اس دفعہ رانی کے تاثرات یکلخت تبدیل ہوگئے۔ "آشا کو جب تم بیٹی کہتے ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے۔" اس نے سلیم شاہ کے گلے میں بازو ڈالے۔

سلیم شاہ نے اسے قریب کیا۔ "وہ بیٹی ہی ہے میری۔ اس کی حفاظت کی طرف سے تم کم از کم بے فکر ہو جاؤ۔"

رانی نے اس کے فراخ سینے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

شام کو آشا پریکٹس سیشن سے واپس آچکی تھی۔ وہ کھلے سمندر میں پریکٹس کی خواہش مند تھی مگر مناسب حفاظتی انتظامات مکمل نہ ہونے کی وجہ سے سلیم شاہ نے اس کی اجازت نہیں دی تھی مگر اس نے آشا کو تسلی دی تھی کہ دو دن بعد وہ کھلے سمندر میں پریکٹس کر سکے گی۔

رات کو انہوں نے شیخ نائر کی جانب سے دیے جانے والے ایک عشائیے میں شرکت کرنی تھی۔ اس سے پہلے ٹیرس پر شام کی چائے پیتے ہوئے سلیم شاہ نے آشا سے گفتگو چھیڑ دی۔ رانی بھی وہاں موجود تھی۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے بعد سلیم شاہ اصل موضوع کی طرف

آیا۔ ”تمہاری مما نے تمہاری الجھن میرے ساتھ شیئر کی ہے۔ یہ کوئی پریشان کن بات نہیں ہے۔ تم نظرانداز کرنے کی کوشش کرو۔“

”میری توجہ متاثر ہوتی ہے انکل!“ آشا نے گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ ”وہ گندی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر رینگتی محسوس ہوتی ہیں تو میری توجہ ہٹ سی جاتی ہے۔ میں اپنی صلاحیت کا پوری طرح سے مظاہرہ نہیں کرپاتی۔“

بیٹی کی بے بسی محسوس کر کے رانی کا دل کٹنے لگا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔ سلیم شاہ کامیابی سے آشا کو اپنی ڈھب پر لے آیا تھا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے بے بی! تم اسے نظرانداز نہیں کرسکتیں تو پھر اس گدھے کو پکڑتے ہیں۔ جوتے بھی لگاتے ہیں اور آنکھوں میں کوئی گرم سی چیز بھی چبھوتے ہیں۔“

اس کے ہلکے پھلکے انداز پر آشا ہنس پڑی۔ رانی نے بھی مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

”ہماری بیٹی کو گھورنے کی یہ کم از کم سزا ہے۔“

”جلدی سے پکڑیں اسے انکل! اگلے ماہ چائنا میں ہونے والے مقابلے میرے لیے بہت اہم ہیں۔ ان سے پہلے اسے پکڑلیں۔“

”اگلا ماہ تو بہت دور ہے۔ چند دنوں میں وہ گدھا ہاتھ آجائے گا... اچھا ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ مقابلوں کے علاوہ کہیں کسی اور جگہ بھی گندی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تمہیں؟“

آشا کے ذہن کی رو تیزی سے گھومنے لگی۔ پل بھر میں ذہن کے برق رفتار کمپیوٹر نے ان ساری جگہوں کو کھنگال لیا۔ ہر جگہ سے جواب نفی میں آیا تھا۔ پھر اچانک ہی ذہن میں جھماکا سا ہوا... ممبئی سے دبئی آتے ہوئے۔ دبئی ائرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ سے پرفیومز خریدتے ہوئے محض ایک، دو لمحوں کے لیے اسے ان بُری نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تھی۔

اب سلیم شاہ کے اس بارے میں مخصوص استفسار کرنے پر اسے یاد آگیا تھا۔ اس نے فوراً ہی سلیم شاہ کو اس بارے میں آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر کامیابی چمکنے لگی جبکہ رانی کی تحسین آمیز نظریں بھی اس پر آجمی تھیں۔

آج کل سیکیورٹی کیمرے بے حد عام ہوگئے تھے۔ عموماً لوگ ایک ماہ... یا پندرہ دن کی ریکارڈنگ رکھتے تھے پھر ڈیٹا ضائع کردیتے تھے۔ انہیں دبئی آئے ہوئے ابھی صرف نو دن ہوئے تھے۔

سلیم شاہ نے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک لائحۂ عمل ترتیب دے لیا تھا۔ اسے کامیابی کی خاصی امید تھی۔ جس سیکیورٹی ایجنسی سے وہ وابستہ تھا، اس کی برانچ دبئی میں بھی تھی۔ وہ اپنے آفس سے بھی مدد لے سکتا تھا۔

رات کو شیخ نائر کے عشائیے میں بھی سلیم شاہ سوٹ میں ملبوس آشا کے قریب تھا۔ دیگر گارڈز کو بھی اس نے چوکس کردیا تھا۔

عشائیہ کیا تھا... حسن و جمال، خوشبوؤں، رنگ و نور اور نامور چہروں کا گلدستہ تھا۔ جنوبی ایشیا کے کئی نامور کرکٹرز، فلمی پریاں اور بڑے بڑے سیاست دان بھی نظر آرہے تھے۔ مقابلے میں شرکت کی غرض سے آئی پری چہرہ سوئمرز بھی نمایاں تھیں اور ان میں آشا کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ سیاہ مغربی طرز کے لباس اور گلے میں سچے موتیوں کی مالا... وہ کسی اور ہی جہان کی مخلوق نظر آرہی تھی۔ کئی آنکھوں میں رشک و حسد نمایاں تھا۔

شیخ نائر کی آمد ہوئی اور محفل اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ڈانس کے ایک راؤنڈ کے بعد کھانے کی غرض سے وہ تینوں اپنے لیے مخصوص ٹیبل پر بیٹھے تو ایک بے حد سیاہ بالوں و آنکھوں والا توانا سا نوجوان ان کے قریب آگیا۔ ”شاہ صاحب! مناسب سمجھیں تو چند منٹ مجھے عنایت کردیں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔“ ماں، بیٹی کو اس نوجوان نے یکسر نظرانداز کردیا تھا۔

سلیم شاہ نے پل بھر میں نوجوان کا جائزہ لے لیا تھا۔ بے حد قیمتی سیاہ سوٹ میں اس کا توانا جسم نمایاں تھا۔ دہکتی ہوئی رنگت، جاذب نقوش... اس کے انداز میں بے پناہ خود اعتمادی تھی۔

”کیوں نہیں۔“ سلیم شاہ نے جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ ”تشریف رکھیں۔“

نوجوان بولا۔ ”ہم وہاں صوفوں تک چل سکیں تو میرے خیال میں زیادہ مناسب ہوگا۔“

سلیم شاہ نے دونوں ماں، بیٹی پر نظر ڈالی۔ رانی کے چہرے پر الجھن آمیز بیگانگی تھی۔ آشا کی آنکھوں میں اسے نوجوان کے لیے پسندیدگی کی چمک نظر آرہی تھی۔ اس کی نظریں نوجوان پر تھیں۔

سلیم نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ ”چلیں۔“

وہ دونوں صوفوں کی جانب چل دیے۔ سلیم شاہ کو اندازہ تھا کہ اس کے پہلو میں چلتا دراز قد نوجوان کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ شیخ نائر کے عشائیے میں مدعو کیے جانے والے بہت خاص لوگ تھے۔ سلیم شاہ نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ ”آپ کا اسمِ گرامی... اور مجھے کیسے جانتے ہیں آپ؟“

”میں سندر کپور ہوں... اور آپ کو کون نہیں جانتا۔ آشا کے چیف سیکیورٹی آفیسر ہی ہیں نا آپ؟“

”بے شک۔“

اس دوران میں وہ صوفوں تک پہنچ گئے تھے۔ دبیز صوفوں میں دھنستے ہوئے سلیم شاہ کی سوالیہ نظریں سندر کپور پر مرکوز تھیں۔

ٹائی کی ناٹ تھوڑی سی ڈھیلی کرتے ہوئے سندر کپور نے کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ قریب کے صوفے خالی پڑے تھے۔ تھوڑی دور ایک بڑے میاں خود سے تین گنا چھوٹی بیوی یا کچھ ”اور“ کے نازونخرے اٹھانے میں مشغول تھے۔

نوجوان نے دھماکا خیز انداز میں کہا۔ ”شاہ صاحب! آپ کو پیشہ ورانہ چیلنج درپیش ہے۔ آشا کے گرد ایک بہت بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔“

مضبوط اعصاب کے باوجود سلیم شاہ کو جھٹکا سا لگا مگر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”کس قسم کا خطرہ؟ اور آپ کی اس معاملے میں دلچسپی کی وجہ؟“

سندر کپور مسکرایا تو اس کے بے حد سفید دانت نمایاں ہوئے۔ ”آشا، ہندوستان کا ”اثاثہ“ ہے اور اپنے اثاثوں کی حفاظت ہم دنیا کے ہر کونے میں کرتے ہیں... میرا تعلق ”را“ سے ہے۔“

سلیم پیشہ ور فوجی رہا تھا۔ سندر کپور کے انداز و اطوار پہلے ہی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کا تعلق کسی سیکیورٹی ادارے سے ہے۔ ”اس فکرمندی کے لیے میں ”را“ کا مشکور ہوں مگر خطرہ کس قسم کا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں رانی اور آشا کا جائزہ لیا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”شاہ صاحب! کھل جائیں تو آشا کے لیے زیادہ بہتر رہے گا۔ وہ ”را“ کے دبئی ڈیسک کے انڈر کور ہے۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں آپ نے اس کی حفاظت کے معاملات کا دوبارہ جائزہ لیا ہے، سیکیورٹی پلان یکسر تبدیل کیا ہے اور اپنی ایجنسی سے دو پیشہ ور غوطہ خور گارڈز مانگے ہیں جو پانی کے اندر استعمال ہونے والے بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہونے چاہئیں... یقیناً کسی خطرے کا ادراک آپ کو ہوچکا ہے۔“

سلیم شاہ نے گہرا سانس لیا۔ اس کے سامنے یقیناً را جیسی باخبر ایجنسی کا نمائندہ تھا۔ سندر کپور کی گہری نظریں اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے اپنا پروفیشنل کارڈ نکالا۔ ”یہ دیکھ لیں... آپ کو ہم پر اعتماد کرنے میں آسانی ہوگی۔“

سلیم نے شکریے کے ساتھ اس کا کارڈ تھام لیا۔ وہ ”را“ میں ڈیپوٹیشن پر تین ماہ گزار چکا تھا۔ ایک نظر میں ہی اس نے دیکھ لیا کہ کارڈ اصلی ہے۔ مزید تسلی کی غرض سے اس نے کہا۔ ”آپ کی اجازت ہو تو آپ کا کوڈ نمبر دیکھ لوں؟“

سندر کپور چونکنے کے بجائے مسکرایا۔ ”بالکل... میں جانتا ہوں کہ آپ نے ”را“ کے لیے تین ماہ کام کیا ہے۔“

سلیم نے جان لیا کہ سندر کپور مکمل ہوم ورک کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھا ہے۔ اس نے صوفے کی آڑ میں سنہری کارڈ کی اوپری پرت ناخن کی مدد سے اٹھائی۔ پرت آسانی سے اٹھ گئی۔ نیچے A-63 کے کوڈ پر را کی مخصوص سیاہ مہر تھی۔ اس کے سامنے را کا اے کلاس ایجنٹ تھا۔

اس نے اوپری تہ جما کر کارڈ سندر کپور کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر اب مرعوبیت کے آثار تھے۔ ”مناسب سمجھیں تو ڈنر کے بعد تفصیل سے بات کرتے ہیں۔“

سندر کپور نے کہا۔ ”یہی مناسب رہے گا مگر خیال رہے ان ماں، بیٹی کو میری حقیقت کا پتا نہیں چلنا چاہیے اور اب مجھے آشا کے قریب رہنا ہے۔ میری جگہ نکالنا آپ کی ذمے داری ہے۔“

”ہوجائے گا۔“ سلیم اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے سے موبائل فون کے نمبروں کا تبادلہ کر کے وہ علیحدہ ہوگئے۔

”کون تھا یہ؟“ آشا نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ کئی ہینڈسم مردوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا مگر کسی نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ یہ اجنبی اسے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا۔

”میری ایجنسی کا ہی بندہ تھا۔“ سلیم شاہ نے سرسری سے انداز میں کہا۔ البتہ رانی نے چونک کر بیٹی کو دیکھا تھا جس کی نظریں اب بھی اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اجنبی سے متعلق رانی کے سوال کا بھی سلیم شاہ نے گول مول سا جواب دیا تو وہ سمجھ گئی کہ آشا کی موجودگی کے سبب وہ بتانا نہیں چاہتا۔

اجنبی کے انداز سے وہ کھٹک ضرور گئی تھی۔

عشائیے سے واپسی پر تنہائی میسر آئی تو رانی کی زبان پر پہلا سوال سندر کپور سے متعلق تھا۔ ”کون تھا وہ؟“

سلیم شاہ جانتا تھا کہ رانی سے کچھ چھپانا بے سود ہے۔ اس نے سندر کپور کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"را کا بندہ تھا... کہتا ہے ایک بہت بڑا خطرہ آشا کے گرد منڈلا رہا ہے۔"

رانی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بمشکل اس نے کہا۔ "کک... کیسا خطرہ؟"

"یہ تو تفصیلی ملاقات پر ہی وہ بتائے گا مگر شکر کا مقام ہے کہ را کو بھی آشا کی فکر ہے۔ وہ را کی چھتری کے سائے میں ہے۔ ہمیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

یہ جان کر رانی نے بھی قدرے اطمینان محسوس کیا اور بولی۔ "مگر ہم مطمئن ہو کر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ اپنے طور پر بھی ہمیں چوکس رہنا ہوگا۔"

"وہ تو ہم پہلے سے ہیں۔"

رانی پُرخیال انداز میں بولی۔ "جس خطرے کی بو را نے سونگھی ہے، کہیں اس کا تعلق آشا کو محسوس ہونے والی نگاہوں کی چبھن سے تو نہیں ہے؟"

سلیم شاہ نے کندھے اچکائے۔ "ممکن ہے مگر کوئی اور خطرہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

رانی روہانسی ہوگئی ۔ "ہائے بھگوان... میری بیٹی پر کس منحوس کا سایہ پڑ گیا ہے۔ اس کی رکھشا کر۔" وہ لبرل ازم کی حامی تھی جس کا ثبوت یہ تھا کہ ایک نام کا سہی مگر تھا تو مسلمان اس کی خلوت کا ساتھی مگر مصیبت کے وقت تو بڑے دہریے قسم کے لوگوں کو خدا... بھگوان یاد آ جاتا ہے۔

سلیم شاہ بولا۔ "آشا کی حفاظت کی غرض سے سندر کپور ہمارے قریب رہے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ ایک گارڈ کو فارغ کر کے سندر کپور کے لیے جگہ بنا دوں۔"

رانی متفکر ہوگئی۔ آشا کی آنکھوں میں اس نے سندر کپور کے لیے پسندیدگی کی چمک دیکھی تھی۔ قربت اس پسندیدگی کو بڑھاوا دے سکتی تھی۔ آشا ابھی نادان تھی۔ کیریئر کے آغاز میں کوئی نادانی اسے بہت پیچھے لے جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ میڈیا کے تمام ذرائع کے لیے بھی وہ "ہاٹ کیک" تھی جو ہر پل اس کی تاک میں رہتے تھے۔

یہ سب خدشات اپنی جگہ مگر آشا کی حفاظت سب خدشات پر بھاری تھی۔ اس کے لیے وہ کسی حد تک بھی جانے کو تیار تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر گویا ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ "جو مرضی کرو مگر میری بیٹی پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اس کی حفاظت کی تمام تر ذمے داری تمہاری ہے۔"

"اور تمہاری ذمے داری؟" سلیم شاہ کا لہجہ شوخی آمیز ذو معنی تھا۔

رانی کے چہرے پر سرخی دوڑی۔ "بکواس نہ کرو۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔"

اگلے دن سندر کپور نے سلیم شاہ سے رابطہ کیا تو سلیم شاہ نے اسے ہوٹل ہی بلا لیا۔ مہمانوں کے لیے مخصوص ڈیلکس ڈرائنگ روم میں وہ تنہا تھے۔

گفتگو کا آغاز ہوتے ہی سلیم نے کہا۔ "آپ کے لیے میں نے آشا کے گارڈز کے درمیان جگہ بنائی ہے۔ گارڈ کے روپ میں آپ بہتر طور پر ہماری مدد کر سکیں گے۔ یہ آپ کے شایانِ شان تو نہیں ہے..."

سندر کپور نے اس کی بات کاٹی۔ "کیا بات کرتے ہیں شاہ صاحب! بلکہ مجھے اب آپ کو "سر" کہنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

"کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟"

"یہ ضروری ہے سر! آپ نے میرے لیے بہترین جگہ چوائس کی ہے۔ دیگر گارڈز کو بھی میری اصلیت کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔" لحاتی وقفے کے بعد سلیم نے دوبارہ کہا۔ "اب ذرا اس خطرے کی وضاحت بھی کر دیں جو آشا کے گرد منڈلا رہا ہے۔"

سندر کے چہرے پر بے حد سنجیدگی ابھر آئی، وہ بولا۔ "میں تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا مگر میری خواہش ہے کہ آپ پہلے بتائیں کہ کن خدشات کی بنیاد پر آپ نے آشا کا سیکیورٹی پلان تبدیل کیا اور سیکیورٹی اور سخت کر دی؟"

سلیم کے چہرے پر آمادگی نظر آئی۔ وہ بولا۔ "میں ٹھہرا ایک سابق فوجی... آپ اے کلاس ایجنٹ ہیں۔ آپ کی برتری میں تسلیم کرتا ہوں اور یقینی طور پر ہمیں لیڈ بھی آپ کریں گے اس لیے میں اپنے خدشات بتانے میں پہل کروں گا۔"

سندر مسکرایا۔ "کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کی خواہش ہو تو میں لیڈ کروں گا ورنہ آپ کے احکامات کی تعمیل کے لیے بھی میں دل و جان سے حاضر ہوں۔"

"لیڈ آپ کریں۔ میرے لیے تو آشا کی حفاظت ہی سب سے اہم ہے۔" یہ کہہ کر سلیم اصل موضوع کی طرف آیا۔ "دراصل پچھلے چند ماہ سے آشا کی چھٹی حس اسے احساس دلا رہی ہے کہ مقابلوں کے درمیان کوئی شخص اسے بُری نظر سے گھورتا ہے۔"

سندر نے گہری دلچسپی لی۔ "حیرت انگیز بات ہے مگر نسوانی چھٹی حس کے کرشموں سے بھی انکار نہیں ہے، خیر آگے چلیں۔"

"نگاہوں کی چبھن کو لے کر آشا خاصی ڈسٹرب ہے۔ اس کی کارکردگی بھی متاثر ہو رہی ہے..."

سندر نے بات کاٹی۔ "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ محض کسی کے گھورنے کو لے کر آپ کے حفاظتی اقدامات میں غیر معمولی اضافہ و تبدیلی کچھ زیادہ ہی..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا۔

"گھورنے والے کی مستقل مزاجی پریشان کن ہے۔" سلیم ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔ "وہ کئی ممالک میں آشا کے تعاقب میں آ چکا ہے۔ یقیناً وہ باوسائل بھی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ گھورنے سے "آگے" بڑھنے کی کوشش کرے اس لیے یہ پیش بندی ضروری تھی۔"

سندر نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ "آپ چاہیں تو "را" آپ کی خدمات سے مستقل مستفید ہونا چاہے گی۔"

سلیم کے چہرے پر فخر آمیز مسرت سرخی بن کر چمکی۔ "نہیں کپور صاحب! اب ہڈیوں میں اتنا دم نہیں رہا۔ میں ٹھیک ہوں یہاں۔"

"او کے مگر آپ کو بھی اب مجھے سندر کہہ کر بلانے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔"

دونوں بیک وقت ہنس دیے۔

"گھورنے والے کا کوئی کلیو بھی ملا؟" سندر واپس ڈھب پر آیا۔

"فی الحال تو کوئی نہیں مگر کچھ امید بندھی ضرور ہے۔"

سندر کی دلچسپی بڑھی۔ "بتائیں گے کچھ؟"

"انڈیا سے دبئی آتے ہوئے، دبئی ائرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ سے شاپنگ کرتے ہوئے آشا کو ان "خاص" نگاہوں کی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ وہاں سیکیورٹی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ میں نے وہ ریکارڈنگ منگوائی ہے۔" سانس لینے کے لمحاتی وقفے کے بعد اس نے مزید کہا۔ "کچھ دن پہلے اولمپک کے مقابلے دیکھنے کے لیے آنے والے تماشائی بھی سیکیورٹی کیمروں کی زد میں تھے۔ وہ ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے۔ دونوں کا ریکارڈ ملتے ہی دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخص دونوں جگہ موجود ہے تو ممکنہ طور پر آشا کو گھورنے والا وہی ہو سکتا ہے۔"

"بالکل درست سمت میں جا رہے ہیں آپ۔" سندر نے تعریفی انداز میں کہا۔ "گھورنے والے کا کلیو ضرور مل جائے گا۔"

ساری تفصیل بتانے کے بعد سلیم کی سوالیہ نظریں سندر پر آ جمیں۔ "اب آپ کی باری جناب! را نے کس خطرے کی بُو سونگھی ہے؟"

"وہ خطرہ بھی "گھورنے" والے سے ملتا جلتا ہی ہے۔ ایک مبہم سی رپورٹ آئی ہے کہ ایک بے حد خطرناک شخصیت آشا کے پیچھے ہے اور اسے اغوا کرنا چاہتی ہے۔"

سلیم کے چہرے پر گہری سنجیدگی اتر آئی۔ "یہ رپورٹ کچھ زیادہ ہی مبہم نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے اس شخصیت کے بارے میں کوئی تفصیل وغیرہ... کون ہے وہ؟"

سندر کے تاثرات بھی تبدیل ہوئے۔ "معاف کیجیے گا... اس بارے میں مجھے بھی فی الحال کچھ نہیں بتایا گیا۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو اعتماد میں لے کر آشا کے قریب رہوں اور اس کا تحفظ کروں۔ میری مدد کے لیے را ہمہ وقت متحرک و تیار ہے۔" اس کے لہجے میں ایک مضبوط و عیار سیکیورٹی ایجنسی کا دیا ہوا غرور پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

سلیم نے فوراً سے پہلے ہتھیار ڈالے۔ "میں نے تو محض ایک نکتے کی وضاحت چاہی تھی... ممکن ہے آشا کو گھورنے والا اور آپ کی طرف سے نشان زدہ ہونے والی شخصیت ایک ہی ہو۔"

"بالکل ممکن ہے... مجھے یقین ہے کہ ہم مل جل کر اس خطرے کا سدباب کر سکیں گے... ہمارے لوگ کام کر رہے ہیں، جیسے ہی اس خطرناک شخصیت کا "خاکہ" واضح ہوا، اس کے کسی منفی اقدام سے پہلے ہم اس کی گردن جا دبوچیں گے۔"

"بالکل..." سلیم نے بھی مضبوط عزم کا مظاہرہ کیا۔

سندر نے کھڑے ہو کر سیلیوٹ کیا۔ "میں ابھی سے جوائن کر رہا ہوں سر!"

ٹھیک ایک گھنٹے بعد آشا ہوٹل کے جمنازیم کے لیے روانہ ہوئی تو سندر گارڈ کی مخصوص وردی میں اس کے ساتھ تھا۔ اسے گارڈ کی وردی میں اپنے قریب دیکھ کر آشا کو خوشگوار حیرت ہوئی مگر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ یہ یقیناً اس کی حفاظت کے لیے کیا جانے والا نیا اقدام تھا... یہ معاملہ اس کی ماں اور سلیم کا تھا۔ جو وہ بہتر سمجھتے کرتے۔ اس کی تو تمام تر توجہ سوئمنگ پر تھی مگر "قابلِ توجہ" کوئی اور بھی اس کے قریب آ موجود ہوا تھا۔

آشا نے دو، تین دفعہ اپنی ماں کی کڑی نظروں سے بچتے ہوئے لگاوٹ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کے پندارِ حسن کو سخت ٹھیس پہنچی... اس نے ایک دفعہ بھی آشا پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ آشا اپنی جگہ سلگ کر رہ گئی۔ اس نے بھی سندر کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

کھلاڑی اپنا جال تیزی سے پھیلا رہا تھا۔ ٹھیک دس دن بعد اسے خون کی پیاس محسوس ہوتی تھی اور ساتھ ہی نفسانی خواہش بھی۔ اگلے دو سے تین دنوں میں دونوں شیطانی ضرورتیں شدید تر ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنا شکار انہی خاص دو، تین دنوں میں کرتا تھا۔ ابھی اگلے شکار میں کئی دن پڑے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اس دفعہ وہ اپنی ''پیاس'' آشا پڈعیون کے کندنی اور خون سے لبالب بھرے وجود سے مٹا سکے گا۔

وہ اس وقت آشا کے ہوٹل کے قریب ہی ایک نیٹ کیفے میں موجود تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کئی ملکوں کی پولیس کے علاوہ اس کے اپنے ''دوست'' بھی اس کے تعاقب میں ہیں۔

دبئی پولیس کی ویب سائٹ کی خاص معلومات تک پہنچنے میں اسے خاص دشواری نہیں ہوئی۔ یہ آریان کے قتل کی تفتیشی رپورٹ تھی۔ وہ توجہ سے دیکھنے لگا۔

دبئی پولیس کے ''آریان قتل کیس'' کے تفتیشی آفیسر نے خاصی سرگرمی دکھائی تھی۔ اس نے بوٹ سے قاتل کے متعدد فنگر پرنٹس حاصل کیے تھے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کو ڈھونڈ نکالا تھا جس نے بندرگاہ سے کھلاڑی کو پک کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس شخص نے آریان کی پرانی تصاویر اخبارات وغیرہ میں دیکھ کر خود پولیس سے رابطہ کیا تھا جس سے کھلاڑی نے آریان کو چھینا تھا۔ اس شخص اور اس کے ڈرائیور کی مدد سے پولیس آفیسر نے ممکنہ قاتل کا کمپیوٹرائزڈ خاکہ تیار کیا تھا... یہ خاکہ بھی رپورٹ میں موجود تھا۔

کھلاڑی کو فنگر پرنٹس کی فکر نہیں تھی۔ وہ جعلی تھے۔ اسے قدرے فکر خاکے کی ہو رہی تھی۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔ کھلاڑی کو یقین تھا کہ وہ شخص اور اس کا ڈرائیور اس کے قریب تر شبہات تک نہیں پہنچ پائے ہوں گے۔

خاکہ دیکھ کر اس کی معمولی سی فکر بھی دور ہو گئی۔ اس شخص نے اپنا سارا غصہ اس کے نقوش بنوانے میں اتار دیا تھا۔ یہ ایک وحشت زدہ جنونی قاتل کا چہرہ تھا۔ سرخ پھٹی ہوئی آنکھیں... بکھرے بکھرے بال... کمی تھی تو صرف دانتوں سے ٹپکتے خون کی۔

آخر میں تفتیشی آفیسر نے اپنے افسران کو یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد ''جنونی قاتل'' تک پہنچ جائے گا۔

کھلاڑی دل ہی دل میں ہنسا۔ اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اب آشا پر مبذول تھی۔ اس کے متعلق وہ ایک پلان کو حتمی شکل دے چکا تھا مگر اب اسے ایک نئے پلان کی ضرورت تھی۔

کھلاڑی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے نیٹ کیفے میں آئے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اسے جلدی واپس جانا تھا۔

☆☆☆

دونوں ریکارڈنگز سلیم شاہ کو مل چکی تھیں۔ سندر کسی کام سے باہر گیا تھا۔ اس نے اکیلے ہی ریکارڈنگز دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ڈیوٹی فری شاپ والی ڈی وی ڈی اس نے ابھی آن ہی کی تھی کہ رانی آ گئی۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

تھوڑی سی کوشش سے سلیم اس حصے تک پہنچ گیا، جب آشا وہاں شاپنگ کر رہی تھی۔ دو فریم میں آشا اور رانی خاصی نمایاں تھیں۔ اچانک ہی رانی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ چلائی۔ ''روکو اسے۔''

سلیم نے فوراً اسٹل والا بٹن دبا دیا۔ اسکرین پر ایک لمبے چوڑے نوجوان کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس نے لمبے سنہری بال ایک ربن سے باندھ رکھے تھے۔ اس کے بالکل قریب ایک اور سرخ و سفید نوجوان نظر آ رہا تھا جو ریک سے کچھ اٹھا رہا تھا۔

رانی کی نظریں اسی سرخ و سفید نوجوان پر تھیں۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے شک ہو رہا ہے کہ یہ سبز آنکھوں والا نوجوان یوسف ہے۔''

''کون یوسف؟'' سلیم نے اچنبھے سے پوچھا۔

رانی کا دھیان کہیں اور تھا۔ سلیم کا سوال جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ ''کسی اور فریم میں دیکھو جس میں یہ زیادہ نمایاں ہو۔''

سلیم کی انگلیاں پھر ریموٹ سے کھیلنے لگیں۔ رانی کا ہراس زدہ چہرہ اسے پریشان کر رہا تھا۔ جلد ہی اسے کامیابی مل گئی۔ ڈیوٹی فری شاپ کے مرکزی دروازے کے اوپر نصب کیمرے نے اس نوجوان کا بے حد واضح شارٹ لیا تھا۔

اس واضح فریم میں نوجوان کو دیکھ کر سلیم کو بھی جھٹکا لگا۔ نوجوان اس کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ ممبئی کی انڈر ورلڈ کے ایک ''بھائی'' کا دستِ راست۔ اس کے کریڈٹ پر کالج گرلز سے بھری ایک وین کا اغوا بھی تھا جن میں سے چار لڑکیاں اس نے ''چھانٹ'' لی تھیں۔ ان چاروں کا آج تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

مشہور تھا کہ اگر کسی نوخیز و شاداب لڑکی پر اس کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ مرجھا کر رہ جاتی ہے۔

بہت کم لوگ اس بات سے آگاہ تھے کہ یوسف درحقیقت ''را'' کے لیے کام کرتا ہے۔

''تم جانتی ہو اسے؟''

رانی نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ ہمارے پرانے ڈرائیور زاہد کا بیٹا ہے۔''

''اوہ...'' سلیم شاہ کے منہ سے بے ساختہ تحیر زدہ آواز نکلی۔

''اس کے لچھن شروع سے ہی اچھے نہیں تھے۔ صفائی کرنے والی کے ساتھ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا، اس کی ایک دو اور منفی رپورٹس بھی تھیں۔ زاہد پرانا اور بے حد وفادار ملازم تھا۔ وہ خود بھی بیٹے کے ہاتھوں عاجز تھا۔ بہرحال میں نے زاہد کو اس کے بیٹے کے حوالے سے آخری وارننگ دے دی۔''

رانی ہراس زدہ چہرے کے ساتھ بیتے دن سنا رہی تھی۔ سلیم ہونٹ بھینچے سن رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔

''پھر ایک دن میری برداشت کی حد آ گئی۔ آشا تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ وہ ایک دن سوئمنگ پول میں تھی کہ میں نے یوسف کو چھپ کر اسے گھورتے دیکھا۔

''میں نے اسی وقت زاہد کو بیٹے سمیت اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔ باپ سے پہلے بیٹا گھر سے نکل گیا اور اب تو بہت ''دور'' نکل گیا ہے۔ زاہد بے چارہ بیٹے کے غم میں گھل گھل کر ختم ہو گیا۔ سلیم! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ بھیڑیا میری بیٹی کے پیچھے ہے۔'' رانی کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو چھلک پڑے۔

سلیم نے گہرا سانس لیا۔ ''اتنی جلدی نتیجہ اخذ مت کرو۔'' اس نے اٹھ کر ڈی وی ڈی تبدیل کر دی اور رانی کے قریب جا بیٹھا۔ رانی نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

سلیم نے اسے تھپکا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر مرض کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوتا ہے۔'' اس کا دوسرا ہاتھ ریموٹ پر متحرک تھا۔ بڑے سے ایل سی ڈی ٹی وی پر باری باری تماشائی ایک سرنگ نما راستے سے گزر کر اپنے لیے مخصوص اسٹینڈز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رانی آنسو پونچھ کر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جلد ہی ان کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ یوسف سرنگ نما راستے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا مضبوط اور توانا جسم فٹنگ والی جینز اور ٹی شرٹ میں بے حد نمایاں تھا۔ بے شک وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ اس کے ساتھ دبئی انڈر ورلڈ کا ایک اور نمایاں چہرہ بھی نظر آ رہا تھا... ارجن سنگھ

گھر۔ اُداس۔ ویران

جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اُداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے اِن شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کِھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوا لیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزما لیں اور خدارا اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنا لیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0301-6690383

0300-6526061

فون اوقات

صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

جس کی زبان بعد میں اور انگلی پہلے چلتی تھی۔

سلیم نے ٹی وی آف کردیا۔ رانی نے دوبارہ سے رونا شروع کردیا تھا۔

سلیم کے دماغ میں کھلبلی سی مچی تھی۔ اب اسے سمجھ آرہا تھا کہ سندر نے آشا کے لیے خطرناک ثابت ہونے والی شخصیت سے پردہ کیوں نہیں اٹھایا تھا۔

یوسف را کے لیے کام کرتا تھا۔ یقیناً آشا کی طرف وہ اپنی ذاتی حیثیت میں متوجہ ہوا تھا۔ ممکن ہے گھر سے نکالنے والی بے عزتی کا بدلہ اس کی وجہ ہو۔ دوسری طرف را میں کسی کلیدی عہدے پر بیٹھا آشا کا کوئی پرستار قسم کا ہمدرد نہیں چاہتا تھا کہ یوسف اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ اس کے ساتھ اپنے ایجنٹ کی بھی انہیں فکر تھی۔ غالباً اسی وجہ سے سندر کپور آدھمکا تھا کہ کوئی درمیانی صورت نکالی جاسکے۔

سلیم کچھ اور سوچنے لگ گیا۔ را والے کسی صورت نہیں چاہیں گے کہ ان کا ایک خاص ایجنٹ ضائع ہوجائے اس لیے اس نے یہ بات سندر سے پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا کہ وہ جان گیا ہے کہ وہ شخصیت کون ہے جو آشا کے درپے ہے۔

را کے منصوبے کے متوازی اس نے اپنا منصوبہ تکمیل دینا شروع کردیا۔ ایک خاص فیصلے پر پہنچ کر اس نے رانی سے کہا۔ ”بے بی کو یوسف کے خونی پنجوں سے بچانے کے لیے تم کم از کم پانچ ملین ڈالرز خرچ کرسکتی ہو؟“

اس کے لہجے نے رانی کو چونکا دیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ پل بھر میں اس نے اپنے بینک اکاؤنٹس کو کھنگالتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بچی بات ہو تو پانچ ملین سے زیادہ بھی۔“

سلیم نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور اپنے موبائل سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ دوسری طرف سے آواز پہچانتے ہی اس نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک کام ہے چارلی۔“

”تم کام کے بغیر کال کرتے ہی نہیں ہو۔“ چارلی نے شکوہ کیا۔

سلیم نے دھیمی سی ہنسی میں اس کا شکوہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”یوسف کو تو جانتے ہی ہونا؟“

”اسے کون نہیں جانتا۔ آج کل دبئی میں ہے۔“

”اسے ”سلام“ بولنا ہے۔“ سلیم کے انداز میں سفاکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس نے درست بندے کا انتخاب کیا ہے۔

”پاگل ہوگئے ہو شاہ؟“ چارلی چونکا۔ ”کون ہائر کرنا چاہتا ہے مجھے؟ تم جانتے ہو وہ کس ”بلا“ کے لیے کام کر ہے؟“

”تمہیں ہائر کرنے والا میں خود ہوں اور ہمارے پا اس ”بلا“ سے بچنے کا بہترین راستہ بھی ہے۔ ہماری اس کوئی عداوت نہیں ہے۔ اس کے درجنوں دشمن چارلی... ہم چپکے سے اپنا کام کرجائیں گے۔“

”تمہیں مطمئن کرنا ہوگا شاہ... مجھے۔ تم جانتے میری کامیابی کا راز بھی ہاتھ، پاؤں بچا کر کام کرنا ہی ہے۔“

”او کے۔“ سلیم شاہ نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”د کی پہلی فلائٹ پکڑلو۔“

چارلی اگلے دن دبئی میں تھا۔ دو گھنٹے کی ملاقات می سلیم شاہ اسے مطمئن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

ساڑھے چھ ملین ڈالرز کی خطیر رقم چارلی کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوگئی۔

☆☆☆

”ڈیوٹی فری شاپ اور تماشائیوں والی ریکارڈنگ سے کوئی کلیو ملا؟ کوئی ایسا شخص جو دونوں جگہ موجود ہو؟“

سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ڈیوٹی فری شاپ وال ریکارڈنگ تو قطعی غیر معیاری ہے۔ خوامخواہ ہی وقت ضائع کر ہے۔“

سندر نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں ہوں نا اب۔ اس نے آشا کے گرد پھٹکنے کی کوشش بھی کی ت مارا جائے گا۔“

سلیم نے اس کے چہرے پر نظر جمائی۔ ”اس بندے کا کوئی واضح خاکہ ملا جو ہاتھ دھو کر ہماری بے بی کے پیچھے پڑ گیا ہے؟“

”ابھی تک تو نہیں مگر امید ہے دو، تین دنوں میں اس کے بارے میں معلوم ہوجائے گا۔“

سلیم نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اس کے سامنے ایک گھاگ ایجنٹ ہے۔ جھوٹ کا ذرا سا شائبہ بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا۔

سلیم اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے تو بے بی کو لے کر ساحل پر جانا ہے۔ وہاں سارے انتظامات مکمل ہیں۔ و کھلے سمندر میں پریکٹس کرے گی۔“

سندر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

آشا اپنے کمرے میں سے باہر نکلی تو سندر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ آشا نے اسے نظر انداز کردیا او آگے بڑھتے ہوئے بازو کو مخصوص انداز میں جھلایا تو اس کی کلائی میں کوئی چیز چمکی۔ سندر چونک پڑا۔ اس نے بغور جائزہ لیا۔ یہ وائٹ گولڈ سے بنا قیمتی بریسلیٹ تھا جس پر نایاب نیلے رنگ کے ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یہ آج ہی شیخ نائر کی اسسٹنٹ سیکریٹری خصوصی طور پر آشا کے لیے شیخ نائر کی جانب سے لائی تھی۔

آشا کو وہ بریسلیٹ بے حد پسند آیا تھا۔ جس مقابلے کی غرض سے وہ اب تک دبئی میں مقیم تھی اس میں محض دو دن رہ گئے تھے۔

تین گاڑیوں پر مشتمل قافلہ ساحل کی طرف روانہ ہوا۔ تینوں سیاہ رنگ کی ایک جیسی لینڈ روور ٹائپ گاڑیاں تھیں۔ تینوں ہی بلٹ پروف اور دستی بم جیسے حملے کو بھی جھیلنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

آشا کی گاڑی درمیان میں تھی۔ رانی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ ڈرائیور اور دو گارڈز بھی تھے۔ آنے والی گاڑی میں سلیم اور آخری گاڑی میں سندر تھا۔ تینوں گاڑیوں کا آپس میں رابطہ بھی تھا۔

ویران ساحلی سڑک پر پہنچتے ہی طے شدہ سیکیورٹی پلان کے تحت گاڑیوں کی رفتار 160 کلومیٹر تک بڑھادی گئی تھی۔ عقب میں دور صرف ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمک رہی تھیں۔ ساحل کے ایک ویران حصے میں دو جدید قسم کی چھوٹی تیز رفتار بوٹس اور دو انڈر واٹر کام کرنے والے ہتھیاروں سے مسلح غوطہ خور پہلے سے موجود تھے۔

آشا نے کپڑے تبدیل کیے تو گارڈز کی نظریں بے اختیار ہی اس کے کندنی وجود پر پھسلنے لگیں۔ آشا نے کن انکھیوں سے سندر کو دیکھا۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آشا کو اس پر خوامخواہ ہی غصہ آنے لگا۔

سلیم نے سیکیورٹی پلان کے تحت اچانک ہی پریکٹس کی منتخب جگہ تبدیل کردی۔ یہ قافلہ دوبارہ سے گاڑیوں میں لدا اور پانچ کلومیٹر آگے چلا گیا۔ سلیم کی نظریں عقب میں چمکتی لائٹس پر تھیں۔ پریکٹس سیشن تین گھنٹے سے زیادہ چلا۔ دونوں غوطہ خور زیرِ آب رہ کر آشا کے گرد رہے۔ اس کی برق رفتاری کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس پورٹیبل ”واٹر اسکوٹر“ تھے جن کی مدد سے وہ زیادہ تیزی سے تیر سکتے تھے۔

دونوں بوٹس پر سلیم شاہ اور سندر کپور دیگر گارڈز کے ساتھ اطراف سے چوکنا رہے۔ دونوں بوٹس نے آشا کو درمیان میں رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن پریکٹس سیشن کے لیے رات کا وقت منتخب کیا گیا تھا۔ آشا کا کہنا تھا کہ چاندنی راتوں کے سبب رات میں لہریں زیادہ بلند ہوتی ہیں۔ چونکہ مقابلہ بھی رات میں تھا اس لیے وہ رات کو پریکٹس کرے گی۔

ہوٹل میں انہیں سروس مہیا کرنے والے سارے ملازمین ایک اسسٹنٹ منیجر کے ساتھ آموجود ہوئے تھے۔ اس لیے سلیم شاہ نے خود ہوٹل میں رکنے کا فیصلہ کیا اور سندر کپور کو سیکیورٹی انچارج بنا کر رانی اور آشا کے ساتھ بھیج دیا۔ اسے کچھ حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔

پیراسٹامول کی دو گولیاں پھانک کر اور چائے کا کپ تھامتے ہوئے وہ مصروف ہوگیا۔ دو گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد اس نے مطمئن ہوکر ہوٹل ملازمین کو شارٹ لسٹ کردیا۔ آٹھ کے بجائے اب صرف پانچ ملازموں نے انہیں سروس فراہم کرنی تھی۔

ٹھیک اسی وقت بحیرۂ عرب کے گہرے پانیوں میں لنگر انداز ایک لگژری بوٹ زوردار دھماکے سے بکھر گئی۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ بوٹ کی ”بیم“ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

اس دھماکے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد سلیم کے موبائل فون کی مخصوص بیل بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو چارلی کا نمبر چمک رہا تھا۔ فوراً ہی سلیم کے چہرے پر ہیجانی چمک ابھری۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے چارلی کی بے تاثر اور پُرسکون آواز ابھری۔

”تمہارا کام ہوگیا شاہ“ اور ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

سلیم کے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک بے ہنگم سا نعرہ لگایا اور باقاعدہ اٹھ کر ناچنے لگا۔

اس نے اپنے جوش پر قابو پایا اور یہ خوش خبری رانی کو سنانے کے لیے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ متعدد کوششوں کے باوجود رانی نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ بوٹس کے شور کی وجہ سے رانی موبائل کی رنگ ٹون سن نہیں پارہی ہوگی۔

اس نے سندر کا نمبر ملایا۔ اس کا نمبر بند جارہا تھا۔ اب سلیم کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اسی وقت اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پر رانی کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ کر اس کا اطمینان لوٹ آیا۔ کال ریسیو کرتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ تم لوگ کب واپس پہنچ رہے ہو؟“

رانی کی بے حد گھبرائی ہوئی ہسٹریا زدہ آواز نے اس

کی بات کاٹی۔ ”وہ... وہ... سندر نے سب کو مار ڈالا ہے۔ وہ، میری بچی کو ساتھ لے گیا ہے... میں کبھی معاف نہیں کروں گی تمہیں سلیم!“ وہ چلّا چلّا کر رونے لگی۔

سلیم کو لگا جیسے زمین و آسمان نے اپنی جگہ بدل لی ہے۔ موبائل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے ایک ہاتھ سے صوفے کو تھاما۔

کچھ دیر بعد اس کی گاڑی برق رفتاری سے ساحل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ گاڑی کسی چیز کے ساتھ ٹکرا دے۔ سندر یا جو بھی اس کا نام تھا اس نے اسے شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا۔

سلیم کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ سندر کپور... کون تھا یہ سندر کپور؟

حالات و واقعات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے، آشا کو گھورنے والا شخص سندر ہی تھا۔ وہی کئی ماہ سے اس کے تعاقب میں تھا۔

یوسف تو مفت میں مارا گیا تھا۔ محض اس اتفاق کی وجہ سے کہ وہ بھی اسی ڈیوٹی فری شاپ پر موجود تھا جہاں سے آشا نے خریداری کی تھی۔ پھر فرشتۂ اجل اسے گھیر کر اولمپک کے تیراکی کے مقابلے دیکھنے لے گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے دل میں آشا کے متعلق منفی جذبات ہوں۔ سلیم نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اس کا پالا ایک برتر صلاحیتوں کے مالک شخص سے پڑا ہے۔ کئی مہینوں کی ریکی سے اس نے دیکھ لیا تھا کہ آشا کی سیکیورٹی فول پروف ہے۔ وہ بھرپور معلومات اور متاثر کن انداز میں را کا ایجنٹ بن کر ان کے قریب آیا اور بڑی آسانی سے ان کی صفوں میں کلیدی پوزیشن سنبھال لی اور آج اپنا مقصد بڑی کامیابی سے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ سوچ کر سلیم کا دماغ پھٹنے والا ہو گیا کہ سندر نے را کا خصوصی شناختی کارڈ کہاں سے حاصل کر لیا؟ اور یہ بات اسے کیسے معلوم ہوئی کہ وہ ڈیپوٹیشن پر را میں کام کر چکا ہے؟

سلیم کی نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ کارڈ سو فیصد اصلی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آنکھیں بند کر کے سندر کپور پر اعتماد کر لیا تھا۔

☆☆☆

آشا کے لیے وہ سب کسی ڈراؤنے خواب جیسا تھا۔ سندر ان کے ساتھ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ آشا اور رانی عقبی سیٹ پر تھیں۔

سندر نے پہلے آگے اور پیچھے والی گاڑی کو درمیانی فاصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ساحلی شاہراہ بالکل ویران تھی۔

فاصلہ بڑھتے ہی سندر نے جیب میں سے ایک ریموٹ نکال کر بیک وقت دو بٹن پش کیے۔ کسی کو کچھ سوچنے، سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آگے، پیچھے دوڑتی گاڑیاں خوفناک دھماکوں سے آگ کے گولوں میں تقسیم ہو گئیں۔

سندر نے ہینڈ بریک دبایا تو سیٹ بیلٹ نہ لگانے کی وجہ سے رانی اگلی سیٹوں سے جا ٹکرائی۔ جسم پر سیٹ بیلٹ کے دباؤ کی وجہ سے آشا کی سسکاری نکل گئی تھی۔

سیٹ بیلٹ میں جکڑے ڈرائیور نے اپنا پسٹل بڑی تیزی سے نکالا مگر سندر تو گویا کسی عفریت کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کی کھڑی ہتھیلی کے ایک ہی وار نے ڈرائیور کی گردن توڑ دی۔

سندر جیسے برق کی طرح تڑپ کر گاڑی سے اترا۔ آشا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور زوردار ٹکر کے سبب وہ ہوش و حواس سے بیگانی نظر آ رہی تھی۔

آشا نے اسے جھنجوڑا۔ اسی وقت سندر عقبی دروازہ کھول کر اندر گھس آیا۔ اس کا خوبرو چہرہ کسی خون آشام درندے کے چہرے میں بدل گیا تھا۔ آشا کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کی کلائی پر ہاتھ جماتے ہوئے سندر نے دوسری سمت کا دروازہ کھولا اور اس کی ماں کو بیدردی سے باہر دھکیلا۔ آشا کو محسوس ہوا جیسے اس کی کلائی کسی آہنی شکنجے میں آ گئی ہے۔ اس نے اپنے دانت سندر کی بالوں بھری کلائی میں گاڑ دیے۔

سندر کے حلق سے نفرت آمیز سسکاری نکلی۔ ”تسلی سے میری جان!“ اس کے لہجے میں جیسے کوئی درندہ چنگھاڑا تھا۔ ”تمہارے پاس کاٹنے، مارنے اور چیخنے چلّانے کے لیے خاصے مواقع ہوں گے۔“ یہ کہتے ہی اس نے آشا کی کلائی سے شیخ نائر کا دیا ہوا بریسلیٹ اتار پھینکا۔ کلائی میں گڑے آشا کے دانتوں کی اسے مطلق پروا نہیں تھی۔

آشا کو محسوس ہوا جیسے تکلیف جیسے احساسات سے وہ شخص عاری ہے۔ اس نے کلائی چھوڑ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے سندر کا بازو کسی اژدہے کی طرح اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ آشا کی آنکھوں کے آگے تاریکی پھیلنے لگی۔ اس نے ہاتھ پیر مارے تو سندر نے اس کی گردن مخصوص جگہ سے مسل دی۔ اس کا ذہن تیزی سے تاریکی میں

ڈوب گیا۔

☆☆☆

دوسری طرف سریش سنگھ، شرما اور دبئی میں را کا ڈیسک انچارج ونود سر پکڑے بیٹھے تھے۔ کھلاڑی کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہوں نے آشا کو ”نگاہوں سے اوجھل“ دائرے میں لیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کھلاڑی، سندر کپور کے روپ میں آشا کے بے حد قریب پہنچ چکا ہے۔ چار ایجنٹ، آشا کو کور دے رہے تھے۔ سب سے اہم چیز وہ بریسلیٹ تھا جو ونود نے شیخ نائر کے ذریعے آشا کی کلائی تک پہنچا دیا تھا۔ اس بریسلیٹ میں نصب چپ، سیٹلائٹ سے منسلک تھی۔ اس کے ذریعے بڑی آسانی سے آشا کی لوکیشن کا پتا چلایا جا سکتا تھا۔

قریب ہونے کے سبب کھلاڑی نے اس بریسلیٹ کو پہچان لیا تھا۔ را ایسے زیور استعمال کرتی رہتی تھی۔

کھلاڑی نے طے شدہ منصوبے کے مطابق کوئی گاڑی پہلے سے ساحلی شاہراہ کے ساتھ ساتھ موجود ریت کے ٹیلوں میں چھپا رکھی تھی۔

آشا کے گارڈز اور را والوں سے نمٹ کر اس نے آشا کو دوسری گاڑی میں منتقل کیا اور گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔

ادھر رانی بھی اسپتال میں تھی۔ اسے کوئی شدید چوٹ تو نہیں آئی تھی مگر شدید صدمے کے زیرِ اثر وہ آئی سی یو میں تھی۔

سلیم پاگلوں کی طرح مقامی پولیس کے ساتھ ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا۔ اس نے دہلی میں را کے ہیڈ کوارٹر فون کیا تھا۔ سندر کپور کا کوڈ A-63 اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ وہاں سے اسے شرما کا رابطہ نمبر دیا گیا۔ اس نے شرما سے بات کی تھی اور کچھ ہی دیر میں دونوں کی ملاقات ہونے والی تھی۔

☆☆☆

آشا کی آنکھ دوبارہ کھلی تو اس نے خود کو ایک کشادہ... بیڈ روم میں بستر پر دراز پایا۔

گزرا وقت کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اسے یاد تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے یقین نہیں آیا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے اور اغوا کرنے والا وہ شخص ہے جسے دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ اس کے دل کی دھڑکنوں کا آہنگ تبدیل ہوا تھا۔

آشا خاصے مضبوط دل و دماغ کی لڑکی تھی۔ آشا نے حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ شخص اس کی عزت کے درپے ہوتا تو اس نے آخری دم تک مزاحمت کا بھی سوچ لیا۔ وہ خاصی مضبوط لڑکی تھی۔ سوئمنگ کی طویل مشقوں کے سبب اس کا اسٹیمنا قابلِ رشک تھا۔

اسے خود سے زیادہ ماں کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ زخمی تو نہیں ہوئی تھی مگر آشا جانتی تھی کہ اس نے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیا ہو گا۔

آشا نے اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں بیڈ اور کارپٹ کے علاوہ کسی اور چیز کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اسے قدرے مایوسی ہوئی۔ اسے کسی تیز دھار چیز کی تلاش تھی جسے وہ حفاظت کی غرض سے اپنے پاس رکھ سکتی۔

باتھ روم میں بھی ایسا کچھ نہیں تھا۔ پھر بلیچ کی بوتل دیکھ کر اسے ایک اچھوتا خیال آیا۔ اس نے جلدی جلدی ایک ڈبے میں بلیچ اور پانی کا محلول تیار کیا اور کمرے میں لا کر بیڈ کے نیچے رکھ دیا۔ پھر بیڈ پر لیٹ کر ہاتھ جھکا کر دیکھا۔ تھوڑی سی کوشش سے اس کا ہاتھ ڈبے تک پہنچ گیا تھا۔

اس نے دروازے کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط لکڑی سے بنا تھا اور باہر سے لاک تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی کا اس نے پردہ ہٹایا تو چونک گئی۔ بیچ میں سمندر کا نیلگوں پانی اور اس کے پار دبئی کی پُرشکوہ عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اغواکار اسے ”پام سٹی“ میں لے آیا تھا۔ وہ کسی عمارت کی چوتھی یا پانچویں منزل پر تھی۔

کھڑکی کے شیشوں کے دوسری طرف لوہے کی مضبوط گرل بھی نظر آ رہی تھی۔

عقب میں آہٹ سی ابھری تو وہ تیزی سے پلٹی۔ اس کے سامنے سندر کپور تو نہیں تھا۔ سیاہ چمکیلے بال سنہری مائل ہو چکے تھے۔ سیاہ آنکھیں جیسے سبز رنگ کے پتھر میں تبدیل ہو چکی تھیں اور قدرے پھیلی ناک کسی عقاب کی چونچ جیسی باریک ہو چکی تھی۔ پھولے گال بھی غائب تھے اور جبڑوں کی ابھری ہڈیوں نے اسے سخت سا روپ دے دیا تھا۔

سبز پتھر جیسی آنکھیں آشا پر جمی ہوئی تھیں۔ آشا کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ساری خود اعتمادی ہوا ہوتی محسوس ہوئی۔ ”کک... کون ہو تم؟“

مدمقابل کے خنجر کی نوک جیسے باریک ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔ ”بھول گئیں سندر کپور کو جسے تم بڑی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھیں۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں سندر کپور پر... غالباً تم نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔“

”نہیں... حلیہ پہلے بدلا ہوا تھا۔“ اس نے آشا کی طرف قدم بڑھائے۔

”دور رہو مجھ سے۔“ آشا ہراساں ہوئی۔ ”نہیں تو

میں شور مچادوں گی۔"

کھلاڑی ہنسا۔ "شوق سے۔ یہ پوری عمارت ویران پڑی ہے... بلکہ اردگرد کی عمارتیں بھی ابھی اپنے مکینوں کے انتظار میں ہیں۔" اس کی پیش قدمی جاری رہی۔

آشا پیچھے ہٹی تو بیڈ سے ٹکرا کر بیڈ پر گر گئی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ کھلاڑی نے اس کے گرد کہنیاں ٹکاتے ہوئے جسم اس سے دور رکھا۔ آشا اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ وہ بے حد قریب تھا اس سے۔ اس کے وجود کی حیوانی مہک صاف محسوس ہو رہی تھی۔

کھلاڑی اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ اس کی سبز پتھریلی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ "کتنا تڑپا ہوں تمہارے اس سندر شریر میں دوڑتے سرخ خون کے لیے۔" اس نے کسی درندے کی طرح زبان نکالی اور آشا کے گال کو چاٹ لیا۔ اس کے انداز میں صرف اور صرف حیوانیت تھی۔ آشا کو جیسے ننگے تار نے چھولیا تھا۔ وہ اچھلی تو درمیانی فاصلہ ختم ہو گیا۔ کھلاڑی نے اسے ننھی سی چڑیا کی طرح دبوچ لیا۔

آشا چلائی، بھرپور مزاحمت کی۔ وہ خاصی جاندار لڑکی تھی مگر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم کسی چٹانی وجود کے نیچے دبا ہو۔ اس کی کلائیاں کھلاڑی کی گرفت میں تھیں۔ وہ کسی درندے کی طرح اپنی ہوس کو مٹا رہا تھا۔ اس کی مختصر سی ٹی شرٹ کھلاڑی کی وحشت کو چند سیکنڈ بھی نہیں سہار سکی تھی۔

کھلاڑی پوری طرح اس کے جسم پر حاوی تھا۔ آشا مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ نچلا جسم کھلاڑی کے چٹانی وجود کے نیچے دبا تھا۔ کلائیاں اس کی فولادی گرفت میں تھیں۔ وہ چلانے اور تڑپنے کے علاوہ کچھ کر نہیں پا رہی تھی۔

اچانک ہی وہ درندے سے انسان کی جون میں لوٹنے لگا۔ ایک جھٹکے سے وہ آشا سے علیحدہ ہو گیا۔ "میری جان! ایک مجبوری ہے۔ مجھے جانا ہے۔ رات میں خوب کھیلیں گے اور پیار کریں گے۔"

آشا نے بُری طرح سے روتے ہوئے تکیہ اپنے عریاں سینے پر رکھ لیا۔

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ پلٹا۔ "ہاں، شور مچانے کا شوق جتنا چاہو، پورا کر سکتی ہو۔ کھڑکی میں لگا شیشہ بھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اس لیے بہتر ہے اپنی توانائیاں رات کے لیے بچا رکھو۔"

آشا کے رونے کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اس کی سبز آنکھوں کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ آنکھیں کسی انسان کی آنکھیں نہیں ہیں۔

آنے والی رات اس کے لیے بے حد بھاری ثابت ہونے والی تھی۔

☆☆☆

شرما نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔ "ہم سے صرف ایک دن کی تاخیر ہوئی ورنہ جیسے ہی وہ شیخ نائر کے عشائیے میں تمہارے قریب آیا تھا، ہمارے ایجنٹوں کی نظر میں آ جاتا۔"

"مگر وہ ہے کون؟ اس کے پاس را کا اصلی آفیشل کارڈ کہاں سے آیا؟ اور را کی خفیہ معلومات تک اس کی رسائی کیسے ہو گئی؟" سلیم کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ محض چند گھنٹوں میں ایک پُراعتماد سیکیورٹی آفیسر سے وہ پریشان حال شخص میں ڈھل گیا تھا۔

شرما نے قدرے سرد انداز میں کہا۔ "یہ تو اس کے ہاتھ آنے پر ہی پتا چل سکے گا۔ ممکن ہے آپ کی نظروں نے دھوکا کھایا ہو۔ کارڈ جعلی ہی ہو گا۔"

سلیم نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "اوکے، یہ سب بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تو بے بی کے لیے کچھ کریں۔ وہ جنونی نہ جانے اس کے ساتھ کیا کر گزرے۔" بدترین اندیشے اس کی آواز میں لرز رہے تھے۔

شرما کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ "اسی کے لیے تو ہم سب اکٹھے ہوئے ہیں۔"

ونود نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آشا، محترم شیخ نائر کی مہمان تھی۔ ساری دبئی پولیس حرکت میں ہے۔ ہم پولیس پروگریس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی تک انہیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔"

شرما نے یاد آنے پر کہا۔ "شاہ صاحب! ذرا وہ سی سی ٹی وی فوٹیج تو منگوائیں جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ جو ایک شخصیت دونوں فوٹیج میں آپ کو نظر نہیں آئی، ممکن ہے ہمیں بھی آ جائے۔"

سلیم شاہ کے چہرے کا رنگ ایک لحظے کے لیے بدلا مگر اس نے بڑی تیزی سے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ سب دونوں ریکارڈنگز دیکھ رہے تھے۔

اچانک ہی سریش چونکا۔ اس نے ڈیوٹی فری شاپ پر موجود ایک سنہری بالوں والے لمبے، چوڑے نوجوان کی طرف شرما کی توجہ مرکوز کرائی۔ "ذرا اسے دیکھیں سر!"

سلیم نے ویڈیو فوراً اسٹل کر دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس نوجوان کی چار مختلف فوٹیج کے پرنٹ نکال چکے تھے۔

را کی ٹیم کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔

دوسری فوٹیج میں بھی اس سے ملتا جلتا نوجوان موجود تھا۔

شرما کی تیز چبھتی ہوئی نظریں سلیم کے چہرے پر آ جمی تھیں۔ "آپ نے شاید فوٹیج پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ نوجوان دونوں جگہ موجود ہے۔"

سلیم نے قدرے دھندلی تصویروں پر نظر ڈالی۔ "آپ کا کہنا درست ہے مگر یہ تو سندر یا جو بھی اس خطرناک شخص کا نام ہے، اس سے خاصا مختلف ہے۔"

شرما بولا۔ "ہماری فائلوں میں اس شخص کو "ہزار چہروں والا" کہا گیا ہے۔ اس کی شکل پر نہ جائیں۔ آپ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو چکی ہے۔"

سلیم اب کیا بتاتا کہ یوسف کے دونوں جگہ نظر آتے ہی کسی اور طرف اس کا دھیان ہی نہیں جا سکا تھا۔ اس نے سر جھکا کر گویا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

ونود کی نظریں نکالے ہوئے پرنٹس پر تھیں۔ سریش بھی اس کے قریب ہی تھا۔ ایک پرنٹ میں سنہری بالوں والا نوجوان اشتہارات کے بورڈ کے پاس کھڑا تھا اور وہاں سے کچھ دیکھ کر وہ اپنے موبائل پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ڈیوٹی فری شاپس پر اشتہارات کے لیے مخصوص بورڈز سیاحوں کی سہولت کے لیے آویزاں کیے جاتے تھے۔

ونود کے موبائل پر کال آئی تو اس نے سریش کی توجہ اس پرنٹ پر مرکوز کرواتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے سر ہلایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

شرما سے مخاطب ہو کر وہ بولا۔ "سر! وہ نمبر بوگس ہے۔ اسے صرف شاہ صاحب سے رابطے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر اور کسی کال کا ریکارڈ نہیں ہے۔"

"وہ ہمیشہ ایسے ہی کام کرتا ہے۔ اس کے نقشِ پا ڈھونڈنا ناممکن حد تک مشکل ہے۔" شرما کے انداز میں مایوسی تھی۔

ونود نے اشتہار والے پرنٹ کی طرف شرما کی توجہ مبذول کروائی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ونود نے ایک کال کی اور تھوڑی دیر میں مخصوص تاریخ کو بورڈ پر آویزاں سارے اشتہارات کی کاپی ان کے پاس پہنچ گئی۔

تقریباً سبھی اشتہارات مختلف ہوٹلز، گیسٹ ہاؤسز اور ریستورانوں کے تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز دو اشتہارات ٹھہرے... ان میں سے ایک پے انگ گیسٹ کا تھا اور دوسرا کرائے پر مختلف بوٹس مہیا کرنے والی کمپنی کا۔

را کی ٹیم نے دو حصوں میں بٹ کر دونوں جگہ ٹرائی کیا۔ دونوں جگہوں سے صرف کھلاڑی کے قدموں کے مٹے مٹے نشان ہی ملے۔

ایک جگہ اس نے پے انگ گیسٹ کے طور پر قیام کیا تھا اور چند دن پہلے وہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ سندر کپور کے روپ میں ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔

دوسرا کلیو قدرے اہم تھا۔ سندر کے ہی نام سے اس نے نقد ادائیگی کر کے چوبیس گھنٹوں کے لیے ایک جدید بوٹ کرائے پر لی تھی اور محض دو گھنٹے پہلے واپس کی تھی۔

آشا انہی چوبیس گھنٹوں میں اغوا ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اغوا کے بعد کھلاڑی نے آشا کو گاڑی کے بجائے بوٹ کے ذریعے کہیں اور منتقل کیا تھا... کہاں؟ ممکنہ طور پر یہ جگہ سمندر میں ہی ہو سکتی تھی۔ سمندر میں انسانی مہارت و ہمت کا شاہکار ایک اور دبئی "پام سٹی" ابھر چکا تھا۔ اس کی آبادکاری جاری تھی۔ اس کے علاوہ بحیرۂ عرب میں درجنوں بوٹس اور چھوٹے بڑے بحری جہاز بھی لنگرانداز تھے۔ کھلاڑی کی ممکنہ کمین گاہ ان میں سے بھی کوئی ہو سکتی تھی۔

اگر وسیع پیمانے پر دبئی پولیس کی مدد سے سمندر اور پام سٹی کو کھنگالا جاتا تو کھلاڑی چوکنا ہو سکتا تھا اور اس صورت میں آشا کو فوری نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

را والے جانتے تھے کہ ان کے پاس محض چند گھنٹے ہیں۔ آج کا سورج غروب ہو گیا تو پھر آشا اس سورج کو کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔

سورج اب ڈھلنے ہی والا تھا۔

بوٹس مہیا کرنے والی کمپنی کے آفس سے ونود اور سریش نکل ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان جھجکتا ہوا ان کے قریب آیا۔ اسے وہ آفس میں دیکھ بھی چکے تھے۔ حلیے سے وہ کسی بوٹ کا ناخدا لگتا تھا۔

"آپ کو شاید اس شخص کی تلاش ہے جس نے ہماری کمپنی سے چوبیس گھنٹے کے لیے بوٹ کرائے پر لی تھی؟" دونوں کی دلچسپی تیزی سے بڑھی۔

ونود نے اس نوجوان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ ہماری اس حوالے سے مدد کر سکو تو شاہی خاندان بھی تمہارا مشکور ہو گا۔"

نوجوان کا چہرہ چمکنے لگا۔ شاہی خاندان کے مشکور ہونے کا مطلب بہت بڑا انعام بھی مل سکتا تھا۔ وہ خوشی سے معمور انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔"

محض آدھ گھنٹے میں وہ نوجوان، را کے دبئی ہیڈکوارٹر

میں تھا۔ شرما اور سلیم بھی وہیں پہنچ گئے تھے۔

وہ نوجوان جس کا نام عاصم تھا، اس نے بتایا کہ بوٹ کرائے پر حاصل کرنے والا نوجوان غیر قانونی طریقے سے ایران کی پورٹ قاسم جانے کا خواہش مند تھا۔

عاصم اور اس کا ایک پارٹنر یہ غیر قانونی کام بھی کرتے تھے۔ منہ مانگے معاوضے پر سارے معاملات طے پا چکے تھے اور صبح پانچ بجے انہوں نے اپنے مسافر کو پام سٹی کی ایک عمارت سے پک کرنا تھا۔ اس عمارت کے ساتھ جیٹی بھی بنی ہوئی تھی۔ بوٹ آسانی سے اس جیٹی پر لنگر انداز ہو سکتی تھی۔

را کی پوری مشینری بڑی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ عاصم کو حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا۔ ایک بوٹ کے ذریعے خاصے فاصلے سے اس نے مذکورہ عمارت کی نشاندہی بھی کر دی۔ شرما بے حد پُرجوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ آشا اسی عمارت میں تھی۔ اس نے سوچا اپنی ایجاد کردہ ''بلا'' کو تلف کرنے کا یہ شاید پہلا اور آخری موقع ہے۔

☆☆☆

خوف کے سبب آشا کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ کھلاڑی، اس کے سامنے موجود تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی کے سامنے بے حد دبیز پردہ پھیلا ہوا تھا۔

آشا بیڈ کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اپنی بچی کھچی ٹی شرٹ میں وہ اپنی برہنگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کھلاڑی کی بھوکی نظریں اس کے مخملی جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے چھریوں والا مخصوص تھیلا نیچے رکھا تو دھاتی کھنکھار سن کر آشا چونکی۔ اس کی آنکھیں خوف سے اور زیادہ پھیل گئیں۔

''کک... کیا ہے اس میں؟''

''تیز دھار چھریاں ہیں۔ ان سے تمہارے بے داغ جسم پر ''پھول بوٹے'' بنانے ہیں۔'' اس کے لہجے میں جو کچھ تھا، اس کے سبب آشا کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

درندہ اپنے جامے سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے کپڑے اتار پھینکے تھے۔ آشا نے بیڈ سے اتر کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی مگر کھلاڑی نے اسے راستے میں ہی چھاپ لیا اور چیختی، چلّاتی آشا کو بیڈ پر لا پھینکا اور اس پر چھاتا چلا گیا۔

آشا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے... اسے دانتوں سے کاٹا مگر اس کے سامنے تو گوشت پوست سے بنا انسان تھا ہی نہیں۔

آشا نے اپنے حواس برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی آخری امید بلیچ والا ڈبا تھا۔ کھلاڑی کی وحشت عروج پر تھی۔ اس کے ہاتھ اب آشا کی جینز پر تھے اس لیے اس نے آشا کی کلائیاں چھوڑ دی تھیں۔

آشا نے اسے آخری موقع جانا، اس نے تھوڑا سا رخ بدل کر اپنا ہاتھ بیڈ کے نیچے بڑھایا۔ کھلاڑی اپنے ''کام'' میں مشغول تھا۔

آشا کا کپکپاتا ہاتھ ڈبے تک پہنچا۔ آخری لمحے پر کھلاڑی کو اس کی ''موومنٹ'' کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھایا تو بلیچ کا پورا ڈبا اس کے چہرے پر خالی ہو گیا۔ آنکھوں میں شدید جلن کے احساس کے ساتھ وہ دہاڑا اور اندھوں کی طرح آشا پر جھپٹا۔

آشا نے بڑی چابک دستی سے خود کو اس کی زد سے بچایا اور چلّاتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر راہداری میں آ گئی۔ راہداری نیم تاریک تھی۔ بچا ہوا تعمیراتی میٹریل اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔

آنکھیں مسلتا ہوا کھلاڑی، اس کے پیچھے تھا۔ پوری راہداری آشا کی چیخوں سے گونج رہی تھی۔ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر آشا گری اور بُری طرح سے چلّانے لگی۔ اسے اپنی برہنگی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

کھلاڑی کسی درندے کی طرح غرا کر اس پر جھپٹا۔ اس کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ بلیچ کی وجہ سے اس کی دیکھنے کی صلاحیت بے حد کم رہ گئی تھی۔

آشا پر گرنے سے پہلے اس کے جسم کو جھٹکا لگا۔ پوری راہداری گولی کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔

راہداری تیزی سے جیسے روشنی اور انسانوں سے بھر گئی تھی۔ شرما کے ریوالور کی نال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا اور کھلاڑی کی پیشانی کے عین درمیان میں موت کا سیاہ سوراخ ہو گیا تھا۔

سلیم نے تیزی سے بڑھ کر چیختی چلّاتی آشا کو بازوؤں میں چھپا لیا اور اپنی شرٹ اتار کر اسے پہنا دی۔

ونود نے بڑھ کر کھلاڑی کے جسم کو ہلایا۔ وہ بے جان ہو چکا تھا۔ سبز پتھریلی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

شرما نے افسردہ سا سانس لیا اور بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔ کھلاڑی کا سفاکانہ کھیل اختتام پذیر ہو چکا تھا... آشا کو پانے کی خواہش اس کے وجود کے ساتھ ناتمام ہو چکی تھی۔

لاش کا پیغام

بشریٰ امجد

بعض اوقات ایک معمولی سا جرم قتل جیسے بھیانک جرم کا جواز فراہم کر دیتا ہے... اس کے پاس بھی جواز تھا... مگر وہ نہیں جانتا تھا... کہ قتل کتنی ہی صفائی سے کیا جائے... بعض اوقات مقتول ہی اپنے قتل کی گواہی پیش کر دیتا ہے۔

قاتل اناڑی اور مقتول کھلاڑی کے درمیان ان دیکھی جنگ کا ٹکراؤ...

لاش فرش پر پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بچے نے گڑیا کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ یہ ایک بھیانک منظر تھا۔ لاش کے سر سے خون رس رہا تھا۔

قاتل نے بڑی منصوبہ بندی کی تھی۔ تاہم قتل کے بعد اس کے اعصاب بوجھل ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل حالت میں واپس آ گیا۔ اس نے نہایت احتیاط سے مقتول کی خواب گاہ کی تلاشی لی۔

کئی روز سے وہ اس اندرونی خوف میں مبتلا تھا کہ اس

کا نابینا مالک اس کے ارادوں کو نہ تاڑ لے۔ قدرت کسی سے کوئی کمی رکھتی ہے تو اس کا ازالہ ضرور کرتی ہے۔ ایسے شخص کی بقیہ حسیات غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہیں... نابینا ہونے کے باوجود مقتول کی حسیات عام انسان کے مقابلے میں کئی گنا تیز تھیں۔ وہ اردگرد موجود افراد کے احساسات و جذبات کو محسوس کر لیتا تھا... بالکل ایسے جیسے اس کے سر میں کوئی انٹینا لگا ہو جو بڑی مستعدی کے ساتھ سگنل وصول کرتا ہو۔ وہ اپنے گھر میں اسی طرح چلتا پھرتا تھا جیسے وہ اندھا نہ ہو۔ لیکن گھر سے جتنا دور جاتا اتنا ہی بینائی کی محرومی نمایاں ہوتی چلی جاتی اور گھر سے باہر نکلتے ہی ظہیر کی ضرورت بڑھ جاتی۔ کار بھی ظہیر ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

کمرے کی تلاشی کے بعد قاتل مطمئن ہو گیا تھا۔ خواب گاہ کی ہر چیز بالکل اسی حالت میں تھی جیسے مقتول کی زندگی میں ہوا کرتی تھی۔ کوئی شے غیر معمولی یا بے قاعدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بوڑھے آدمی کے کپڑے الماری میں سلیقے سے ٹنگے تھے۔ پرانے اُڑی اُڑی رنگت کے لباس کے درمیان، جہاز کا پرانا یونیفارم جس کی آستینوں کے کنارے سنہری رنگ کے تھے۔ دیگر ملبوسات کے درمیان وہ خاص طور پر نمایاں نظر آرہا تھا۔ قاتل نے بڑی باریک بینی سے تمام گھر کی تلاشی لی۔

کارنس پر چند تصاویر موجود تھیں۔ کارنس کے نیچے ایک چوبی اسٹینڈ پر چمکتی ہوئی مچھلی کے شکار کی راڈ سلیقے سے دھری تھی جیسے مقتول کے شغل کی گواہی دے رہی ہو۔

یہ راڈ مقتول کا غرور تھی، اس کا فخر تھی۔ ”یہ جادو کی چھڑی ہے۔“ بوڑھا آدمی کہا کرتا۔ مقتول کا بہترین دوست انسپکٹر راشد اس مہارت کا گواہ تھا کہ مچھلیاں بوڑھے آدمی کی شکاری راڈ کی جانب اس طرح لپکتی تھیں جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو کھینچتا ہے۔

مقتول کی بدقسمتی کہ قاتل نے اسی راڈ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ظہیر واپس کچن میں آگیا۔ اس نے لاش اور کچن کا بغور جائزہ لیا۔ مچھلی پکڑنے کی راڈ وہ اچھی طرح دھو کر واپس خواب گاہ میں اس کی مخصوص جگہ پر رکھ آیا تھا۔

ظہیر نے کچن میں سنک کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جہاں اس نے فشنگ راڈ کو دھویا تھا۔ لاش کو دیکھا اور اوون کے کونے پر خون کا نشان دیکھا۔ وہ اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ یہ ایک حادثہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ وسیع کچن میں موجود ریفریجریٹر کا دروازہ اس نے کھلا رہنے دیا تھا۔ آہنی اوون کے قریب پڑا اسٹول الٹ دیا تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا حادثہ تھا۔ مقتول کچن میں آیا اور کسی وجہ سے گر کر اوون سے ٹکرایا پھر سنبھلتے سنبھلتے اسٹول سے ٹکراتا ہوا فرش پر جا گرا... اس کے سر پر دو جگہ چوٹ آئی... ایک اوون سے ٹکرانے پر اور دوسری بار فرش سے ٹکرانے پر...

ظہیر نے حادثے کا منظر نامہ ایک ماہر ڈائریکٹر کی طرح ترتیب دیا تھا۔

ظہیر پیشہ ور مجرم نہیں تھا لیکن جوئے کی لت نے... نہ صرف اسے کنگال کر دیا تھا بلکہ وہ بھاری قرض بھی چڑھا بیٹھا تھا۔ سود خور جواری اس کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے... اگر وہ پرانا گاہک نہ ہوتا تو اب تک مارا جا چکا ہوتا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے وہ مسلسل مہلت لیتا رہا۔ آخر وہ حد آگئی جب اس نے فرار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا...

یہ محض اتفاق تھا کہ اسے مقتول کی پوشیدہ رقم کا علم ہو گیا اور اس نے فرار کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرار کا آپشن کوئی خاص مفید نہیں تھا۔ قاتل جواری بوگیر کتوں کے مانند جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالتے... اسے اپنی جان بچانی تھی۔ ویسے بھی بڑے میاں زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔

☆☆☆

ظہیر نے منصوبہ تبدیل کر دیا اور ..... بوڑھے نابینا نعیم یونس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بعد ازاں اسی نے چوکور دھاتی باکس خفیہ جگہ سے برآمد کیا جسے بڑے میاں نے نہایت ہوشیاری سے چھپایا تھا۔ آٹھ بائی دس کے اس دھاتی باکس کو اس نے لان میں ایک کیاری کے عقب میں احتیاط سے دفن کر دیا تھا۔ آخری بار اس نے تمام جزئیات کا جائزہ لیا اور دروازہ بند کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک وفادار ملازم کی طرح مالک کی حادثاتی موت کی خبر دینے جا رہا تھا۔ انسپکٹر راشد قریب ہی رہائش پذیر تھا۔ ظہیر کے اندازے کے مطابق اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا۔

”تم نے فون کیوں نہیں استعمال کیا؟“ ظہیر کی کہانی سننے کے بعد انسپکٹر راشد کا پہلا سوال فون سے متعلق تھا۔

”فون تین دن سے خراب ہے۔“

”شکایت کی؟“

”پہلے دن ہی کر دی تھی۔“ ظہیر مطمئن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ راشد فون کمپلین کی تصدیق کرے گا۔ کمپلین وہ کر چکا تھا۔

انسپکٹر راشد کے چہرے پر عموماً سنجیدگی اور نامعلوم اداسی کی ہلکی سی تہ موجود رہتی تھی۔ مقتول اس کا گہرا دوست تھا۔ چنانچہ چہرے کی اداسی مزید بڑھ گئی تھی۔

حادثے کو ہوئے دو روز گزر گئے تھے۔ ظہیر اپنی جگہ پُرسکون تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ ماہرین نے موت کی وجہ ”حادثہ“ قرار دیا تھا۔

انسپکٹر راشد لابی میں کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ چمڑے کی آرام دہ نشست پر تھی۔ مقتول نعیم کی یہ پسندیدہ نشست تھی۔

”میں اسے بہت مس کروں گا، ظہیر۔“ انسپکٹر نے کہا۔ انسپکٹر کی آواز بھاری ہو گئی۔ وہ نعیم یونس کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا... ظہیر کو خوف محسوس ہوا تاہم وہ اس کی وجہ نہ جان سکا۔ آخر تحریری طور پر موت کی وجہ حادثہ قرار دیا گیا تھا۔ مقتول کے نابینا پن نے ماہرین کے لیے آسانی پیدا کر دی تھی...

ظہیر، انسپکٹر کے ساتھ خواب گاہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا دل سینے میں زخمی پرندے کی طرح کیوں پھڑپھڑا رہا ہے؟ اسے لگا کہ وقت رک گیا ہے۔ اس کی نگاہیں خواب گاہ کے دروازے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

”انسپکٹر!“ اس نے آواز کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ ظہیر سے صبر نہ ہو سکا۔

انسپکٹر، دروازے میں نمودار ہوا۔ ”معاف کرنا میرا مقصد تمہیں اس طرح تنہا چھوڑنا نہیں تھا۔ دراصل میں پرانی یادوں میں کھو گیا تھا۔“

ظہیر، حیرت و پریشانی کے عالم میں انسپکٹر کے ہاتھ کو تک رہا تھا جس میں فشنگ راڈ چمک رہی تھی۔

”میں نے سوچا کہ میں اسے ساتھ لے جاؤں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”میری اور نعیم کی یادیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم نے کئی بار ساتھ شکار کھیلا۔ اس کی موجودگی میں، میں محسوس کروں گا کہ نعیم میرے آس پاس ہی ہے۔“ انسپکٹر نے اداس لہجے میں وضاحت پیش کی۔

’میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔‘ ظہیر نے سوچا۔ ”میں تمہارے احساسات سمجھ سکتا ہوں، انسپکٹر۔“ وہ بولا۔ ”یقیناً نعیم صاحب کی خواہش بھی یہی ہوگی کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھو۔“

انسپکٹر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ معاً دروازہ کھولتے کھولتے وہ رکا اور پلٹ کر بولا۔ ”تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟“

”مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ لیکن بہرحال مجھے جانا تو پڑے گا۔“

”تم کب تک جا رہے ہو؟“

فن کا مظاہرہ

ایک صاحبہ نے مصور سے ایک تصویر بنوائی لیکن پیسے دیتے ہوئے ہچکچانے لگیں۔ عذر یہ تراشا کہ میرا کتا اس تصویر کو پہچانتا نہیں ہے۔ مصور نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، میں تصویر کو اس طرح کر دوں گا کہ وہ بھی اسے آپ کی تصویر سمجھے گا۔ مصور تصویر کو اپنے ساتھ لے گیا اور اس پر کچا گوشت اس طرح مل دیا کہ بو تو رہ گئی لیکن تصویر خراب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسے دوبارہ ان صاحبہ کے گھر لے گیا۔ جب کتے کو تصویر کے قریب لایا گیا تو وہ اس پر لپکنے لگا۔ بڑی مشکل سے اسے قابو میں رکھا گیا۔ محترمہ بے بس ہو گئیں اور انہوں نے فوراً پیسے ادا کر دیے۔

(کراچی سے احمد رضا کی فنکاریاں)

”شاید ایک دو روز میں...“

”اس کا مطلب، ہماری ایک ملاقات اور ہو سکتی ہے؟“

”شاید، ایسا ہو جائے... مجھے خوشی ہوگی۔“

انسپکٹر کے جانے کے بعد ظہیر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

دو روز بعد ظہیر لاؤنج میں اپنا سوٹ کیس تیار کر رہا تھا۔ وہ اس کے فیتے کس کر کھڑا ہوا تو باہر اسے کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ وہ چند ساعت کے لیے ساکت رہ گیا۔ کار کے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی آہٹ... دروازہ کھلا، ظہیر نے انسپکٹر راشد کو داخل ہوتے دیکھا۔

انسپکٹر کی آنکھوں نے ظہیر کی مصروفیت کا جائزہ لیا۔

”جا رہے ہو؟“

”ہاں انسپکٹر، جانا تو ہے۔“ ظہیر نے خود پر لعنت بھیجی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انسپکٹر کے آنے سے قبل نکل جائے گا۔

انسپکٹر نے قدم بڑھائے اور ظہیر کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ ”میں نعیم کے اچھے دوست کو ڈراپ کرنے کی زحمت تو کر ہی سکتا ہوں۔“ انسپکٹر نے کہا۔

ظہیر نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ انسپکٹر کی آواز میں کوئی نامعلوم پہیلی تھی۔ انسپکٹر نے ظہیر کا ردِعمل دیکھنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔

”آجاؤ۔“ اس نے شانوں کے اوپر سے ظہیر کو پکارا۔ انسپکٹر واپس جارہا تھا۔

وہ دونوں کار میں خاموش بیٹھے رہے۔

”مجھے ذرا دیر کے لیے دفتر پر رکنا پڑے گا، خیال مت کرنا۔“

”نہیں، کوئی بات نہیں۔“ ظہیر کو اپنی آواز کھوکھلی سی لگی۔ کار دومنزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ انسپکٹر اتر کر عمارت کے اندر جانے کے بجائے گھوم کر ظہیر کی سمت آگیا۔

اس نے کہا۔ ”آؤ، میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔“

چاروناچار، ظہیر کو انسپکٹر کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں آگئے جہاں ایک ڈیسک پر پستہ قامت شخص موجود تھا۔ ڈیسک کے علاوہ دو کرسیاں اور تھیں۔

”وہ کاغذ دکھانا ذرا، روشن علی۔“

روشن علی نے ڈیسک کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر انسپکٹر کو پکڑا دیا۔ انسپکٹر نے کاغذ کھول کر دیکھا پھر اسے ظہیر کے حوالے کردیا۔ ”دیکھو تمہاری دلچسپی کی چیز ہے۔“ انسپکٹر کی آواز میں بظاہر نرمی تھی۔

دونوں بیک وقت کاغذ کو گھور رہے تھے۔ ظہیر کا دماغ چکر پھیریاں کھارہا تھا۔ اسے لگا کہ الفاظ کاغذ کی سطح سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ یہ متحرک الفاظ اسے زندہ محسوس ہوئے۔ ظہیر نے پیشانی کی نمی کو بھوؤں پر سے صاف کیا۔ الفاظ کو غور سے دیکھا:

”وارنٹ یا گرفتاری... ظہیر عالم۔“

نصف گھنٹے تک ظہیر کا دماغ کورے کاغذ کے مانند صاف پڑا رہا۔ وہ ایک کوٹھڑی میں بند تھا جہاں ایک چھوٹے سائز کی چارپائی پڑی تھی... کوٹھڑی کی دیوار میں ایک جانب سلاخ دار روشن دان تھا۔

وہ چارپائی کے چوبی کنارے پر بیٹھا تھا۔ یہ بات قطعی واضح ہوچکی تھی کہ اسے قاتل کے طور پر پہچان لیا گیا ہے۔ اس کا دماغ سن ہورہا تھا... کیسے؟ آخر کیسے؟ اس نے کہاں پر غلطی کی تھی؟

کوٹھڑی میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ ظہیر نے سر اٹھایا۔ وہ انسپکٹر راشد تھا، مقتول کا دوست۔

”تم یقیناً سوچ رہے ہو کہ ہمیں حقیقت کیونکر معلوم ہوئی؟“ راشد نے کہا۔ ”کوئی حرج نہیں ہے تمہیں بتانے میں کہ قتل کی نشاندہی، مقتول نے خود کی تھی۔“ انسپکٹر نے دھماکا کیا۔

ظہیر خالی خالی نظروں سے انسپکٹر کو تک رہا تھا۔ اس نے بمشکل سر کو نفی میں حرکت دی۔ ”میں بالکل نہیں سمجھا؟“

”نعیم یونس نے ایک پیغام چھوڑ دیا تھا۔“

”ناممکن، میں نے ہر جگہ کو اچھی طرح کھنگالا تھا۔“

”یقیناً تم نے ایسا کیا ہوگا لیکن تم ایک چیز بھول گئے۔“

”کیا؟“

”مچھلی پکڑنے کی ڈوری۔ نعیم کو پتا تھا کہ میں فشنگ راڈ اور فشنگ لائن پر ضرور توجہ دوں گا۔ ڈوری کی ریل (reel) پر ایک قطار میں گرہیں لگی تھیں۔ مچھلیوں کے شکاری کے لیے یہ ایک عجیب حرکت تھی۔ تاہم میں نے نوٹ کرلیا تھا کہ گرہوں کی قطار میں ایک نظم وضبط ہے جسے سمجھنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔“

ظہیر کا چہرہ لٹک گیا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔

”میری عقل میں کچھ بھی نہیں آیا۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”مورس کوڈ، ڈیئر مورس کوڈ...“ انسپکٹر نے کہا۔ ”کبھی سنا ہے اس کے بارے میں؟“

ظہیر نے نفی میں سر ہلادیا...

”مورس کوڈ کے ذریعے پیغام دینے کے مختلف طریقے ہیں... نعیم یونس نے انوکھا طریقہ اختیار کیا... تمہاری بدقسمتی کہ تم نے ایسے آدمی کو قتل کیا جو ماضی میں جہاز پر ریڈیو آفیسر تھا... وہ نابینا ضرور تھا لیکن اس کی حسیات بہت تیز تھیں۔ اس نے تمہارے بدلے ہوئے رویّے کو محسوس کرلیا تھا۔ خطرہ اور خطرے کی وجہ بھی وہ جان گیا تھا۔ لہٰذا اس نے ڈوری پر گرہیں لگا کر پیغام دے دیا۔“

”مورس کوڈ؟ پیغام؟“

”گرہیں، ڈاٹ اور ڈیش کو ظاہر کرتی تھیں... ڈاٹ اور ڈیش کو شناخت کرنے میں، مجھے کچھ وقت لگا... اس کے بعد کوئی مشکل نہیں ہوئی۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”کیا تم پیغام کے آخری الفاظ سننا پسند کروگے؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

ظہیر گنگ بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا... وہ جیتی ہوئی بازی یک دم ہار بیٹھا تھا۔

آخری الفاظ تھے: ”ظہیر کو رقم کا پتا چل گیا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنے والا ہے۔“ انسپکٹر نے سنجیدگی سے قاتل کو دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی۔

”سمجھو یہ پیغام قبر سے آیا ہے۔ تم کسی کو قتل تو کرسکتے ہو لیکن بعض اوقات تم اسے بولنے سے نہیں روک سکتے سمجھے مسٹر ظہیر!“

ڈرامانگاری کی عکاس ایک فریب کہانی کے پیچ وخم

خواب دیکھنے پر پابندی لگ جائے تو لوگ ان کی تعبیر کو چھونے کے لیے جائز ناجائز حربے آزمانے کی کوشش نہ کریں... لیکن یہ ممکن نہیں... فطری چیزوں سے فرار لاحاصل جدوجہد ہے... لوگ پھر بھی اس سے ٹکرانے کا عزم کرلیتے ہیں... لالچ... فریب اور دھوکا دہی کے شیطانی منصوبوں سے گندھی تحریر...

تعبیر

تنویر ریاض

باب ولسن سے ہماری پرانی واقفیت ہے۔ وہ ہمارا ہم پیشہ ہونے کے علاوہ اچھا دوست بھی ہے۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ والا شخص ہے اور کبھی بھی فون کیے بغیر نہیں آتا لیکن اس مرتبہ اس نے یہ تکلف گوارا نہ کیا اور اطلاع دیے بغیر ہی ہمارے دفتر چلا آیا۔ میں اور وکی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جس پر انگریزی کے حروف آر، ایم کا لیبل چسپاں تھا جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ یہ سوٹ کیس اس کا نہیں ہے۔ اس نے وہ سوٹ کیس میز پر رکھا اور ہم دونوں سے باری

باری مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔

”میں ایک خاص معاملے میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر وکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم رینالڈ میریل کو جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“ وکی نے جواب دیا۔ ”اس سے ایک دو مرتبہ عدالت میں ملاقات ہوئی ہے۔ البتہ اسے اس دلچسپ کتاب کے مصنف کی حیثیت سے جانتا ہوں جو کہ اس نے قدیم تاریخی چقماق کی کانوں کے بارے میں لکھی ہے۔“

باب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ غائب ہو گیا ہے۔ میں اس معاملے کی پبلسٹی نہیں چاہتا لیکن جب کوئی شخص اپنے دفتر یا گھر میں موجود نہ ہو اور نہ ہی اس کے کہیں جانے کا امکان ہو، ایسی صورت میں اگر وہ کسی کو بتائے بغیر غائب ہو جائے تو اسے گمشدہ ہی سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں فوری تحقیقات کی ضرورت ہے۔“

”بے شک۔“ وکی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی وہ شخص ہو جس پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔“

”مجھے اس سے انکار نہیں۔ میں وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی وصیت پر عمل درآمد کروانے کا بھی ذمے دار ہوں۔ اور جہاں تک میرے علم میں ہے کہ اس کا بھانجا البرٹ کرک ہی اس کی تمام دولت اور جائداد کا اکلوتا وارث ہے لیکن میریل کے ساتھ ساتھ کرک بھی غائب ہے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ایک غیر معمولی واقعہ نہیں ہے؟“

”کیا تم نے اس کی وصیت دیکھی ہے؟“

”ہاں اور وہ میرے سیف میں محفوظ ہے لیکن میریل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک دوسری وصیت تیار کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ایسا کر چکا ہو۔ اس صورت میں بھی وہ مجھے ہی یقیناً اس پر عمل درآمد کرنے کی ذمے داری سونپے گا۔“

”کیا دوسری وصیت تیار کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟“ وکی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ باب نے جواب دیا۔ ”پچھلے چند برسوں میں اس کے اثاثے کئی گنا بڑھ گئے تھے چنانچہ اس نے اپنی وراثت میں ایک اور شخص سیموئل ہورڈر کو بھی شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پرانی وصیت کے مطابق میریل کے مرنے کے بعد تمام اثاثے کرک کو مل جاتے لیکن میریل نے نئی وصیت میں دو باتیں شامل کریں۔ پہلی تو یہ کہ اگر کرک کی موت میریل سے پہلے واقع ہو جائے تو ہورڈر اس کا متبادل وارث ہو گا اور دوسری یہ کہ میریل کے مرنے کے بعد اس کے اثاثے کرک اور ہورڈر میں مساوی طور پر تقسیم ہوں گے کیونکہ میریل کا خیال ہے کہ اب یہ دولت کرک کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا اس میں سے ہورڈر کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔“

اتنا کہہ کے باب نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”گزشتہ بدھ کو مجھے اس نے فون پر بتایا کہ اس نے میرے لیے کچھ کاغذات تیار کیے ہیں جو مجھے اگلے روز یعنی جمعرات کو مل سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس روز صبح ساڑھے دس بجے سے شام ساڑھے چھ بجے تک دفتر میں نہیں ہوگا، اس لیے میں شام میں وہ کاغذات منگوا سکتا ہوں۔ اتفاق سے جمعرات والے دن میرا کلرک پیگ، کسی کام سے لندن گیا تو اس نے مسٹر میریل کو ایک عمارت سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بڑا سا ہینڈ بیگ لیے چل رہا تھا۔ پیگ کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ اس نے لمحہ بھر میں ہی نوٹ کر لیا کہ اس شخص نے سبز رنگ کی جیکٹ اور سلیٹی رنگ کا ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمارت کے باہر لگے ہوئے کلاک میں وقت بھی نوٹ کیا۔ اس وقت ایک بج کر چھیالیس منٹ ہوئے تھے۔ میریل نے بھی کلاک پر ایک نظر ڈالی اور وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسٹیشن کی جانب بڑھ گئے۔ شام کے وقت میں نے پیگ کو وہ کاغذات لانے کے لیے اس کے دفتر بھیجا۔ وہ وہاں ساڑھے چھ کے بعد پہنچا لیکن دفتر بند تھا۔ اس نے یہ سوچ کر دروازے پر دستک دی کہ شاید میریل اس کی آواز سن کر باہر آجائے کیونکہ وہ دفتر سے ملحقہ مکان میں رہتا ہے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پیگ وقت گزاری کے لیے مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ میریل کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

”وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جس نے سبز رنگ کی جیکٹ اور سلیٹی رنگ کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا تو پیگ نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہی آدمی تھا جسے اس نے صبح مسٹر میریل کے ہمراہ دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے روک کر پوچھا کہ کیا وہ بتا سکتا ہے کہ مسٹر میریل کب گھر واپس آئیں گے؟ اس شخص نے حیرت سے پیگ کو دیکھا اور بولا۔ ”میریل! کون میریل؟ میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔“

”پیگ نے اس شخص سے معذرت کی اور کہا کہ وہ اس جیکٹ کی وجہ سے دھوکا کھا گیا کیونکہ اس نے صبح انہی کپڑوں میں ملبوس ایک شخص کو مسٹر میریل کے ساتھ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے بے مقصد گھومنے کے بعد پیگ دوبارہ میریل کے دفتر گیا لیکن اس بار بھی دروازہ بند تھا۔ جب کئی بار دستک دینے کے بعد بھی جواب نہیں آیا تو اس نے ایک پرچہ لکھا اور دروازے پر لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال کر آگیا۔ اگلے روز میں نے صبح کے وقت اسے دوبارہ بھیجا لیکن تب بھی دفتر بند تھا اور اس کے بعد سے وہ دفتر مسلسل بند ہے۔ میریل کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں سنا اور نہ ہی کوئی جانتا ہے کہ وہ کہاں چلا گیا۔

”ہفتے کے روز میں نے یہ سوچ کر اس کے بھانجے کرک کو فون کیا کہ شاید وہ میریل کے بارے میں کچھ بتا سکے لیکن یہ جان کر میری حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا کہ وہ بھی لاپتا ہے۔ وہ جمعرات کی صبح یہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں روچسٹر جا رہا ہے اور شاید ڈنر تک اس کی واپسی نہ ہو سکے لیکن وہ دو دن گزر جانے کے باوجود گھر نہیں پہنچا اور نہ ہی اس نے گھر والوں سے کوئی رابطہ کیا۔ میں نے اتوار کی شام اس کے گھر دوبارہ فون کیا لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

”آج سہ پہر لنچ کے بعد میں نے بلڈنگ کے چوکیدار کو فون کیا جس کے پاس ہر فلیٹ اور دفتر کی ڈپلی کیٹ چابی ہوتی ہے جو وہ عام طور پر صفائی کرنے والی عورت کو اس صورت میں دیتا ہے جب صاحب خانہ موجود نہ ہوں اور اس کی غیر موجودگی میں وہ عورت گھر یا دفتر کی صفائی کر سکے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ چابی لے کر آجائے تاکہ ہم دفتر اور اس سے ملحقہ گھر کا جائزہ لے سکیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اندر میریل کی لاش پڑی ہو یا وہ بے ہوشی کے عالم میں ہو۔ چوکیدار نے مجھے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ ہر روز صبح مکان کی چابی کام کرنے والی عورت کو دیتا ہے جو اپنا کام مکمل کر کے دو گھنٹے بعد چابی واپس کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود وہ چابی لے کر آگیا اور مجھے ساتھ لے کر کام کرنے والی عورت کے گھر گیا جو میریل کے دفتر کے قریب ہی رہتی تھی۔ وہ دیکھنے میں ایک ذمے دار اور سمجھ دار عورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ اس نے گزشتہ چند روز سے میریل کو نہیں دیکھا۔ چوکیدار نے اسے چابی پکڑائی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس عورت سے جس کا نام مسز ٹیلر تھا، چند باتیں کیں جن سے مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ جمعرات والے روز اس نے مسٹر میریل کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے گھر اور دفتر کی اچھی طرح صفائی کی ..... ”میں جانتی تھی کہ وہ صفائی پسند ہے لیکن اس کی موجودگی میں پورے گھر کی جھاڑ پونچھ ممکن نہیں تھی۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کہ تمہاری محنت رائگاں گئی کیونکہ وہ تو واپس ہی نہیں آیا۔“

”مسٹر میریل آئے تھے۔“ اس نے پورے یقین سے کہا۔ ”دوسرے روز جب میں صفائی کے لیے آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ مسٹر میریل میرے جانے کے بعد کسی وقت آئے تھے لیکن دوبارہ چلے گئے۔“

”یہ اندازہ تمہیں کیسے ہوا؟“

”میں قالین صاف کرنے والا برش الماری کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ اسے اپنی جگہ پر رکھنا چاہیے تھا لیکن اس وقت تک میں چابیاں چوکیدار کو واپس کر چکی تھی۔ دوسرے روز دیکھا تو وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں میں چھوڑ کر گئی تھی بلکہ آتش دان کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books
and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

اسی طرح دیوار پر لگے آئینے کی پوزیشن بھی مختلف تھی۔ میں نے جانے سے پہلے اس میں اپنی شکل دیکھی اور بال سنوارے تھے۔ میرا قد چھوٹا ہے اس لیے آئینے کو تھوڑا سا اپنی جانب جھکانا پڑا لیکن دوسری صبح دیکھا تو وہ سیدھا ہو چکا تھا جیسے کسی لمبے قد کے شخص نے اسے استعمال کیا ہو۔ اسی طرح میری نظر شیونگ برش پر گئی جو اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور جب میں نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ گیلا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر میریل نے ہی اسے استعمال کیا ہوگا۔"

یہ کہہ کر باب سانس لینے کے لیے رکا پھر اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم لوگ میری بات غور سے سن رہے ہو نا؟"

"ہاں۔" وکی نے جواب دیا۔ "مجھے اس عورت کی قوت مشاہدہ پر حیرت ہو رہی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" باب نے کہا۔ "شیونگ برش کے گیلا ہونے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ میریل رات میں کسی وقت گھر آیا تھا۔ پھر میں نے مسز ٹیلر سے کہا کہ وہ میریل کی الماری کھول کر دیکھے کہ کیا اس نے گھر آ کر لباس بھی تبدیل کیا تھا۔ اس نے الماری کھول کر دیکھی اور تھوڑی دیر بعد اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں سبز رنگ کی جیکٹ لیے ہوئے کھڑی تھی۔

"جب میں نے الماری میں رکھے کپڑوں کی برش سے صفائی کی تو یہ جیکٹ یہاں موجود نہیں تھی۔" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کئی دنوں سے اسے صاف نہیں کیا گیا ہے۔ ویسے بھی اس سے پہلے میں نے یہ جیکٹ یہاں نہیں دیکھی۔"

"میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک بار پھر الماری کا بغور جائزہ لے کر بتائے کہ ان کپڑوں میں سے کوئی کوٹ یا جیکٹ گم تو نہیں ہے۔ اس نے الماری میں لٹکے ہوئے ہینگر سرکائے اور بولی کہ ان میں سے ایک سلیٹی رنگ کی جیکٹ غائب ہے جس کی اس نے گزشتہ روز صفائی کی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ سبز رنگ کی جیکٹ مسٹر میریل کی ہے یا نہیں۔ میں نے سوچا کہ تم دونوں زیادہ اچھی طرح یہ کام کر سکو گے۔ اسی لیے میں اپنے ساتھ اس سوٹ کیس میں وہ جیکٹ لے کر آیا ہوں اور اس میں ایک جیکٹ مسٹر میریل کی بھی ہے۔ اب تم ان دونوں کو دیکھ کر بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس بارے میں کوئی درزی ہی بہتر رائے دے سکتا ہے۔" وکی نے کہا۔ "اگر دونوں کی پیمائش مختلف ہے تب بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پھر بھی ہم دیکھ لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وکی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میز پر پرانے اخبارات پھیلا دیے۔ پھر اس نے سوٹ کیس کھول کر وہ دونوں جیکٹس نکالیں اور انہیں میز پر برابر برابر رکھ دیا۔ پھر اس نے فیتے کی مدد سے ان کی پیمائش لی اور ایک کاغذ پر لکھتا گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کاغذ پر نظر دوڑائی اور بولا۔ "اس پیمائش سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں جیکٹس کسی ایک شخص کی نہیں ہیں۔ سبز جیکٹ کی آستینیں لمبی ہیں اور اس کی چوڑائی بھی دو انچ زیادہ ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ سبز جیکٹ والا، میریل کے مقابلے میں لمبے قد اور چوڑے بدن کا مالک ہے اور اگر اس نے میریل کی جیکٹ پہنی تو شاید اس کے بٹن بھی بند نہ کر پایا ہو۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میریل کسی دوسرے شخص کی جیکٹ پہن کر گھر آیا تھا یا کوئی اور شخص اس کے گھر میں داخل ہوا؟ پیگ نے جو کچھ مجھے بتایا، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ کوئی شخص میریل کی غیر موجودگی میں اس کے گھر میں داخل ہوا، اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے تو اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص نے جیکٹ کیوں تبدیل کی اور شیو کس لیے بنایا؟ وہ میریل کے گھر میں کس طرح داخل ہوا اور وہ وہاں کیا کرنے آیا تھا؟ میریل کہاں ہے اور اس سارے معاملے کے پیچھے کیا کہانی ہے؟"

"ان سوالوں کے جواب بڑے واضح ہیں۔" وکی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "سبز جیکٹ والے شخص کو پیگ نے دوپہر کے وقت مسٹر میریل کے ساتھ لندن برج پر دیکھا تھا پھر شام کو جب وہ مسٹر میریل کے پاس کاغذات لینے گیا تو اس نے گرجا کے پاس اسی شخص کو دیکھ کر مسٹر میریل کے بارے میں پوچھ لیا کیونکہ سبز جیکٹ کی وجہ سے وہ سمجھا کہ یہی شخص دوپہر کے وقت مسٹر میریل کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس آدمی کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس جیکٹ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس نے شیو کیوں کیا؟ پیگ نے اس کے حلیے کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں، وہ لمبے قد کا ہے اور اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہے۔ چہرے پر گھنی سیاہ مونچھیں اور چگی داڑھی ہے۔"

"بہت خوب۔" وکی نے کہا۔ "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص میریل کے مکان میں داخل ہوا، اس نے سبز جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ مونچھیں اور چگی داڑھی تھی لیکن جو شخص اس کے گھر سے باہر آیا، وہ کلین شیو تھا اور اس نے سلیٹی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس مکان کی چابی کہاں سے آئی؟ اس کا سیدھا سادہ جواب ہے کہ یہ چابی اس نے میریل سے لی ہوگی کیونکہ وہ دوپہر میں اس کے ساتھ تھا اور اگر ایسا ہے تو میریل کہاں چلا گیا؟ کہیں اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ خدا کرے یہ اندیشہ غلط ہو۔ وہ شخص میریل کے گھر میں کیا کر رہا تھا؟ ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کسی اہم اور قیمتی چیز کی تلاش میں آیا تھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے گھر میں ایسی کوئی چیز موجود تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" باب نے جواب دیا۔ "البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس کے گھر میں ایک سیف تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس میں اپنے کاغذات اور دستاویزات رکھتا ہو۔ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ اس الماری میں بھاری رقم رکھی ہوگی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں تو اس الماری میں سب سے اہم دستاویز اس کی نئی وصیت ہے۔"

باب سے ہونے والی گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مسٹر میریل نے پہلے جو وصیت تیار کی تھی، اس کے مطابق ان کا بھانجا کرک تمام اثاثوں کا واحد وارث تھا لیکن بعد میں مسٹر میریل نے وصیت تبدیل کر دی اور اس طرح کرک کے حصے میں آدھی جائداد آتی۔ یعنی اگر نئی وصیت ضائع کر دی جاتی تو کرک کو ہزاروں پاؤنڈز کا فائدہ ہو سکتا تھا۔

"اب کیا کیا جائے؟" باب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"یہ تو تمہیں جلد یا بدیر کرنا ہی ہوگا۔" وکی نے کہا۔ "لیکن فی الحال تم یہ دونوں یا کم از کم سبز رنگ کی جیکٹ میرے پاس چھوڑ دو۔ شاید میں اس کے ذریعے کچھ اور معلومات حاصل کر سکوں۔"

"تمہیں اس کی جیبوں میں ریت اور مٹی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم نے مٹی پر توجہ نہیں دی ہوگی۔"

"ہاں، بس اتنا ہی دیکھا تھا کہ میری انگلیوں پر بھی کچھ مٹی لگ گئی تھی۔ بہرحال میں یہ دونوں جیکٹس تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں اور اس دوران میں کرک کے مالک مکان سے اس کے بارے میں کوئی نئی خبر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

باب کے جانے کے بعد میں نے وکی سے کہا۔ "یہ بوڑھا وکیل اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ سبز جیکٹ مسٹر کرک کی ہی ہے؟"

وکی مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ معاملات کو سرسری انداز سے دیکھنے کا عادی ہے لیکن ہم کسی طے شدہ نظریے پر کام نہیں کریں گے۔ ہمیں مزید حقائق تلاش کرنا ہوں گے۔ اب تک کی معلومات ناکافی ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس سبز جیکٹ کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ جیکٹ اٹھائی اور اسے کھڑکی کے قریب لے آیا اور ہم دونوں اسے غور سے دیکھنے لگے۔

"اس پر تو گرد کی تہ جمی ہوئی ہے۔" میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "خاص طور پر سامنے والا حصہ پوری طرح گرد آلود ہے۔ اس کے علاوہ درمیانی بٹن پر ایک سفید نشان بھی نظر آ رہا ہے۔"

"بظاہر یہ چاک کا نشان معلوم ہوتا ہے۔ اگر تم غور سے دیکھو تو دوسرے بٹنوں پر بھی ہلکے ہلکے سفید دھبے نظر آ رہے ہیں جبکہ جیکٹ کی پشت پر زیادہ گرد نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جیکٹ کو ایک جانب گھمایا اور دائیں جانب سے ایک بال برابر ریشہ انگلیوں سے پکڑ کر مجھے تھما دیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "یہ تو مجھے جو کی بالی کا ریشہ معلوم ہوتا ہے۔" جیکٹ پر اسی طرح کے دو اور ریشے نظر آئے جس کا مطلب تھا کہ وہ شخص جو کے کھیت سے گزرا ہے۔ اور جیکٹ کے سامنے والے حصے کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے کسی جگہ زمین پر رینگنا بھی پڑا ہے۔

فیملی پلاننگ

لڑکے نے کہا۔ "ماشاء اللہ ہم چوبیس بہن بھائی ہیں۔"

"کیا تمہارے گھر فیملی پلاننگ والے نہیں آتے؟" گرل فرینڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں سے ایک آنٹی روز آتی ہیں۔"

"کیا وہ تمہارے والدین کو کچھ نہیں سمجھاتیں؟"

"سمجھاتی ہوں گی... ان سے بھی میرا ایک سوتیلا بھائی اور تین بہنیں ہیں... میں انہیں آنٹی کہتا ہوں!" لڑکے نے اطمینان سے بتایا۔

مرسلہ: شگفتہ ناز، منڈی بہاؤالدین

”ہاں، دیکھنے میں تو یہ زمینی مٹی ہی لگتی ہے لیکن پولٹن کی لیبارٹری سے اس کا تجزیہ کروانے کے بعد اس بارے میں مزید معلومات مل سکتی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہ جیکٹ اس کے حوالے کر دیں لیکن اس سے پہلے ہمیں بھی ایک مرتبہ اس کی جیبوں کی تلاشی لینی چاہیے۔“

میں نے ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور چونکتے ہوئے بولا۔ ”باب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ جیب سے باہر نکالا جس میں تھوڑی سی مٹی اور ایک دو چھوٹے ٹکڑے چاک کے تھے۔ ”لگتا ہے کہ وہ کچی زمین پر گھسٹتا رہا ہے۔“

”ایسا ہی ہوا ہے۔“ وکی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے ہاتھ پر نظر ڈالی اور جو کچھ جیکٹ کی جیب سے برآمد ہوا تھا، اس کا معائنہ کرنے لگا۔ جس میں سرخ رنگ کی مٹی اور ایک مٹر کے دانے کے برابر چاک کا ٹکڑا شامل تھا۔

”یہ عام مٹی سے مختلف ہے۔“ وکی نے کہا۔ ”میں یہ جیکٹ لے کر پولٹن کے پاس جا رہا ہوں۔ جب تک وہ اس مٹی کا تجزیہ کر کے اپنی رپورٹ تیار کرے گا، میں اس دوران ایک چکر ایڈ کنسٹن کا لگا لوں گا۔ شاید وہاں سے مزید معلومات مل سکیں۔“

وہ لیبارٹری چلا گیا جہاں ہمارا معاون پولٹن ضرورت کے مطابق مختلف تجربے اور تجزیے کرتا رہتا تھا۔ وکی نے وہ جیکٹ اس کے حوالے کی اور واپس آ گیا۔ پھر ہم دونوں ایک ٹیکسی کے ذریعے ٹولی اسٹریٹ پہنچے۔ ہماری نظر ایک ہارڈویئر کی دکان پر گئی اور وکی نہ جانے کیا سوچ کر اس دکان میں داخل ہو گیا۔ منیجر کوئی شریف آدمی تھا جس نے وکی کے چبھتے ہوئے سوالات کا بڑے محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”گزشتہ جمعرات اس دکان میں کئی لوگ خریداری کے لیے آئے تھے تمہارا کہنا یہ ہے کہ وہ پونے بارہ بجے کے قریب آئے ہوں گے۔ اگر تم یہ بتا سکو کہ انہوں نے یہاں سے کیا چیز خریدی تھی تو ہم بل کی نقل دیکھ کر کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”میں خود بھی نہیں جانتا کہ انہوں نے کیا خریدا ہوگا۔“ وکی نے کہا۔ ”وہ ایک پتلی رسی بھی ہو سکتی ہے جس کی لمبائی تیس چالیس گز ہو لیکن میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔“

میں نے حیرت سے وکی کی طرف دیکھا۔ ابھی تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ہمارے پاس آگے بڑھنے کے لیے کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن وکی نے تحقیقات شروع ہونے سے پہلے ہی ایک امکان کی نشاندہی کر دی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معمے کے کسی معروضی حل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں ابھی اسی سوچ میں غرق تھا کہ منیجر اپنے معاون کے ہمراہ ایک کتاب لے کر آ گیا اور اس نے ایک صفحے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”اس میں ایک نوّے فٹ باریک رسی کی فروخت کا اندراج ہے اور میرے معاون کو یاد آ گیا کہ اس نے یہ اسی جمعرات کے روز دوپہر میں بیچی تھی۔“

”ہاں۔“ معاون نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ وہ شخص اس رسی کو اپنے ہینڈ بیگ میں رکھنا چاہ رہا تھا اور ہم تین آدمیوں نے بڑی مشکل سے اس کا بنڈل بنا کر بیگ میں ڈالا کیونکہ نئی رسی عام طور پر سخت ہوتی ہے اور آسانی سے نہیں مڑتی۔“

”کیا تم ان دونوں کا حلیہ بتا سکتے ہو اور انہوں نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟“

”ان میں سے ایک نسبتاً عمر رسیدہ اور کلین شیو تھا جبکہ دوسرے شخص کے چہرے پر داڑھی تھی۔ اس نے سبز رنگ کی جیکٹ اور کپڑے کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ بس مجھے اتنا ہی یاد ہے۔“

”یہی بہت ہے۔“ وکی نے کہا۔ ”میں تمہارا شکرگزار ہوں اور چاہوں گا کہ مجھے اتنی ہی لمبی ویسی رسی دے دو۔“

اس وقت تک میری حیرت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وکی اس رسی کا کیا کرے گا جو عام طور پر سمندر یا کنوئیں کی گہرائی ناپنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کوئی کام بلاضرورت نہیں کرتا اس لیے میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اگلی کارروائی کے لیے تیار کر لیا لیکن بہت زیادہ سوچنے کے باوجود میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک گردآلود جیکٹ اور اس پتلی رسی کے درمیان کیا تعلق بنتا ہے؟ اب میں پولٹن کی اس رپورٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے جیکٹ پر لگی ہوئی مٹی اور چاک کے ٹکڑوں کا تجزیہ کرنے کے بعد بنائی ہوگی۔

پولٹن نے ایک خاص مشین کے ذریعے جو دیکھنے میں ویکیوم کلینر جیسی لگتی تھی، جیکٹ کے مختلف حصوں پر لگی ہوئی مٹی کو الگ کیا اور ایک بڑے کاغذ پر ان کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنا کر انہیں شیشے سے ڈھک دیا۔ ہر ڈھیری پر ایک لیبل لگا ہوا تھا جس میں اس کے اجزا کی تفصیل کے علاوہ یہ بھی درج تھا کہ یہ نمونہ جیکٹ کے کس حصے سے لیا گیا ہے۔ میں نے دوربین کے ذریعے ان میں سے کچھ نمونوں کا معائنہ کیا لیکن مجھے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ اس میں زرد رنگ کی ریت، تھوڑے سے چاک کے ذرّات، راکھ، بغیر جلے پتھر اور کوئلے کے ذرّات بھی شامل تھے جبکہ ایک نمونے میں مجھے تتلی کے پروں کے ذرّات بھی نظر آئے۔ ان باتوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ جیکٹ پہننے والا کسی ایسے علاقے میں گیا تھا جہاں چونے کا پتھر پایا جاتا ہے اور اس نے ریل کے ذریعے بھی سفر کیا تھا۔

میں جس وقت دوربین کے ذریعے مٹی کے نمونوں کا جائزہ لے رہا تھا تو اسی دوران پولٹن نے ایک نئی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے ایک چھوٹی چمٹی کے ذریعے ان نمونوں میں موجود تمام چاک کے ٹکڑے ایک شیشے کی پلیٹ پر رکھے اور انہیں پانی میں ڈبو کر برش سے دھونا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ وقفے وقفے سے دودھیا پانی کو ایک گلاس میں انڈیلتا جا رہا تھا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ چاک، چھوٹے چھوٹے خلیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جنہیں صرف پانی میں بھگو کر برش کے ذریعے علیحدہ کیا جا سکتا ہے پھر اس مشق کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ چاک ہی تھی اور اس میں ان خلیوں کی موجودگی لازمی تھی۔ پھر اس تجربے کی کیا ضرورت تھی جس کے بارے میں عام آدمی بھی جانتا ہے؟ جب میں نے پولٹن سے اس کی وجہ جاننا چاہی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا لیکن میں جانتا تھا کہ وکی کا کوئی کام بے وجہ نہیں ہوتا۔

کچھ دیر بعد وکی بھی لیبارٹری میں آ گیا۔ اس نے مٹی کے نمونوں کو دیکھ کر میری رائے کی تصدیق کر دی پھر اس نے ان چاک کے ٹکڑوں کو شیشے کی سلائڈز پر رکھا اور دوربین کی مدد سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے کاغذ پنسل سنبھالی اور اجزا کی تفصیل لکھنے کے ساتھ ساتھ ان خلیوں کی ڈرائنگ بھی بنانے لگا۔ اس کے بعد میں اسے وہیں چھوڑ کر کچھ کتابیں لینے چیرنگ کراس روڈ چلا گیا۔

جب واپس آیا تو میں نے اسے ایک نقشے پر جھکا پایا۔ وہ کینٹ کے علاقے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بنائی ہوئی ڈرائنگ اور ان خلیوں کے بارے میں معلوماتی لٹریچر بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تک تم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو گے کہ میریل کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”فی الحال میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن اصل حقائق غیر واضح ہیں۔ ہمارے پاس کچھ علامات ہیں لیکن انہیں نمایاں کرنا ایک مشکل کام ہوگا۔ یہ ایک ایسا کیس ہے جس میں آپ ایک مفروضہ قائم کرتے اور پھر اسے خارج کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے کل مجھے ایک اور چکر لگانا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں جانے کی بات کر رہا ہے۔

”میرے ذہن میں ایک مفروضہ ہے۔ شاید یہ غلط ہو۔ ایسی صورت میں ہم دوسرے مفروضے پر کام کریں گے پھر تیسرے پر اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے۔ پہلے مفروضے کو جانچنے کے لیے مجھے کینٹ جانا ہوگا۔“

”تمہیں اس خطرناک علاقے میں تنہا نہیں جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سفر میں تمہیں حفاظت اور مدد کے لیے میری ضرورت ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ تم اس سے اتفاق کرو گے۔“

”کیوں نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی تم میری طرح اس کیس میں بہت دلچسپی لے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ کھا لینا چاہیے تاکہ کل کے معرکے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔“

دوسرے روز صبح گیارہ بجے وکی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے پولٹن کو کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا اور میں ساتھ لے جانے والے سوٹ کیس میں رکھی اشیا کا جائزہ لے رہا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر دروازے پر ہونے والی مخصوص دستک سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ آنے والا باب کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باب نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کی نگاہ سیدھی ہمارے سوٹ کیس پر گئی اور وہ بولا۔

”کیا کسی مہم پر جانے کی تیاری ہے؟“

”ہاں، ہم ایک مختصر دورے پر کینٹ جا رہے ہیں اور ہماری اصل منزل گریوی سینڈ ہے۔“

”گریوی سینڈ۔“ باب نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ بے چارے میریل کا پسندیدہ تفریحی مقام تھا۔ کہیں تمہارے اس سفر کا تعلق اس کی پراسرار گمشدگی سے تو نہیں ہے؟“

”حقیقت میں ایسا ہی ہے۔“ وکی نے جواب دیا۔ ”اسے تم ابتدائی تحقیق بھی کہہ سکتے ہو۔“

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آج میرے پاس کوئی کام نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہوگا۔"

"ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وکی نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "ممکن ہے کہ تمہارے ساتھ ہونے سے ہمیں کچھ فائدہ ہو جائے۔ پولٹن تمہارے کلرک کو فون کر کے غیر حاضری کی وجہ بتا دے گا یا تم اگر چاہو تو دفتر کا ایک چکر لگا کر آجاؤ۔ ہمارے پاس ابھی کافی وقت ہے۔"

باب نے دوسری تجویز کو پسند کیا۔ اس طرح اسے اپنے لمبے کوٹ اور بڑے ہیٹ کی جگہ جیکٹ اور ٹوپی پہننے کا موقع مل سکتا تھا۔ ہم بھی ساتھ ہی چل دیے۔ اس کا دفتر چیرنگ کراس پر واقع تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سفر کے دوران بھی وکی نے اس سے مسٹر کرک کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی باب نے اس سلسلے میں کوئی بات کی۔

اسٹیشن سے باہر آنے کے بعد وکی بائیں جانب جانے والی سڑک پر مڑ گیا جس کے مخالف سمت ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ یہاں سے اس نے جنوب کا رخ کیا اور مرکزی شاہراہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد شہری علاقہ ختم ہو گیا اور ہم اس کے مضافات میں داخل ہو گئے جہاں دیہی زندگی کے آثار واضح طور پر نمایاں تھے۔ یہاں سے ایک راستہ آبادی کی طرف جاتا تھا جہاں چھوٹے چھوٹے خوب صورت کاٹیجز بنے ہوئے تھے اور ان کے سرسبز لان موسم گرما کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہے تھے۔ سامنے کی جانب پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن کا اختتام ایک بڑے سے گیٹ پر ہو رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر وکی نے اپنی جیب سے نقشہ نکالا اور نقشے میں لگائے ہوئے نشانات سے اس جگہ کا موازنہ کرنے کے بعد بولا۔ "ہمیں اسی راستے پر آگے بڑھنا ہے۔ چند منٹوں بعد معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں کوئی سراغ ملتا ہے یا یہ سفر یونہی رائگاں گیا۔"

ہم نے اونچائی کی جانب ایک پگڈنڈی پر آگے بڑھنا شروع کیا اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے جس کے دوسری جانب ایک زرخیز وادی نظر آ رہی تھی اور اونچے درختوں کے عقب میں کسی کلیسا کے مینار نمایاں تھے۔

"واہ۔" باب نے اپنا ہیٹ اتارا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "کوئی سراغ ملتا ہے یا نہیں لیکن یہ سفر بہت خوش گوار ثابت ہوا ہے۔ دیکھو، ان جھاڑیوں کے گرد کیسی چھوٹی چھوٹی تتلیاں منڈلا رہی ہیں اور جو کے کھیت بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔"

وہ واقعی ایک خوب صورت نظارہ تھا لیکن جو کے کھیتوں پر نظر پڑتے ہی میرا دھیان سبز جیکٹ پر لگے ہوئے جو کے تنکوں کی طرف چلا گیا۔ کھیتوں کے درمیان سے ایک چوڑی پگڈنڈی گزر رہی تھی اور آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں جانب ایک تالاب نظر آ رہا تھا جس کے گرد باڑھ کھینچ دی گئی تھی۔ ہم اس چوڑی پگڈنڈی پر آگے بڑھتے رہے۔ تالاب کے قریب پہنچ کر میری نظر ایک اور تنگ راستے پر گئی جو کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ کوئی شخص جو کی بالیوں کو پامال کرتا ہوا یہاں سے گزرا ہے۔ وکی بھی اسی راستے پر ہو لیا اور غور سے زمین کا جائزہ لینے لگا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ باڑھ کے قریب پہنچ کر ہمیں اندر جانے کا راستہ نظر آ گیا۔ ہم نے وہاں رک کر دیکھا تو وہاں ایک گہرا خلا نظر آیا۔ وکی نے وہاں رک کر بغور جائزہ لینا شروع کیا جیسے اسے کسی سراغ کی تلاش ہو۔ پھر اچانک اس کی نظر باڑھ کے ایک پول کی طرف گئی جس کے ساتھ رسی کا ایک چھوٹا ٹکڑا بندھا ہوا تھا اور اس کے رگڑ کھائے ہوئے سروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رسی کسی بھاری بوجھ کی وجہ سے ٹوٹی ہے۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو مجھے وہاں ایک گہرا گڑھا نظر آیا جس کی تہ میں ایک جانب بڑا سا دائرہ نما سوراخ نظر آ رہا تھا جو رات کی تاریکی کی طرح سیاہ تھا۔

"مجھے تو یہ کوئی پرانا غار معلوم ہوتا ہے۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"ہاں، یہ غار ہی ہے۔" وکی نے جواب دیا۔

"اگر یہ واقعی کوئی قدیم غار ہے تو مجھے ڈر ہے کہ یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہو گی۔" باب نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "قدیم غار تلاش کرنا میریل کا مشغلہ تھا۔ خدا نہ کرے کہ وہ اس غار میں اتر گیا ہو۔"

"مجھے خدشہ ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" وکی نے جواب دیا۔ "باڑھ کے پول کے ساتھ جو رسی کا ٹکڑا بندھا ہوا ہے، وہ بالکل ویسا ہی ہے جو میرے سوٹ کیس میں موجود ہے اور میں نے بھی یہ رسی اسی دکان سے خریدی تھی جہاں سے یہ رسی لی گئی تھی۔"

یہ کہہ کر اس نے سوٹ کیس سے رسی کا گچھا نکالا اور اسے پول سے بندھی ہوئی رسی سے ملا کر دیکھنے لگا۔ دونوں ایک جیسی تھیں۔ اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور بولا۔ "ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"کیا ہم اس غار میں اتریں گے؟" باب بوکھلاتے ہوئے بولا۔

"اگر ممکن ہوا تو پہلے میں جاؤں گا ورنہ نہیں ۔۔۔۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ اوپر ہی رہو۔"

"بے وقوف۔" باب جھلاتے ہوئے بولا۔ "میں اتنا گیا گزرا نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ مجھے کوہ پیمائی کا تجربہ ہے اور میں کسی سہارے کے ذریعے نیچے اتر سکتا ہوں۔ تم خود دیکھ سکو گے کہ وہاں کوئی شخص رسی سے بندھا ہوا پڑا ہو گا۔"

"ہاں۔" وکی نے اس کی تائید کی۔ "مجھے نہیں لگتا کہ کوئی شخص دوبارہ اوپر آیا ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" باب نے اعتراف کیا۔ "ٹوٹی ہوئی رسی سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے پاس بھی ویسی ہی رسی ہے۔"

"تم کیا کہتے ہو؟" وکی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ رسی ٹوٹی نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "اسے کاٹا گیا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے سرے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"میں نے بھی اسے دیکھتے ہی یہ اندازہ لگایا تھا۔" وکی بولا۔ "ویسے بھی اس سائز اور معیار کی رسی ایک آدمی کے بوجھ سے نہیں ٹوٹ سکتی۔"

باب نے ایک نظر ٹوٹی ہوئی رسی پر ڈالی اور بولا۔ "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ کسی دوسرے شخص نے جان بوجھ کر یہ رسی کاٹ دی تا کہ نیچے اترنے والا دوبارہ اوپر نہ آسکے؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم غلطی پر ہو۔ یقیناً اس رسی میں کوئی نقص ہوگا۔"

وکی نے اپنی رسی کا ایک سرا کھولا اور اس کا ایک پھندا سا بنا کر کندھوں سے گزارتے ہوئے بازوؤں کے نیچے لے گیا۔ اس طرح گویا اس نے اپنے آپ کو اس رسی سے باندھ لیا پھر وہ غار کی طرف منہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"بہتر ہوگا کہ تم اس کے دوسرے سرے کو دو مرتبہ بل دے کر باندھ دو۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی بھی وقت اس کی گرہ ڈھیلی نہ ہونے پائے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سوٹ کیس سے ایک ٹارچ نکالی اور اس میں سیل ڈالنے کے بعد ایک بینڈ کے ذریعے اپنے ماتھے پر لگا لیا۔ اپنی تیاری مکمل کرنے کے بعد اس نے غار میں اترنا شروع کیا اور ڈھلوان سطح پر قدم جماتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پھر اس نے کچھ نیچے جا کر ٹارچ کی مدد سے سوراخ میں جھانکا اور رسی پکڑ کر سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ غار صرف بیس فٹ گہرا ہے اور اس میں بہ آسانی اترا جا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر جھکا اور تھوڑی دیر میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ کافی تیزی سے نیچے اترا۔ جیسے ہی رسی ڈھیلی ہوئی، میں نے اسے اوپر کھینچ لیا لیکن باب نے کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی اور جونہی پھندے والا سرا باہر آیا، اس نے لپک کر اسے قبضے میں لے لیا اور میرے احتجاج کے باوجود وہ پھندا اپنے بازوؤں کے نیچے ڈال لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اب میں کس طرح نیچے جاؤں گا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں صرف ایک نظر ڈال کر واپس آجاؤں گا پھر تم چلے جانا۔"

اس سے بحث کرنا فضول تھا۔ میں نے ایک بار پھر پول سے بندھی ہوئی رسی کو چیک کیا اور وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غار میں اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد رسی کے تناؤ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غار کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنی کمر سے پھندا باہر نکال دیا تو رسی ڈھیلی پڑ گئی۔ اس وقت مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی اور میں نے رسی اوپر کھینچ لی۔ اصولاً مجھے باب کے واپس آنے تک اوپر ہی رہنا تھا لیکن مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے تجسس سے مجبور ہو کر وہ پھندا کندھوں سے گزار کر بازوؤں کے نیچے ڈال لیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ رسی کا دوسرا سرا پول کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا ہے۔ غار میں اترنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ہم سے پہلے بھی لوگ یہاں آتے رہے ہیں کیونکہ غار کی دیواروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے قدمچے بنے ہوئے تھے جن پر پاؤں جما کر آسانی سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی میں تہ کے قریب پہنچا، میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑی اور دو ہاتھوں نے مجھے سنبھال لیا۔ یہ وکی تھا۔ اس نے چاک کے فرش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، تم کہاں کھڑے ہو؟"

میں نے جھک کر دیکھا۔ میرے قدموں کے نزدیک ایک شخص منہ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اس کی گردن کے ساتھ رسی کا ایک بے ترتیب گچھا لپٹا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے چاک کے فرش پر قدم رکھا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ ہم اس وقت ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے ہوئے تھے جس

کے بائیں جانب ایک سرنگ کا دہانہ تھا۔ وکی اور باب، لاش کے قدموں کے پاس کھڑے ایک ریوالور کا معائنہ کر رہے تھے جو باب کے ہاتھوں میں تھا۔

’’اسے یقیناً گولی ماری گئی ہے۔‘‘ باب نے کہا۔ ’’کیونکہ چیمبر میں ایک گولی کم ہے اور نال سے بھی بو آرہی ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے۔‘‘ وکی نے کہا۔ ’’لیکن اس کے جسم پر گولی کا زخم نظر نہیں آرہا بلکہ اس کی موت سینے پر چاقو کے وار سے واقع ہوئی ہے۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے لاش پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور میں نے اس کی تصدیق کے لیے تھوڑا سا پلٹ کر دیکھا تو وہ بولا۔ ’’یہ مسٹر میریل کی لاش ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ریوالور پڑا ہوا تھا۔‘‘

’’یہ تو واضح ہوگیا کہ مسٹر میریل کو گولی نہیں لگی اور نہ ہی انہوں نے خودکشی کی بلکہ ان کی موت، چاقو لگنے سے ہوئی ہے۔‘‘

اسی لمحے وکی آگے کی طرف جھکا اور اس نے ٹارچ کی روشنی سرنگ کے دہانے پر ڈالی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر باب اور میں حیرت زدہ رہ گئے۔ سرنگ کے آخری سرے پر تقریباً چالیس فٹ دور ایک اور لاش پڑی ہوئی تھی۔ باب نے فوراً ہی اس جانب بڑھنا شروع کردیا۔ میں اور وکی بھی اس کے پیچھے چل دیے۔ سرنگ کی چھت بہت نیچی تھی اس لیے ہمیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ مردہ شخص کمر کے بل زمین پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے پہلو میں ایک چھوٹی سی ٹارچ پڑی ہوئی تھی۔ وکی نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی تو باب چلا اٹھا۔

’’اوہ میرے خدا! یہ تو کرک کی لاش ہے اور ساتھ ہی اس کا چاقو بھی پڑا ہوا ہے۔‘‘ وہ جھک کر چاقو اٹھانے ہی والا تھا کہ وکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ’’اسے مت اٹھانا۔ اس پر یقیناً اس شخص کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے جس نے مسٹر میریل پر حملہ کیا تھا۔ یہ ایک اہم ثبوت ہوسکتا ہے۔‘‘

’’اب بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟‘‘ باب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’ایک طرف میریل کی لاش ہے جس کے سینے میں چاقو کا زخم ہے اور اس کے برابر میں ایک ریوالور پڑا ہوا ہے۔ دوسری جانب کرک کی لاش ہے جس کے سینے پر گولی کے زخم کا نشان موجود ہے اور اس کے پاس ایک چاقو پڑا ہوا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر یکے بعد دیگرے وار کیے اور تمہیں کیا ثبوت چاہیے؟‘‘

’’کیا تم اپنے بیان کی وضاحت کرسکتے ہو؟‘‘ وکی نے پُرسکون انداز میں کہا۔

’’صاف نظر آرہا ہے کہ پہلے کرک نے میریل پر چاقو سے وار کیا اور میریل نے گولی مار کر اسے ہلاک کردیا پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن رسی ٹوٹ گئی اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بھی مرگیا۔‘‘

’’تمہارے خیال میں پہلے کس کی موت واقع ہوئی... ہوگی؟‘‘ وکی نے پوچھا۔

’’ظاہر ہے کہ پہلے کرک ہی مرا ہوگا۔‘‘ باب نے جواب دینے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔ ’’اس کی لاش وہیں پڑی ہے جہاں وہ گولی لگنے کے بعد گرا ہوگا اور سرنگ کے فرش پر خون کے دھبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میریل نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دہانے پر پہنچ کر وہ بھی جاں بحق ہوگیا۔‘‘

وکی نے بڑے پُراسرار انداز میں سر ہلایا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک بات آئی اور میں نے باب سے کہا۔ ’’تم اس سبز جیکٹ والے کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو؟‘‘

’’اوہ معاف کرنا...... یہ ہولناک منظر دیکھ کر میں واقعی اسے بھول گیا۔‘‘ باب شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن تمہیں اس کا خیال کیسے آیا؟ کیا یہاں اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت ملا ہے؟‘‘

’’یہ میں نہیں جانتا۔‘‘ میں نے جواب میں کہا۔ ’’لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس نے اسٹور سے رسی خریدی اور اسے مسٹر میریل کے ساتھ لندن برج اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ اور ان باتوں سے میں یہی نتیجہ اخذ کرسکتا ہوں کہ اسی سبز جیکٹ کی وجہ سے وکی یہاں تک پہنچا ہے۔‘‘

’’تمہارا کہنا کسی حد تک درست ہے لیکن ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔‘‘ وکی نے کہا۔ ’’فی الحال میں کچھ حقائق کی طرف تمہاری توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ دونوں لاشوں پر لگنے والے زخم ایک ہی جگہ پر ہیں۔ یعنی بائیں جانب سینے کے نیچے اور دوسری بات یہ کہ فرش کے اس حصے کو غور سے دیکھو، جہاں میں روشنی ڈال رہا ہوں۔ اس جگہ تمہیں کسی چیز کو گھسیٹنے کے نشانات نظر آئیں گے اور خون کے نشانات سے بھی یہی لگتا ہے کہ قطرے نہیں بلکہ چھینٹے ہیں جو لاش کو گھسیٹنے کے دوران زمین پھیلتے گئے۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے لاش کو پلٹا جس کے پورے حصے پر چاک لگی ہوئی تھی۔ اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاش کو زمین پر گھسیٹا گیا ہے۔ اگر یہ گولی لگنے کے بعد اسی جگہ گرا ہوتا تو لاش کی یہ پوزیشن نہ ہوتی۔ ایک بات اور کہ رسی خریدنے کے بعد اسے ہینڈ بیگ میں رکھا گیا تھا۔ رسی تو موجود ہے لیکن ہینڈ بیگ کہیں نظر نہیں آرہا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نے رسی کو باہر سے کاٹا ہے اور یہ کام ان دونوں کے قتل ہوجانے کے بعد ہی ہوا ہوگا۔‘‘

اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے جیب سے رومال نکالا اور اس میں چاقو لپیٹ کر قمیص کی اوپر والی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ ہمیں لے کر میریل کی لاش کے پاس آیا اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

’’تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟‘‘ باب نے پوچھا۔

’’چابیاں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’جو کہ اس کی جیبوں میں نہیں ہیں۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے کیونکہ اسی روز سبز جیکٹ والا مسٹر میریل کے گھر میں بھی داخل ہوا تھا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ باب نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ تم اس جرم کو کس طرح دیکھ رہے ہو؟‘‘

وکی نے لحہ بھر توقف کیا پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ’’میرا خیال ہے کہ وہ تینوں یعنی مسٹر میریل، کرک اور سبز جیکٹ والا، اکٹھے یہاں آئے تھے۔ انہوں نے غار میں اترنے کے لیے رسی کو مضبوطی سے پول کے ساتھ باندھ دیا۔ پہلے سبز جیکٹ والا نیچے اترا اور سرنگ کے باہر ہی بقیہ ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے بعد مسٹر میریل کی باری تھی۔ وہ جیسے ہی نیچے پہنچے تو اجنبی شخص نے ان پر چاقو سے حملہ کردیا۔ اس کے بعد کرک نیچے آیا تو اسے بھی اسی جگہ گولی ماردی۔ پھر وہ کرک کی لاش کو گھسیٹتا ہوا سرنگ کے اندر لے گیا اور جہاں تک ممکن ہوسکا، اس نے نشانات مٹانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چاقو اور ٹارچ لاش کے پاس رکھی اور ریوالور مسٹر میریل کی لاش کے قریب ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے مسٹر میریل کی جیب سے چابیاں نکالیں اور رسی کے ذریعے غار سے باہر آگیا۔ اوپر آنے کے بعد اس نے چھوٹی آری سے رسی کاٹ کر اسے غار میں پھینک دیا اور خود اگلی ٹرین کے ذریعے لندن واپس آگیا اور سیدھا مسٹر میریل کے گھر گیا۔ وہاں اس نے سیف کھول کر اپنے مطلب کی چیز نکالی اور وہاں سے چلا گیا۔‘‘

باب نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ’’واقعی اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا تھا۔‘‘

’’اس میں کوئی شک نہیں۔‘‘ وکی اس سے متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن اس پر عمل کرتے ہوئے اس سے سنگین نوعیت کی غلطیاں ہوئیں اور وہ قدم قدم پر ایسے نشانات چھوڑتا چلا گیا جن کی بدولت ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس دنیا میں صرف وہی ایک عقل مند ہے، باقی سب بے وقوف رہتے ہیں۔‘‘

اس کے بعد وکی نے واپس چلنے کا اشارہ کیا اور ہم باری باری رسی کے ذریعے اوپر آگئے۔ پھر وکی نے رسی کو پول سے علیحدہ کیا اور اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پہلے سے بندھا، ٹوٹی ہوئی رسی کا سرا بھی نکال لیا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ وہاں دور دور تک کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی گاؤں کی طرف واپس آتے ہوئے ہماری کسی سے ملاقات ہوئی۔ گویا وہ قتل کرنے کے لیے انتہائی مناسب جگہ تھی۔

’’میرا خیال ہے کہ تم پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دو گے؟‘‘ باب نے کہا۔

’’ہاں۔‘‘ وکی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ’’میں چیف کانسٹیبل کو فون کر کے تمام حقائق سے آگاہ کروں گا اور مشورہ دوں گا کہ فی الحال کچھ دنوں کے لیے تحقیقات ملتوی کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں مجرم خود ہی جال میں پھنس جائے گا۔‘‘

چیف کانسٹیبل اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی بھی جرم کی تحقیقات کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ اس نے وکی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تحقیقات تین ہفتے کے لیے ملتوی کردی اور مقامی پولیس کو صرف یہ ہدایت کی کہ کسی نے اسے مذکورہ علاقے میں ٹوٹی ہوئی رسی کے بارے میں بتایا ہے لہٰذا اس معاملے کی چھان بین کر کے تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں۔ اس بارے میں ہمارا نام ظاہر نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی نے ثبوت فراہم کرنے کے لیے کہا۔

اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت اس وقت ہوئی جب میں اور وکی، کچھ کاغذات سمیت باب کے دفتر پہنچے اور اس کے کلرک پیگ کو وہ پلندا تھما دیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سبز جیکٹ والے کو مسٹر میریل کے ہمراہ دیکھا تھا۔ وکی نے اس سے کہا۔ ’’کیا تم اس شخص کو داڑھی اور مونچھوں کے بغیر بھی پہچان سکتے ہو؟‘‘

’’ہاں، میں اسے آنکھوں سے پہچان لوں گا۔‘‘ پیگ

نے پورے یقین اور اعتماد سے کہا۔ ”اس کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں۔ ہلکی سبزی مائل جس میں تھوڑی سی پیلاہٹ بھی جھلک رہی تھی۔ میں نے آج تک کسی شخص کی ایسی آنکھیں نہیں دیکھیں۔“

پیگ وہ کاغذات لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا تا کہ ان کا معائنہ کر سکے۔ دس منٹ بعد دفتر کا بیرونی دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ وہ بھاری بھر کم، کلین شیو اور قدرے سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس کی زرد آنکھیں مجھے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ اس نے ہماری جانب توجہ دیے بغیر استقبالیہ کلرک سے کہا۔

”میرا نام ہورڈر ہے اور میں نے مسٹر باب سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے۔“

کلرک کوئی جواب دیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عین اسی وقت پیگ اپنے کمرے سے باہر آیا اور جیسے ہی اس نے ہورڈر کو دیکھا، وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی گلی کے نکڑ پر دو کتے اچانک ہی آمنے سامنے آجائیں۔ پیگ کو دیکھتے ہی ہورڈر کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ پیگ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا تم مسٹر باب سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے قدرے جھلاہٹ سے کہا۔ ”میں اپنا نام بتا چکا ہوں، ہورڈر۔“

پیگ واپس پلٹا اور مسٹر باب کے کمرے میں چلا گیا۔ البتہ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا تھا۔

”مسٹر ہورڈر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ مجھے اس کی آواز سنائی دی پھر وہ باہر آیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ”تم بیٹھو، مسٹر باب ابھی آتے ہیں۔“ پھر اس نے کھونٹی سے اپنا ہیٹ اٹھایا۔ گھڑی پر نظر ڈالی اور باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے دو منٹ بعد مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن کسی نے دروازے پر دستک دی اور نہ ہی کوئی اندر آیا۔ پھر باب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا شخص باہر آیا۔ وہ سراغ رساں ملر تھا۔ وہ سیدھا چلتا ہوا بیرونی دروازے تک گیا۔ باہر جھانکا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر ہورڈر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا خیال ہے کہ تم سیموئل ہورڈر ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور تمہیں مسٹر میریل کے گھر میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ تمہیں اس سلسلے میں خبردار کر دوں....“

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہورڈر اپنی جگہ سے اٹھا اور کوٹ کی اندرونی جیب میں دایاں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ اسی لمحے وکی نے پھرتی دکھاتے ہوئے اس کا دایاں بازو پکڑ لیا اور بائیں بازو کو ملر نے جکڑ لیا۔ میں نے اس کے ریوالور پر جھپٹا مارا اور اس کی نال کا رخ فرش کی جانب کر دیا۔ لیکن ہمارا قیدی بہت طاقتور تھا۔ وہ ایک وحشی درندے کی طرح اپنے آپ کو ہماری گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کی انگلی ابھی تک ریوالور کے ٹریگر پر تھی۔ استقبالیہ کلرک یہ منظر دیکھ کر خاموشی سے کھسک گئی۔ شور کی آواز سن کر باب بھی ایک لمبا ساڈنڈا لہراتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔

یہ تماشا زیادہ دیر جاری نہ رہا۔ چند منٹوں بعد ہی دو تنومند اور قد آور پولیس والے آ گئے اور انہوں نے ہورڈر کو قابو کر لیا۔ اس کا ریوالور زمین پر گر چکا تھا اور ایک کانسٹیبل اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”اب اسے سکون آجائے گا۔“

جب پولیس والے ہورڈر کو اپنے ساتھ لے گئے تو وکی نے ملر سے کہا۔ ”تم نے اس پر صرف غیر قانونی طریقے سے مسٹر میریل کے گھر میں داخل ہونے کا الزام کیوں لگایا؟“

”ہاں۔“ ملر نے جواب دیا۔ ”پہلے ہم اس کی انگلیوں کے نشان کا موازنہ اس چاقو پر پائے گئے نشانات سے کریں گے جو تم نے ہمیں دیا تھا۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ اس چاقو پر ہورڈر ہی کی انگلیوں کے نشانات ہیں تو اس پر قتل کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔“

چاقو پر ہورڈر ہی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس کے علاوہ جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے مسٹر میریل کے گھر کی چابیاں اور وہ دوسری وصیت بھی برآمد ہو گئی جو ہورڈر نے مسٹر میریل کے سیف سے چرائی تھی۔ گو کہ اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا تھا لیکن حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی اسے لے ڈوبی اور وہ اپنی حماقتوں کی وجہ سے اس کیس میں بُری طرح پھنس گیا۔

اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی میرے ذہن میں کئی سوالات تھے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ پیگ نے مسٹر میریل کے ساتھ ہورڈر کو اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر کرک اس غار تک کیسے پہنچ گیا اور یہ کہ وکی کے ذہن میں اس غار کا خیال کس طرح آیا؟ جب میں نے یہی بات اس سے پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس کیس میں امکانات اور مفروضوں کے ساتھ ساتھ قسمت نے بھی ہمارا بہت ساتھ دیا۔ جب باب نے پہلی بار مجھے مسٹر میریل کی گمشدگی اور ان کی دوسری وصیت کے بارے میں بتایا تو میں اسی وقت سمجھ گیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ مسٹر میریل کی غیر موجودگی میں ان کے گھر سے دوسری وصیت کا چوری ہو جانا یہ ثابت کر رہا تھا کہ اس کیس میں دو افراد ملوث ہو سکتے ہیں۔ یعنی کرک اور ہورڈر کیونکہ ان دونوں کو مسٹر میریل کے مرنے کی صورت میں ہزاروں پاؤنڈز مل سکتے تھے اور اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کرک کی موت مسٹر میریل سے پہلے واقع ہو گئی تو مسٹر میریل کے مرنے کے بعد تمام جائداد ہورڈر کے حصے میں آجائے گی۔ ورنہ آدھی جائداد کے حق دار کرک یا اس کے وارث ہوں گے۔“

پہلے میرا شک کرک پر تھا لیکن مسٹر میریل کے گھر سے سبز جیکٹ برآمد ہونے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اس واردات میں ہورڈر ملوث ہے۔ جب میں نے اس جیکٹ پر لگے ہوئے چاک کے ذرّات، جو کے تنکوں اور اس پر لگے ہوئے تتلی کے پروں کا تجزیہ کروایا تو یہ واضح ہو گیا کہ وہ شخص مسٹر میریل کے ساتھ گیا ہے جہاں چاک موجود تھی۔ وہ دونوں گیارہ بج کر باون منٹ پر کینٹ جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے جو روچیسٹر سمیت کئی اسٹیشنوں سے گزرتی ہے اور اس پورے علاقے میں چاک کے ذخائر موجود ہیں جو سیمنٹ بنانے میں کام آتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر میریل نے کس مقصد کے تحت یہ سفر کیا؟ دراصل انہیں آثارِ قدیمہ سے دلچسپی تھی اور انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ اس علاقے میں پائے جانے والے مصنوعی غار دراصل قدیم کھریا مٹی کی کانیں ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایسے کئی غاروں کی نشان دہی کی تھی اور جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک دکان سے نوّے فٹ لمبی رسی خریدی ہے تو فوراً سمجھ گیا کہ وہ کسی نئے غار کی تلاش میں گئے ہیں۔ اب مجھے اس غار کے محلِ وقوع کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اگر اس غار تک نہ پہنچ سکا تو میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ میں نے جیکٹ پر موجود چاک کے ذرات کا تجزیہ کروایا تو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس قسم کی چاک کس علاقے میں پائی جاتی ہے۔ جب میں نے آثارِ قدیمہ کے دفتر سے اس علاقے کا نقشہ حاصل کیا تو معلوم ہوا کہ ایک غار ایسا بھی ہے جس کا ذکر میریل کی کتاب میں نہیں تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ اسی غار کی تلاش میں گیا ہو گا۔ اس نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا اور ہورڈر کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اگر کرک یہاں موجود ہوتا تو شاید وہ اس کے ہمراہ جانے کو ترجیح دیتے۔“

”پھر کرک وہاں کیسے پہنچ گیا؟“

”جب ہورڈر کو اس پروگرام کا علم ہوا تو اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ جنم لینے لگا۔ اس نے مسٹر میریل کو مشورہ دیا کہ وہ کرک کو بھی ساتھ لے لے کیونکہ کسی ایک آدمی کا غار کے باہر رہنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ مسٹر میریل نے کرک کو فون کر کے ہدایت کی کہ وہ روچیسٹر کے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو جائے۔ اس طرح ہورڈر نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ اس نے جائے وقوعہ پر اس طرح کا سین ترتیب دیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کرک کی موت پہلے واقع ہوئی اور اس کے بعد مسٹر میریل زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اس طرح ہورڈر بلا شرکت غیرے ان کی تمام جائداد کا وارث بن جاتا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے تصدیق ہو گئی ہے کہ مسٹر میریل کی موت پہلے واقع ہوئی جبکہ کرک بعد میں نیچے اترا اور اسے بھی ہورڈر نے فائر کر کے ہلاک کر دیا۔ تاہم وصیت کی رو سے موجودہ صورتِ حال میں مسٹر میریل کے آدھے اثاثے کرک کے وارثوں کو منتقل ہو جائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہورڈر کو کیا سزا ہو گی اور از روئے قانون دہرے قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد وہ مسٹر میریل کے آدھے اثاثوں کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں۔ بہرحال اس نے پوری جائداد پر قبضہ کرنے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔“

”اُف میرے خدا! کتنا خوفناک منصوبہ تھا۔“ باب کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”بہرحال میں پوری کوشش کروں گا کہ اس کا حصہ بھی کرک کے وارثوں کو مل جائے اور تمہیں اس کام میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

”میں تیار ہوں۔“ وکی نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں اجازت دو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔“

جواری

احمد اقبال

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردِّعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

رات بہت سرد اور تاریک تھی۔ سردی ایسی کہ ہڈیوں تک کو منجمد کر رہی تھی، اس آسیبی رات میں میری نگاہیں زیادہ دور تک کام نہیں کر رہی تھیں لیکن میں جہاں تک دیکھ سکتا تھا، ریل کی پٹری دو سیاہ لکیروں کی طرح عافیت کے راستے کی راہنمائی کر رہی تھی۔ دونوں پٹریوں کے درمیان لکڑی کے ایک فٹ چوڑے تختے تھے جن میں مضبوطی سے لگے ہوئے نٹ بولٹ دونوں فولادی پٹریوں کو ایک سوت اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے دیتے تھے تاکہ ہزاروں انسانوں کا بوجھ اٹھائے لاکھوں ٹن وزنی ریل گاڑیاں ان کے اوپر سے دندناتی گزر جائیں۔

تختوں کے درمیان پتھر تھے جن پر میرے قدم بار بار لڑکھڑا جاتے تھے۔ میں دو بار گرا لیکن کسی چوٹ کی پروا کیے بغیر پھر اٹھ کے دوڑنے لگا۔ میرے بالکل پیچھے غلام محمد عرف گامارستم تھا جو مسلسل میری حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ ”پیچھے مڑ کے مت دیکھ کاکا! آگے نظر، آگے...“ دو چار بار وہ بھی گرا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ان گالیوں سے ہوا تھا جو مشکل وقت اور پریشانی میں ازخود اس کے منہ سے نکلتی تھیں۔

ہمارے پیچھے رات کے سناٹے میں اب بھی فائر گونج رہے تھے۔ کچھ آوازیں مشین گن کی تھیں جو واچ ٹاور کے پہرے دار استعمال کر رہے تھے۔ نشانہ لیے بغیر وہ راؤنڈ پر راؤنڈ ختم کر رہے تھے، صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ کتنے مستعد اور فرض شناس ہیں۔

دورانِ فائرنگ مجھے کبھی پستول کے فائر بھی سنائی دے رہے تھے اور ان تھری ناٹ تھری رائفلوں کے دھماکے بھی جو انگریز جاتے وقت ایک غلام قوم کو بخش گئے تھے۔ صرف ایک سرچ لائٹ تھی جو شمال کی سمت واقع واچ ٹاور پر نصب تھی اور ایک ہی رفتار سے مسلسل گھوم رہی تھی۔ اس کی چندھیا دینے والی روشنی کی لکیر جو آگے پھیلتی جاتی تھی، آس پاس کے جس علاقے سے گزرتی تھی وہاں جیسے دن نکل آتا تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ تک پہرے داروں کی نظر ہر حرکت کو دیکھ سکتی تھی۔ جب یہ روشنی دائرے میں سفر کرتی ہماری جانب آنے لگتی تھی تو میں اور گامارستم اوندھے منہ ریلوے لائن پر گر کے ساکت ہو جاتے تھے اور اس کے گزرتے ہی پھر اٹھ کر دوڑنے لگتے تھے۔ سرچ لائٹ اپنا دائرہ مکمل کر کے دوبارہ ہم پر سے تین منٹ کے بعد گزرتی تھی۔ یوں ہم دو منٹ پچاس سیکنڈ بھاگتے تھے تو دس سیکنڈ الٹے پڑے گہری سانسوں کے ساتھ پھر اپنی توانائی بحال کرتے تھے۔

مجھے اندازہ تھا کہ اب میں خطرے کی حد سے کافی باہر پہنچ چکا ہوں۔ اس کے باوجود کسی اَن دیکھی گولی کے دل میں اتر جانے کا خوف تھا جو میرے پیروں کو مشینی انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ اچانک تاریکی میں میرے پاؤں کسی جسم سے ٹکرائے اور میں سنبھل نہ سکا۔

”ابے اندھا ہے کیا؟“ کسی نے نیم خوابیدہ لہجے میں کہا۔

میرے گھٹنے پر... چوٹ آئی تھی۔ میں نے طیش میں اس کے ایک لات رسید کی جو ریل کی پٹری کے ایک تختے پر مردے کی طرح سیدھا پڑا تھا۔ ”سور کے بچے! یہ سونے کی جگہ ہے؟ تیرے باپ کا بیڈروم ہے؟“

وہ بڑبڑایا۔ ”فقیر کو جہاں نیند آ جائے وہی اس کے باپ کا بیڈروم... مگر تُو نے مجھے سور کا بچہ کیسے کہا؟“

میں نے اس کے دوسری لات ماری۔ ”اور کیا کہوں...؟“

گامارستم میرے ساتھ ہی رک گیا تھا۔ ”چل جانے دے کاکا۔ یہ تو ہے کوئی پاگل چرسی۔“

چرسی جیسے خود سے بولا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے مجھے کہا تھا کتے کا بچہ، کیا میری شکل دونوں سے ملتی ہے... سور سے بھی اور کتے سے بھی...؟“

گامارستم نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے آگے کھینچ لیا۔ ”وقت ضائع مت کر۔“

چرسی پیچھے سے بولا۔ ”کمینو! مجھے یہاں سے ہٹایا بھی نہیں، دو لاتیں مفت میں ماریں۔ میرے اوپر سے ٹرین گزر گئی پھر...؟“

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے چرسی کو گھسیٹا اور ریلوے لائن سے ہٹا کے کچھ دور لٹا دیا۔ ”اب دوبارہ اپنے باپ کے بیڈروم میں مت جانا۔“

چرسی نے میرا ہاتھ چوم کے کہا۔ ”تھینک یو فادر۔“

فائرنگ بالآخر رک گئی تھی یا روک دی گئی تھی۔ سرچ لائٹ اب بھی گھوم رہی تھی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کا اجالا ہم تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ گامارستم میرے ساتھ چلنے لگا۔ ہم دونوں اپنی پھولی ہوئی سانس اور اپنے وجود میں بھرے ہوئے موت کے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جگہ دونوں طرف پھیلے ہوئے شہر سے خاصی بلند تھی۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر پُل تھا۔

پرانے شہر کو نئے شہر سے ملانے والی سڑک اس کے نیچے سے گزرتی تھی۔

گامارستم اچانک بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کے ماچس کی تیلی کے شعلے کو دونوں ہاتھوں کی پناہ میں رکھا اور سگریٹ کے جلتے ہی اسے پھونک مار کے بجھا دیا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں اس نے ایک طویل کش کا دھواں خارج کیا۔ ”جب پاکستان نہیں بنا تھا تو یہاں جے بی سنگھارام بسکٹ فیکٹری تھی جو بعد میں یعقوب بسکٹ فیکٹری بنی۔ اس کے انرجی فوڈ بسکٹ میں اپنے بچپن میں بڑے شوق سے کھاتا تھا۔“

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت اپنے بچپن کی کسی یاد کے حوالے کا یہ کون سا موقع تھا۔ میں اس شہر کو دیکھ رہا تھا جو سو رہا تھا۔ جھونپڑی کے فرش سے کسی پُرتکلف ائرکنڈیشنڈ... بیڈروم کے فوم والے بیڈ تک۔ کسی تھانے کے ڈرائنگ روم میں تفتیش کے عمل سے گزر کر آنے والے حوالاتی سے کسی حجلۂ عروسی میں یک جان دو قالب ہو کر سونے والوں تک رات نے سب کو سکون کی پناہ میں لے رکھا تھا۔ میں اور میرے جیسے کچھ بدبخت جاگ رہے تھے۔ وہ جن کے لیے خواب آور گولی بھی بے اثر تھی۔ بیمار بوڑھے یا وہ جن کو صبح کے سورج کا اجالا دیکھنے سے پہلے تختۂ دار پر سو جانا تھا۔

گامارستم کی آواز مجھے پھر خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔ ”کاکا! اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

میں چونکا۔ ”استاد! کیا ٹائم ہو گیا؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میرے تیرے راستے یہاں سے الگ ہوتے ہیں۔ چل جا تیرا رب راکھا۔“

فرطِ جذبات سے میرا گلا رندھ گیا۔ ”استاد! میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟“ میں تے اس کا ہاتھ تھام کے کہا۔

وہ ہنسا۔ ”بندے کو بندے کا شکرگزار نہیں ہونا چاہیے۔ شکر کرنا چاہیے اس سوہنے رب کا جو زندگی کے وسیلے بناتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر کب ملو گے استاد؟“

اس نے پھر انگلی اوپر اٹھائی۔ ”جب اسے منظور ہوا... جس نے ہمیں پہلی بار ملایا تھا۔ چل اب جا... اور ہاں، میری بات یاد ہے نا؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور اسے بائیں رخ پر آباد نئے شہر کی جانب نشیب کا فاصلہ طے کرتے دیکھتا رہا۔ نیچے پہنچ کے اس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے اس کی بڑے بھائی جیسی پُرشفقت حوصلہ دینے والی مسکراہٹ کو محسوس کیا پھر وہ تاریکی میں گم ہو گیا۔

ریلوے پُل کے نیچے سے اس وقت بھی اِکّا دُکّا گاڑی پرانے شہر کی طرف سے آتی تھی اور دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ گھنٹا گھر کی طرف سے میں نے ٹن ٹن کی وہ مدھم آوازیں سن کے اندازہ کیا کہ رات کے دو بجے کا وقت ہے۔ سنبھل سنبھل کے قدم جماتا ہوا میں نیچے اترتا گیا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں۔

کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر سڑک کی روشنیاں گل تھیں۔ یہ میرے لیے اچھی بات تھی۔ مجھے خود کو چھپائے رکھنے کے لیے اندھیرے کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ میری سب سے پہلی فکر اپنے اس لباسِ فاخرہ سے نجات حاصل کرنے کی تھی جس پر ایک دو تین کے ہندسے اتنے نمایاں تھے کہ کسی تعارف کے بغیر ہی میرے بارے میں سب کچھ بتا دیتے تھے کہ میں کون ہوں، کیا کرتا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ لیکن ایک دو تین کا نمبر نظر آنے سے پہلے ہی میرا چارخانے والا لباس ہر نگاہ کو متوجہ کر سکتا تھا۔

ایک بار میں نے یہ بھی سوچا کہ اس لباسِ رسوائی سے لاکھ بہتر ہو گا کہ میں اسی لباسِ قدرت میں نظر آؤں جس میں ستائیس سال پہلے میں اس دنیا میں وارد ہوا تھا۔ کوئی دیکھ بھی لے تو زیادہ سے زیادہ مجھے دیوانہ اور مجذوب سمجھے گا۔ یہ تو نہیں ہو گا کہ مجھے پکڑ لے اور واپس وہیں پہنچا دے جہاں سے میں جان کی بازی لگا کے نکلا تھا۔

اپنے اس ارادے پر عمل کرنے سے پہلے ہی تانگا اسٹینڈ کی جانب مجھے پہلا گھر وہ ملا جس کے صحن کی دیواریں میرے اپنے چھ فٹ کے قد سے ذرا ہی اونچی تھیں۔ ہاتھوں کے زور پر اپنا وجود اٹھا کے میں نے دیوار پر سے جھانکا تو مجھے ایک چھوٹا سا ویران صحن نظر آیا جس میں لمبائی کے رخ باندھی گئی ڈوری پر کچھ کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ دیوار پکی تھی اور اس بات کا امکان نہ تھا کہ میرے بوجھ سے کوئی اینٹ اکھڑ کے ہاتھ میں آ جائے تو پہلے میں بھد سے نیچے گروں، پھر اینٹ مجھ پر اور وہ لگ جائے سر پر تو میں بے ہوش۔ ہوش آئے تو میں وہیں جہاں سے جان ہتھیلی پر رکھ کے نکلا تھا، یا پھر کوئی پوچھ رہا ہو کہ بھیا، کون ہو؟ اور میں یادداشت کے چلے جانے سے سب کی صورت دیکھ کے خود اپنے آپ سے یہی سوال کرتا نظر آؤں۔ نہ جانے کتنی فلموں میں ایسا ہو چکا ہے۔

چنانچہ میں نے احتیاط سے وہ دیوار عبور کی اور خاموشی سے دوسری طرف کے آنگن میں اتر گیا۔ ڈوری پر ملے جلے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ گھر میں دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ پھر ان دونوں کو پیدا کرنے والی ماں کے کپڑے بھی نظر آگئے جو میرے کسی کام کے نہیں تھے۔ میں لڑکی ہوتا تب بھی انہیں استعمال کرنا مشکل تھا۔ ان کی چوڑائی میں دو عام لڑکیاں سماسکتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سائز میں اتنا ہی بڑا دوسرا مردانہ جوڑا ملا جو یقیناً شوہر نامدار کا تھا۔

میری نظر اپنے مقابل دو کمروں کے بند دروازوں پر بھی رہی جہاں سے کسی بھی وقت کوئی نمودار ہوجاتا تو جیل کے سائرن سے بلند تر آواز میں خطرے کا سائرن بجادیتا جس کی گونج ابھی تک میرے کانوں میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ شلوار قمیص میرے سائز سے خاصے بڑے تھے۔ انہیں پہن کر میں آسانی سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس مشکل کا حل بھی مجھے فوراً سوجھ گیا۔ میں نے یہ کپڑے اپنی سرکاری وردی پر چڑھالیے۔ اس کے تین فائدے ہوئے۔ ایک تو لباس مجھے زیادہ ڈھیلا نہیں رہا، دوسرے ڈبل لباس نے سردی کا احساس کم کردیا اور تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ کہ میں قیدی نمبر ایک دو تین کے بجائے عام شریف آدمی نظر آنے لگا۔

جیل سے فرار کے بعد میں نے پہلا نیک کام یہ کیا کہ کسی شریف آدمی کے کپڑے چرائے لیکن مجھے اللہ پر بھروسا تھا کہ وہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ انسان کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور خطاؤں کو معاف کرتا ہے۔

اس گھر سے باہر آنا آسان تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور زیادہ اعتماد کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایک مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ میرے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور سردی میں سخت زمین پر چلنا میرے لیے مشکل ہورہا تھا۔ میرے پیر پہلے ہی ریلوے کی پٹری پر دوڑنے سے زخمی تھے۔ اگر اس صحن میں کہیں مجھے اپنے پیروں کے سائز کے مردانہ جوتے نظر آتے تو میں انہیں بھی چرانے میں تکلف سے کام نہ لیتا۔

میرے قدم اب اپنی اگلی پناہ گاہ کی طرف اٹھ رہے تھے جو زیادہ دور نہیں تھی۔ میری نظریں بائیں ہاتھ پر لطیف پارک کو دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے آگے تانگا اسٹینڈ تھا لیکن درمیان میں ایک پتلی سی سڑک لطیف پارک کی بیرونی دیوار کے ساتھ پرانی ٹائل فیکٹری کی طرف جاتی تھی۔ اس کے پیچھے کہیں وہ ویران حویلی تھی جو آسیب زدہ کہلاتی تھی اور جن بھوتوں کا ڈیرا سمجھی جاتی تھی۔

سکھر کے شہر سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں میرے نانا یہاں نہروں کے محکمے میں کسی اعلیٰ انتظا عہدے پر فائز تھے چنانچہ سکھر بیراج کی نہروں میں پانی روانی ان کی مرضی کے تابع تھی۔ دونوں کناروں کی کس میں کتنا پانی چھوڑا جائے... کسے کم، کسے زیادہ اور کر بالکل نہ دیا جائے، اس کا انحصار پانی کے خریداروں کی قو خرید پر رہتا تھا۔ نذرانہ اچھا تو زمین اگلے سونا... نذرا نہیں تو پیاسی فصل سے کسان کو روٹی بھی میسر نہیں... چاہے تو فرمودۂ اقبال پر عمل کرے اور ہر خوشۂ گندم جلادے... اللہ میرے نانا مرحوم کی بخشش کرے کرے... نواسے کو ان کے گناہ کا اعتراف کرنے میں کو شرم محسوس نہیں ہوتی کہ انہوں نے لاکھوں رشوت سے کھا جو آج کے حساب سے کروڑوں سمجھے جاسکتے ہیں۔ ہمار رہائش لاہور میں شملہ پہاڑی کے قریب کسی ہندو کی چھوڑ ہوئی پرانی مگر بہت وسیع وعریض کوٹھی میں تھی۔ ہر سال مو گرما کی چھٹیاں ہوتے ہی اماں میکے کے لیے رختِ باندھ لیتی تھیں اور ہم دونوں بھائی بڑے ذوق وشوق اس سالانہ جشن سیر وتفریح کی تیاری کرتے تھے۔ نانا رہائش کے لیے دریا کے کنارے قدرے بلندی پر ایک کو ملی ہوئی تھی جس کے برآمدے کا رخ دریا کی جانب تھا پیچھے کی سیڑھیوں سے اتر کے ہم گھنٹا گھر والی سڑک پر آجا تھے۔ ہر شام ایک کشتی ہمیں دریا میں بیراج سے روہڑ برج تک سیر کرانے لے جاتی تھی تو دوسری کسی ہنگامی صور حال سے نمٹنے کے لیے ساتھ چلتی تھی... دونوں کے ملاح تیراک اور غوطہ خور تھے چنانچہ دریا کی سرکش روانی ہماری زندگی کو لاحق خطرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ کبھی بنسی اور ڈور سے کوئی چھوٹی سی مچھلی پکڑنے میں کامیا ہوجاتے تھے تو یوں خوش ہوتے تھے جیسے وہیل کا شکار کیا ہ ہماری خدمت اور ہر فرمائش پوری کرنے کے لیے نوکر چا موجود رہتے تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ نانا کے لاڈ سے بگڑ والے نواسوں کو ماں کی ممتا سدھار سکے... میں شاید جماعت میں تھا کہ نانا کا انتقال ہوا... انہیں کسی نے کرادیا تھا... ہماری سالانہ عیاشی اور شہزادگی ختم ہوگئی لیکن اس وقت کی آوارہ گردی نے مجھے اس پرانے شہر سڑکوں اور گلی محلوں سے متعارف کرادیا تھا اور پندرہ، سال گزر جانے کے بعد بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن بہت میری یادداشت میں محفوظ تھا۔

تاہم اس وقت میں نے یہاں کی کسی پُرآسیب حویلی کا کوئی قصہ نہیں سنا تھا۔ پرانی ٹائل فیکٹری بھی یادِ ماضی ہوگئی تھی۔ یہ شاید تقسیم سے پہلے یہاں ہوگی۔ اب سارا علاقہ نوتعمیر شدہ مکانوں سے بھر گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس سے اس حویلی کا پتا پوچھوں۔ نہ گلی میں کوئی نظر آرہا تھا، نہ کسی گھر میں روشنی تھی اور نہ یہ ممکن تھا کہ میں دستک دے کر کسی کو سوتے سے جگاؤں اور اس سے بھوتوں والی حویلی کا پتا معلوم کروں جو میرے لیے، گامارستم کے مطابق آج کی رات سب سے محفوظ پناہ کی جگہ ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے پیچھے کی پُرپیچ گلیوں میں گھوم پھر کے دیکھا لیکن ہر بار میں وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں سے چلا تھا۔ عین اس وقت جب میں مایوسی اور جھنجلاہٹ سے خوف اور پریشانی میں مبتلا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے حویلی کا خیال چھوڑ کے پناہ کے لیے کوئی اور ٹھکانا دیکھنا چاہیے، حویلی اچانک مل گئی یا شاید اس حویلی نے بھوتوں سے خود بھی غائب ہوجانے کا ہنر سیکھ لیا تھا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں گنی چنی گلیوں میں سرگرداں رہا اور حویلی مجھے دکھائی نہ دی۔

حویلی سہ منزلہ تھی۔ اس کے دو حصے مکمل تھے اور تیسرا نصف حصہ بھی بنا ہوا نظر آرہا تھا۔ گامارستم کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ حویلی تقسیم سے بھی پچاس برس پہلے کسی لالہ کاشی رام نے تعمیر کرائی تھی جن کے بحری جہاز بمبئی سے عدن تک چلتے تھے۔ حویلی کا ایک حصہ مندر جیسا نظر آتا تھا تو دوسرا مغل طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔ یقیناً جب یہ بنی ہوگی تو اس کا حسن دیکھنے والوں کو مسحور کرتا ہوگا۔ اب یہ عبرت سرائے دہر تھی۔ اس کی ویرانی اور خستہ حالی اس کے ساتھ زمانے کے بے رحم سلوک کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ ایک ایسی لاوارث اور فٹ پاتھ پر مفلوج ہڈیوں کا ڈھانچا بنی عورت کی طرح تھی جو اپنے زمانے میں حسن وشباب کی خیرہ کن آب وتاب رکھتی ہو اور سیکڑوں پرستاروں یا خریداروں اور حسن کے پجاریوں کے دل اس کی راہ میں پھولوں کی طرح بچھے رہتے ہوں کہ کہیں اس کے نازک گلابی تلوے کسی کنکر سے مجروح نہ ہوں۔

یہ وقت ہرگز شاعرانہ تصورات اور خیال آرائی کا نہ تھا لیکن میں کیا کرتا، بقول غالب... زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی۔ سوتے جاگتے، وقت بے وقت میرے احساس کا آزاد پنچھی اسی طرح خیالوں کے آسمانوں میں پرواز کرنے نکل جاتا تھا۔ وہ میرے قابو میں کب تھا۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حویلی کے اندر جانے کا ایک ہی دروازہ تھا جس کے ادھ کھلے پٹ سے اندر کی ویرانی اور تاریکی عیاں تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ محبوس ہوا کے ساتھ میں نے ایک عجیب سی بو محسوس کی۔ یہ حویلی میں سکونت پذیر چمگادڑوں یا ویرانوں کے ساکن کسی الو کے خاندان کی بو تھی جو حویلی کو بطور ٹائلٹ بھی استعمال کرتا ہوگا۔

میں خود الو کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش کررہا تھا اور اندھوں کی طرح قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں دروازے کے سامنے ہی ڈیرا ڈال دوں اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں ساری حویلی کا جائزہ لے کر اپنے لیے پسند کی جگہ تلاش کرسکوں۔

میرے ننگے پیروں کے نیچے مٹی دھول کے ساتھ خس وخاشاک بھی آرہے تھے۔ جانوروں یا انسانوں کی وہ خوراک بھی جو ان کے جسم نے ہضم کرنے کے بعد خارج کردی تھی۔ نہ جانے کہاں کوئی بلی کسی بلّے پر غصے سے غرا کے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ عورت کی نہ میں ہاں بھی ایسے ہی ہوتی ہے؟ میں نے سوچا اور منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ فرش پر نہ جانے کیا کچھ تھا۔ شکستہ اینٹوں کے ٹکڑے، کنکریاں، مٹی کا کوئی برتن... اچانک میں سامنے آجانے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔

اس وقت مجھے اپنی عقل پر غصہ آیا۔ اگر میں ذرا سا دور اندیش ہوتا تو گامارستم سے ماچس ہی مانگ لیتا۔ بڑی آسانی سے میں کسی بھوت اور بھوتنی کے بیڈروم میں کوئی محفوظ جگہ تلاش کرلیتا۔ وہ اپنی خلوت میں میری مداخلت کا کیوں برا مانتے جبکہ میں انہیں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے تو کیا۔ یہ ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی پیدائشی اندھا غلطی سے کسی کے حجلۂ عروسی میں داخل ہوجائے۔

باہر سے کوئی موٹر سائیکل گزری۔ اس کی ہیڈ لائٹس کا تھوڑا سا اجالا پل بھر کے لیے اندر آیا لیکن اس نے مجھ پر گردوپیش کے منظر کو عیاں کردیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہ ڈیوڑھی قسم کی جگہ تھی۔ ایک بے چوکھٹ والے دروازے کا

خلا میرے سیدھے ہاتھ پر تھا، دوسرا بائیں جانب۔ میں دائیں طرف والے در کے قریب تھا۔ اس میں سے گزرتے ہی میں نے ہاتھوں پیروں سے ٹٹول کے ایک صاف جگہ تلاش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

سکون کی پہلی سانس کے ساتھ میں نے گامارستم کے بارے میں سوچا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا؟

☆☆☆

گامارستم اس کا اصل نام نہیں تھا۔ پہلے وہ صرف غلام محمد تھا جو لاہور میں بسنت روڈ کے ایک چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ لاہوری روایات کے مطابق گھر والوں نے بھی اسے گاما کہہ کے بلایا۔ جوانی میں اس نے دنگل دیکھے اور جیتنے والوں کو دیکھا جو پسینے اور کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے باوجود تماشائیوں کے کندھوں پر سوار ہو کے انعام میں دیے جانے والے طلائی گرز کو یوں لہراتے تھے جیسے انہوں نے رستم لاہور کا خطاب نہیں جیتا، سارا زمانہ جیت لیا ہو۔ گامارستم زماں تھا، بھولو رستم پاکستان۔ باقی سب لوکل رستم تھے۔ گاما نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی زور آور بنے گا۔ رستم لاہور ہوگا اور تقدیر نے یاوری کی تو رستم زماں ثانی لیکن نہ جانے کیوں تقدیر نے یاوری نہیں کی۔ وہ اکھاڑے گیا، کشتیاں بھی لڑیں۔ استادوں کی گالیاں اور ماریں بھی کھائیں لیکن رستم لاہور تو کیا رستم گڑھی شاہو بھی نہ بن سکا جو لاہور کا ایک محلہ تھا جہاں وہ زور کرتا تھا۔ بس اس کے نام کے ساتھ رستم کا لفظ لگ گیا۔ پہلے یہ محض اظہارِ تمسخر تھا پھر اس کے نام کا حصہ ہوگیا۔

گامارستم سے میری ملاقات سکھر جیل میں قدم رنجہ فرمانے کے بعد تیسرے روز ہوئی تھی۔ جب میں دن بھر کی مشقت اور ذلت کے بعد اکیلا بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اچانک کسی نے میرے قریب بیٹھ کے پُرتمسخر لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا ہوا ہے کاکا۔ کسی نے... ہے تیری؟ یہ تو ہوتا ہے یہاں۔''

میں نے سر کو نفی میں ہلایا۔ ''کسی میں ہمت ہے...''

وہ ہنس پڑا۔ ''ہمت تو سب میں ہے اور کیوں نہ ہو؟ تُو ہے بھی بڑا چکنا۔ پہلے سب تیری طرح روتے ہیں پھر عادی ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ بھی وہی کرنے لگتے ہیں جو ان کے ساتھ ہوتا ہے۔''

''اپنی بکواس بند کرو اور جاؤ۔''

''دیکھ کاکا! روٹی ملنے کا ایک ٹائم ہوتا ہے۔ یہ ٹائم نکل گیا تو رات بھر بھوکا پڑا رہے گا پھر کھانے کو... بھی نہیں ملے گا۔ بھوکے پیٹ آنکھ سے آنسو بھی نہیں نکلتے.. اوپر سے کسی نے تیری...''

میں نے اسے نفرت سے دھکا دیا۔ ''تم کو ا

کیوں ہے میری؟''

''پتا نہیں کیوں۔ تُو مجھے کاکا لگتا ہے۔ چھوٹا سا کا

جس کو ماں اسکول میں داخل کرا کے واپس گھر چلی گ

میں بھی ایسے ہی روتا رہا تھا پہلے دن۔ چل آجا می

ساتھ، شاباش اٹھ۔''

نہ جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی کہ میں

کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھڑا ہوگیا۔ ہم کھانا لے کر لوٹے ت

دیوار کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانے لگے۔ میں نے

غور سے دیکھا۔ وہ مضبوط جسم اور قد میں مجھ سے کچھ ک

عمر میں آٹھ دس سال زیادہ تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں

ہوا، اسے موت کی سزا ہوئی تھی مگر اسے یقین تھا کہ اس

کی اپیل منظور ہوجائے گی اور سزائے موت کو عمر قید

بدل دیا جائے گا۔ نہ جانے کیوں یہ یقین رحم کی اپیل ک

والے ہر قیدی کو ہوتا ہے۔ اپنے اخلاق یا رویّے

رستم نے نگراں عملے کو رام کرلیا تھا اور اسے نمبردار

کردیا گیا تھا۔ یعنی وہ قیدی جو دوسرے قیدیوں پر نظ

ہے... جیسے کلاس کا مانیٹر۔

''نام کیا ہے تیرا کاکا؟'' اس نے کھاتے ک

پوچھا۔

''چودھری فریدالدین۔''

وہ بولا۔ ''بس فرید کافی ہے کاکا۔ ادھر کوئی چو

نہیں۔ کس جرم میں آیا ہے؟''

''قتل کے جرم میں... مگر میں نے کوئی قتل نہیں ک

''چھوڑ یہ بات۔ جب ٹھپّا لگ گیا قاتل کا تو

کوئی عدالت نہیں، یہاں سب یہی کہتے ہیں۔''

میں نے تلخی سے کہا ''تم بھی...؟''

''ہاں میں بھی کاکا! مانتا کون ہے اس لیے یہ

کرنا بھی فضول ہے۔ سزا کیا ہوئی تھی؟''

''سزائے موت۔''

وہ ہنسا۔ ''یعنی اپنا تیرا ساتھ رہے گا، پھانسی ک

تک۔''

معلوم نہیں کیوں وہ مجھ پر مہربان ہوا لیکن

والے دنوں میں اس کا رویّہ میرے ساتھ بالکل بڑے

جیسا رہا۔ ایک ہفتے بعد مجھے اندر کی دیوار پر رنگ کر

مشقت دی گئی کیونکہ قیدیوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی

والی کوئی این جی او اس جیل کا دورہ کرنے آرہی تھی۔ مجھے ٹین کا ایک پرانا ڈبّا تھما دیا گیا تھا۔ یہ کوکنگ آئل کا پانچ لیٹر والا ڈبّا تھا جس میں اوپر دو سوراخ کر کے تار سے ہینڈل بنا دیا گیا تھا۔ میں ایک سیڑھی پر چڑھا دائیں بائیں جہاں تک میرا ہاتھ جاتا تھا، برش سے زرد رنگ کا ڈھیر پھیلا رہا تھا۔ جب رنگ ختم ہو جاتا تھا تو میں نیچے اتر کے پیسٹ اور پانی ملا کے پھر آدھا ڈبا بھرتا تھا۔

میں نے دیکھا میرے چاروں طرف میرے جیسے بہت تھے۔ کچھ حقیقی مجرم اور کچھ بنا دیے جانے والے۔ یہ سب ناقابلِ شکست سلاخوں، بے حس اور سفاک پہرے داروں اور برقی رو کی ہلاکت خیزی سے معمور خاردار تاروں کے اسیر تھے۔ یہ سب تھوڑے کو بہت سمجھنے کے پابند کر دیے گئے تھے۔ تھوڑی سی آؤٹنگ، تھوڑی سی روشنی، تھوڑی سی زندگی۔ انہیں اپنے مقررہ راشن سے بھی تھوڑا سا حصہ ملتا تھا جسے سب بالآخر یہ لوگ کافی سمجھ کے قبول کرنے لگتے تھے۔ ان کے پاس امید کا تھوڑا سا اجالا تھا جس سے وہ خوف اور بے یقینی کے اندھیرے کا جال کاٹتے رہتے تھے۔ یہ تھوڑی سی خوشی اور تھوڑے سے خواب اور ان کی تھوڑی سی تعبیر مانگتے رہتے۔

''ٹنڈے لاٹ کی اولاد!'' گدّی پر پڑنے والے زبردست جھانپڑ نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں سامنے والی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے باوجود میں نے رنگ کے ڈبے کو گرنے نہیں دیا ورنہ شاید میرا رات کا کھانا بند کر دیا جاتا۔ کام میں غفلت برتنے سے بڑا جرم رنگ کا نقصان بن جاتا۔ یہ دن میں خواب دیکھنے اور خیالوں میں گم ہو جانے کی سزا تھی۔ سزا دینے والا پرانا پاپی تھا جس کے نامۂ اعمال میں چوری، ڈکیتی، اغوا اور قتل جیسے سنگین جرائم تھے مگر یہاں وہ مراعات یافتہ اور معزز شمار ہوتا تھا کیونکہ اس کے خیر خواہ باہر سے اندر کے حکام کو بڑی باقاعدگی سے ماہانہ نذرانے پہنچاتے تھے اور خطرناک لوگ تھے۔

میں رنگ کا ڈبا لے کر دوبارہ سیڑھی پر چڑھا اور میرا ہاتھ میکانکی انداز میں پھر یوں چلنے لگا جیسے سوئچ آن کرتے ہی میں انسان سے کوئی مشین بن گیا ہوں۔ اس وقت گامارستم کہیں سے نمودار ہوگیا۔

اس نے مجھے لات مارنے والے کو روک لیا اور بڑے دوستانہ انداز میں اسے سگریٹ پیش کی۔ ''یہ لے... سگریٹ پی۔'' اس نے عادت کے مطابق درمیان میں ایک گالی فٹ کی۔ ''دیکھتا کیا ہے، باہر کی ہے۔''

سگریٹ لینے والے نے ایک کے بدلے دو گالیاں دیں۔ ''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں... مگر مقصد بتا اپنی ماں کے...''

رستم نے اس کی سگریٹ جلائی۔ ''یار، یہ جو نیا چوچا ہے نا... ذرا اس پر ہاتھ ہولا رکھ۔''

''کیوں؟ تیرے مامے دا پتر ہے؟''

''مامے کا نہیں، چاچے کا پتر ہے۔ چھوٹا بھائی ہے میرا تو سمجھ لے۔ نیا آیا ہے نا... سالے کو باہر کی یاد زیادہ آتی ہے۔''

''ہم سب بھلا دیں گے تیری ماں کے یار کو۔'' وہ بولا مگر میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی دھمکی محض اپنی مونچھ اونچی رکھنے کی کوشش ہے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ گامارستم کسی کو اپنا چھوٹا بھائی کہے اور وہ اس رشتے کو اہمیت نہ دے۔

رات ہونے سے پہلے میں ڈبا لے کر اترا تو رستم پہلے سے نیچے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ''دیکھ، یہ خیالوں میں گم ہونا چھوڑ دے کاکا۔ یہ اندر کی دنیا بڑی بے رحم ہے۔ یہاں سوتے میں بھی اچھے خواب دیکھنا جرم سمجھا جاتا ہے۔''

''میں کیا کروں؟ جب اسکول میں تھا تب بھی بہت مار پڑتی تھی۔ ماسٹر سوال کرتے تھے اور میں کھویا رہتا تھا اپنے خیالوں میں۔ اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔'' میں ڈبا رکھ کے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''باہر کی سب اچھی عادتیں یہاں برائی شمار ہوتی ہیں۔ میں نے کہہ تو دیا ہے سب سے کہ سختی نہ کریں... مگر میں کوئی جیل سپرنٹنڈنٹ نہیں ہوں یہاں کا۔ میرا سگا بھائی بھی ہوتا تو میں اسے بچا نہ سکتا۔ یہ تو بس اندر کی سیاست ہے۔ کسی اور کے لیے یہ مجھ سے رعایت لیتا ہے ورنہ میں اس کی تو سب کے سامنے...'' حسبِ دستور اس نے اپنی گفتگو میں نصف درجن سے زائد فحش الفاظ شامل کیے۔

میں نلکے پر ہاتھ دھوتا رہا۔ ''آخر کیوں مہربان ہو رہے ہو تم مجھ پر؟ کیا اس میں بھی تمہاری کوئی غرض شامل ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''بات کھری کی تُو نے۔ یہاں نہ وہاں، دنیا میں کون کسی کے ساتھ بے غرض نیکی کرتا ہے۔ مگر تُو نے پوچھا ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔ جب میں نے پہلی بار دیکھا تجھے... تو مجھے لگا جیسے وقت پانچ سال پیچھے چلا گیا ہے، جب میرا بھائی زندہ تھا۔ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ تیرے ہی جیسا خوبصورت جوان تھا وہ... لیکن اس کے لیے خواب میں دیکھتا تھا۔ وہ سارے خواب میرے تھے جو مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ خود میں نے خاک میں ملا دیے تھے۔

وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا... اب وہ دو بچوں کی ماں ہے مگر اس سے محبت کرنے والا ایک قبر میں ڈھانچا ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بی اے کر لے پھر ایم اے... اس کی صورت مجھے تیری صورت میں نظر آتی ہے تو میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔”

اس نے سگریٹ بجھا کے ایک انگلی سے اس آنسو کو جھٹک دیا جو اس کی پتھر آنکھوں سے پھوٹ نکلا تھا۔

ابھی صرف دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ دوپہر کے وقت وہ کھانا لے کر میرے پاس آ بیٹھا۔ “دیکھ جو کچھ میں بتانے آیا ہوں، اسے دھیان سے سن کاکا۔ آخر کیا سوچا ہے تُو نے؟ اسی طرح سختی اور ذلت اٹھاتا رہے گا جیل کی دیواروں میں... اور پھر کسی دن جھول جائے گا پھانسی کے تختے پر۔ یہ جو باہر کی دنیا ہے نا... اس پر بھروسا مت رکھ۔ اب تو دوسری دنیا میں ہے۔ اندر کی دنیا میں... اور جیسے سب دوسری دنیا چلے جانے والوں کو بھول جاتے ہیں، ان سے تمام جذباتی اور خونی رشتے ختم کر لیتے ہیں، یہ دوسری دنیا وہ ہے جہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا... یا جیل... امریکا، کینیڈا... وہاں سے بھی کوئی لوٹ کے نہیں آتا۔”

میں رستم کو دیکھتا رہا۔ “استاد... فلسفہ بول رہے ہو تم۔”

اس نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ “یہ سارا فلسفہ کس نے پڑھایا ہے مجھے؟ اسی زندگی نے کاکا! جا کے پوچھ اندر والوں سے، ان سے سب نے ناتے توڑ لیے ہیں۔ ماں باپ کو چھوڑ دے، بہن بھائی... دوست سب اپنی اپنی زندگی گزارنے میں مگن ہیں، اپنی اپنی فیملی کے ساتھ۔ عمر قید پانے والے کی بیوی، بچے تک اس کے نہیں رہتے۔ ہم تم تو سب کے لیے مر چکے ہیں۔ سزائے موت جس دن ہوگی، کچھ لوگ زمین میں گاڑنے کے لیے وقت نکال کے آ جائیں گے... اور اس کے بعد ختم۔ اب نہ تیرا وکیل کچھ کر سکتا ہے نہ کوئی اور... کیا تو کرنا چاہتا ہے؟ پھانسی دیکھی ہے کبھی؟”

میں نے گھبرا کے نفی میں سر ہلایا۔ “میں زندہ رہنا چاہتا ہوں استاد! ابھی میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے؟”

“تیرے نہ ماں باپ، نہ بھائی بہن۔ کس کے لیے جینا چاہتا ہے تو کاکا؟”

“اپنے لیے استاد! میرے بڑے ارمان تھے، خواب تھے۔ میں نے ایم اے پاس کر لیا تھا، سوچا تھا پی ایچ ڈی کروں گا۔”

وہ ہنس پڑا۔ “پھر شادی کروں گا، بچے پیدا کروں گا۔ کبھی محبت کی کسی سے؟”

“میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ وہ ہو جاتی ہے۔ کرنے کا پوچھتے ہو تو پتا نہیں اب تک کس کس سے کی... سب سے پہلے اپنی ایک چاچی سے کی تھی۔ اس سے کہہ بھی دیا تھا۔ اس نے اپنے میاں کے سامنے کہہ دیا کہ تم خاک محبت کرتے ہو، محبت کرتا ہے مجھ سے فرید اور شادی بھی کرنا چاہتا ہے مجھ سے۔ بڑی بے عزتی ہوئی میری۔ بڑی گالیاں پڑیں اماں ابا سے۔ اس کے بعد بھی کی... محلے کی دو لڑکیاں تھیں، کالج میں تھیں، سب نے مجھے بتائے بغیر شادی کر لی۔”

“اچھا چھوڑ یہ قصے... اب میری بات دھیان سے سن۔ اگر تو جینا چاہتا ہے کاکا تو پھر اس کے لیے کچھ کر۔”

میں نے حیرانی سے کہا۔ “میں کیا کروں استاد! جی تو رہا ہوں۔”

اس نے میرے ایک ہاتھ مارا۔ “تُو پھانسی کے کنوئیں میں لٹکنے کا انتظار کر رہا ہے... جینا کہتے ہیں اسے؟”

“پھر کیا کروں استاد! یہاں سے نکلنا تو میرے اختیار میں نہیں۔” میں نے خفگی سے کہا۔

“الو کے پٹھے! یہی بتانے آیا تھا میں۔ جینے کے لیے یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ آج پھر موقع ہے، یہ تیرے لیے آخری موقع ہو سکتا ہے۔”

تقریباً چھ مہینے پہلے ایک شخص نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ اس شخص کو میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا... اور میں نے اسے وہی جواب دیا تھا جو پہلے بھی دے چکا تھا۔

اس سے پہلے... بہت پہلے... وقت کی مسافت پر بہت پیچھے۔ آج کا سورج ایک ہزار صبحوں کی دوری پر... یہی الفاظ ایک اور شخص نے میرے بھائی سے بھی کہے تھے۔ وہ شخص... جائز طور پر... اپنی بے حساب دولت کا غرور رکھتا تھا۔ طاقت اور قوتِ تسخیر رکھتا تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کچھ بھی اس کی قوتِ خرید سے باہر نہیں۔ وہ میرے بھائی کو بھی اس کے ایمان اور ضمیر، اصولوں کے ساتھ خریدنا چاہتا تھا... مگر ایسا نہ ہوا۔

مگر جو کچھ ہوا... کاش وہ نہ ہوتا۔

رستم نے جلتی سگریٹ کو میرے بازو سے چھوا تو میں اچھل پڑا۔ “تو پھر کھو گیا نا اپنے خیالوں میں... میری طرف سے جہنم میں جا۔ میں یہاں بھونک رہا ہوں کتے کی طرح۔”

میں نے اسے روک لیا۔ “تم خفا ہو گئے استاد! آئی ایم سوری۔”

وہ پھر بیٹھ گیا۔ “بڑا بھائی بھی سمجھتا ہے اور میری سنتا بھی نہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں تیری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔”

“اچھا بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہے؟”

“تجھے کچھ بھی نہیں کرنا ہے کاکا۔ بس میرے ساتھ یہاں سے نکلنا ہے۔ سوچتا رہا تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں بھی نکل جاؤں گا تو سر پر ہاتھ رکھ کے روئے گا۔ تیرا وہ حشر ہوگا یہاں کہ یاد کرے گا جس دن کھڑا ہوگا پھانسی کے تختے پر، اس دن یاد آئے گا تجھے کہ مارستم کیا کہتا تھا۔”

“میں سن رہا ہوں استاد! تم بولو، یہاں سے نکلنا کیا اتنا ہی آسان ہے؟”

“آج یا کل میں سب خود بخود ہو جائے گا کاکا۔ یہ تالے جو کسی چابی سے نہیں کھلتے، توڑ دیے جائیں گے۔ یہ سلاخوں والا دروازہ تیرا راستہ نہیں روکے گا۔ تیری میری راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں ہوگی۔”

“یہ سب کیسے ہوگا استاد... تم پاگل ہو گئے ہو؟”

“فرید! کیا میں نے پہلے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے؟ دو بار پہلے بھی میں نے تجھے بتایا تھا۔ دو موقع آئے تھے جب تو ہمت کرتا تو نکل جاتا... مگر تُو ڈر گیا...” اس نے آخر میں وہ لفظ استعمال کیا جو بزدل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

میں نے خفت سے کہا۔ “ڈر تو لگتا ہے نا استاد! ابھی تو امید ہے کہ میری اپیل منظور ہو گئی تو میں عمر قید کاٹ کے ایک دن رہا ہو جاؤں گا۔”

اس نے برہمی سے کہا۔ “اس کا مطلب ہے تُو خود کو مجرم سمجھتا ہے اس لیے سزا کاٹنا چاہتا ہے۔ پھر میرے سامنے کیوں بکواس کی تھی کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔”

میں نے مقابل کی دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ “میرے بکواس کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ چور وہ جو پکڑا جائے، مجرم وہ جس پر جرم ثابت کر دیا جائے۔”

“دیکھ میں پھر یہ بات سمجھا رہا ہوں تجھے۔ کسی اپیل کی منظوری کے خیال میں نہ رہنا۔ زندہ رہنا ہے تو اس زندگی کو داؤ پر لگا دے۔ ابھی وہ تجھے دہشت زدہ کر رہے ہیں۔ پھانسی سے ڈرا رہے ہیں تاکہ تو ان کی مان لے۔”

“میں ان کی بات کبھی نہیں مانوں گا۔”

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ “یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تیری اپیل منظور کرا دیں۔ دیکھ لینا، تیرے مرنے کے بعد ان کے لیے بھی چانس نہیں رہنا مگر تجھے عمر قید کی سزا ہو تو وہ کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔ تو ایسے عمر قید کاٹے کہ ہر روز مرنے کی دعا کرے اور ہر روز مرے۔ یہ جو ذہنی اور جسمانی تشدد ہوتا ہے کاکا، یہ آدمی کو اندر باہر سے ایسے توڑ پھوڑ دیتا ہے جیسے تیزاب سخت ترین فولاد کو بھی گلا دیتا ہے۔ جس دن ان کو یقین آ گیا کہ تو کتے کی دم ہے جو سیدھی نہیں ہوگی، اس روز وہ تجھے مروا دیں گے۔ انہی کے ہاتھوں جو تجھ پر تشدد کے سارے حربے آزماتے رہے تھے۔ وہ تجھے گولی مار دیں گے۔”

“وہ... مجھے کیسے قتل کر سکتے ہیں؟ گولی کیسے مار سکتے ہیں؟”

وہ ہنسا۔ “کاکا! تُو جانتا نہیں، باہر پولیس مقابلے میں ڈاکو کیسے مارے جاتے ہیں۔”

میں نے سر ہلایا۔ “اصل ڈاکو انہیں مارنے والے ہوتے ہیں مگر وہ اپنی وردی میں پہچانے نہیں جاتے۔”

“بالکل ایسا ہی جیل کے اندر ہوتا ہے۔” وہ اطمینان سے بولا۔

“یہاں بھی فرار کرانے کے ڈرامے ہوتے ہیں؟”

اس نے سر ہلایا۔ “ہاں... اصل مجرم فرار کرا دیے جاتے ہیں۔ تیرے جیسے مار دیے جاتے ہیں۔”

“مجھے ایک بات بتاؤ استاد! آخر انہیں سزا کیوں نہیں ہوئی جو قاتل تھے؟ سارا زمانہ جانتا ہے انہیں، تم بھی جانتے ہو۔ کوئی میری مانتا کیوں نہیں کہ وہ سب جھوٹ تھا جسے میرے خلاف سچ بنا کے ثبوت اور شہادت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ قرآن اٹھا کے میرے خلاف گواہی دینے والے جھوٹے تھے، میرے سچ کو کسی نے سنا کیوں نہیں؟”

“تُو نے سچ کو عدالت میں پیش کیا تھا۔ دو گواہوں کے کٹہرے میں آیا تھا۔ چھوڑ یہ ساری ہزار دفعہ کی کہی ہوئی باتیں۔ تیاری کر، آج یا کل رات میں کسی وقت جیل پر حملہ ہوگا۔ حملہ کرنے والے اپنے ہی ساتھیوں کو چھڑانے آئیں گے۔ وہ سب ڈاکو ہیں۔ ان کو سزائے موت دی گئی ہے اور ان کی آخری رحم کی اپیل بھی صدر صاحب نے مسترد کر دی ہے۔ ان کے بلیک وارنٹ موصول ہونے والے ہیں۔ لیکن یہ جو ڈاکو ہوتے ہیں نا... یہ شریف آدمی کی طرح... نہیں ہوتے۔” اس نے پھر سخت بزدلی کا ہم معنی لفظ استعمال کیا۔ “ان میں غیرت ہوتی ہے۔ وفاداری کا جذبہ ہوتا ہے۔ جان دینے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے اور جان لینے کا بھی۔ وہ یاروں کے یار ہوتے ہیں۔”

“لیکن استاد! یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ کامیاب ہوں۔ ان کا حملہ پسپا کر دیا جائے، وہ خود بھی مارے جائیں۔”

“جی تو چاہتا ہے کہ ایک ایسا جھانپڑ ماروں تیرے کہ تیری عقل ٹھکانے آجائے۔ ابے افلاطون، ایم اے پاس گدھے... انہوں نے پکّا بندوبست کیا ہے۔ انہوں نے سب کو خرید لیا ہے۔ پہرے داروں سے جیلر تک سب کو فرض شناسی کی منہ مانگی قیمت ادا کردی ہے۔ جیل کے سارے حفاظتی انتظامات اور محافظوں کے تمام مہلک ہتھیار.. سب ان کے لیے غیر موثر ہوجائیں گے۔ ہر طرف سے گولیوں کی بارش ہوگی مگر انہیں خراش تک نہیں آئے گی۔ جب وہ آئیں گے اور پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر جائیں گے تو انہیں سارے راستے صاف اور محفوظ ملیں گے۔ پھر بھی جیل پر مسلح حملے کا ڈراما ضرور ہوگا۔ وہ بھی خوب گولیاں اور گولے چلائیں گے لیکن اس آتش بازی کے مظاہرے سے زرخریدوں کی نوکری محفوظ رہے گی، آئی بات سمجھ میں؟”

میں نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ “یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟”

“مجھے فرشتے بتا دیتے ہیں کاکا! یہ فرشتے بھی اندر ہی ہیں، قیدیوں کے روپ میں۔ جیل کے اندر شاید تو بھی ہے جسے کچھ معلوم نہیں ورنہ سب ایک دوسرے کو بتا رہے ہیں۔”

“کیا... کیا بتا رہے ہیں؟”

“یہی کہ آج کل میں حملہ ہوگا۔ جن کے لیے موت کی سزا کا دن بھی مقرر ہوگیا، وہ خیر و عافیت کے ساتھ اپنی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے۔”

میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔ “اگر ایسی بات ہے تو پھر یہ جیل کے حکام، یہ کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ سودا تو انہوں نے چوری چھپے کیا ہوگا، کسی کے سامنے تو پیسا نہیں لیا ہوگا اور نہ کوئی بات کی ہوگی... انہیں ڈر نہیں کہ ان کا راز فاش ہوگیا ہے...؟”

گاما رستم نے افسوس سے سر ہلایا۔ “ڈبو یا تُو نے پڑھ لکھ کے سالے۔ اس سے تو اچھا تھا تو ہماری طرح جاہل رہتا۔ ابے، یہ عقل کیا کتابوں میں ملتی ہے، یہ یہاں ہوتی ہے کاکا، یہاں۔” اس نے اپنے سر کو انگلی سے بجایا۔ “اور یہ ورثے میں ملتی ہے، تجربے سے بڑھتی ہے۔ ان دیواروں کے پیچھے کچھ تو قیدی ہیں اور کچھ جواری... ویسے تو ہم سب جواری ہیں اور زندگی ایک جوا ہے جس میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ ان قیدیوں میں جیلر صاحب نے اپنے جاسوس بھی چھوڑ رکھے ہیں۔ وہ سب کی باتیں سن رہے ہیں اور ا سب کے نام جیلر صاحب کو لکھوا رہے ہیں جو حملے سے فائد اٹھا کے فرار ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ کچھ پہلے سے ان ک نظر میں ہیں جو فرار کی ناکام کوشش کر چکے ہیں یا فرار کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ یہ سب جواری ہی تو ہیں ج زندگی کو داؤ پر لگا کے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں... او اس میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے کہ جوئے میں زندگ ہار جائیں۔”

“کچھ لوگ جوا نہیں کھیلتے۔”

“ہاں، ہوتے ہیں تیرے جیسے افلاطون۔ وہ موق ملنے کے باوجود بھاگتے نہیں۔ یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ا بھاگ کے کہاں جائیں گے؟ پکڑے گئے تو واپس ا قید خانے میں۔ ان کے جرم میں ایک اور سنگین جرم کا اضاف ہوجائے گا۔ سزا کی میعاد اور بڑھ جائے گی۔ ابھی وقت ہ کاکا! سوچ لے کہ تو جواری ہے یا...” اس نے اپنا پسندید لفظ پھر استعمال کیا۔

رات کو اپنی کوٹھری کے اندھیرے میں میری نظ امید کی ایک کرن دیکھتی رہی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب تک میں نے اپنے رویّے سے خود کو کسی طرح بھی جواری ثابت نہیں کیا تھا۔ میں شاید جیل حکام کی نظر میں افلاطون تھا یا.. جو رستم مجھے کہتا رہتا تھا۔ جیل حکام یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ میں ایک شریف قاتل ہوں۔ بیشتر قتل بھی شریف آدمی ہی کرتے ہیں... یعنی وہ جو عرفِ عام میں شرافت ک زندگی گزارتے ہیں۔ زر، زمین یا زن کے کسی جھگڑے م قتل ان سے اچانک سرزد ہوجاتا ہے۔ پھر وہ ایم اے، پ ایچ ڈی ہوں یا انگوٹھا لگانے والے... ایک ہی صف م کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سب سمجھتے تھے کہ میں پڑھا لک ہوں چنانچہ بزدل بھی ہوں۔ سوچتا بہت ہوں اور خیالوں ک دنیا میں رہنے والے عملی دنیا میں کوئی تیر نہیں مارتے۔

میرے بارے میں یہ تاثر بے بنیاد نہیں تھا کہ م جواری نہیں ہوں۔ میں کسی صورت کوئی غیر قانونی قدم نہ اٹھا سکتا۔ فرار کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ باہر نہ ک میرا مددگار ہے نہ ہمدرد۔ میں ایک پھکّو آدمی ہوں جو ا لیے کوئی بڑا وکیل تک نہ کر سکا۔ یہ صحیح تھا کہ میرے سا جیل پر دو بار حملہ ہوا اور اس میں کچھ لوگ بھاگ گئے۔ ک پکڑے گئے اور کچھ مارے گئے۔ میں ہر بار اپنی کوٹھ میں دبکا رہا۔ حالانکہ میں بھی کوشش ضرور کرسکتا تھا کہ بھا جاؤں۔ مگر میں کسی گولی کا نشانہ بننے سے بچنے کے ل

کوٹھری میں جا گھسا تھا۔ میں ذرا بھی جواری نہیں تھا۔ میرا ریکارڈ ایسا ہی ثابت کرتا تھا۔

چنانچہ اس اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہ جوا کھیل سکتا تھا۔ رستم ہر طرح سے مجھے یقین دلا چکا تھا کہ میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ خود انہی ڈاکوؤں میں شامل تھا جن کو زندہ سلامت نکال لے جانے کی ڈیل ہر طرح سے فائنل ہوچکی تھی۔ گاما رستم اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا تو میں ہر طرح سے محفوظ تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ باہر پہنچ جانے کے بعد میں کیا کروں گا؟ اپنی آزادی کو کیسے برقرار رکھوں گا؟ میری زندگی کے دشمن تو باہر بھی تھے۔ پولیس شاید مجھے نہ تلاش کر پائے لیکن ان کی نظروں سے میں نہ بچ پاؤں گا۔

اس رات میں اپنے ذہن میں مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرتا رہا۔ اس مستقبل کا جو اس جیل خانے سے نکلنے کے بعد میری نئی زندگی میں آئے گا۔ یہ میرے لیے ایک چیلنج ہوگا۔ اگر میں پہلے جان لیوا مرحلے سے زندہ سلامت گزر کے باہر پہنچ گیا تو شاید دوسرا مرحلہ بھی طے کرلوں گا۔ میری کامیابی کا انحصار میری ہمت سے زیادہ عقل و ذہانت پر ہوگا۔ پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔ کراچی سے خیبر تک دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ فاصلے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ ہر دو سو کلومیٹر کے بعد لوگوں کی زبان، تہذیب، رہن سہن میں فرق آجاتا ہے۔ میں لاہور بھی جا سکتا ہوں اور پشاور بھی۔ اپنا نام بدل کے نیا شناختی کارڈ بنوانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ یہاں تو افغان مہاجروں کو پاکستانی پاسپورٹ تک جاری کردیے گئے۔ اب رہی ڈگری تو اسے کون دیکھتا ہے۔ سوائے ان کے جو انٹرویو کی رسمی کارروائی پوری کرتے ہیں اور پھر کسی سفارشی کو ملازمت دے دیتے ہیں۔ دنیا میں اور بہت کام ہیں جو اس ڈگری کی مدد سے یا اس کے بغیر بھی کیے جا سکتے ہیں۔

اس رات کوئی حملہ نہیں ہوا۔ صبح مجھے موقع مل گیا کہ میں رازداری کے ساتھ دوسرے قیدیوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرسکوں۔ رستم کی بات غلط نہیں تھی۔ تقریباً سب نے ہی رازدارانہ انداز میں اعتراف کیا کہ متوقع حملے کے بارے میں انہیں بھی معلوم ہے۔

“آج رات حملہ ضرور ہوگا۔” ایک میرے جیسے قیدی نے سرگوشی میں تصدیق کی... “مجھے یقین ہے۔”

“تمہیں کیوں یقین ہے؟”

اس نے افسوس سے مجھے دیکھا۔ “یار کل جو نہیں ہوا... آج تو پکی بات ہے۔”

“پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟” میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے شکی نظر سے دیکھا۔ “میں کیوں بتاؤں تمہیں؟ تمہارا کیا بھروسا۔”

میں نے کہا۔ “میں نے تو طے کرلیا ہے۔”

“کیا طے کرلیا ہے؟”

“میں کیوں بتاؤں تمہیں؟ تمہارا کیا بھروسا۔” میں نے اسی کا جملہ لوٹایا۔

دوسرے قیدی نے بھی بلا تکلف اعتراف کرلیا۔ “اپنا تو یار پکّا پروگرام ہے۔ اِدھر یا اُدھر۔ ویسے یہ سالی کوئی زندگی ہے... اس سے موت اچھی۔ چار سال میں اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ گھر والی تک بھاگ گئی اس کے ساتھ جس سے اس کا یارانہ تھا، شادی سے پہلے۔ ماں صدمے سے مر گئی۔ باپ بیماری سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ بھائی سالے جورو کے غلام کسی کے بھی نہیں۔ مر جائیں گے تو رونے والا کوئی نہیں۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟”

“کیسا پروگرام؟” میں چونکا۔

“ابے یہی... موقع سے فائدہ اٹھا کے نکلنے کا؟”

“نہیں بھیا، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ وہ گولی ماردیں گے یا پکڑ لیں گے۔” میں نے گھبراہٹ اور خوف کے ساتھ کہا۔

“ابے کچھ نہیں ہوگا... زنخے کی اولاد... ہمت کر... اِدھر یا اُدھر، یہ تو جوا ہے۔”

“مگر میں جواری نہیں ہوں، تم جاؤ... اللہ تمہاری مدد کرے۔ مگر دیکھو، ایسے ہر ایک کو کیوں بتاتے ہو، بہت سے سرکاری جاسوس بھی ٹوہ لیتے پھر رہے ہوں گے۔”

مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے اپنے عزائم کا کھل کر اظہار کرنے والے سب سچے لوگ نہیں تھے اور جو مجھے نامرد، بزدل، کم ہمت اور ان سب پر بھاری ایک لفظ کی گالی سے نواز کر جوا کھیلنے پر اکساتے تھے، سب کے سب جواری نہیں تھے۔ وہ خود جاسوس تھے جو اپنی رپورٹ مرتب کررہے تھے کہ قیدیوں میں سے کتنے فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

میری بزدلی اور کم ہمتی کی داستان عام ہورہی تھی۔ یہی میں چاہتا بھی تھا کہ ایک بے وقوف اور کم ہمت اعلیٰ تعلیم یافتہ افلاطون کے بارے میں یہ رپورٹ دی جائے کہ وہ ذرا بھی جواری نہیں بلکہ رستم کی زبان میں سخت... ہے۔ اس کا تو مارے جانے کے خیال سے پیشاب خطا ہوتا ہے۔ وہ سالا تو بھاگنے کے خیال سے بھاگتا ہے۔

وہاں میں اکیلا عقل مند نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے میری طرح کچھ اور لوگوں نے بھی کسی پر اعتبار کرنے میں خطرہ محسوس کیا ہو۔ جواری اپنے پتّے دکھادے تو بازی کیسے جیت سکتا ہے؟ تاہم رات تک حکامِ بالا کو کسی حد تک اندازہ ہوچکا تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار ہونے کا پکّا پروگرام بنانے والے کتنے ہیں۔ جنہوں نے آزادی کی قیمت ادا کردی تھی وہ جواری نہیں تھے، سوداگر تھے۔ ان کے ساتھ بلاٹکٹ نکل جانے کی بات کرنے والے ہی وہ بے وقوف جواری تھے جو اپنی زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ محافظوں نے فرشتۂ اجل کے لیے ایک فہرست بنالی تھی کہ آج کے ڈرامے میں بے خطا کون نشانہ بنے گا اور گولی کسے سلامتی کے ساتھ نکل جانے کی راہ دے گی۔

قانونی ویزا لے کر جانے والوں کو کسی بھی سرحد پر کون روکتا ہے۔ جنہوں نے یہ ویزا خریدا تھا، وہ زندگی کی سرحد کو آسانی سے عبور کرجائیں گے۔ جو بغیر ویزے کے نکلنے کا پروگرام بنارہے تھے، سب کے نام ملک الموت کی مطلوبہ فہرست میں لکھے ہوئے تھے۔ ان ہار جانے والے جواریوں کو فقط ایک خبر کا عنوان بننا تھا جو کچھ یوں ہوگی کہ ڈاکوؤں کے ایک مسلح گروہ نے اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے جیل پر حملہ کیا۔ حفاظتی عملے نے فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کوشش ناکام بنانے کے لیے بھرپور جوابی کارروائی کی جس میں اتنے قیدی ہلاک ہوئے اور باقی پکڑ لیے گئے۔ مارے جانے والوں کی لاشیں کھلی آنکھوں سے لہولہان پڑی ہوں گی اور ان کی تصویریں دیکھ کے آنسو بہانے والا کون ہوگا؟ سب کہیں گے اچھا ہوا مارے گئے سالے۔ جرم کرکے سزا نہ ہو تو دنیا ایک جنگل ہوجائے۔ سزا سے بھاگنے والوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

شام کو رستم نے مجھے دور ہی سے انگوٹھا اوپر کرکے سگنل دیا کہ ریڈی... جواب میں خودبخود میں نے بھی انگوٹھا دکھادیا مگر حاضری اور کھانے کے بعد جب مجھے اپنی کوٹھری کی تنہائی میں دھکیل دیا گیا تو مجھ پر امیدوں اور اندیشوں نے یلغار کی۔ اس میں آزادی کے خواب کھلے آسمان کی نیلاہٹ میں تیرتے سفید بادل دکھاتے تھے۔ زمین کے سرسبز گلشن میں کھلے بہار کے سارے رنگ اور کامیابیوں کے سارے خوابوں کی تعبیر دکھاتے تھے۔ ایک طرف مثالی بیوی، مثالی بچے، مثالی گھر اور مثالی زندگی... تو دوسری طرف خوف کے ڈرانے والے عفریت میری رگوں میں خون منجمد کردینے والی تصویریں پیش کرتے تھے۔

مجھے اپنا وہ بھائی یاد آتا رہا جس کا تصور بھی میرے خیالوں سے معدوم ہوتا جارہا تھا۔ وہ جس کا میرے لیے باپ کی شفقت، بھائی کی محبت اور دوست چاہت کا نام تھا، نہ جانے کہاں محض ہڈیوں کا بوسیدہ اور ڈھیر بنا پڑا تھا۔ کسی بے نشان قبر میں۔ کسی دشت کی ریت کے نیچے۔ کسی جھیل یا دریا کی تاریک گہرائی م زمین اور آسمان کے درمیان وہ جہاں بھی تھا، وہاں میرے تصور کی رسائی نہ تھی۔

اپنے اس بھائی کے ساتھ موت کے تصور کو منس کرنا ہی بڑا عجیب لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں میں ابھی تک ا خیال سے عملی سمجھوتا نہیں کر پایا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

میں اس کھولی میں اکیلا نہیں تھا۔ دوسرا ایک عمر ر شخص تھا جس کی ڈاڑھی کے، سر کے اور بھووں کے سار بال برف کی طرح سفید تھے۔ اس پر اپنی بہو کے قتل الزام تھا جس نے شادی کے آٹھ سال بعد اور دو بچوں ماں ہونے کے باوجود کسی سے ناجائز مراسم استوار کر تھے۔ بڈھے کا ایک ہی بیٹا تھا... یہ بات اسے معلوم ہو غیرت نے اسے اپنی بے وفا شریکِ حیات کے قتل اکسایا... ایک رات اس نے سوتی ہوئی بیوی کو ذبح کر اور خود کو آلۂ قتل سمیت مقامی تھانے والوں کے حوا کردیا۔ معاملہ روایات کی پاسداری کا تھا... کسی بھی عور کو کاری قرار دے کر سزائے موت دینے کا اختیار خاند کی عزت کے پاسدار سمجھے جانے والے مردوں کے پاس خواہ وہ باپ اور بھائی ہوں... شوہر یا بیٹے۔ مقدمہ عدال کے بجائے پنچایت میں گیا۔ شوہر کو اپنی سچائی ثابت کر کے لیے انگاروں پر چلنے کا حکم دیا گیا کیونکہ معاملہ ا بڈھے کے بیان سے مشکوک ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی بہ کاری تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے الزام اپنے بیٹے پر عائد کیا تھا کہ وہ شہر کی کسی عورت سے شادی کرنا چ تھا اور بیوی اس کی راہ میں حائل تھی۔ بیٹے نے انگاروں چلنے سے انکار کیا۔ اسے ڈر تھا کہ انگارے اسے جلا د گے... پولیس نے عین وقت پر مداخلت کرکے قاتل گرفتار کرلیا... جب یہ یقین ہوگیا کہ عدالت سے بیٹے سزائے موت یا کم سے کم عمر قید سنادی جائے گی تو باپ فیصلہ کیا کہ الزام وہ اپنے سر لے گا... وہ اپنی زندگی جی تھا اور اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ بیٹے کی زندگی بچا بچوں کو ماں کے بعد باپ کے سائے سے محروم نہ ہو دے... اسے عمر قید کی سزا ہوئی تھی... وہ ہر وقت روتا

تھا اور تقدیر سے گلہ کرتا تھا کہ اسے موت کیوں نہ ملی... وہ اپنے پوتوں کو ہر وقت یاد کرتا تھا اور اپنے بیٹے کو کوستا تھا جس نے ایک وفادار شوہر پرست بیوی پر ایسا شرمناک الزام عائد کیا اور اپنی ہوس پر اپنے بچوں کی ماں کو قربان کیا۔

شاید چند منٹ کے لیے مجھے بھی جھپکی سی آ گئی تھی ورنہ میری ہر سانس آنے والے لمحے کے انتظار میں تھی۔ میں نے سوتے جاگتے ایک خواب دیکھا۔ یہ میں تھا جس کے دو چہرے تھے اور وہ ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔

ایک نے کہا۔ ”جواری مت بن، حالات کا مقابلہ کر۔ خدا سے انصاف کی امید رکھ۔ وہ جانتا ہے کہ تُو بے گناہ ہے۔“

دوسرے نے سر ہلایا۔ ”خدا بھی تو ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا تو ایک دن پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوگا۔ رسی تیرے گلے میں ہوگی اور نقاب تیرے چہرے پر۔ تجھے یہ رسک لینا ہی چاہیے۔“

پہلے نے کہا۔ ”بے وقوف انسان! تُو نے اپنے بھائی کے انجام سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔“

دوسرا بولا۔ ”یار، ایک ناکامی سے زندگی ناکام نہیں ہوتی۔ ایک محاذ پر شکست سے جنگ میں ہار نہیں ہوتی۔“

پہلے نے کہا ”زندگی صرف ایک بار ملتی ہے... کیا اسے بھی تو جوئے میں ہارے گا؟“

دوسرا بولا۔ ”ہر جواری کی نظر جیت پر رہنی چاہیے۔“

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ اپنے وجود میں جاری مثبت اور منفی خیالات کی یہ خانہ جنگی میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میرا سارا جسم پسینے میں تر تھا اور خوف کا عفریت میرے دل میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔ میں قوتِ فیصلہ سے محروم ہونے لگا تھا۔

ابھی تک میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ بفرضِ محال قسمت کی یاوری سے میں اس جیل خانے سے نکلنے میں کامیاب رہا تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ میں کیا کروں گا... کہاں جاؤں گا؟

صرف ایک دن پہلے میں نے رستم سے پوچھا تھا۔ ”استاد! اگر تم نکلنے میں کامیاب رہے تو کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟ تم نے کچھ سوچا ہے؟“

”سب کچھ پہلے سے طے کر لیا ہے میں نے۔ تُو نے بھی کچھ سوچا ہے کاکا، اپنے بارے میں؟“

میں نے مایوسی سے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔ ”یہاں سے باہر نکل کے سوچوں گا، اگر پکڑا نہ گیا۔“

”یہ شہر تیرا دیکھا بھالا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں، بہت کچھ بدل گیا ہوگا... لیکن راستے مجھے معلوم ہیں۔“

”دیکھ... ایک بار ان دیواروں سے باہر نکل جائے تو پھر پلٹ کے مت دیکھنا۔ اپنی نظر آگے کے راستے پر رکھنا۔ تجھے اس سمت ہی جانا ہے جدھر ریلوے لائن ہے۔ فکر نہ کر، میں کوشش کروں گا کہ تیرے ساتھ ہی رہوں... لیکن یہ ساتھ تھوڑی دیر کا ہوگا۔ تو میری بات سن رہا ہے نا کاکا... ریلوے لائن پر آگے ایک پل آئے گا، اس کے نیچے سے ایک سڑک گزرتی ہے۔ تیرے دائیں ہاتھ پر ہوگا پرانا شہر۔ نیچے اترے گا تو تھوڑے فاصلے پر لطیف پارک ہے۔ اس سے آگے تانگا اسٹینڈ۔“

”وہ دیکھا ہے میں نے۔ وہاں سے مجھے کہاں جا ہوگا؟“

”دیکھ... جہاں تک ممکن ہو، سڑک سے دور ہی رہ جہاں روشنی نہ ہو۔ میں دوسری طرف اتروں گا۔ شالیمار سین کی طرف... جو سڑک گھنٹا گھر جاتی ہے، وہی دوسری طرف روہڑی کی طرف نکل جاتی ہے۔ اس پر ہر وقت ٹریفک رواں رہتا ہے لیکن آج کل سردیاں ہیں، آدھی رات کے بعد سناٹا ہی ہوگا۔ فرار ہونے والوں کو پکڑنے والے بھی سڑک پر گاڑیاں لے کر نکلیں گے۔ ہر گاڑی کی ہیڈ لائٹ سے خود کو بچا کے رکھنا... اور تیرا جو جیل کا لباس ہے نا... یہی تیرا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ اگر تو پکڑا گیا خدا نخواستہ... تو اسی کی وجہ سے پکڑا جائے گا۔ جتنی جلد ممکن ہو اس کو اتار پھینکنا... لیکن پھینکنا ایسی جگہ کہ کسی کی نظر میں نہ آئے۔ کسی گٹر میں ڈال دینا... یا ساتھ رکھنا اور بعد میں آگ لگا دینا۔ آدھی رات کے وقت بازار کھلا نہیں ملے گا کہ تو نئے کپڑے خرید سکے اور کچھ خریدنے کے لیے تیرے پاس پیسے کہاں ہوں گے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملے کسی کے کپڑے چوری کر کے پہن لینا۔“

”یہ سب میں کر لوں گا استاد! لیکن مجھے چند دن روپوش رہنے کے لیے بھی کوئی ٹھکانا بتا دو، جب تک معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔“

اس نے کچھ دیر سوچا۔ ”تو نے لطیف پارک کے پاس پرانی ٹائل فیکٹری دیکھی ہے؟ اس کے پیچھے ایک اجڑی ہوئی خستہ حال حویلی ہے جو آسیب زدہ مشہور ہے۔ یہ تقسیم سے بھی سو سال پہلے کسی لالہ کاشی رام نے تعمیر کرائی تھی۔ اس حساب سے تو یہ ڈیڑھ سو سال پرانی حویلی ہے۔“

”ابھی تک اس پر کسی نے قبضہ کیوں نہیں کیا؟“

”اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ محکمۂ اوقاف کی ملکیت میں ہے۔ کہتے ہیں لالہ جی نے بھارت جانے سے پہلے اسے اس مندر کو دے دیا تھا جو سادھو بیلا کے نام سے مشہور تھا۔ تُو نے دیکھا ہوگا کہ یہ دریا کے بیچ میں جزیرے پر ہے۔“

”ہاں، سات سہیلیوں کا مزار بھی ہے وہاں۔“

”دوسری وجہ حویلی پر قبضہ نہ ہونے کی یہ ہے کہ لالہ جی نے کسی یتیم لاوارث کو گود لیا تھا۔ وہ خود بے اولاد تھے۔ انہوں نے لڑکے کو پڑھایا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھی بھیجا۔ اب وہ پاکستان میں کسی اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز ہے۔ چیف سیکریٹری ہے کسی صوبے کا۔ چیف سیکریٹری کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ انگریز کے زمانے میں گورنر کو لاٹ صاحب کہتے تھے۔ چیف سیکریٹری چھوٹا لاٹ صاحب کہلاتا تھا۔ آج بھی گورنر تو بس نام کا ہوتا ہے، سارے اختیارات چیف سیکریٹری کے پاس ہوتے ہیں۔ لالہ کاشی رام کے لے پالک نے یہاں متروکہ املاک والوں کو بھی ٹائٹ کر رکھا ہے کہ اس حویلی پر قبضہ ہوا تو کسی کی خیر نہیں۔“

”یہ سب تم کیسے جانتے ہو استاد؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”چھوڑ، کیا کرے گا جان کے۔ یہ سب بتانے کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ حویلی کے غیر آباد رہنے کی سب سے بڑی وجہ اس کا آسیب زدہ ہونا ہے۔ برسوں سے کسی نے اس کے اندر قدم نہیں رکھا۔ کہتے ہیں ایک بار یہ حویلی کسی نے کرائے پر لے لی تھی۔ ظاہر ہے متروکہ املاک والوں کی اجازت سے۔ اس نے رنگ و روغن کرا کے حویلی کو آباد کیا اور یہاں اپنے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ لیکن شادی کی رات ہی یہ ہوا کہ دلہن نے خود اپنا سہاگ اجاڑ لیا۔ اس نے دولہا کو قتل کیا، ایسے ذبح کیا کہ اس کی گردن ایک کان کے نیچے سے دوسرے کان تک کاٹ دی۔ پھر وہ خون آلود چھری سمیت فرار ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے خود دیکھا کہ پورے عروسی لباس میں زیوروں سے لدی پھندی ایک دلہن بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ خون آلود چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔ خون کے دھبے اس کے لباس پر بھی تھے اور اس کے چہرے پر بھی۔ وہ دیوانہ وار ہنس رہی تھی۔ دیکھنے والے اسے چڑیل سمجھ کے دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ حویلی پھر ویران ہو گئی اور برسوں چڑیلوں، بھوتوں کا مسکن سمجھی جاتی رہی۔ پھر کوئی ولایت سے پڑھ کر آنے والا چیف سیکریٹری کی سفارش سے یہاں ڈپٹی کمشنر لگا اور اس نے حویلی کے بارے میں لوگوں کی باتیں سنیں تو اس نے حویلی میں رہائش اختیار کی۔ وہ ان سب کا مذاق اڑاتا تھا کہ اب کہاں گئے وہ جن بھوت۔ وہ اپنے ساتھ انگلستان سے ایک میم بھی لایا تھا۔ وہ کچھ دن بعد اسے چھوڑ کے چلی گئی تو صاحب نے دوسری شادی یہاں کے ایک بزنس مین کی لڑکی سے کی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ شادی کی رات دلہن نے پھر اسی طرح دولہا کو ذبح کیا اور نئی دلہن کے جوڑے میں خون آلود چھری لہراتی اسی طرح فرار ہو گئی جیسے وہ پہلی دلہن ہوئی تھی۔ یہ نظارہ بھی بہت سے لوگوں نے دیکھا۔“

”کوئی قاتل دلہن پکڑی نہیں گئی؟“

”نہیں۔ کسی قتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں نے سنا ہے کہ ایسا ہی تیسرا واقعہ ابھی دو سال پہلے بھی پیش آیا تھا مگر پہلے مجھے معلوم نہیں کہ قتل کس کا ہوا تھا۔ یہ ضرور سنا ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے چاند کی آخری تاریخوں میں یہاں سے عورتوں کے قہقہے سنے ہیں۔ کچھ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ تینوں قاتل دلہنوں کا اس حویلی میں اجتماع ہوتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ اتنی ہم شکل ہیں کہ جڑواں بہنیں لگتی ہیں۔ خیر... کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمت ہے تو اس حویلی میں چھپ جانا۔ اس سے بہتر پناہ کی جگہ تجھے نہیں مل سکتی۔“

”میں جن بھوتوں اور بدروحوں پر اتنا بھی یقین نہیں رکھتا جتنا جادو ٹونے پر۔“

رستم کی ساری ہدایات میرے ذہن میں رٹے ہوئے سبق کی طرح محفوظ تھیں لیکن ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ آج کی رات میری زندگی میں کوئی انقلاب آئے گا۔ اچانک مجھے آزادی اور نئی زندگی کی ضمانت حاصل ہو جائے گی۔ ہنوز یہ ایک خیال تھا یا ایک خواب۔ رستم کی تمام یقین دہانی کے باوجود مجھے یہ ناممکن سا لگتا تھا کہ کوئی جیل خانے پر حملہ کر کے سزائے موت پانے والوں کے لیے آزادی کا اعلان عام کر دے۔ پھر بھی ایک اندرونی خلش اور بے چینی تھی جس نے مجھے انتظار کے آزار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ رستم کا یقین بے سبب یا فریب خیال نہیں ہو سکتا۔ محض آرزو کا سراب یا دماغ کے خلل کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

اچانک رات کے سناٹے کو منتشر کرنے والی ایک فائر کی آواز کسی بم کا دھماکا بن کے گونجی۔ میں اچھل پڑا اور

میرا دل جیسے اچھل کر میرے حلق میں آ گیا۔ نہ جانے کون چلّایا... پھر دوسرا فائر ہوا۔ اس کے بعد تو گولیوں کے فائر مسلسل ہونے لگے۔ بیچ بیچ میں مختلف دھماکے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف پٹاخے چلائے تھے چنانچہ میں ریوالور، پستول، رائفل اور شکاری بندوق کے فائر کی آواز میں فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں، کلاشنکوف کے برسٹ میں نے سنے تھے۔

باہر ایک شورِ محشر بپا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ بیک وقت چیخ چلّا رہے تھے۔ ''بھاگو... دوڑو... پکڑو...'' اس کے ساتھ گالیاں تھیں اور آہنی دروازے کھولے جانے کی آوازیں۔ پھر اندر گھپ اندھیرا پھیل گیا اور تاریکی میں ٹارچ کی تیز روشنی اِدھر سے اُدھر لہرانے لگی۔ بہت سے قیدی زور زور سے دروازے جھنجوڑ رہے تھے۔ برآمدوں میں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔

میں خود لوہے کی سلاخیں تھامے کھڑا تھا جب ایک سایہ دوڑتے ہوئے میری طرف آیا، یہ رستم تھا۔ اس نے چابی لگا کے قفل کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ ''چل آجا میرے ساتھ کاکا!'' وہ مجھے کھینچتے ہوئے دوڑنے لگا۔ نہ جانے کس نے گالیاں دیتے ہوئے ہذیانی قہقہہ مارا... ''جاؤ، نکل جاؤ... بھاگ جاؤ سور کے بچو!'' گولیاں ہر طرف سے برس رہی تھیں مگر کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ فائر کون کر رہا ہے اور کس پر کر رہا ہے؟

رستم میرا ہاتھ پکڑ کے دوڑتا چلا گیا۔ میں جیل کے صدر دروازے سے گزرا تو مجھے بڑا عجیب لگا۔ اس دروازے سے اندر آتے وقت میں نے سوچا تھا کہ اب اس راستے سے میری واپسی نہ ہوگی۔

وہ سب گزری ہوئی رات کے کسی وحشت ناک خواب کی طرح ہو گیا تھا۔ میں اس زنداں سے بہت دور اسی آسیب زدہ حویلی کی تاریک پناہ گاہ میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

کہیں پھر اسی کلاک نے تین گھنٹے بجائے جس کی صدا میں نے پہلے بھی سنی تھی۔ اس بار یہ آواز قریب سے آئی تھی اور بہت واضح تھی۔ ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ اس ایک گھنٹے کے ایک ایک سیکنڈ کا متحرک جیتا جاگتا نقش میرے دماغ میں فلم کے فریم کی طرح چل رہا تھا اور یہ مجھے ایک گھنٹے کی نہیں، پوری ایک رات کی روداد لگتی تھی۔ وہ رات جو ابھی جاری تھی، میرے ساتھ اور ہر طرف محیط تھی۔ بے شک میں زنداں کی دیواروں سے، فولادی سلاخوں والے دروازوں اور سلاسل کی آہنی گرفت سے دور آ گیا تھا لیکن پھر گرفتار ہو جانے کا خوف مسلسل میرے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میری ہر سانس میں موجود تھا۔

ابھی تک میں نے یہ سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ یہاں سے میں کہاں جاؤں گا۔ اپنی اس دوسری زندگی کا آغاز کہاں سے اور کیسے کروں گا۔ ابھی میں یقین کی اس منزل سے بہت دور تھا جہاں میں اپنے مستقبل کے لیے سوچ بھی سکتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ آنے والے چند دنوں میں کیا ہوگا۔ اخبارات کی شہ سرخیاں ہر شہر میں لوگوں کو جیل سے خطرناک ڈاکوؤں کے فرار کی خبر دیں گی۔ خطرناک ڈاکو گیارہ تھے۔ یہ مجھے رستم نے بتایا تھا۔ ان کے ساتھ کتنے نکل گئے تھے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ جان سکتا تھا۔ ہاں، یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ جیل کے مستعد محافظوں نے فرار کی کوشش کرنے والے کتنے خطرناک مجرموں کو پھر پکڑ لیا... کتنوں کو مار ڈالا... لیکن یہ تعداد بھی درست نہیں ہوگی۔

صبح صوبائی وزارتِ داخلہ کے اعلیٰ حکام جیل پہنچ کے جائے واردات کا معائنہ کریں گے۔ آئی جی جیل خانہ جات، پولیس کے آئی جی صاحب اور جواب طلبی ہوگی سپرنٹنڈنٹ جیل سے۔ ہمیشہ کی طرح ایک تفتیشی ٹیم بنائی جائے گی یا کوئی کمیشن قائم ہوگا۔ فرار ہونے والے مجرموں کی تصاویر تمام اخبارات میں شائع ہوں گی۔ پولیس تمام باہر جانے والے راستوں پر ناکا بندی کرے گی۔ ریلوے اسٹیشن، بس کے اڈے، ائرپورٹ، ہر مسافر ٹرین اور بس پر چھاپے مارے گی اور تلاش کا یہ سلسلہ یا ڈراما کم سے کم ایک ہفتہ پورے زور و شور سے جاری رہے گا۔ پھر اس کی شدت میں کمی آنے لگے گی۔ ایک مہینے بعد بات پرانی ہو جائے گی۔ لوگ بھی اس کو بھول جائیں گے اور خود پولیس کے لیے مزید تلاش لاحاصل ہو جائے گی۔

ہاں، اس عرصے میں کچھ بدنصیب پھر پکڑ لیے جائیں گے۔ اپنی بے وقوفی سے یا کسی کی مخبری سے... یا یہ ہو سکتا ہے کہ پولیس اس بھوت پریت کے ڈیرے پر بھی چھاپا مارے۔ پولیس میں سب تو آسیب پر یقین نہیں رکھتے اور بلاشبہ کچھ ذہین اور محنتی بھی ہوتے ہیں، خواہ ان کا وجود آٹے میں نمک کے برابر ہو۔

ابھی میں خود کو صرف غیر محفوظ ہی نہیں، بہت بے کس اور لاچار... تنہا اور کمزور بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں موت کو جل دے کر نکل تو آیا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ یہاں سے آگے کہاں جاؤں گا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میرے پیروں میں پہننے کے لیے جوتے نہیں تھے۔ جو لباس میں نے زیب تن کر رکھا تھا، وہ چوری کا تھا اور اس کے نیچے وہ جو مجھے ایک مفرور مجرم ثابت کرتا تھا۔

اب میری دست گیری کرنے والا گاما رستم بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے کی نقاب اوڑھے وہ دنیا کی بھیڑ میں ہمیشہ کے لیے گم ہو چکا تھا۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔ مجھ پر ایک نیکی کا قرض چھوڑ کے وہ اپنی دنیا میں لوٹ گیا۔ یہ اسی کی مسلسل کوشش کا نتیجہ تھا کہ میں نے جواری بن کے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا اور پہلی بازی جیت گیا۔ وہ مسلسل مجھے قائل کرتا رہا تھا کہ یہ آخری موقع ہے کاکا... اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔

لیکن یہ موقع مجھے ان لوگوں نے فراہم نہیں کیا تھا جو پہلے مجھے دوبار آفر دے چکے تھے کہ میں ان کی بات مان لوں اور ان سے تعاون پر آمادہ ہو جاؤں تو میرے لیے زنداں کی اذیت بھری زندگی اور ایک عبرت ناک انجام والے مستقبل کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے طاقتور تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ میں زندگی رکھتے ہیں تو دوسرے میں موت۔ جو نعوذ باللہ خدائی کے دعوے سے کم نہ تھا۔ میرے جیسے عام لوگ ان کے نزدیک حشرات الارض جیسے تھے۔ میں ایک جیل کی دنیا سے تو نکل آیا تھا لیکن باہر وہی دنیا تھی جس میں ان کی فرعونیت کا سکہ چلتا تھا۔ وہ آج بھی گزرے ہوئے کل کی طرح وہی پرانے دشمن تھے۔

اب مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یہ رخصت ہوتے موسمِ سرما کی آخری سرد لہر تھی جس نے میرے پیروں کو سن کر دیا تھا اور دہرے کپڑوں میں بھی آخر شب کی ٹھنڈک سے میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود میرا حلق خشک ہونے لگا تھا لیکن یہاں پانی کا حصول بھی ممکن نہ تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ دو چار گھنٹے میں وہ صبح طلوع ہو جائے گی جب میں جیل کے اندر اپنی کوٹھری سے باہر آنکھیں کھولوں گا اور آزادی کے پہلے سورج کی روشنی کو اپنے اردگرد پھیلتا دیکھوں گا لیکن میرا جسم آزادی کی مسرت کے ساتھ زندہ رہنے کے مادی اسباب کا طلب گار بھی ہوگا۔ پیاس کے بعد مجھے بھوک محسوس ہوگی جو میں ایک حد تک برداشت کر لوں گا مگر اس کے بعد...!

اچانک میرے حواس کو ایک جھٹکا لگا اور میرے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ یہ ایک مسحور کن تیز اور دلنواز خوشبو کا جھونکا تھا جس نے میرے حواس پر یلغار کی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈاکوؤں کے ساتھیوں نے جیل خانے پر مسلح یلغار کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں گھبرا گیا اور خوف سے میرے پورے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اب تک یہاں صرف بو تھی، اس بو میں ہر قسم کی بو شامل تھی جس میں سانس لیتے ہوئے مجھے اب کسی ناگواری کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ خوشبو کا یہ ہیجان انگیز جھونکا اس ماحول میں بالکل اجنبی تھا۔ اتنا ہی اجنبی جتنا میلے کچیلے بدحال فقیروں کی ٹولی میں کوئی خوش پوش، خوش شکل اور خوشحال بادشاہ زادہ۔

ابھی میں اس خوشبو سے آشنائی کا رشتہ استوار بھی نہ کر پایا تھا کہ میری سماعت پر حیرت کا وار ہوا۔ میں نے ایک ہلکی سی کھنک سنی جیسے چوڑیوں کی دبی دبی جھنکار۔ میں کہہ سکتا تھا کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا لیکن وہ خوشبو تو جیسے وہیں رک گئی تھی اور اپنا وجود تسلیم کرانے کے لیے تاریکی میں مجھ پر یلغار کر رہی تھی۔

خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اترنے لگی۔ میں کبھی بھوت پریت کا قائل نہ تھا۔ ذاتی طور پر نہ مجھے عالمِ ارواح کے کسی مکین سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اور نہ اس بے وجود مخلوق سے جن میں بھوت اور چڑیلیں شامل تھیں۔ مختلف لوگوں کے تجربات میں نے سنے تھے اور پڑھے بھی تھے مگر میرا ذہن مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر خود پرکھے بغیر کسی بات کو قبول نہ کر سکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آج اس آسیب زدہ حویلی میں میری یہ خواہش پوری ہونے کا وقت بھی آ گیا تھا۔

میں نے اس خوشبو پر غور کیا۔ یہ قبرستانوں اور مزاروں پر محسوس ہونے والی اگربتی، کافور یا لوبان کی وہ خوشبو نہیں تھی جس سے روحانیت کا پُرخوف ماحول طاری ہو جاتا ہے۔ نہ یہ پھولوں کی مہک تھی نہ حنا کی خوشبو۔ پھر یہ کیا تھا؟ ٹالکم پاؤڈر یا ٹائلٹ سوپ، یوڈی کلون یا اعلیٰ قسم کا پرفیوم... پرفیومز کا شمار نہیں۔ چند ایک کے سوا میں کوئی خوشبو شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ بروٹ، چارلی، پوائزن، بلیک میجک... میں نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ خوشبو جانی پہچانی ضرور لگتی تھی لیکن پھر بھی سب سے جدا تھی اور کچھ یاد نہ آتا تھا کہ اس سے میرا واسطہ پہلے کہاں پڑا تھا۔ جیسے راہ چلتے کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے۔ سلام دعا بھی ہو مگر بہت سوچنے پر بھی یاد نہ آئے کہ اس کا نام کیا تھا، اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

چوڑیوں کی کھنک پھر سنائی دی تو میں تقریباً اچھل

پڑا۔ اس بار یہ آواز بہت واضح اور بلند تھی۔ اب یہ ناممکن ہوگیا تھا کہ میں اسے فریبِ سماعت سمجھ کے نظرانداز کردوں۔ میں نے مکمل تاریکی میں ایک سیاہ چوکھٹا سا محسوس کیا جو درحقیقت دوسرے کمرے میں جانے کا راستہ تھا۔ کسی پٹ یا چوکھٹ کے بغیر اسے دروازہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ خوشبو کا جھونکا بھی اسی طرف سے آیا تھا اور چوڑیوں کی جھنکار بھی اسی سمت سے سنائی دی تھی۔

میں سنبھل کے قدم جماتا ہوا آگے بڑھا۔ میرے پیروں کے نیچے وہی ٹوٹا پھوٹا گردآلود اور زمانے بھر کی غلاظت سے بھرا فرش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے صرف اس ویرانے میں مقیم چمگادڑ یا الّو ہی نہیں، دوسرے پرندوں کے علاوہ وقتِ ضرورت آوارہ گرد اور مجبور لوگ بھی اس کو بیت الخلا کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ میرے تلوے دکھ رہے تھے مگر اس سے زیادہ فکر مجھے یہ تھی کہ میں ٹھوکر کھا کے اس پرتعفن اور غلیظ فرش پر منہ کے بل نہ گر پڑوں۔

میں دروازے کے قریب تھا جب میں نے ایک سسکی سنی۔ ایک دبی دبی سسکی۔ پھر چوڑیوں نے صدا دی۔ ایک لمحے کے لیے میرے منطق پرست سائنسی ذہن پر بے یقینی کے سائے سے پھیلنے لگے۔ کہیں سچ مچ یہ کوئی بھٹکتی ہوئی روح تو نہیں تھی۔ ساری دنیا جادو ٹونے، بھوت پریت اور نیک و بد ارواح، جنات اور چڑیلوں کے وجود کو تسلیم کرتی ہے۔ مافوق الفطرت واقعات کی کوئی انتہا نہیں جن کی سائنسی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ بعض لوگوں کے ذاتی تجربات کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا کیونکہ عام زندگی میں وہ انتہائی معتبر سمجھے جاتے ہیں۔

یہ چند سیکنڈ کی بات تھی۔ پھر میں نے سر سے ایسے تمام خیالات کو جھٹک دیا کہ یہ کوئی آسیب کا سلسلہ تھا۔ میری عقل یہ بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ میرے حواس مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ وہ خوشبو ایک حقیقت تھی اور چوڑیوں کی کھنک بھی۔ یہ سب اس ماحول کا اثر تھا یا پہلے سے سنی ہوئی روایات کا۔ گامار ستم نے مجھے اس حویلی سے منسوب تاریخ یوں سنائی تھی کہ حقیقت میں افسانے شامل کردیے تھے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ کچھ دیر پہلے میں خوف اور دہشت کے جس تجربے سے گزرا تھا، اس میں موت ہم رکاب تھی۔ ابھی تک میرے اعصاب پر اس کا اثر باقی تھا چنانچہ میں گھپ اندھیرے میں ساکت کھڑا رہا۔ یوں جیسے سیاہ کینوس پر سیاہی سے بنی قدِ آدم تصویر۔

وہ خوشبو اب میرے حواس پر مسلط ہوچکی تھی اور اپنا وجود ثابت کر رہی تھی۔ چوڑیوں کی کھنک اور دبی دبی سسکیوں کی آواز مجھے بہت قریب سے آتی محسوس ہوتی تھی لیکن میں وہاں مفلوج کھڑا تھا۔ مجھ میں آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہ تھی۔ میری آواز تک میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی کہ میں تین لفظوں کا ایک سوال کرسکتا کہ تم کون ہو؟ اگر اس وقفے میں باہر سے کوئی موٹر سائیکل یا کار گزرتی تو اندر کا منظر چند سیکنڈ کے لیے اتنا روشن ضرور ہوجاتا کہ میں کچھ دیکھ سکوں۔

اسی وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ اسے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے کہ کوئی بہت باریک سا اڑنے والا کیڑا جو کسی مچھر کا نومولود بھی ہوسکتا تھا، میری ناک کے اندر پہنچ گیا۔ ظاہر ہے نظر اسے بھی نہیں آرہا تھا ورنہ وہ ناک کی بند گلی میں داخل ہی کیوں ہوتا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ مجھے بے اختیار چھینک آگئی۔

اس چھینک کے ساتھ ہی کسی نے چیخ ماری اور میں یوں اچھل پڑا جیسے جیل کا سائرن عین میرے کان پر بج اٹھا ہو۔

”کک… کو… کون ہو… تم؟“ اس نے دبی دبی گھٹی ہوئی، پُرخوف آواز میں سوال کیا۔ ”خبردار… آگے مت آنا۔ میں گولی ماردوں گی۔“

خوشبو کا ایک تیز جھونکا سا آیا اور چوڑیوں کی جھنکار اب بالکل مخالف سمت سے سنائی دی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی آواز میں نرمی اور شائستگی شامل کر کے کہا۔ ”دیکھو… ڈرو نہیں۔“

وہ اسی گھبراہٹ میں بولی۔ ”خبردار، وہیں رک جاؤ… میں نے کہا نا… پستول ہے میرے پاس… اور میں اندھیرے میں بھی شوٹ کرسکتی ہوں۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔“

میں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور آہستہ سے کہا۔ ”تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں… میں تو خود یہاں…“

اس کا ہسٹریا زدہ لہجہ برقرار رہا۔ ”جھوٹ… جھوٹ بولتے ہو تم۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہاری نیت کو۔ آئی ول مرڈر یو۔ اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش بھی کی…“

”آل رائٹ… آل رائٹ! میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ تمہارا نشانہ اتنا ہی اچھا ہے تو میری آواز پر بھی تم مجھے شوٹ کرسکتی ہو۔ میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلوں گا۔ بس خدا کے لیے اپنے ریوالور کا رخ میری طرف مت رکھو… پلیز!“

”کیوں… تاکہ تم فائدہ اٹھا سکو؟“

”ہرگز نہیں۔ دیکھو تم بہت ٹینس ہو، نروس ہو۔ آئی ڈونٹ نو وائے… لیکن ایسی کیفیت میں…“

”بالکل ٹھیک ہوں میں… کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم سخت خوف زدہ بھی ہو۔ تمہاری آواز کانپ رہی ہے… کیونکہ تم پر خوف سے لرزہ طاری ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہوں تو بلاارادہ بھی گولی چل جاتی ہے۔ ٹیک اٹ ایزی۔ کم سے کم مجھ سے تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہیے۔“

اس کا لہجہ کچھ بدلا۔ ”آخر… کون ہو تم…؟“

”میں ایک شریف آدمی ہوں۔“

”شریف آدمی… یہاں کیا کر رہے ہو تم؟“ وہ تلخی سے بولی۔

”یہ سوال میں نے پہلے کیا تھا۔“

اس نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ”غلط… پہلے میں نے پوچھا تھا… کون ہو تم… بولو…“

”میں… میں ہوں… ایک مجبور آدمی…“

”ابھی تم خود کو شریف آدمی کہہ رہے تھے۔ نام بتاؤ اپنا… کام کیا کرتے ہو… یہاں کیوں آئے ہو؟“

اس کی گفتگو کے انداز سے میں نے بہت سے اندازے قائم کیے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اَن پڑھ نہیں ہے۔ خوف اور گھبراہٹ کے باوجود اس کی آواز سے وہ کم عمر یا عمر رسیدہ نہیں لگتی تھی۔ اس سے میں یہ اندازہ بھی قائم کرسکتا تھا کہ وہ فقیرنی نہیں ہوسکتی۔

اس سے پہلے کہ خاموشی کا وقفہ اس کے دل میں شکوک پیدا کرتا اور میں اندازوں کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے میں ہی مارا جاتا، کوئی گاڑی باہر سڑک سے گھوم کے گلی میں آئی اور اس کا اجالا چند سیکنڈ کے لیے کمرے کو روشن کرگیا۔ اس اجالے میں ہم نے پوری طرح ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک سیکنڈ میں مجھ پر چودہ طبق روشن ہوگئے۔

وہ ایک دلہن تھی۔ سر سے پیر تک سرخ لباسِ عروسی میں… زیورات سے لدی پھندی اور پورے سولہ سنگار کے ساتھ۔ وہ اس کھنڈر جیسے ویران کمرے میں اکھڑے ہوئے پلستر والی دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی… اور اس کے ہاتھ میں کوئی ریوالور نہیں تھا، ایک خون آلود چھری تھی۔

میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ وہ سب خوش فہمی جو مجھے اپنے توہم پرست نہ ہونے کے بارے میں تھی، پلک جھپکتے میں دور ہوگئی۔ مجھے ذرا سا شک نہ رہا کہ بالآخر آج میں اس حویلی کے آسیب کا شکار ہوچکا ہوں۔ جس کو میں لوگوں کی جہالت کا وہم قرار دیتا تھا، وہ حقیقت تھی۔ ایک نئی نویلی دلہن کے خون آلود چھری لہراتے ہوئے نظر آنے کے جو واقعات مجھے گامار ستم نے جیل میں سنائے تھے، بے بنیاد نہیں تھے۔ میرے اندر سے اٹھنے والی خوف کی سرد لہر نے مجھے مفلوج کردیا۔ میں نے سوچا کہ پلٹ کر بھاگ جاؤں مگر میرا جسم حرکت کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہوگئے تھے اور میں پلک جھپکائے بغیر اندھیرے کو گھور رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں اس قابل ہوا کہ کچھ بول سکوں لیکن حلق سے نکلنے والی آواز مجھے مضحکہ خیز حد تک اجنبی لگی۔ ”تم… تم وہی… وہی دلہن ہو نا… تم نے سہاگ رات میں… اپنے شوہر کا قتل…“

اس نے بڑی تیزی سے جست لگا کے مجھ پر حملہ کیا۔ معلوم نہیں اس کی آنکھوں نے اندھیرے میں مجھے کیسے دیکھا اور اس میں اتنی ہمت اور وحشیانہ قوت کہاں سے آگئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہسٹریا سے مغلوب ہو کے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ میری بات نے جذبات کے بارود کی… ڈھیر میں چنگاری پھینکنے کا کام کیا۔

یہ زندگی کا دفاع کرنے کی حیوانی جبلت تھی جس نے میرے جسم کے خود حفاظتی نظام کو بروقت متحرک کردیا۔ ہر خطرے میں انسان کی ہر حس بہت تیز ہوجاتی ہے۔ میں نے مکمل تاریکی میں بھی اس خوشبو کو ہوا کے جھونکے کی طرح اپنی طرف لپکتے محسوس کیا۔ بے اختیار میں پیچھے ہٹا اور دفاعی انداز میں اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھا کے ڈھال بنانے کی پوری کوشش کی۔

میرے بائیں ہاتھ کی پشت پر چبھن سی ہوئی۔ پھر درد کی ایک لکیر سی میری کہنی سے کلائی تک پھیلتی چلی گئی۔ اس کے وجود کی خوشبو مجھے اپنے جسم کے گرد کسی غلاظت کی طرح لپٹی ہوئی محسوس ہوئی تو میرے ہاتھوں نے خود بخود اس کو دبوچنے کی کوشش کی مگر وہ پوری طرح میری گرفت میں نہیں آئی۔ میرے ہاتھ اس کے شانوں پر گئے۔ خوف یا اشتعال کے ہسٹریا نے اسے پاگل کردیا تھا۔ وہ متلاطم سمندر کی ایک بپھری ہوئی موج تھی یا تاریک طوفانی رات میں گرنے والی بجلی۔ اس کا ریشمی وجود میری گرفت میں آیا مگر میں اسے اسیر نہ کرسکا۔ وہ تڑپ کر میرے ہاتھوں سے پھسل گئی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ پھر مجھ پر وار کرتی، میں نے اس کے وجود کا تعین اس کی خوشبو اور قربت کی حرارت سے کیا۔ میں نے تاریکی میں حملہ کیا اور اپنے جسم کی ساری قوت کے ساتھ اس سے ٹکرا گیا۔ جب میں گرا تو وہ میرے نیچے آ گئی۔

وہ زخم خوردہ ناگن کی طرح تڑپتی، مچلتی رہی۔ بل کھاتی اور پھنکارتی رہی۔ ”تم... بدمعاش... تم کیا سمجھتے ہو... پکڑ لوگے مجھے... گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کردو گے؟“

اب مجھ پر جنون طاری تھا اور وہ میری وحشیانہ قوت کے سامنے بے بس تھی۔ میں نے ایک گھٹنے کا سارا دباؤ ڈال کے اسے زمین سے لگائے رکھا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تو اس کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہوگیا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اس کی وہ کلائی جکڑ لی جس میں ایک خون آلود خنجر اب بھی میرے دل تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

اچانک اس کی ساری مزاحمت ختم ہوگئی۔ اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ یہ بے ہوشی کی علامت تھی مگر میں کوئی رسک لینے پر تیار نہ تھا۔ اس کی بے حسی مکر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنا گھٹنا تھوڑا سا اوپر اٹھایا تاکہ وہ سانس لے سکے مگر اس کا خنجر بکف ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔

اب مجھے احساس ہوا کہ اس کی کلائی کتنی گداز اور نازک تھی۔ میں نے اپنی وحشیانہ گرفت سے ان چوڑیوں کو بھی چُورا چُورا کردیا تھا جن کی جھنکار نے اس ویرانے کی تاریک خاموشی میں اس کو مجھ سے متعارف کرایا تھا۔

اپنی مردانہ بے رحمی پر تھوڑی سی خجالت کے ساتھ میں نے اس کی کلائی کو چھوڑا تو وہ ہاتھ بے جان سا ہو کے فرشِ خاک پر گر گیا۔ میں نے اس کی گرفت سے خنجر یوں لے لیا جیسے کوئی سو جانے والے بچے کے ہاتھ سے کھلونا لے لے۔ پھر میں نے اس کے منہ پر سے ہاتھ بھی ہٹا لیا۔ وہ خاموش رہی۔

میں نادم سا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا جہاں وہ غلیظ گرد آلود فرش پر قیمتی لباسِ عروسی کے ساتھ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اچانک ایک پریشان کرنے والے خیال نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کے دیکھوں۔ میں ڈر گیا تھا کہ اپنی بے عناں وحشت میں کہیں میں نے اسے مار تو نہیں دیا تھا۔ لیکن اس کی سانس چل رہی تھی گو اس کی حرکت میں اب وہ پہلے جیسی مدوجزر کی کیفیت نہیں رہی تھی۔

بڑی احتیاط اور نزاکت سے میں نے پھر اس تھاما اور نبض کی رفتار کو محسوس کیا جو بہت کم تھی مگر ختم نہیں تھی۔ اطمینان کے ساتھ ہی اب میں بھی پُرسکون ہو گ شاید میری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے لگی تھیں کا پورا پیکر میری نظر میں تھا۔ اپنے بالکل پیچھے میں نے کو محسوس کیا اور سہارا لے کر اپنے پیر پھیلا دیے۔ پھ نے ایک طویل گہری سانس لی۔

اب میں نے درد کی اس ٹیس کو محسوس کیا جو میر بائیں ہاتھ میں ہتھیلی کی پشت سے کہنی تک محسوس ہو رہی میں زخم کی گہرائی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ایک انگلی سے میں خون کی چپچپاہٹ کو محسوس کیا۔ شاید مجھے صرف خراش تھی۔ لکیر سے رسنے والا خون وہیں جم گیا تھا مگر کہنی کے سے اب بھی بہہ رہا تھا۔ خنجر کی نوک نے صرف کھال تھا۔ خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس بہاؤ کو میں پٹی باندھ کے روک دوں۔

اس آسیب زدہ حویلی میں فرسٹ ایڈ باکس کہاں آتا؟ یہاں تو اندھیرے میں پانی تلاش کرنا بھی ناممکن پانی ہوتا تو میں زخم کو دھو کے صاف کرسکتا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ خون میرے لباس پر کہاں کہاں آئے گا۔ اپنے آپ کو قاتلانہ حملے سے محفوظ رکھنے کی کو ایک غیر ارادی فعل تھا۔ اس وقت احتیاط کے تقاضوں کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے دبا کے خو روکنے کی کوشش کی۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا ہاتھ خود اپنے ہی لہو سے بھر گیا۔ ضرورت ایک پٹی کی تھی۔

اس ضرورت کا احساس ہوتے ہی مجھے واقعات یاد آئے جو میں نے کہانیوں میں پڑھے فلموں میں دیکھے تھے۔ بستر کی چادریں پھاڑ کے اور آپس میں گرہ دے کر قیدی اتنی لمبی رسی بنا لیتے تھے اسپتال یا قید خانے کی دوسری تیسری منزل پر کسی کھڑکی راستے فرار ہو جائیں۔ کپڑے تو میرے جسم پر بھی تھے میں کہیں سے ایک پٹی پھاڑ کے الگ نہیں کرسکتا؟

اندازے سے فرش کو ٹٹول کر میں نے چھری اٹھا دلہن کے لباسِ عروسی میں ٹشو کا ایک دوپٹا بھی تھا۔ ظاہر ابھی دلہن کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا ایک پھاڑنے سے ڈھائی گز کی لمبائی کیا کم ہوتی۔ خدا بروقت مجھے عقلِ سلیم سے مشورے کی صلاحیت عطا

مجھے سوتی کپڑے کی پٹی درکار تھی۔ ٹشو کے کام والے دوپٹے کی پٹی خون کو جذب نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی قمیص بھی ریشمی تھی، شلوار بھی۔

پھر مجھے اپنے کپڑوں کا خیال آیا۔ اوپر والا لباس چوری کا تھا۔ اس سے میں نے جیل کی خلعتِ فاخرہ کو چھپالیا تھا۔ جیل والا ایک دو تین نمبر کا لباس سو فیصد کاٹن کا تھا۔ میں نے چوری کے ملبوس کا دامن اٹھایا اور جیل میں زیرِ استعمال رہنے والی قمیص کے دامن سے پوری پٹی کاٹ لی۔ چھری سے میں نے صرف سلائی والے کنارے کو کٹ لگایا تھا، باقی پٹی پھاڑ کے الگ کرنا مشکل کام نہیں تھا۔

ایک ہاتھ سے پٹی باندھنا مشکل کام تھا۔ میں نے پٹی کے ایک کنارے کو درمیان سے لمبائی کے رخ دو حصوں میں کاٹا۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ بظاہر کچن میں استعمال کی جانے والی چھری کی دھار کتنی تیز ہے۔ یہ کہیں میری پسلیوں میں اتر جاتی تو دل کی ہر رگ یوں کاٹ دیتی کہ وہ معدے میں جا گرتی۔ ایک کونا دانت میں دبا کے میں نے پٹی کو اتنا سخت باندھا کہ وہ کٹ کو بند کردے۔ کسی دشواری کے بغیر میں نے پٹی کی گرہ باندھی اور سکون کا سانس لے کر پھر دیوار سے ٹیک لگالی۔

اب مجھے اس دلہن کے پھر ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ میں نے پل بھر کے اجالے میں اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کے جوان ہونے میں شک نہیں تھا لیکن اس کی خوبصورتی کا احساس بالکل غیر واضح تھا۔ عام حالات میں تو ہر دلہن زرق برق لباس اور سولہ سنگار میں حسین ہی لگتی ہے۔ میں نے جس دلہن کو دیکھا تھا، اس پر وحشت سوار تھی۔ اس کی آنکھوں میں جنون تھا اور چہرے پر دہشت کا اثر غالب تھا۔ اگر وہ ایک مسکراتی، شرماتی دلہن ہوتی تو شاید اس کے حسن کی جلوہ سامانی میری نظر کو بھی خیرہ کرتی۔

اب میرے ذہن سے اس دلہن کے بھوت پریت ہونے کا خیال مٹ چکا تھا۔ وہ ایک زندہ سلامت، جیتی جاگتی عورت تھی۔ سابقہ روایات سے ایسی دو دلہنوں کا وجود ثابت ہوتا تھا۔ یہ تیسری تھی جسے ابھی تک صرف میں نے دیکھا تھا۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا اور وہ چھری لیے میرا تعاقب کرتی تو شاید روایات میں ایک اور خونی دلہن کا اضافہ ہو جاتا۔ بشرطیکہ نصف شب گزر جانے کے بعد بھی کسی بیمار بوڑھے کی بے خواب آنکھیں اسے دیکھ لیتیں... یا رات کا کوئی پہرے دار، نائٹ ڈیوٹی کر کے دیر سے گھر لوٹنے والا یا آوارہ گرد اسے دیکھ لیتا۔

روایات کا سفر ایسے ہی آگے بڑھتا ہے۔ کوئی ایک ناقابلِ یقین واقعہ سناتا ہے۔ سننے والے زیبِ داستان کے لیے اس کی سنسنی خیزی میں کچھ اضافہ کرتے ہیں اور دوسری جگہ نئے سامعین کے سامنے بیان کر دیتے ہیں۔ کچھ یقین کرتے ہیں، کچھ نہیں۔ مگر بات پھیلتی جاتی ہے۔ اصل حقیقت گم ہو جاتی ہے کیونکہ اس تک پہنچنے کی زحمت ہی کوئی نہیں کرتا۔ سنسنی خیزی کا ڈرامائی عنصر اس حد تک غالب آجاتا ہے کہ بالآخر کوئی ایک ناول لکھ مارتا ہے۔ اس ناول پر کوئی فلم بن جاتی ہے۔ مدھو بالا کی فلم ''محل'' نے کیا دھوم مچائی تھی۔ آسیب، ارواح اور مافوق الفطرت واقعات پر بالی وڈ سے ہالی وڈ تک سیکڑوں ہزاروں فلمیں بن چکی ہیں۔

اس حویلی سے منسوب آسیب کی کہانی میں ایک بار نہیں دو بار ایسا ہوا تھا کہ بابل کے انگنا سے پیا گھر جانے والی دو روایتی قسم کی دلہنوں نے اپنے سرتاج من سلامت باشد کو عدم کی راہ دکھانے میں شبِ عروسی کی سحر ہونے ک انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ یہ کسی نے کبھی نہیں بتایا کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا اور بعد میں ان کا انجام کیا ہوا؟ پیارے پیارے دو چار بچوں اور ایک دیوانہ وار محبت کرنے والے شوہر کا خواب دیکھنے والی لڑکیوں کی آنکھ تختۂ دار پر کھلی ت انہوں نے پھانسی پانے کے بعد عالمِ ارواح سے واپس آ کے پبلک کو دہشت زدہ کرنے کا تماشا کیوں کیا؟ کیا د کسی اور کو چاہتی تھیں؟ کیا بعد میں انہیں اپنا پیار ملا؟ او سب سے بڑھ کر یہ کہ مقتول کا خطاب پانے والے دولہا نے یہ ڈراما کیوں نہیں کیا؟

میں نے ذہن سے ان فضول خیالات اور سوالات ک جھٹکا۔ آج میں نے حویلی کی روایات کا رخ بدل دیا تھا۔ ایک دلہن مجھے پوری کوشش کے باوجود قتل نہیں کر سکی تھی... لیکن میں اس کا دولہا ہی کہاں تھا۔ اصل مقتول دولہا کون ت اور کہاں تھا؟ قتل ہونے والا دولہا نمبر تین۔ کتنے افسوس ک بات ہے، روایات کا دھارا ایک ہی سمت میں بہتا چلا جا ہے۔ کم سے کم ایک بار تو ایسا ہو کہ لوگ کسی دولہا کو خون آل چھری کے ساتھ سنسان راتوں میں بھٹکتا دیکھیں۔

وہ آہستہ سے ایک بار کراہی، یہ بے ہوشی سے ہو کی جانب سفر کی پہلی نشانی تھی۔ میں خیالات کے گرداب سے نکل آیا اور چوکس ہو کے بیٹھ گیا۔ میرے تمام حواس اب رات کی مخلوق کی طرح کام کر رہے تھے۔ ممکن ہے یہ کاذب کا اجالا ہو کہ میں اس کی خفیف سی حرکت کو بھی دیکھنے لگا تھا۔ سب سے زیادہ پریشان کن وہ خوشبو تھی جو میرے احساس پر چھا گئی تھی اور میں اتنا بے بس ہو گیا تھا جیسے ریشم کا کیڑا خود اپنے گرد ریشم کا تار لپیٹ کر محصور ہو جاتا ہے۔

سکوت میں اس کی دبی دبی، دکھی اور مجبور سرگوشی سنائی دی۔ ''تم... تم ابھی ہو یہاں؟''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''بالکل ہوں... یہ جو تم میری آواز سن رہی ہو نا... یہ عالمِ ارواح سے نہیں آ رہی ہے۔''

وہ خاموش رہی۔

میں بولتا رہا۔ ''تم نے تو کوئی کسر چھوڑی نہیں تھی مجھے دوسری دنیا کی طرف روانہ کرنے کی لیکن میں سو فیصد زندہ ہوں۔ آئی بات سمجھ میں؟ اگر اب بھی تمہارے دل میں کوئی خیال ہے کہ مجھے بھی قتل کردو...'' میں نے ''بھی'' پر زور دیا۔ ''تو اس پاگل پن کے خیال سے باز آجاؤ۔ وہ چھری اب میرے پاس ہے، آلۂ قتل... اس پر میرا خون بھی ہے۔''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''تم کون ہو... پولیس کے آدمی؟''

''پولیس والا اور آدمی... خیر، فرض کرلو مجھ میں یہ متضاد صفات ہیں... معصوم قاتل... تم کو ہی کہا جا سکتا ہے۔''

اس نے خوف سے کہا مگر آرام سے لیٹی رہی۔ ''تم... کیا تم مجھے گرفتار کرو گے؟''

''کرنا تو مجھے یہی چاہیے...''

وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

میں اندھیرے میں اس کی صورت دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ خود تم نے کون سا سچ بولا ہے مجھ سے ابھی تک۔''

''میں سچ بولوں گی... تو... تم مانو گے نہیں۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''لگتا ہے اب تم رونے کی تیاری کر رہی ہو۔ یہ سراسر فاؤل پلے ہے۔ ہر عورت اپنے آنسوؤں سے جھوٹ کو سچ تسلیم کرا لیتی ہے... لیکن تم صاف سن لو، میں بہت کمینہ ہوں۔''

''یہ ایک اور جھوٹ ہے، تم شریف آدمی ہو۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''اچھا... یہ تو اب تک خود مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟''

''تم شریف آدمی نہ ہوتے تو... تو اب تک ضرور فائدہ اٹھا چکے ہوتے۔''

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ ''فائدہ... کیسا فائدہ؟ اچھا اچھا... میں سمجھ گیا۔ دیکھو لڑکی، میری زندگی کے تجربات ایسے ہیں کہ میں نے جب کسی کی بات نہیں مانی... تو اچھا نہیں ہوا۔ لیکن تمہاری بات میں مان لوں گا اگر تم نے سچ بولا... مگر پہلے اس خیال کو دل سے نکال دو کہ میں شریف آدمی ہوں۔''

وہ دیوار کا سہارا لے کر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''پھر کیا ہو تم؟ کوئی چور ڈاکو... جو یہاں چھپے بیٹھے ہو؟''

''فرض کرلو کہ ایسا ہی ہے۔ میں چور ڈاکو ہوں۔ جیل سے بھاگا ہوں۔ الو ہوں جو اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آباد ہے... یا کوئی بدروح ہوں تمہاری طرح۔''

''میں بدروح لگتی ہوں تمہیں؟'' وہ کچھ برا مان کے بولی۔

''لگتی ہو... میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ہو۔ دیکھنے میں تم ایک نئی نویلی دلہن ہو جس کو ہونا تو چاہیے تھا حجلۂ عروسی میں۔ تم جو یہاں چھپی بیٹھی ہو تو یہ بات ذرا گڑبڑ ہے... ذرا کیا بالکل غلط ہے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ تم نے کوئی غلط کام کیا ہے... یا کوئی معمولی سا جرم جیسے اپنے دولہا کا قتل وغیرہ... تو مجھے صاف صاف بتا دو۔''

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ''مجھے... ڈر لگتا ہے۔''

میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ ''ڈر ہمیشہ بعد میں لگتا ہے۔ اگر یہ ڈر آدمی کے دل میں پہلے پیدا ہو جائے... میرا مطلب ہے کوئی جرم مثلاً قتل سے پہلے...''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ ''مجھے پیاس بھی لگی ہے۔''

میں نے بھنا کے کہا۔ ''پھر... کیا کروں میں؟ سیون اپ حاضر کروں یا کوک... یا منرل واٹر سے کام چل جائے گا؟''

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں نے اس کی ہلکی سی سسکی سنی اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ لرز رہی تھی۔

یہ بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی سچویشن تھی۔ اگر میں ہمدردی یا پیار سے کام لیتا تو اس کے اندر جمع ہونے والے دکھ کا غبار کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح دھماکے سے نکلتا اور اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوتا۔ وہ مجھ سے چمٹ جاتی پھر بے ہوش ہو جاتی یا دونوں

کام کرتی۔ اگر میں دل پتھر کر کے سختی سے کام لیتا، تب بھی شاید یہی ہوتا مگر ذرا مختلف انداز میں۔ وہ چلّانے لگتی، مجھے گالیاں دیتی، بے رحم جانور یا سفاک اور پتھر دل وغیرہ کہتی۔

یہاں ایک اعترافِ حقیقت میں کوئی حرج نہیں کہ اپنی سابقہ زندگی میں بیوی اور محبوبہ یا گرل فرینڈ تو دور کی بات ہے، مجھے کسی بھی ہسٹریا زدہ نوجوان لڑکی کو سنبھالنے، سمجھانے کا سرے سے کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ چند بے ضرر سے معاشقے تو نوعمری سے نوجوانی کے سفر میں تجربات کا حصہ ہوتے ہیں لیکن وہ سب لڑکیاں، کزن یا محلے دار... کچھ دن بعد بددل یا مایوس ہو کے کسی اور کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں اور ایسے ہی خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس ناچیز نے بھی دوسرا جذباتی ٹھکانا تلاش کرلیا تھا۔ دو چار وقت آنے پر ہنسی خوشی پیا گھر سدھار گئی تھیں اور ظاہر ہے میں نے پُرامن بقائے باہمی کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت کو بھلا دیا تھا۔

اچانک مجھے اپنی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہوا۔ یہ وہی پرانی عادت تھی، حال سے ماضی یا مستقبل کی جانب نکل جانے اور خیالات کی دنیا میں گم ہوجانے کی۔ یہاں میرے پڑوس میں بلکہ تقریباً میری بغل میں ایک لڑکی رو رہی تھی اور میں اسے چپ کرانے کے بجائے چپ بیٹھا تھا۔ کیا سمجھتی ہوگی وہ کہ کیسے احمق سے واسطہ پڑا ہے۔

دماغ کو حاضر کرتے ہی مجھے مشکل کا حل بھی سوجھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”دیکھو لڑکی، ایسے صرف رونے دھونے سے بات نہیں بنے گی۔ آدھی سے زیادہ رات تو گزر چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہوجائے گی۔ مجھے کچھ بتانا نہیں تو تمہاری مرضی۔ میں بھی چپ بیٹھا رہوں گا، تم روتی رہو۔“

اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آئی... ایم سوری۔“

میرے ردِعمل نے صحیح نتائج پیدا کیے تھے۔ میں اس کو غیظ و غضب کی یا بے ہوشی کی منزل سے واپس نارمل حالت میں لانے کی آزمائش سے بچ گیا تھا۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ ہسٹریا میں دو ہی علاج کارگر ثابت ہوتے ہیں... یا ایک جھانپڑ یا پھر پیار مگر دونوں زبردست۔

اس کامیابی سے حوصلہ پا کے میں نے بات آگے بڑھائی۔ ”اگر اعتبار کرسکتی ہو ایک اجنبی پر تو پھر مجھے سچ سچ ساری بات بتادو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اس مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لیے جو مدد کرسکا ضرور کروں گا۔ حالانکہ میں خود بھی مشکل میں ہوں مگر لیڈیز فرسٹ... پھر میں بھی تمہیں سب بتادوں گا اپنے بارے میں... اگر ت نے پوچھا۔“

وہ اندھیرے میں گم صم یوں بیٹھی رہی جیسے آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔ مجھے سخت طیش آیا۔

”دیکھو لڑکی، اتنی دیر سے...“

اس نے کہا۔ ”نورین ہے میرا نام۔“ اس کی آواز صرف ایک سرگوشی تھی جو میرے اس کان تک بھی مشکل سے پہنچی جو اس کے ہونٹوں کے نزدیک ترین تھا۔

میرے غصے کا غبارہ پھر نیچے آ گیا۔ ”مس نورین میرا یہاں موجود ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ پتا نہیں رات کو یہاں کون کون آتا ہوگا۔ اس وقت بھی کیا معلوم ک اتنی بڑی ویران حویلی کے دوسرے حصوں میں اور کون کون ہے... لیکن تم جیسی نئی نویلی دلہن کا یہاں پایا جانا بالکل ناقابلِ فہم سی بات ہے۔ لوگوں کو چھوڑو جو جن بھوت کی کہانیوں پر فوراً اعتبار کرلیتے ہیں... یا خود ایسی بے سرو کہانیاں پھیلاتے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے؟“

میرے خیالات کی ترجمانی کرنے والا الفاظ بہتا دھارا پھر رک گیا۔ ”نام... کیا کروگی میرا نام جان کے؟ میں نے خاور بتایا تو کیا تم مان لوگی؟ میں نے تو خیر شرافت میں مان لیا۔ میں اعتبار کرنے والا اور خود بھی قابلِ اعتبار آدمی ہوں۔ اگر تم سے کوئی... غلطی... گناہ یا جرم سرزد ہوگیا ہے... جانتے بوجھتے... یا بلاارادہ...“

”میں نے قتل کردیا ہے خاور۔“

میں پُرسکون رہنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ”قتل...؟“ میرے حلق سے بڑی مضحکہ خیز آواز نکلی۔ ”سچ مچ کا قتل... میرا مطلب ہے... کس کو...؟“

”اسی کو... جو خود کو میرا شوہر سمجھتا تھا... خوامخواہ۔“

میں نے کہا۔ ”خوامخواہ... یعنی وہ تمہارا شوہر نہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”جب میں نے اسے مانا ہی نہیں...“

میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”ایک منٹ... تم مجھے کنفیوز کررہی ہو۔ شرعی اور قانونی طور پر وہی شوہر ہوتا ہے جس کے ساتھ نکاح ہو... بات تمہارے ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے۔“

”یہی سمجھانے کی کوشش کررہی تھی میں۔ کل شام زبردستی مجھے اپنے چچازاد کے پلّے باندھا جارہا تھا۔ میں اس سے شادی پر موت کو ترجیح دیتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا دماغ خراب تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ پاگل تھا۔ وہ ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ بڑی مشکل سے آٹھویں جماعت تک پڑھ سکا تھا۔ وہ بھی ایسے کہ باپ نے مل ملا کے اور دے دلا کے اگلی جماعت میں بٹھادیا تھا۔ اسے پڑھنا کہتے ہیں؟“

”خود تم نے کتنا پڑھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بی اے تک۔ میری بڑی خواہش تھی کہ ایم اے کروں۔ ماں باپ ہوتے تو شاید یہ خواہش بھی پوری ہوجاتی مگر وہ تو بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اس وقت میں سات سال کی تھی۔ یہ چچا میرا سرپرست مقرر کردیا گیا۔ قانون کے مطابق ماں باپ نہ رہیں تو دادا یا دادی میں سے کسی کو سرپرست مقرر کیا جاتا ہے۔ جب تک بچہ بالغ نہ ہوجائے۔ ان کے بعد چچا کا نمبر آتا ہے۔ ادھر میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ دوسری طرف چچا کا وہی ایک بیٹا تھا۔ ایک انڈا وہ بھی گندا۔ صورت کی بدصورتی کو بھی برداشت کرسکتی تھی... لیکن وہ بدکردار بھی تھا۔“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”تمہارے والدین کا انتقال کیسے ہوا تھا؟“

”کسی حادثے میں... یہی بتایا گیا ہے مجھے۔“

”وہ کیا کرتے تھے... تمہارے والد؟“

”نہروں کے ٹھیکے دار تھے۔ نہریں بنانا، ان کی مرمت اور دیکھ بھال... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میرے والد بھی نہر کے محکمے کے چیف انجینئر تھے۔ تمہارے والد نے بھی مال تو بہت بنایا ہوگا؟“

اس نے کچھ بُرا مانا۔ ”یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟“

”مس نورین! دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ آخر تمہارا وہ چچا کیوں تمہیں زبردستی اپنے پاگل بیٹے کے پلّے باندھنا چاہتا تھا؟ ظاہر ہے اسی لیے کہ وہ سب کچھ اسے مل جائے... جو تمہارا تھا... اور تم ساری عمر اس پاگل کو پالتی رہو۔“

”اس کے علاوہ بھی میرے انکار کی ایک وجہ تھی... بلکہ دو۔ کیا میں بہت خوبصورت ہوں؟“ اس نے کہا۔

میں اس غیر متوقع سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ”خوبصورت... میں کیا بتاؤں... ابھی میں نے دیکھا کہاں ہے تمہیں... اس سوال کا جواب صبح ہونے کے بعد دوں گا... لیکن دوسری وجہ بتا سکتا ہوں۔“

”اچھا... کیا تھی، دوسری وجہ؟“

”تم کسی اور کو چاہتی تھیں... رائٹ!“ میں نے کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ وہ کچھ حیران ہوئی۔

”مس نورین۔ ایسا ہی ہوتا ہے، یہ عام بات ہے۔ گھر گھر کی کہانی... فلموں میں بھی دیکھا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔ مجھے محبت تھی سلمان خان سے۔“

”یا میرے خدا... کیا پاکستان کی سب لڑکیاں پاگل ہوگئی ہیں۔ سلمان خان، عامر خان، شاہ رخ خان... سب ان پر فریفتہ ہیں۔ آخر ہمارے ملک کے نوجوان بھی تو ہیں۔“

وہ خفگی سے بولی۔ ”کیا وہ کترینہ کیف اور کرینہ کپور کے پیچھے پاگل نہیں ہیں؟ ایک سے بڑھ کر ایک چمار نظر آنے والا بھی۔ یہ سلمان میری ایک سہیلی کا بھائی تھا۔ وہ بھی بی اے پاس تھا مگر بے روزگار تھا۔ گلہ مجھے تقدیر سے نہیں، اس سے ہے۔ بڑے دعوے کرتا تھا وہ محبت کے۔ یہ کہتا تھا کہ میری خاطر وہ ساری دنیا سے لڑسکتا ہے۔ سب کو چھوڑ سکتا ہے۔ ہم اسی حویلی میں ملتے تھے۔ تین سال ملتے رہے۔ مجھ پر جنون سوار تھا ایم اے پاس کرنے کا۔ وہ نوکری تلاش کررہا تھا لیکن ایک فتور تھا اس کے دماغ میں۔ وہ نوکری نہیں افسری چاہتا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا اسے کہ ہر شخص ترقی پا کے افسر بنتا ہے... اور براہِ راست افسر بنتا ہے تو مقابلے کا امتحان دے لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایسے ہی وقت ضائع کرتا رہا...“

”بات کاٹنے کی معافی چاہتا ہوں مس نورین۔ وہ تم سے محبت بھی کرتا رہا اور تمہارے پلّے سے عیش بھی کرتا رہا۔ تم اس نکھٹو عاشق کو پالتی رہیں۔“

”دیکھو، میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے پیسے کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔“

”تمہارا یہ ظالم چچا تمہیں کافی پاکٹ منی دیتا تھا؟“

”وہ مجھے کچھ نہیں دیتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو ایک پیسا نہ دیتا مجھے مگر میں اس کی محتاج نہیں تھی۔ ہر مہینے میرے بینک اکاؤنٹ میں کافی رقم آجاتی تھی۔ سلمان میرا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا پیسا اس کا ہے۔ اس نے جب جتنا مانگا، میں نے دے دیا۔“

”اور وہ ایک Parasite بن کے پلتا رہا۔ تم سے عشق کی پوری قیمت وصول کرتا رہا، بے غیرت انسان۔“

وہ چلّائی۔ ”خدا کے لیے ایسا مت کہو۔ اسے واقعی

محبت تھی مجھ سے... اور محبت میں اعتماد ہی بنیاد ہوتا ہے۔ میں نے کبھی اس پر شک نہیں کیا تھا۔ میں مطمئن تھی کہ چچا کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کے عزائم کا اندازہ تو مجھے بہت پہلے سے تھا۔ میں نے اسے مطمئن رکھا، بی اے کرنے تک اور اپنی سعادت مندی کے باعث ہر رعایت حاصل کرتی رہی بلکہ عیش کرتی رہی۔ میں ڈرتی تھی کہ چچا کو ذرا بھی شک ہوا تو وہ فوراً نکاح پڑھوا دے گا میرا اس پاگل سے۔ جب میں نے بی اے پاس کرلیا تو چچا نے ایک طرح سے مجھے نوٹس دے دیا کہ بس اب بہت ہوچکی پڑھائی۔ چچی نے بھی میری ایم اے کرنے کی خواہش کو مسترد کردیا۔ انہوں نے کہا کہ ایم اے تو شادی کے بعد تم پرائیویٹ امتحان دے کر بھی کرسکتی ہو۔"

"کیا تمہیں اپنے سلمان خان کے ساتھ فرار ہو کے شادی کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟"

"مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ ارادہ تو میرا یہی تھا کہ میں اس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔ مجھے روکنے والا کون تھا؟ جب میں نے محسوس کیا کہ اب سر پر آپڑی ہے تو میں نے سلمان کو یہاں بلایا مگر وہ دبئی گیا ہوا تھا۔"

"یہ بھی کوئی جگہ ہے رومانس کے لیے... ایسے ماحول میں..."

وہ سختی سے بولی۔ "خاور صاحب! فلمی دنیا کے رومانٹک ماحول اور عملی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم یہاں اس لیے ملتے تھے کہ کسی کی نظر میں آنے سے محفوظ رہیں ورنہ یہاں دریا کا کنارہ ہے۔ وہ باغ ہے جو لبِ مہران کہلاتا ہے۔ اس کے باوجود چچی کو شک تھا۔"

"شک سب کو فوراً ہو جاتا ہے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟" وہ بولی۔ "ذاتی تجربے کی بات کررہے ہو؟"

"نہیں..." میں نے بوکھلا کے کہا۔ "وہ... کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے کہ... عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ تم آگے بولو۔"

"ایک ہفتے بعد میں نے اسے پیغام بھیجا کہ بس اب مزید انتظار کی گنجائش نہیں ہے۔ چلو، ہم نکل جاتے ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا کہ نکل کے کہاں جائیں گے؟ تمہیں لے کر میں کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا؟ میں نے کہا کہ ہم کورٹ میرج بھی کرسکتے ہیں اور نکاح بھی پڑھوا سکتے ہیں... آخر بالغ ہیں ہم دونوں... اور بعد میں کیا ہوگا، اس کی فکر مت کرو۔ ہم دونوں مل کے کچھ کرلیں گے۔ میں بی ایڈ کر کے ٹیچر بن جاؤں گی۔ میرے اکاؤنٹ میں کا پیسے ہیں لیکن اس سے زیادہ چچی کے لاکر میں زیور ہے۔ م جانتی ہوں کہ چچی کا زیور دراصل میری ماں کا زیور ہے۔ و بھی مل جائے گا۔ اس کی چابی تو رہتی ہے چچی کے پاس لیکن ہے وہ میرے نام پر کیونکہ چچی خود تو اَن پڑھ ہیں۔ بینک منیجر جانتا ہے کہ سائن میں ہی کرتی ہوں۔ چابی چرانا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن سلمان ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ میرے خلاف تمہارے اغوا کا مقدمہ درج ہوجائے گا۔ چاہے بعد میں کورٹ ہمارے حق میں فیصلہ کرے اور پولیس کو بھی کہے کہ ہمیں تحفظ فراہم کیا جائے مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس ساری عمر تو ہماری سیکیورٹی کے لیے گارڈز فراہم نہیں کرسکتی۔ سب بعد میں مار دیے جاتے ہیں۔ دراصل وہ بہت کم ہمت بھی تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ میرے خلاف چوری اور فراڈ کا کیس بن جائے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ عدالت سے انصاف ملتا ہے بعد میں۔ اس سے پہلے پولیس کیا کرتی ہے۔ تنگ آ کے میں نے اس سے کہا کہ چلو پھر ہمت کرو اور چچا سے میرا رشتہ مانگنے آجاؤ۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ انکار کیسے کرتے ہیں۔ سلمان نے میری بات مان لی مگر میرے چچا نے اسے باتوں میں لگا کے اپنے دو چار بندے بلا لیے۔ اوپر سے آگئی پولیس۔ ان سب نے مل کر سلمان کو بہت مارا۔ اسے دھمکی دی کہ وہ باز نہ آیا تو اس کی شادی شدہ بہن کو اغوا کرلیا جائے گا اور اسے ایک رات تھانے میں رکھا جائے گا تو سلمان خان کا سارا عشق کا بخار اتر جائے گا۔"

"کاش اس کے لیے میں وہ لفظ استعمال کرسکتا جو انتہائی بزدل کے معنی میں بولا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے تو فوراً توبہ کرلی ہوگی۔ کان پکڑ لیے ہوں گے کہ آئندہ اس کا باپ بھی عشق نہیں کرے گا۔"

"ایسی بات نہیں۔ بعد میں مجھے اس کا پیغام ملا تھا کہ میں نے تمہاری بات نہ مان کے غلطی کی تھی۔ ہمیں بھاگ کے شادی کرلینی چاہیے تھی۔ میں نے کسی طرح اسے جواب تو بھجوا دیا کہ فکر نہ کرو، ایسا ہی ہوگا مگر چچا نے مجھے بھی بہت مارا اور کمرے میں قید کردیا۔ صرف چچی صبح شام مجھے کھانا دینے کے لیے دروازے کا تالا کھول کے اندر آتی تھی۔ اس نے تو میرے لیے خودکشی کے امکانات بھی نہیں چھوڑے تھے... چھری کیا معمولی رسی بھی نہ تھی کہ میں پھانسی لٹک جاؤں۔"

"یعنی ارادہ تھا تمہارا خودکشی کا؟" میں نے کہا۔

"کبھی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ہاں، یہ خیال ضرور آتا تھا کہ میں اس بڑھیا کا گلا گھونٹ دوں جو میری چچی کہلاتی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر شادی کے سارے انتظامات مکمل کرلیے۔ میں بھی طے کرچکی تھی کہ کروں گی اپنی مرضی۔ میں شادی سے پہلے نہ نکل سکی تو عین شادی کے وقت انکار کردوں گی۔ شادی کے لیے سارا زیور منگوا لیا گیا تھا اور کیش کی مجھے فکر نہ تھی۔ چیک بک میرے قبضے میں تھی۔ میں نے سلمان کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ رات کو یہاں آ کے میرا انتظار کرے۔ میں کسی وقت بھی آجاؤں گی اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم نکل جائیں گے۔ اس کا جواب بھی آگیا تھا کہ میں تیار ہوں۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" میں نے طنز سے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ چاچا بہت کمینہ آدمی ہے۔ ادھر اس نے مجھے نکاح کی تاریخ کا بھی پتا نہیں چلنے دیا۔ وہ ڈرتا ہوگا کہ میں بھاگ جاؤں گی۔ کیا پتا اس نے سلمان خان کا بھی کوئی ایسا ہی بندوبست کرادیا ہو... کہ وہ یہاں نہ پہنچ سکے۔ عین وقت پر چچی نے مجھے تیار کیا۔ زیور پہنایا اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ قاضی سے لے کر وکیل اور گواہ تک سب اس کے اپنے تھے۔ جب رسمی طور پر وہ مجھ سے پوچھنے آئے تو میں نے صاف کہا کہ مجھے یہ نکاح منظور نہیں۔ آہستہ سے نہیں، چیخ کر بتایا مگر وہ سور کا بچہ سر ہلا کے چلا گیا اور باہر جا کے کہہ دیا کہ لڑکی نے اقرار کرلیا ہے۔ تم بتاؤ، کیا یہ نکاح ہوگیا؟"

میں نے کہا۔ "بالکل ہوگیا۔ قانونی طور پر بھی اور شرعی طور پر بھی... کیونکہ تم اپنے وکیل کو جھوٹا ثابت نہیں کرسکتیں۔"

"شرعی طور پر نکاح کیسے ہوگیا؟ وکیل نے وہ نہیں کہا جو میں نے کہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "دنیا نے تو یہی سنا ہوگا کہ تم راضی ہو۔"

"یومِ حشر جو سزا انہیں ملے گی، وہ تو بہت دور کی بات ہے۔ یہاں دنیا میں زبردستی، میرے نکاح سے انکار کے باوجود... مجھے ایک پاگل شخص کی بیوی بنا دیا گیا... زبردستی۔"

میں نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ تو غالباً... حدود آرڈیننس کا کیس بنتا ہے۔"

"مگر میں نے تو اسے تین سو دو کا کیس بنا دیا۔" وہ سوچے سمجھے بغیر بولی۔ "جب مجھے اس کے ساتھ حجلۂ عروسی میں بند کردیا گیا، اس جانور کے ساتھ تو اس پر وحشت سوار ہونے لگی۔ وہ اتنا دیوانہ بھی نہیں تھا کہ اسے معلوم نہ ہوتا کہ شبِ عروسی میں کیا ہوتا ہے؟ میں نے پہلے تو اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا کہ میں نے انکار کردیا تو شرعی اور قانونی طور پر یہ نکاح نہیں ہوا۔ نہ میں اس کی بیوی ہوں اور نہ وہ میرا شوہر۔ مگر اس میں اتنی سمجھ کہاں تھی؟ وہ یہی کہتا رہا کہ تم میری بیوی ہو اور تمہیں ساتھ رہنا پڑے گا۔ میں اس کے حملوں سے بچتی رہی اور اسے صاف بتا دیا کہ وہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے۔ میں اس رشتے کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ وہ مجھے زبردستی اپنی بیوی بنا کے نہیں رکھ سکتا۔ میں سلمان سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی۔ اس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ وہاں دودھ کا بھرا ہوا ایک گلاس رکھا تھا۔ وہ میں نے اس پر کھینچ کے مارا۔ اس کا جنون بڑھ گیا۔ کچھ دیر یہی ہوتا رہا۔ وہ میری طرف آتا تھا تو میں بیڈ سے کود کے دوسری طرف اتر جاتی تھی۔ ایک بار میں نیچے گھس گئی۔ اس نے ٹانگ پکڑ کے مجھے کھینچا۔ میں نے اس کے منہ پر لات ماری۔ پھر مجھے ایک طرف رکھے ہوئے پھل نظر آگئے۔ ان کے ساتھ چھری تھی۔ میں نے وہ اٹھالی اور کہا کہ دیکھو میں اپنا گلا کاٹ لوں گی۔ اس نے ایک بڑی بےشرمی کی بات کی۔ احساسِ ذلت اور غصے نے اس کو وحشی اور حیوان بنا دیا تھا۔ اس نے پھر مجھ پر حملہ کیا اور مجھے نیچے گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں کیا بتاؤں کہ اس کی گرفت سے کیسے نکلی۔ ابھی کھڑی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ پھر بھوت کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ کبھی وہ اوپر تو کبھی میں۔ میں نے جانتے بوجھتے اس پر وار نہیں کیا۔ مجھے اس کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔ بس خود بخود ایسا ہوگیا۔ چھری اس کی پسلیوں میں اتر گئی۔ وہیں... دل کے پاس۔ اس نے ایک چیخ ماری لیکن وہ کمرا اوپر تھا۔ نیچے کچھ مہمان جاگ رہے تھے، کچھ سو رہے تھے۔ لڑکے لڑکیوں نے وی سی آر پر اونچی آواز میں کوئی فلم لگا رکھی تھی۔ دولہا کی درد بھری پکار کسی نے سنی ہی نہیں۔ سب فرض کیے بیٹھے رہے کہ وہ تو دلہن کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہوگا۔ میں گھبرا گئی۔ اسے یوں قتل کرنے کا میرا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ اس کے تڑپنے اور لوٹنے سے سارا فرش خون آلود ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور سارے جسم پر خون ہی خون تھا۔ میں ایک طرف کھڑی اسے دم توڑتے دیکھتی رہی۔ وہ اپنے ہی خون میں ایسے تڑپتا رہا تھا جیسے بن پانی کے مچھلی ریت پر تڑپتی ہے۔ اس کے حلق سے کرب آمیز آوازیں نکلتی رہیں۔ وہ اپنی ماں کو پکارتا رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ ایسی عجیب نظروں سے جن میں دیوانگی کے ساتھ نفرت بھی اور بےیقینی تھی۔ موت کی اذیت تھی۔

خدا کی قسم میں صرف اسے ڈرانا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے دور رہے۔ میرا اس کو یوں قتل کرنے کا کوئی ارادہ کبھی نہ تھا۔“

وہ اب رو رہی تھی اور وہ سارا منظر بیان کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے بے حسی سے کہا۔ ”تمہارا ارادہ تو تھا اسے مارنے کا۔ ورنہ تمہیں اس کو قبول کرنا پڑتا۔“

اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ ”ہاں، زبان سے میں نے یہ بارہا کہا۔ اس کو ڈرانے کے لیے بھی کہا لیکن قتل کرنے کے لیے میرے پاس کیا تھا؟ نہ پستول، نہ چاقو۔ وہ چھری تو کسی اور نے وہاں رکھ دی تھی... اور میں ایسا چاہتی تو کر نہ پاتی۔ وہ ایک جوان مرد تھا، تنومند اور وحشی جانور جیسا... میں نے کچھ اور سوچا تھا۔“

کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے سوال کیا۔ ”کیا سوچا تھا؟“

اس نے اندھیرے میں میرا ہاتھ تلاش کیا۔ یہ ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں پڑیا آ گئی۔ ”شادی سے پہلے میں نے یہ نیند کی گولیاں منگوائی تھیں۔ خود چچا کے ذریعے۔ مجھے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ مایوں بٹھانے کے بہانے۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو دکھایا تو ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا۔ چچا ایک گولی مجھے ہر رات دیتا تھا۔ ایک دن وہ شیشی میرے کمرے میں بھول گیا۔ میں نے اسے غائب کر دیا۔ چچا واپس آیا اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ شیشی جاتے وقت تمہارے ہاتھ میں تھی۔ مجھے کیا معلوم۔ اس کے دل میں شک بیٹھ گیا کہ میں رات کو پوری شیشی کھا کے خودکشی کر لوں گی۔ اس نے چچی کو میرے ساتھ سلا دیا۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ شیشی کہاں رکھی ہے۔ میں نے بعد میں گولیوں کو پیس کے سفوف بنا لیا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ خود کو اس جانور سے نہ بچا سکی تو خود کھا لوں گی۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ اسے دے دوں۔ اگر وہ ذرا صبر کا مظاہرہ کرتا تو میں اس پر اپنے پیار کا جادو چلاتی، نرمی محبت سے اسے وہ دودھ کا گلاس خود اپنے ہاتھوں سے پلاتی جو میں نے اس پر پھینکا تھا۔ وہ سفوف اور دودھ پی کے آرام سے سو جاتا۔ شاید مر بھی جاتا سوتے میں۔ لیکن میں خاموشی سے نکل جاتی۔“

”اس کو مارنے... میرا مطلب ہے اس کے مرنے کے بعد کیا تم اعلان کر کے نکلی تھیں؟“

”طنز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں دروازہ کھول کے باہر آئی اور پڑوس والے گھر کی چھت پر چلی گئی۔ درمیان میں چھوٹی سی دیوار تھی۔ میں زینے سے اتری اور صحن کا دروازہ کھول کے گلی میں آ گئی۔ وہ سب شادی کا پلاؤ زردہ ٹھونس کے سوئے پڑے تھے۔ میں سیدھی یہاں آ گئی۔“

”لگتا ہے تمہارا گھر کہیں بہت قریب ہی ہوگا ورنہ تمہیں ڈر ہوتا کہ راستے میں کوئی دیکھ لے گا۔ تمہیں ملا کوئی نہیں؟“

”گلی میں اندھیرا تھا۔ گھر تو میرا ہوگا یہاں سے دو تین میل دور۔“

”اور یہ راستہ تم نے... اکیلے طے کیا... پیدل...؟“

”اور کیا کرتی، یہاں ایک قاتل دلہن کی کہانی مشہور ہے۔“ وہ بولی۔

”عجیب بات ہے۔ میں بھی تمہیں دیکھ کے ڈر گیا تھا حالانکہ میرا ابدارواح پر کوئی ایسا یقین نہیں۔ مجھے بھی کچھ دن پہلے جیل میں یہ کہانی ایک ڈاکو نے سنائی تھی۔“

”جیل میں... تم واقعی جیل سے بھاگے ہو؟“

”مجھے خوامخواہ تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا تم نے فائرنگ اور دھماکے نہیں سنے تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، آوازیں تو سنی تھیں۔ میں سمجھی کوئی شادی ہے۔ تم جیل کیوں گئے تھے؟“

”یہ لمبی کہانی ہے۔ تم سن کے کیا کرو گی؟“

”جب تم آئے تو میں سمجھی سلمان آ گیا۔ اس کا اور تمہارا قد و قامت ایک جیسا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم اتنے اندھیرے میں دیکھ سکتی ہو؟“

”دراصل... تمہارے پیچھے دروازہ تھا اور آسمان کچھ روشن سا لگتا تھا۔ تم سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ سلمان نے کہا تھا کہ وہ اسی جگہ ملے گا اور ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ اپنے ساتھ کچھ لانے کی ضرورت نہیں... میرے پاس بہت ہے۔ اب ہم اس ملک میں بھی نہیں رہیں گے، ہم دبئی چلے جائیں گے۔“

”یا میرے خدا... صرف ایک ہفتے کے لیے وہ دبئی گیا تھا۔ اس نکمے اور بے روزگار شخص نے اتنی دولت کیسے کما لی؟“

”اسے کسی نے اپنے بزنس میں ورکنگ پارٹنر بنایا تھا۔ تم سمجھتے ہو یہ ورکنگ پارٹنر کیا ہوتا ہے؟“

میں نے بے حد قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں، دیکھو ایک ہوتا ہے لائف پارٹنر۔ جیسے ایک

گاڑی کے دو پہیے، میاں بیوی... پھر ہوتے ہیں بزنس پارٹنر۔ دونوں کام کرتے ہیں چنانچہ ورکنگ پارٹنر کہلاتے ہیں۔ گھر کی نوکرانی کہلاتی ہے ورکنگ پارٹنر، میاں بیوی سلیپنگ پارٹنر۔“

اس نے خفگی سے کہا۔ ”بس بس، رہنے دو۔ اندازہ ہو گیا کہ تمہیں کتنا معلوم ہے۔“

”تم کیا مجھ سے زیادہ جانتی ہو؟“

”ہاں۔ دبئی میں کسی نے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگایا۔ سلمان نے اس کا سارا کاروبار سنبھال لیا۔“

”وہ خود لمبی تان کے سو گیا، نیند کی گولیاں کھا کے؟“

”وہ کچھ اور کرتا ہوگا... اور اسے بھروسا ہوگا سلمان پر۔ سلمان ذہین، محنتی اور ایماندار ہے۔“ وہ بُرا مان کے بولی۔

”افسوس... یہاں کسی نے اس کی قدر نہیں کی۔ خیر، یہ کاروبار کیا تھا؟“ میں نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔“

”ظاہر ہے کوئی ایسا کام ہوگا جس کا سلمان کو تجربہ ہوگا مگر کام تو... جیسا کہ تم نے خود بتایا، اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔“

”ہر کام کے لیے سابقہ تجربہ ضروری تو نہیں ہوتا۔“ وہ بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا۔ ”بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔ بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ چلو اس کے پارٹنر کو بہت اعتماد تھا اور سلمان خان کو تجربے کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اس بندے نے بزنس میں کتنا سرمایہ لگایا تھا جس میں سے تمہارا سلمان خان اپنے ساتھ اتنا لے آیا؟“

”وہ ملے گا تو پوچھوں گی۔“

”آخر وہ کب ملے گا؟ ابھی تک تو وہ آیا نہیں۔ اسے کوئی خیال نہیں کہ تم اس بھوت بنگلے میں اکیلی ہو۔ اور تم ہو کہ دلہا میاں کو چھری سے کاٹ کے آ گئی ہو۔ کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی اور سب کو معلوم ہو جائے گا کہ تم اپنے شوہر کو قتل کر کے فرار ہو گئی ہو۔“

وہ چلّائی۔ ”نہیں تھا وہ میرا شوہر۔ آخر تم سمجھتے کیوں نہیں... اور میں نے خود کو بچاتے ہوئے قتل کیا، اپنے دفاع میں۔“

”اچھا... تو پھر یہاں کیوں چھپی بیٹھی ہو؟ اتنا بھروسا ہے قانون پر تو جاؤ، پولیس اسٹیشن جا کے سب بتا دو۔ جب عدالت میں کیس جائے تو اپنی وکالت خود کرنا۔ ثبوت، شہادت اور گواہ لے آنا۔ ثابت کر دینا کہ وہ تمہارا شوہر نہیں تھا۔ وہ سب جھوٹے ہیں اور بکواس کرتے ہیں جو نکاح کے وقت موجود تھے۔ قاضی اور تمہارے وکیل۔ تمہارے قانونی گارجین، ویڈیو فلم بھی ہوگی تمہارے پاس۔ وہ بھی دکھا دینا جس سے شک و شبہے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ ثابت ہو جائے گا کہ حملہ کس نے کیا تھا اور تم نے اپنی عزت بچانے کے لیے اپنا دفاع کیا۔ قتل تو بلا ارادہ تھا۔“

وہ رونے لگی۔ ”میں سمجھی تھی تم شریف آدمی ہو۔“

”یہ بھی غلطی تھی تمہاری۔ جیل میں کیا شریف آدمی رہتے ہیں؟ میں نے کیا جرم کیا تھا... کیا سزا کاٹ رہا تھا... تمہیں کیا معلوم...؟“

”پھر بھی... تم نے میری بات سنی۔ میرے ساتھ تمہارا سلوک اچھا تھا۔ تم نے ہمدردی کی... اور میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں سمجھی تم میری مدد کرو گے۔“ وہ سسکیاں لے کر روتی رہی۔

”میں خود مدد کا طالب ہوں... تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ پھر بھی... میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔ جو مجھ سے ہو سکا، کروں گا... لیکن پہلے خدا کے لیے یہ رونا بند کرو۔ عورت کے آنسو دل پر بہت بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس سے دماغ کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ میرے پاس رومال نہیں ہے کہ تمہیں پیش کر سکوں۔ اپنے دوپٹے سے صاف کر لو۔“

اس نے سڑ سڑ کر کے ناک صاف کی۔ ”تم واقعی میری مدد کرو گے... پلیز خاور!... میں تمہارا احسان...“

”لاحول ولاقوۃ... احسان گیا بھاڑ میں۔ ابھی تو میں صرف سوچ رہا ہوں کہ تمہاری کیا مدد کروں... اور کیسے؟ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں صبح ہو جائے گی۔“

”دیکھو، تم صرف اتنا کرو کہ سلمان کے گھر چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں کوئی نہیں پہچانتا... تمہارے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“

”ڈرنے کی بات تو ہے۔ میرے بھی دشمن ہیں باہر۔ اگر میں واپس نہ آ سکا پھر...؟“

”تو کوئی بات نہیں۔ تم سلمان کو کہہ دینا کہ نورین تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں سلمان کے گھر کا پتا تمہیں سمجھا دیتی ہوں۔ جب تک وہ نہیں آئے گا، میں اکیلی یہاں سے نکل کے کہیں نہیں جاؤں گی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں اس کا یہیں انتظار کرتی رہوں گی۔ آج نہ سہی کل پرسوں۔ میں یہیں ملوں گی۔ ظاہر ہے تم وہاں مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے لیکن یہ تو کر سکتے ہو کہ کل رات کو مجھے اتنا بتا دو کہ سلمان ملا یا نہیں؟ ملا تو اس نے کیا کہا؟ کیا بتایا کہ وہ کیوں نہیں آ سکا؟ اور آخر وہ کب آئے گا؟ ایک دن تو میں بھوک

پیاس کے ساتھ گزار لوں گی، کل رات جب تم آؤ تو کچھ کھانے پینے کے لیے بھی لیتے آنا۔“

”اوہ میرے خدا!“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”کتنا بولتی ہو تم اور بلاوجہ، سوچے سمجھے بغیر۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا ہے تم نے کہ میں تمہارے سلمان خان سے ملنے ضرور جاؤں گا؟“

وہ مایوسی اور خفت سے بولی۔ ”تو کیا تم نہیں جاؤ گے؟ آخر کیوں...؟“

”اس لیے مس نورین کہ میں بھی تمہاری طرح یہاں چھپ کر رہنے پر مجبور ہوں۔ اگر میرے لیے باہر جانا ممکن ہوتا تو میں تمہیں بھی لے جاتا... یا تمہارے اس سلمان خان کو بھی کان سے پکڑ کے یہاں لے آتا۔“

”تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے؟“

”کتنی بار بتاؤں کہ میں جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہوں۔ یہی مجبوری ہے جس کی وجہ سے میں یہاں بیٹھا ہوں تمہارے پاس، اس بھوتوں والی حویلی میں۔ اب تو میرا خیال ہے کہ یہاں بھوت بھی نہیں رہتے ہوں گے۔ ایسی بے ہودہ گندی جگہ ہے یہ۔ جس کا گھر نہ ہو وہ بھی فٹ پاتھ پر سو جاتا ہے۔ پارک میں یا کسی دکان کے تھڑے پر سو جاتا ہے لیکن یہاں نہیں آتا۔ میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں نورین۔“

”کیا مطلب... تم نے کسے قتل کیا ہے، اپنی بیوی کو؟ مگر تم تو دولہا نہیں لگتے۔“

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”یار نہ میں کسی کا شوہر ہوں اور نہ کوئی... بیوی تھی میری جسے میں قتل کر سکتا۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی... اور نہ آئندہ کرنے کا ارادہ ہے۔“

”پھر تم جیل کیوں گئے تھے؟“

میں نے جھلا کے کہا۔ ”میری مرضی... شوق تھا مجھے جیل جانے کا۔ تمہاری بات میں نے سن لی... اور اس پر یقین بھی کر لیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گی۔“

”یہ تم نے کیوں فرض کر لیا پہلے سے؟“

”میری بات آج تک کسی نے نہیں مانی، پھر بتانے کا فائدہ؟“

وہ بولی۔ ”جیل سے بھاگنا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں۔ خود میں کبھی ہمت نہ کرتا، سوچتا بھی نہیں... لیکن میرے ساتھ کچھ ڈاکو تھے۔ ان کا سردار تھا رستم گاما رستم۔ اسے مجھ سے کچھ ہمدردی تھی۔ شاید وہی ایک شخص تھا جس نے میری بات سنی اور اس پر اعتبار بھی کیا۔ اس کے کچھ ساتھی باہر تھے۔ انہوں نے جیل پر حملہ کیا۔ وہ اپنے سزایا ساتھیوں کو رہا کرانے آئے تھے ورنہ انہیں پھانسی ہو جاتی۔ افراتفری میں مجھے بھی دوسرے بہت سے لوگوں کے سات نکلنے کا موقع مل گیا۔ رستم نے مجھے اس جگہ کا بتا دیا تھا ک یہاں کوئی مجھے تلاش کرنے نہیں آئے گا۔ میں سیدھا یہا آ کے چھپ گیا۔“

”یہاں پہلے سے میں موجود تھی۔“

”عجیب بات ہے۔ اگر میں نے سنا ہوتا کہ یہا کوئی سر کٹا گورا فرنگی ہاتھ میں سر لیے پھرتا ہے تو شاید وہ م جاتا۔ قاتل دلہن کا سنا تھا، وہ تو مل گئی۔“

”پتا ہے ابھی کیا ہوا... جب میں آ رہی تھی؟“ و ہنس پڑی۔

’کیا پاگل لڑکی ہے... ابھی رو رہی تھی، اب ہن رہی ہے۔‘ میں نے سوچا۔

”میرا لباس تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ ایک چھری بھ میرے ہاتھ میں تھی۔ چھری میں پیچھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں گلی سے نکلی تو ایک بندہ اپنے گھر کے دروازے پ بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھا آدمی تھا۔ شاید بیمار بھی ہوگا یا پھر اسے نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ وہ اٹھ کے اندر بھاگا... اس کے بع ایک شخص شاید سوتے سے اٹھا تھا، دیوار کی طرف منہ کے بیٹھا تھا۔ وہ پلٹا تو ازار بند باندھتا ہوا دوڑا اور دیوار پھان گیا۔ آخری آدمی ایک مولوی تھا۔ اس حویلی سے کچھ فاصلے پر ملا تھا۔ وہ زور زور سے لاحول پڑھتا ہوا بھاگ گیا۔“

میں نے بگڑ کے کہا۔ ”کمال ہے۔ تمہیں یہ لطیفے سنانے کی سوجھ رہی ہے۔ یہ فکر نہیں کہ اب ہوگا کیا؟ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے، تمہیں کوئی ڈر نہیں؟“

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ”آئی ایم سوری!“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ میں غیر ارادی طور پ گھاس کھاتا رہا۔ ایک تنکا چباتا رہا۔ اس کا ذائقہ بہت خراب تھا۔ میں نے دوسرا تنکا اٹھا لیا۔ اس کا ذائقہ زیادہ خراب تھا اور خراب کیوں نہ ہوتا، اس پر گرد و غبار کے علاو ہر قسم کے پرندوں نے کچھ ٹپکایا تھا اور ظاہر ہے یہ کوئی صحت بخش خوراک نہیں تھی لیکن بے خیالی میں اچھے بُرے کی تمیز نہ رہی تھی۔ سوچتے ہوئے لوگ ناخن بھی تو کھاتے ہیں۔ بت کی طرح بیٹھ کے میں تاریک خلا کو یک ٹک گھورتا رہا۔ ابھی تک میری عقل نے پوری طرح کام شروع نہیں کیا تھا۔ جیل سے بھاگتے وقت تو مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔ یہاں آیا تو کچھ عقل ٹھکانے آئی لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے بارے میں سو

کے کسی نتیجے پر پہنچتا، ایک قاتل دلہن سے پالا پڑ گیا۔ یک نہ شد دو شد۔ اپنا تو تھا ہی، اب اس کا بھی مسئلہ۔

میری خاموشی سے ڈر کے نورین نے کہا۔ ”خاور... کچھ سوچا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔ لگتا ہے ہم اسی طرح بیٹھے رہیں گے۔ صبح سے دوپہر اور پھر رات تک۔ نہ کوئی ہماری مدد کے لیے آئے گا، نہ ہم کسی کے پاس مدد کے لیے جا پائیں گے۔ سڑ جائیں گے یہیں۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم...؟“

میں نے کہا۔ ”جیسی لوگ کرتے ہیں۔ اب تک ایک دلہن کا قصہ چل رہا تھا۔ آئندہ لوگ ایک بھوت بھی دیکھیں گے۔ جیل کے کپڑوں میں۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، پکڑے جانے کا ڈر الگ۔“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”سنو... کچھ پیسے ہیں میرے پاس۔ مجھے منہ دکھائی میں ملے تھے۔ میرے بیگ میں ہوں گے شاید... اور یہ میرا سارا زیور ہے... تین چار لاکھ کا تو ہوگا۔ سونا بہت مہنگا ہو رہا ہے۔“

”اس زیور کا میں کیا کروں... جا کے سناروں کو دکھاؤں اور کہوں کہ ایک دلہن کا ہے، اس نے شوہر کا خون کر دیا ہے اور وہ بیچنا چاہتی ہے۔ تم پاگل ہو گئی ہو؟“ میں نے بھنا کے کہا۔

”پاگل تم خود ہو رہے ہو۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی کہ ابھی جاؤ میرا زیور بیچو۔“ وہ چیخ کے بولی اور اپنا بیگ میری طرف پھینک دیا۔ ”نکال لو اس میں جتنے پیسے ہیں۔“

”یہ تمہارے پیسے لے کر میں کیا کروں گا؟“

”جو چاہو کرو... لیکن تم اب مجھے اس طرح چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”اگر سلمان آ جائے گا تو میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد تمہاری مرضی۔ میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ سلمان کو بھی نہیں بتانے دوں گی، بس تم ایک بار جا کے اسے بتا دو... کہ میں یہاں ہوں۔“

”او کے... او کے... میں جاتا ہوں مگر ابھی نہیں۔ رات کا وقت ہے اور پولیس ابھی ہر طرف نظر آئے گی۔ تھوڑی سی روشنی ہو جائے۔ سڑک پر اور لوگ بھی نظر آنے لگیں پھر میں نکل سکتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ تم پہلے جا کے کھانے پینے کو کچھ لے آؤ۔ کل رات بھی میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ پریشانی میں مبتلا تھی، بہت دیر سے پیاس بھی لگ رہی ہے۔“

میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میرا اکیلے کا اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھا۔ جب تک جیل سے بھاگنے والوں کا معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جاتا، میں کہیں روپوش رہ سکتا تھا۔ دنیا میں اگر میرے دشمن نادر شاہ جیسے لوگ تھے تو آفریدی جیسے دوست بھی تھے۔ وہ مجھے پناہ دے سکتے تھے۔ ابھی یہ میں نے طے نہیں کیا تھا کہ اپنی آئندہ زندگی کہاں گزاروں گا اور کیسے؟ کوئی اچھے سے اچھا دوست بھی مجھے زیادہ دن اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ایک مفرور مجرم کو پناہ دینے کے جرم میں وہ خود مصیبت میں پھنس جاتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ میری تلاش میں پولیس انہی سے پوچھ گچھ کرے گی جو میرے دوست یار رشتے دار تھے۔ اپنے ساتھ ان کو بھی آزمائش میں ڈالنا کوئی عقل مندی نہ ہوتی۔

چنانچہ محفوظ راستہ تو یہ تھا کہ میں اپنی جان بچا کے اس ملک سے بھی نکل جاؤں۔ کسی دوسرے نام سے اپنی دوسری زندگی کسی دوسرے ملک میں گزاروں۔ ماضی میں جو بھی ہوا، اسے بھلا کے اپنا گھر بناؤں اور بساؤں۔ یہ کام مشکل تھا، ناممکن نہیں۔ ایک نئے نام سے نیا پاسپورٹ حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں ویزا حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ ویزا مل بھی جاتا تو ایک پاکستانی کے لیے بیشتر یورپی ممالک یا امریکا میں نوکری کرنا یا شہریت حاصل کرنا اب تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔

ہاں، یہ ہو سکتا تھا کہ میں پاکستان میں ہی روپوش ہو جاؤں۔ کراچی سے خیبر تک درجنوں شہر تھے اور سیکڑوں ہزاروں گاؤں قصبے۔ پاکستان میں رہ کے ایک نئی زندگی خاموشی سے بسر کرنا آسان تھا... لیکن میرے لیے نادر شاہ جیسے دشمنوں کے ہر ظلم کو بھول جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا کیونکہ وہ بااختیار تھے۔ قانون کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتے تھے۔ بنا سکتے تھے اور بگاڑ سکتے تھے، توڑ سکتے تھے اور خرید سکتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی ہر ناانصافی اور ہر ظلم کی سزا بھی انہوں نے مجھے ہی دی تھی۔

اب میرے لیے اس خواہش سے دستبردار ہو جانا کہ اپنے کیے ہر جرم کی سزا انہیں اسی دنیا میں ملے... اگر ہمارا نظامِ انصاف ان کی طاقت کے سامنے بے بس اور مجبور ہے تو پھر یہ کام میں خود کروں۔ سارا حساب برابر کرنے کے بعد خواہ میں اپنے آپ کو خود قانون کے حوالے کر دوں، مجھے

منظور ہوگا... کہ ہاں، اب میں اپنی سزا کے لیے تیار ہوں۔ اب میں اپنے ہر جرم کا اقرار کرتا ہوں۔

لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ میں اکیلا نہیں رہا تھا کہ اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کر سکوں۔ میرے لیے نورین کو چھوڑ کے فرار ہو جانا بالکل ناممکن تھا۔ میں اسے ساتھ لے کے بھی نہیں پھر سکتا تھا۔ میں اپنا چہرہ بدل سکتا تھا اور اپنے رسک پر کہیں بھی جا سکتا تھا مگر ایک خوبصورت جوان لڑکی جو کہ دلہن کے لباس میں بھی تھی، کے ساتھ یہاں سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اپنا جرم یا اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا، اسے کیسے چھپاتا؟

سب سے آسان یہی ہوتا کہ سلمان خان آئے اور اپنی کترینہ کیف کو لے جائے۔ آگے وہ جانے اور اس کا کام۔ نورین شاید مجھ سے زیادہ مدد کی مستحق تھی اور وہ تھی بھی ایک عورت... جو مردوں کی اس دنیا میں مرد کا سہارا لیے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتی۔ اس کی رحم طلب نظروں نے مجھے پگھلا دیا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ‘‘تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟’’

‘‘تم... جان چھڑانا چاہتے ہو نا مجھ سے؟’’ وہ بولی۔

‘‘سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے تم ملی ہو، میں یہی سوچ رہا ہوں کہ تمہارا کیا کروں... لیکن ایسے چھوڑ کے بھاگ جاؤں... یہ ناممکن ہے۔’’

‘‘پھر... کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟’’

‘‘فیصلہ ہے تمہارا۔ تم سلمان کے ساتھ جانا چاہتی ہو۔ میں اسے بلا کے لاتا ہوں۔ وہ تمہیں جہاں چاہے لے جائے۔’’

‘‘تھینک یو خاور۔ میں... میرا مطلب ہے ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے... اور جو کچھ تمہارے لیے کر سکے، وہ بھی ضرور کریں گے۔’’ وہ خوش ہو کے بولی۔

‘‘میں بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارے ہاتھوں شوہر کے قتل...’’

‘‘پھر وہی شوہر... آخر تم سمجھتے کیوں نہیں... وہ پاگل ایک سیکنڈ کے لیے بھی میرا شوہر نہیں بنا تھا۔’’

‘‘افوہ... تم بھی اپنے یقین کی بات کرتی ہو... یہ دنیا کے یقین کرنے نہ کرنے کا مسئلہ ہے۔ جو تم کہہ رہی ہو، وہ صرف تمہارے لیے سچ ہے۔ مجھے بھی عدالت میں حلفیہ بیان دینا پڑے تو میں کہوں گا کہ مجھے وہی معلوم ہے جو اس لڑکی نورین نے بتایا ہے۔ جھوٹ سچ یہ خود جانے... لیکن تمہارے یا میرے سامنے نکاح کا وکیل آ کے حلف اٹھالے کہ تم نے اس کے سامنے مقتول کو شوہر تسلیم کیا تھا... تو اس کی مانی جائے گی۔ یہ تم جتنا جلدی سمجھ لو، اچھا ہے۔’’

وہ چپ ہو گئی۔ ‘‘یعنی... تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو؟’’

‘‘مجھے تمہارے جھوٹ سچ سے کیا۔ آج کے بعد میرا تمہارا راستہ الگ ہو جائے گا۔ نہ مجھے کبھی یہ معلوم ہوگا کہ تمہارا کیا بنا۔ سلمان کے ساتھ تمہاری شادی ہوئی یا نہیں، نہ تمہیں میرا اپنا چلے گا۔ ہمارے درمیان کوئی رابطہ جو نہیں ہوگا۔’’

‘‘ہم چاہیں تو رابطہ رکھ سکتے ہیں۔’’

‘‘کیوں؟ کیا ضرورت ہے اس کی؟ یہاں سے ملنے سے پہلے کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے؟ یہ ایک رات کی ملاقات ہے۔ اتفاقیہ کہو یا حادثاتی۔ صبح ہو گی تو سلمان تمہیں لے جائے گا۔ میں اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ رات گئی، بات گئی۔ زندگی کے سفر میں بہت لوگ ایسے ہی ملتے ہیں۔ کبھی ٹرین میں، کبھی بس میں۔’’

اس نے آہستہ سے کہا۔ ‘‘جیسے تمہاری مرضی...’’

‘‘بس ایک بات شاید تمہیں بُری لگے... اگر وہ سلمان خان میرے ساتھ آ گیا، میرے بلانے پر... تو یہاں تمہارے سامنے ہی اس کے دو جھانپڑ ضرور ماروں گا۔’’

‘‘کیا... وہ کس لیے... کیوں مارو گے تم اسے...؟’’ ... وہ گھبرا گئی۔

‘‘کیوں... تم خود سوچو، یہ کوئی شرافت ہے؟ سراسر اس کی ذلالت ہے۔ ایسا کرتے ہیں محبت کرنے والے؟ یہ مردوں کا شیوہ ہے، تمہیں کہہ دیا کہ یہاں آ جاؤ... خود کیوں نہیں آیا؟ اسے نہیں خیال کہ یہاں اکیلی تم کیا کرو گی؟ اگر وہ بھول گیا تو کیسے؟’’

‘‘معلوم نہیں... اسے کیا مجبوری تھی کہ وہ آ نہیں سکا۔’’

‘‘اور جب میں کہوں گا تو آ جائے گا؟ واہ... کیا مجبوری ہے... کیا محبت ہے؟’’ میں نے کہا۔

اب میں صبح کے دھندلکے میں اس کی صورت کے نقوش بھی دیکھ سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی۔ اگر لوگ ایسا سمجھتے تھے تو غلط نہ تھا۔ دلہن بن کے تو ہر لڑکی حور پری لگتی ہے۔ بیوٹی پارلر والے سب کو ڈینٹ پینٹ کر کے مس یونیورس کے مقابلے پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ صبح جب دلہن منہ دھوتی ہے تو دولہا پر دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ یہ شب بھر میں کیا ماجرا ہو گیا، کیا میں نے محل کو کھنڈر کر دیا۔

لیکن وہ حسین تھی، اس کی صورت کے نقش بولتے تھے۔ اس کی آنکھیں کہتی تھیں، اس کی نزاکت اور ادائے حسن بتاتی تھی... اور میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔

وہ اچانک اداس ہو گئی۔ ‘‘ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟’’

‘‘دیکھ رہا ہوں تمہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا واقعی خدا حسن اور عقل میں سے ایک چیز دیتا ہے۔ صورت کا حسن تو شاید سارا دے دیا اس نے تمہیں۔ کاش تھوڑی سی عقل بھی دے دی ہوتی۔’’

‘‘پھر کیا ہوتا؟’’ وہ کچھ خوش ہوئی۔

‘‘تم جو کرتیں، سوچ سمجھ کے کرتیں۔ کیسے شخص سے محبت کی تم نے؟’’

‘‘میں سلمان کے خلاف تمہاری بکواس نہیں سن سکتی۔’’

‘‘یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ ایک طرف تم ہو کہ اس کی خاطر قتل کر دیا۔ آدھی رات کو دیواریں پھاند کے نکل آئیں اور اس بھوت نگر میں اکیلی بیٹھی تھیں جہاں آتے ہوئے مردوں کو ڈر لگتا ہے... اور وہ... کہاں ہے وہ؟ اسے بلا کے لانے کے لیے مجھے بھیج رہی ہو تم... میں نہ آتا یہاں... پھر؟’’

‘‘پھر کیا... وہ آ جاتا۔’’

میں نے تلخی سے کہا۔ ‘‘بے وقوف لڑکی! تمہارے دیے ہوئے پتے پر جا کے میں کوشش ضرور کروں گا... لیکن مجھے ذرا بھی امید نہیں کہ وہ ملے... اور ملے تو میرے ساتھ آئے۔ اسے آنا ہوتا نورین... تو وہ تم سے پہلے یہاں موجود ہوتا۔’’

وہ چلّائی۔ ‘‘تم مجھے اس سے بدگمان نہیں کر سکتے۔’’

میں نے اس کے شور کو نظر انداز کر دیا۔ ‘‘تم دونوں اسی جگہ ملتے تھے، میرا مطلب ہے... اسی کمرے میں؟’’

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ‘‘مجھے آگے جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔’’

‘‘کس سے؟ قاتل دلہن کی بدروح سے... یا سلمان سے؟’’

اس نے نظر جھکا کے بادل ناخواستہ اعتراف کیا۔ ‘‘دونوں سے۔’’

‘‘کبھی حویلی کو گھوم پھر کے دیکھا؟’’

‘‘نہیں۔ یہاں بھی میں مجبوراً آتی تھی۔ میں نے دیکھا ہے لڑکیوں کو۔ وہ دھڑلے سے عشق لڑاتی ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بے خوفی سے پھرتی ہیں... اور ان کے ساتھ بھاگ بھی جاتی ہیں۔ میں حد سے زیادہ محتاط تھی ورنہ ڈر مجھے بہت لگتا تھا یہاں آتے ہوئے۔ جب تم آئے تو آہٹ پر میں پہلے سمجھی کہ سلمان ہوگا۔ تمہیں دیکھ کر میں ڈر گئی تھی۔’’

میں نے کہا۔ ‘‘تم سے زیادہ تو میں ڈرا تھا، تمہیں دیکھ کر۔’’

وہ ہنسی۔ ‘‘تم یہی سمجھے تھے نا... کہ میں وہی بدروح ہوں؟’’

‘‘ظاہر ہے، تم سے پہلے بھی دو دلہنوں نے ایسا ہی کیا تھا... جو تم نے کیا۔’’

‘‘وہ سب جھوٹ ہے۔ ہم دو سال میں سو بار تو یہاں آئے ہوں گے۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا، نہ کوئی ملا۔’’

‘‘یہ اتنی بڑی حویلی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دوسرے کمرے میں چھپا بیٹھا تھر تھر کانپ رہا ہو... جیسے میں کانپ رہا تھا۔’’

‘‘اس کا کوئی امکان نہیں۔ اب تک وہ مجھے ضرور تلاش کر لیتا۔ وہ تمہاری طرح بزدل نہیں ہے۔’’

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ‘‘میں دیکھ کے آتا ہوں۔’’

‘‘آخر کیا ضرورت ہے... حویلی تو بہت بڑی ہے۔’’ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ ‘‘کہیں ٹھوکر لگ جائے گی اندھیرے میں۔’’

میں نے کہا۔ ‘‘اب خاصی روشنی ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں کسی دیوار سے نہیں ٹکراؤں گا۔ تم چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔’’

‘‘نہیں، میں بیٹھی ہوں یہاں۔ کیا پتا وہ آ جائے۔’’

میں نے کہا۔ ‘‘مجھے کچھ پیسے دے دو۔’’

‘‘بیگ تمہارے پاس پڑا ہے، نکال لو جتنے چاہئیں۔’’

میں نے بیگ میں سے کچھ چھوٹے بڑے نوٹ نکالے۔ ‘‘تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ میں تمہارے پیسے لے کر بھاگ ہی نہ جاؤں؟’’

‘‘نہیں، میں سمجھتی ہوں... تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے مگر دیکھو، خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ پیسوں کی بات نہیں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے... اور تم نے وعدہ بھی کیا ہے۔’’

میں نے سر ہلایا۔ ‘‘میں اپنے وعدے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔’’

اس سے شناسائی کا رشتہ ایک آسیب زدہ خوشبو سے قائم ہوا تھا۔ اب وہ پیکرِ حسن و رعنائی میری نظر کے سامنے تھا۔ اس کی نظر میں خوف کے ساتھ امید تھی، التجا تھی۔ عروسی لباس میں اس کا سہما ہوا مختصر وجود اب ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گیا تھا جو خیالی اور افسانوی قاتل دلہن سے یکسر مختلف تھا۔ یہ یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ اس کمزور، خوف سے مغلوب اور بزدل نظر آنے والی نازک سی لڑکی نے سچ مچ

خود کو بچانے کے لیے چھری سے ایک مرد کو قتل کر دیا تھا اور پھر ویران رات کی تاریکی میں اکیلی اس بھوتوں کے ڈیرے تک بھاگتی آئی تھی۔

میں اس غلیظ اور ویران کمرے کی قید سے نکلا تو ایک مختلف آدمی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں موت کے خوف سے بھاگ رہا تھا اور موت میرے تعاقب میں تھی۔ محافظوں کی بندوق سے فائر کی جانے والی کس گولی پر میرا نام لکھا ہوگا، میں نہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے یقین کے مطابق زندگی کے لیے دوڑ رہا تھا، صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

لیکن گزرے ہوئے چند گھنٹوں نے میری سوچ کا محور بدل دیا تھا۔ میری شخصیت میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جیسے جیسے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا، اپنی زندگی پر یقین بڑھتا جا رہا تھا اور یہ اعتماد مجھے نیا حوصلہ دے رہا تھا کہ میں کامیاب اور فتح مند ہوں۔ جیل سے گولیوں کی بوچھاڑ میں نکلتے وقت موت ہر قدم پر ہم رکاب تھی اور اچانک کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی کا نشانہ بن جانے کی دہشت میرے اعصاب پر مسلط تھی، میرے دوڑتے جسم میں رواں ہر قطرۂ خوں میں سمائی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے چھ فٹ کے زندہ جسم کو ڈیڑھ دو انچ کی کون سی گولی ایک خون آلودہ لاش میں بدل دے گی جسے اخباری نمائندے فرشِ خاک پر پڑا دکھائیں گے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

لیکن موت پیچھے رہ گئی تھی، زندگی کی سرحد کے پار۔ اس نے اپنے نامزد شکار سمیٹ لیے تھے۔ اب میں زندہ رہ سکتا تھا۔ آزاد رہنا اس کے لیے شرطِ اوّل تھی۔ میرا خوف مٹ گیا تھا اور اس رات کے بطن سے امید کی نئی کرن پھوٹی تھی۔ اس کا نام نورین تھا۔ اب یہ احساس میری طاقت بن گیا تھا کہ ایک مجبور، بے کس اور کمزور لڑکی نے مجھے اپنا محافظ اور مددگار مان لیا ہے۔ اور میں نے اس کا سہارے کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ تھام کے ایک ذمے داری قبول کر لی ہے۔

میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جو مجھے اس ویران اور تاریک حویلی میں کسی بدروح کی طرح سرگرداں پھرتے ہوئے یاد آئی۔ کہانی کسی بچے کی تھی جو اسکول جاتا تھا تو اسے راہ میں ایک کتا بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے کتے کو دیکھتا، راستہ کاٹ کے دور سے گزرتا تھا۔ اچانک ایک دن کسی چھوٹی سی بچی نے اس کا راستہ روک کے کہا۔ ”مجھے اس کتے سے ڈر لگتا ہے۔ میرا اسکول آگے ہے۔“ لڑکے نے اس کا ہاتھ تھام کے بہادری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں، چلو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“ اور بڑی بہادری سے کتے کی طرف دیکھے بغیر گزر گیا۔ وہ بچہ اب میں تھا۔

میں دوسرے کمرے میں گیا۔ پھر اس کے برابر والے کمرے میں۔ اندر برسوں کی ویرانی نوحہ خواں تھی۔ دیواروں کا پلستر جھڑ گیا تھا۔ چھت دکھائی نہ دیتی تھی مگر اس کی حالت بھی خستہ ہوگی۔ ادھڑے ہوئے فرش پر شاید کبھی ٹائل ہوں گے۔ کھڑکیاں اور دروازے نکال کر لے جانے والے سب لے گئے تھے۔ چشمِ تصور سے میں نے اس وقت کو دیکھنے کی کوشش کی جب یہ حویلی اپنے مکینوں کے دم سے آباد تھی۔ بیش قیمت قالین، پردے اور فرنیچر سے آراستہ تھی اور اس کے دولت مند، پُر رعونت اور بااختیار مالکوں کی ایک آواز پر خدمت گار حاضر ہو کے پوچھتے ہوں گے... کیا حکم ہے میرے آقا... الٰہ دین کے چراغ کی طرح۔ مگر الٰہ دین کا چراغ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اب میں ہوں اور ماتمِ ایک شہرِ آرزو۔ وہ لوگ اب نہ جانے کہاں ہوں گے؟

میں ایک کے بعد دوسرے کمرے سے گزرتا گیا۔ ہر جگہ بے بس و مظلوم در و دیوار کی وہی کہانی تھی۔ لاوارث وقت کی وہی نشانیاں تھیں... گرد و غبار، گھاس پھوس اور تنکے... کوڑا کرکٹ، پرندوں کی بیٹوں سے لپا ہوا فرش۔ انسانی جسم کی خارج کردہ غلاظت کی بُو۔ بھوت چڑیلیں اور بدروحیں تو شاید بعد میں آئے ہوں گے، ان سے پہلے آنے والے ایک لاوارث حویلی سے سب کچھ لوٹ کے لے گئے تھے۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ دیواریں اور چھت بھی لے جاتے۔ اب لے جانے کو کچھ نہیں رہا تھا تو افسانے رہ گئے تھے۔

اجالے کی کرن کے ساتھ ہی ہر کونے سے پرندے پھڑپھڑا کے نکلنے لگے تھے مگر ان کے چہچہانے میں کوئی نغمگی نہ تھی۔ آمدِ صبح کا کوئی مدھر گیت نہیں تھا۔ وہ تو احتجاج کرتے محسوس ہوتے تھے جیسے شور مچا کے ساری دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہوں کہ دیکھو، یہاں کون کون ہے؟ ایک جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ وہ دلہن ہے جس نے اپنے شوہر کو قتل کیا اور اس کی خون آلود لاش کو حجلۂ عروسی میں چھوڑ کے بھاگ آئی۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے ایک پاگل کو قتل کیا۔ اسے وہ اپنا شوہر بھی نہیں مانتی۔ اسے انتظار ہے اس کا جسے وہ چاہتی تھی۔ پرندے آزاد تھے۔ دنیا کے سارے انسان بھی آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، سچ کو جھوٹ یا جھوٹ کو سچ مانیں۔ خونی دلہن کی کہانی کو چشم دید واقعہ بنائیں۔

اچانک میرے سامنے ایک زینہ آ گیا۔ میں نے دم بہ دم بڑھتے اجالے میں باہر کے صحن کو دیکھا جو اس حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ اس میں جھاڑ جھنکاڑ اور لمبی خشک گھاس تھی جس میں گرگٹ بڑی مہارت سے پھدکتے ہوئے ٹڈے پکڑ کے ناشتا کر رہے تھے۔ برگد کے پرانے درختوں کی لمبی لمبی ڈاڑھی زمین میں پیوست ہو کے تنے کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی گھنی شاخوں میں سیکڑوں چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ درمیان میں ایک فوارے کے آثار تھے۔ اس کے حوض کی شکستہ دیوار میں ملبا بھرا ہوا تھا۔ وہیں ایک کتیا نے اپنے نومولود بچوں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کر لیا تھا۔

زینہ دیکھ کر میں شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ میں اوپر چڑھتا تو شکستہ بلکہ غیر موجود جالی سے مجھے کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔ عقبی گلی میں ابھی خاموشی تھی۔ چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد میں تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ زینہ نسبتاً صاف تھا۔ اگر میری راہ میں ملبا حائل ہوتا تو میں وہیں سے لوٹ جاتا۔

ایک جست لگا کے میں زینے میں سے گزر گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایک سیکنڈ میں کسی کو کیا نظر آیا ہوگا۔ بالفرضِ محال عین اسی وقت کوئی ادھر سے گزرتے ہوئے منہ اٹھا کے میری طرف دیکھنے لگا ہوگا تو وہ جا رہا ہوگا اپنے کسی کام سے۔ آفس یا کسی دکان تک، وہ تفتیش میں وقت ضائع کرنے کیوں آئے گا؟

ایک ایک سیڑھی پر احتیاط سے چڑھتے ہوئے میں سب سے اوپر کے پہلے کمرے میں طلوع ہوا۔ تاریکی یہاں بھی غالب تھی لیکن کم۔ میں اپنے دائیں بائیں دیواروں میں دو دروازوں کے خلا بھی دیکھ سکتا تھا اور اوپر روشن دانوں میں قیام پذیر کبوتروں کو بھی جو پھڑپھڑا کے اڑتے تھے اور پھر اپنی جگہ جا بیٹھتے تھے۔ انہیں میرا دخل در معقولات ناگوار گزر رہا ہوگا۔

اجالا اب تیزی سے پھیل رہا تھا۔ روشن دانوں کے خالی چوکھٹے میں سے آسمان بہت روشن نظر آ رہا تھا۔ اس ویرانے کی طرف جو پرانے وقتوں میں پائیں باغ کے نام سے یاد کیا جاتا ہوگا' دو جگہ کھڑکیوں کے خلا تھے۔ ان سے اندر آنے والے اجالے میں شامل ہو کے سورج کی پہلی کرن مقابل کی دیوار پر اتری۔

اچانک میری نظر فرش پر گئی۔ وہاں پرانی دھول میں کسی کے نقشِ قدم صاف نظر آ رہے تھے۔ کوئی جاگرز پہن کر یہاں آیا تھا اور اس کے سول کے نقش تازہ تھے۔ میں نے اپنے پیچھے اس زینے کو دیکھا جس پر قدم رکھتا ہوا میں یہاں آیا تھا۔ وہاں اب بھی اندھیرا تھا لیکن ہلکا سا فٹ پرنٹ آنے والے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ بھی میری طرح اسی زینے سے اوپر آیا تھا۔

یہ فٹ پرنٹ ایک ڈائریکشن رکھتے تھے۔ وہ جو بھی تھا، اس ہال کے فرش پر چلتا ہوا دائیں جانب گیا تھا۔ محض تجسس نے مجھے اس کا سراغ لگانے پر مجبور کیا۔ جاگرز پہن کے یہاں آنے والا کون ہو سکتا تھا؟ یہ ہو سکتا تھا کہ رات کے وقت یہاں نشئی آوارہ گرد یا فقیر ڈیرا ڈال لیتے ہوں۔ ان کے لیے یہ فری بیڈروم بھی تھا اور بیت الخلا بھی... لیکن ایسے لوگ اوپر کیوں آنے لگے... نیچے وافر جگہ تھی۔

جوتوں کے نشان دیوار کے ساتھ ساتھ تھے۔ میں آگے بڑھا تو مجھے دائیں جانب ایک اور دروازے کا خلا دکھائی دیا۔ یہ نسبتاً چھوٹا کمرا تھا جس میں ایک شخص دیوار کے ساتھ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق تیس سال کا جوان مرد تھا۔ اس کا جسم مضبوط تھا اور بال گھنے۔ اس کے جسم پر چست ٹی شرٹ تھی جس پر ایک انچ چوڑی سفید اور براؤن یا سیاہ پٹیاں آڑی پھیلی ہوئی تھیں۔ ہاف سلیو اس کے گندمی توانا بازو سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بازو فرش پر سیدھا تھا اور دوسرا جسم سے دور تقریباً کندھوں کی سیدھ میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ نیلی جینز اور سفید جاگرز میں تھا۔ سیدھے پھیلے ہوئے پیروں سے میں جاگرز کا فٹ پرنٹ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ وہی فٹ پرنٹ تھا جس نے مجھے زینے سے اوپر آ کے متوجہ کیا تھا۔

اچانک میں نے نورین کی آواز سنی۔ یہ بازگشت کی طرح گونجتی آواز میرے پیچھے ایک کھڑکی کے خلا سے مجھ تک پہنچی تھی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ ”خاور! کہاں ہو تم... خاور...!“

میں نے کھڑکی کے قریب جا کے دیکھا تو نیچے وہ سائے کی طرح دکھائی دی۔ وہ اسی دیوار کے قریب کھڑی تھی اور میں عین اس کے اوپر والے کمرے کی کھڑکی میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہیلو... نورین! کیا بات ہے؟“

وہ چونک کے پلٹی اور اس نے اوپر دیکھا۔ ”وہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں، میں آ رہا ہوں دو منٹ میں۔“

”جلدی آؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”اب ڈرنے کی کیا بات ہے، صبح ہو چکی ہے۔“

”جا کے کچھ لاؤ نا۔ میرا بھوک پیاس سے برا حال

ہو رہا ہے۔ میں بے ہوش ہو کے گر جاؤں گی۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا اچھا۔ بس میں یوں گیا بازار اور یوں آیا۔ باہر جانے کا ایک راستہ پیچھے کی طرف بھی ہے۔“

”ہاں۔ ادھر سے ہی نکلنا۔ سامنے والا دروازہ غیر محفوظ ہے۔ کافی لوگ آتے جاتے ہیں۔“ وہ بولی۔

اس کی اور میری آواز اس ویرانے میں گونج رہی تھی۔ وہ درمیان کے اس حصے میں تھی جس کی چھت کی بلندی دگنی تھی۔ اسے حویلی کا فیملی لاؤنج سمجھا جا سکتا تھا۔ یہاں رہنے والے اس جگہ اکٹھے بیٹھ کے کھانا کھاتے ہوں گے یا عزیزوں، رشتے داروں کو بٹھاتے ہوں گے۔ شادی بیاہ یا کسی تہوار پر خواتین یہاں گانے بجانے کے لیے جمع ہو جاتی ہوں گی۔ اس زمانے میں ہندو خواتین بھی سخت پردہ کرتی تھیں۔ غیر مرد باہر رہتے تھے۔ انہیں مردان خانے میں بٹھایا جاتا تھا، شادی بیاہ کے لیے باہر ہی شامیانہ لگا کے۔

مجھے بڑی حیرانی تھی کہ نورین سے میری گفتگو نے بھی سونے والے کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالا تھا۔ سب سے پہلے تو اس کے سونے کے انداز نے مجھے شک میں مبتلا کیا۔ ایسی غفلت کی گہری نیند اس فرشِ خاک پر کسی نشہ کرنے والے کے لیے ممکن تھی۔ وہ نوجوان اپنی اچھی صحت سے نشہ کرنے والا ہرگز نہیں لگتا تھا۔ بے خبری کی ایسی نیند وہ بھی سو سکتا تھا جو کئی راتوں کا جاگا ہوا ہو۔

آخر وہ کون تھا؟ میں نے اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کے سوچا۔ اس وقت تک میرے ذہن سے اس خیال کا گزر بھی نہ ہوا تھا کہ وہ سلمان خان ہو سکتا ہے۔ اگر وہ آتا تو یہاں آ کے کیوں سو جاتا؟ وہ نورین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ پہلے پہنچ جاتا تو نیچے وہیں بیٹھ کے نورین کا انتظار کرتا جہاں میں نے نورین کو دیکھا تھا۔

پھر اچانک میری نظر اس کے سینے اور پیٹ پر گئی جو سانس کی آمد و رفت کے ساتھ اوپر نیچے نہیں ہو رہا تھا۔ اس خیال نے کہ وہ زندہ نہیں مُردہ ہے، مجھے حواس باختہ کر دیا۔ میں گھبرا کے کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اس نوجوان کے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھا۔ اس کا دل خاموش تھا۔ تصدیق کے لیے میں نے اس کی کلائی کو تھاما۔ نبض ساکت تھی۔ اب شک کی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ وہ مر چکا تھا اور اسے مرے ہوئے بھی کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کا سرد ہاتھ اکڑا ہوا تھا۔ سردی تو خیر میرے لیے بھی تھی مگر جو ننگے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہو... اور زندگی کی حرارت سے بھی محروم ہو، اس کے جسم کا اکڑ جانا قدرتی بات تھی۔

خوف اور گھبراہٹ میں مجھے دوسرا وحشت نا
خیال یہ آیا کہ کہیں وہ سلمان خان تو نہیں۔ نیچے سے نور
مجھے پکار رہی تھی۔ میں نے اس کو تھوڑا سا ہلا کے پتلون
پچھلی جیب سے اس کا بٹوا نکالا۔ یہ چرمی بٹوا تھا جس م
نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس کی ایک پاکٹ م
مجھے شناختی کارڈ دکھائی دیا۔ میں نے اسے روشنی کے ر
کر کے دیکھا تو مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کارڈ پر اس
نام سلمان خان ولد عمران خان لکھا ہوا تھا۔

سلمان خان کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ اس کی موت کسی خنجر یا گولی کے زخم کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے کپڑوں فرش پر مجھے خون کا کوئی داغ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اندھیرا ہوتا تو میں اس کی گردن پر انگلیوں کے یا رسی کے نشانات دیکھتا جس سے اندازہ ہوتا کہ اسے کسی نے گلا گھونٹ کے ہلاک کیا ہوگا۔

قتل کے اسباب بھی بہت ہو سکتے تھے مگر ایک بات بہت واضح تھی کہ اسے کسی نے لالچ میں قتل نہیں کیا تھا۔ جتنی ر اس کے پرس میں تھی، محفوظ تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس رقم کو شمار کرتا۔ مجھے ڈر تھا کہ میری غیر حاضری سے گھبرا کے نورین اوپر نہ آ جائے۔ میں نے اس پرس کو اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔ اٹھتے اٹھتے میں نے اس کی دوسری ہپ پاکٹ دیکھی۔ اس میں کچھ نہیں تھا لیکن ایک سائڈ پاکٹ میں سے نوٹوں کی پوری گڈی نکل آئی۔ یہ سب بڑی مالیت کے لیکن استعمال شدہ نوٹ تھے۔ یہ پانچ لاکھ روپے تھے۔ میں کچھ دیر دم بخود بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دوسری طرف کی پاکٹ دیکھی۔ اس میں سے سو کے نوٹوں کی دوسری گڈی آدھی باہر نکل آئی تھی۔ یہ بھی پانچ لاکھ روپے تھے۔

سلمان کی جیبوں کو خالی کر کے رقم اپنی جیب میں منتقل کرتے ہوئے میرے ضمیر نے مجھے سخت ملامت کی اور میری اس حرکت پر مجھے وہ گالیاں دیں جو میں بھی دیتا اگر میں کسی کو چور ڈاکو سمجھ کے کسی لاش کو لوٹتے دیکھتا۔ خواہ وہ لاش سڑک پر حادثے میں ہلاک ہونے والے کی ہوتی یا مردہ خانے میں رکھی ہوئی۔

لیکن میں چور ڈاکو نہیں تھا۔ مجبور ضرورت مند تھا اور میرے لیے اس رقم کی ضرورت اور اہمیت کہیں زیادہ تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی تھا کہ مرنے والے نے یہ رقم جائز ذرائع سے حاصل نہیں کی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس سے محبت کرنے والی ایک پاگل لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک نکما آدمی تھا جو کام تلاش کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتا تھا اور کوئی کام ملتا تھا تو

اسے اپنے لیے ناموزوں قرار دے کر جان چھڑا لیتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود ہر کام کے لیے ناموزوں تھا۔

کیا ایسا شخص محبت کے لیے موزوں تھا؟

نیچے سے نورین نے چلّا کے کہا۔ ”آخر کہاں پھر رہے ہو تم؟“

میں نے کھڑکی سے جھانکے بغیر کہا۔ ”آ رہا ہوں یار۔ دراصل... تین چار دن سے مجھے قبض کی شکایت تھی... سوری!“

نیچے سے مجھے اس کی ہنسی سنائی دی۔ ”اچھا اچھا... ٹیک یور ٹائم۔ چار دن کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے میں بھی وقت تو لگتا ہے۔“

میں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ ”معاف کرنا دوست!“ میں نے لاش کو مخاطب کر کے خاموشی کی زبان میں کہا۔ دنیا کہتی ہے کہ پیسا ہاتھ کا میل ہے۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ یہ پیسا تمہارے لیے ہاتھ کا میل تھا، میرے لیے نہیں۔ یہ کون سی تمہارے خون پسینے کی کمائی تھی۔ پھر بھی تم زندہ رہتے تو یہ ہاتھ کا میل تمہارے گھر کے راستوں پر کہکشاں بچھا دیتا جن پر پتھر تھے۔ پھر نورین خود چل کے تمہارے حجلۂ عروسی میں پہنچ جاتی جو اب اس آسیب نگر میں بلاوجہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔

مگر اب یہ ہم زندہ رہ جانے والوں کے لیے... میرا مطلب ہے نورین کے لیے تمہاری طرف سے پہلا اور آخری تحفہ ہے جسے میں قبول کرتا ہوں۔ میں نے یہ سب نوٹوں کی گڈیوں کو ڈھیلی ڈھالی قمیص کی دونوں جیبوں میں ڈالتے ہوئے سوچا۔

میرا دماغ اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے پاس چند منٹ کی مہلت تھی۔ فوری طور پر نورین کے اوپر آ جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے والی مثال مجھ پر صادق آئی ہے۔ جب میں جیل سے فرار ہوا تو میرے لیے واحد مسئلہ خود اپنی زندگی کا تحفظ تھا۔ دوسرا مسئلہ بن کے نورین نازل ہوئی تھی اور اب اس کے محبوب سلمان خان کی لاش اس ویرانے میں بھوت کی طرح سامنے آ گئی تھی۔

میں نے خود کو پُرسکون کیا اور اپنی راہِ عمل طے کی۔ فوری طور پر نورین کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جانا بھی ناممکن تھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ خود اس کا لال عروسی جوڑا تھا۔ خود میں لباس بدلنے کے بعد باہر کی دنیا میں رونمائی کا خطرہ مول لے لیتا، فوری طور پر اس لاش کا ڈسپوزل ناممکن تھا۔ درحقیقت نہ یہ میرا کام تھا اور نہ میری ضرورت۔ مسئلہ اس سنگین حقیقت سے نورین کو آگاہ کرنے کا تھا اور پھر اس کو سنبھالنے کا۔

میں نے اپنی محدود عقل کی مدد سے لاش کو دیکھ کر کچھ پوسٹ مارٹم والے نتائج اخذ کیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ سلمان کو یہاں لا کے مارا گیا... یا مار کے یہاں ڈال دیا گیا۔ اس کی موت کو طبعی یا حادثاتی سمجھنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا اپنے بھائی کی موت کو قتل نہ سمجھنا۔ یہ بھی واضح تھا کہ اسے قتل کرنے والے وہ لوگ نہیں تھے جنہوں نے اسے دس لاکھ دیے تھے۔ ظاہر ہے کسی جائز قانونی کام کے لیے ایسا خطیر معاوضہ کون ادا کرتا ہے۔ مارنے والے وہ خود ہوتے تو جاتے وقت اپنی رقم واپس لے جاتے۔ قاتل دوسرے لوگ تھے تو ان کو علم نہیں تھا کہ سلمان کی جیب میں دس لاکھ ہیں ورنہ وہ بھی کیوں چھوڑتے؟ یا پھر شاید وہ جلدی میں تھے۔

”یااللہ! آخر کتنی دیر لگے گی تمہیں؟“ نیچے سے نورین کی آواز سن کے میں بھاگا پھر رکا۔ میرے اندازے کے مطابق دن چڑھنے کے ساتھ سورج مخالف سمت میں سفر کرے گا۔ دوپہر کے بعد یہاں اتنی روشنی نہیں رہے گی اور اس کمرے میں جہاں لاش پڑی ہے، بالکل اندھیرا ہو جائے گا۔

میں اسی زینے سے اترا تو سخت نروس تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میری دہشت زدہ صورت نورین کو شکوک میں مبتلا کر دے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ خوف سے میرا دل لرز رہا تھا اور سردی کے باوجود میرے جسم پر پسینا آ گیا تھا۔ اگر میں سنبھل کے نہ اترتا تو زینے پر قدم لڑکھڑانے سے خود لڑھک جاتا۔ حوصلہ... حوصلہ... میں نے خود کو تسلی دی۔ گھبرانے یا پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔

نورین اب دوسرے کمرے میں آ گئی تھی اور غالباً خود بھی اوپر آ کے دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ کیسا قبض ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اس خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا کہ چند منٹ بعد وہ اوپر آ کے حقیقی صورتِ حال دیکھ لیتی تو کیا ہوتا؟

اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ لا کے کہا۔ ”یہ تم کہاں سیر کرتی پھر رہی ہو؟“

”تم نے اتنی دیر لگا دی؟“

میں نے اسے ڈانٹا... ”میں سلمان کو تلاش کر رہا تھا... اور پھر میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا تو میں کیا کرتا...؟“

”میں مر جاؤں گی بھوک پیاس سے۔ اس کا کوئی خیال نہیں تمہیں؟“

آلو کی پٹھی... میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ کیسے ڈانٹ رہی ہے مجھے۔ آخر کیا سمجھتی ہے مجھے؟ میں اس کا شوہر ہوں، عاشق یا حکم کا غلام۔ یہ میرا ہی حوصلہ اور ظرف ہے کہ گلے پڑ جانے والی مصیبت کا مقابلہ شرافت اور خوش اخلاقی سے کر رہا ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو لاٹری میں ملنے والی نئی ملی دلہن کے ساتھ شب عروسی مناتا اور نکل جاتا۔

میں اسے ہاتھ پکڑ کے واپس لے گیا۔ ”آرام سے بیٹھو۔ یہ مت بھولو کہ ہم دونوں سخت مشکل میں ہیں۔ پولیس کیا کسی اور نے بھی دیکھ لیا تو دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا۔“

اس نے احتجاج کیا۔ ”چھوڑو میرا ہاتھ۔ کیا کلائی توڑو گے جنگلی!“

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی... ”سوری! دراصل اس نئی پریشانی نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

”کون سی نئی پریشانی...؟“

”تم... تم اور کون؟“ میں نے سنبھل کے کہا۔ ”اب میں جا رہا ہوں تھوڑی دیر کے لیے باہر... لیکن تم نے اس طرح بے فکری سے گھومنا پھرنا شروع کر دیا تو میرے واپس آنے سے پہلے ہی تمہیں لے جائے گا کوئی۔“

”یہاں کوئی نہیں آتا۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ شاید رات کو لوگ یہاں آنے سے ڈرتے ہوں... دن میں تم خود آتی رہی ہو یہاں۔ سب بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتے۔ جو اس حویلی کی آخری کیل تک اکھاڑ کے لے گئے، وہ بھوت نہیں انسان ہی تھے۔ یہ... میرے خیال میں یہ جگہ ٹھیک ہے... جب تک میں نہ آؤں۔“

”لیکن یہ تو... شاید...“

”یہ پوری حویلی ایک عوامی بیت الخلا کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر برداشت کر لو۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں وہ کرو ورنہ... جو تمہارا دل چاہے کرو، میں چلا جاتا ہوں... اور واپس نہیں آؤں گا۔“

وہ ایک دم رو پڑی۔ ”خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ میں تمہاری بات مانوں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔“

وہ میرے کندھے سے سر لگا کے سسکیاں لے رہی تھی اور میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا تھا کہ میں اسے تسلی دے کر چپ کرانے کے لیے وہی کروں جو ہر مہذب مرد کو کرنا چاہیے۔ میں اسے سینے سے لگا کے اس کے سر پر ہاتھ پھیروں۔ اس کے آنسو صاف کروں اور... اسے پیار کروں۔ یہ میرے دل میں پیدا ہونے والے رومانی خیالات کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس سچویشن میں رومانس کا تھ
ناممکن تھا۔ میری جگہ اس کا بھائی ہوتا تو یہی کرتا۔

میں نے اسے وہاں بٹھا دیا۔ ”صرف دس من
میں یوں گیا اور یوں آیا۔ کچھ کھا پی کے ہم یہاں سے
جائیں گے... لیکن اس کے لیے مجھے ڈھنگ کے کپڑ
چاہئیں۔ تمہیں یہ دلہنوں والا جوڑا بدلنے کے علاوہ بر
پہننا پڑے گا۔“

”مگر... ہم جائیں گے کہاں؟“ اس نے ایک سسکی لی

”یہ... بعد میں سوچیں گے... یا جہاں قسمت
جائے۔“ میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔

”دیکھو... پیچھے بھی ایک دروازہ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اوپر سے دیک
تھا میں نے۔“

اجاڑ باغ کے جھاڑ جھنکاڑ سے گزر کے میں بیر
دیوار تک آیا جو ابھی تک سلامت تھی اور اس خلا
گزر گیا جو دروازہ نکالنے سے باقی رہ گیا تھا۔ باہر ا
تنگ گلی تھی۔ کسی نے بھی مجھے اس بھوت نگری سے بر
ہوتے نہیں دیکھا۔ اس گلی کے موڑ پر ہی ایک چھوٹی سی مٹ
کی دکان کے باہر پوریاں تلی جا رہی تھیں۔ یہ ریڈی
ناشتا تھا۔ مسئلہ چائے کا تھا جس کی طلب میرے
ضرورت بن رہی تھی۔

یہ مسئلہ میں نے یوں حل کیا کہ پولیتھین
دو لفافوں میں گرم چائے ڈلوا کے دو اسٹرا حاصل کیے جو
ڈرنکس پینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سارے
میں نے بیس منٹ میں نمٹائے۔ مجھے یہ بیس منٹ اپنے
عمل پر سوچ بچار کے لیے بھی کافی ثابت ہوئے۔ جب
واپس پہنچا تو تقریباً طے کر چکا تھا کہ مجھے پہلے کیا
چاہیے۔ بڑے بازار جہاں سے میں کپڑے اور برقع
خرید سکتا تھا، ابھی بند تھے۔ نورین کے ساتھ ناشتا کر
کے بعد دوبارہ باہر نکلنے سے پہلے مجھے نورین سے کچھ پو
تھا... اور اسے کچھ بتانا تھا۔

لیکن شکستہ دیوار سے ویران باغ میں داخل ہوتے
میرے ذہن کو ایسا الیکٹرک شاک لگا کہ میں بے ہوش ہو
ہوتے بچا۔ اندر پولیس موجود تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل
دیکھا اور ایک سب انسپکٹر کو... میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

منظر امام

عامل گزیدہ

اُستاد... زندگی کے سفر کا سچا ساتھی اور حیات کے لیے روحانی زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے... استاد جیسے بڑے لوگ مرتے نہیں... بلکہ تاریخ میں چلے جاتے ہیں... استادِ محترم کا شمار بھی ایسی شخصیات میں ہوتا ہے... وہ کسی بے کل کی طرح متلاشی رہتے تھے... سچی بات ہے کہ علم کی محبت اور تلاش ہی انسان کو سچی مسرت سے دوچار کرتی ہے... استادِ محترم نے بھی اس دفعہ کچھ اسی قسم کا کارنامہ سرانجام دیا ہے...

حس مزاح سے محظوظ ہونے والے قارئین کے لیے ایک انوکھا اور شگفتہ پارہ

استاد نے نہ جانے کس طرح ایک عامل سے دوستی کر لی تھی یا شاید عامل نے ان سے دوستی کر لی تھی۔ بہر حال دونوں کی جوڑی زبردست چل رہی تھی۔

استاد کا حلیہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں۔ لانبا قد، انتہائی گہرا رنگ اور بے ہنگم سی داڑھی کے ساتھ ساتھ لال لال آنکھیں۔ جبکہ اس عامل کا حلیہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

کم بخت اچھا خاصا موٹا تھا۔ توند نکلی ہوئی، لال آنکھیں جو یقیناً بھنگ یا چرس کی وجہ سے ہوں گی۔ جسم پر

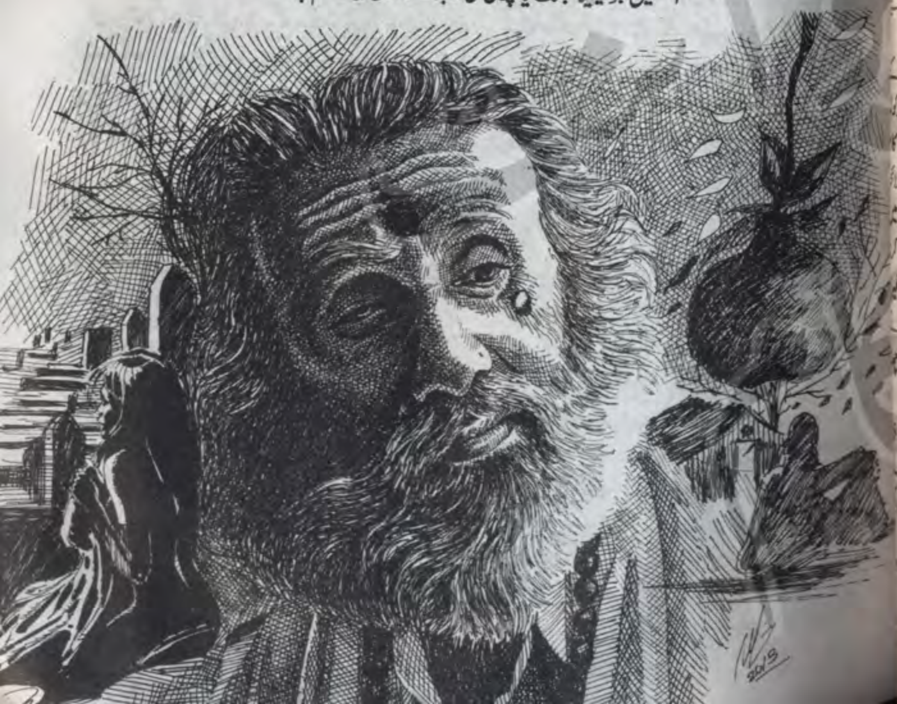

صرف ایک لنگوٹی۔ استاد کے رنگ سے بھی گیا گزرا رنگ تھا۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا جھولتی رہتی۔

اس کے جسم سے سڑے ہوئے جانور کی بو آیا کرتی۔ خدا جانے استاد ایسے شخص کو کس طرح برداشت کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں استاد نے مجھ سے بھی رازداری برتی تھی۔

اُستاد کے پاس جب میں نے پہلی بار ایسے بندے کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ استاد نے اس کا تعارف بہت زوردار انداز میں کروایا تھا۔ ”یہ ہیں منوہر لال اقر ہتاب رنگ ہستیان بہ طرز افراسیاب و سامری پیدا کردن۔ بہ چشمِ نم۔ از روئے فرسنگ و آہنگ۔“

”خدا کے لیے استاد ذرا آسان کر دیں۔“

جب میں ایسی بات کہتا تھا تو استاد بھنّا کر رہ جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ادب عالیہ سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ بہرحال استاد نے پھر اس مشکل کو کچھ یوں آسان فرمایا۔ ”یہ شخص میدانِ کارزارِ فن جادوگری و سپہ گری اور شیشہ گری میں مثالِ چرخِ کہن ہے۔“

بہت دیر تک استاد سے جھک مارنی پڑی تھی۔ تب جا کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ منوہر لال ایک زبردست عامل قسم کا بندہ ہے اور سفلی عمل کرتا ہے۔

اس کی اصلیت جان کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ استاد کس چکر میں پڑ گئے تھے۔ میں اشارے سے انہیں ایک طرف بلا کر لایا۔ ”استاد! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ عامل قسم کے لوگ اچھے نہیں ہوتے۔ یہ آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں؟“

”میں ثوابِ دارین و مریدین کے چکر میں گنجلک ہوا ہوں۔“ استاد نے بتایا۔

”اس میں کیا ثواب ہے استاد۔ یہ شخص تو آپ کو برباد کر دے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور آپ تو خود بھی ہر فن مولا ہیں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کی شاگردی اختیار کریں۔“

”ہر شخص مثالِ فتنہ دوراں بے محابہ و بے تحاشا ہوتا ہے۔ مرد ہر فن استاد ستراط ہے گویا سے فراواں ہوا کرتا ہے۔ جبکہ زنجیرِ بے شغل اور بے لباس ہے۔ یہ کیا قیاس ہے۔“

استاد یہ فرما رہے تھے کہ یہ قیاس کرنا غلط ہے کہ ہر شخص کو ہر کام آتا ہے۔ اس بندے کے پاس چونکہ سفلی عمل کا ہنر ہے اسی لیے انہوں نے اس کی شاگردی اختیار کی ہے۔

”اب آپ کی مرضی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ بتائیں، اس نے اب تک آپ کو کیا سکھایا ہے؟“

”خفیہ و پوشیدہ منتر کا بابہ گراں۔“ استاد نے بتایا۔

”جیسے اقر مہتا سنگ الٹ سونٹھ پلٹ کپٹ لپٹ، فرافل و عنبر ہو جا کہ اگن بیتھ کا چشم بے حال ہے۔“

”کیا مطلب ہوا اس کا؟“ میں نے پوچھا۔

”منتر اولین۔“ استاد نے بتایا۔ ”اس کا آشیانہ امروزِ فردا میں خاک گردستان و نو آموز میں گا۔ شب ہائے پیچیدہ اور رنجیدہ کو... چلہ با گوش ساتواں خانہ ہے۔“

سمجھ میں آیا کہ استاد یہ فرما رہے تھے کہ انہیں راتوں تک کسی قبرستان میں بیٹھ کر اس منتر کا جاپ کرنا تب جا کر وہ کچھ حاصل کر سکیں گے۔

میں نے ایک بار پھر استاد کو سمجھانے کی کوشش کی استاد پر تو بھوت سوار ہو چکا تھا اور جب ان پر بھوت جائے تو پھر اسے اتارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

”ٹھیک ہے استاد! اب میں آپ کو نہیں سمجھاؤں گا۔“

اس وقت استاد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم کو بھی عندلیب خانہ بہزاد میں ہم نوائی اور ہم ادائی کرنی ہوگی۔“

استاد یہ فرما رہے تھے کہ جاپ کے وقت میں بھی کے ساتھ رہوں گا۔ میں یہ سن کر گھبرا گیا۔ ”ارے نہیں میں ان چکروں میں نہیں پڑوں گا۔ آپ خود ہی جائیں۔“

لیکن استاد نے تو ضد ہی پکڑ لی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ ایک بہانہ میری سمجھ میں آ ”نہیں استاد! مجھے اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ اس جاپ اکیلے بیٹھ کر کیے جاتے ہیں۔“

”فکر نہ کرو، اجازت پیشگی و ہمسائیگی ہے۔“ مسکرا کر بولے۔

نہ جانے استاد کے ذہن میں کیا تھا۔ انہوں نے سوچ کر یہ چکر چلایا تھا۔ الٹا سیدھا جاپ کر کے وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ ان باتوں کا ابھی تک کوئی اندازہ ہو رہا تھا۔

استاد میرا ہاتھ تھام کر اس عامل منوہر لال کے لے آئے۔ ”اے چشم دلبر جادوگرانِ اسفل۔“ استاد نے مخصوص انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”یہ شخص باکمال و حال میرا ہمدم دیرینہ سال اور خوش وبال ہے۔ میں اس ساتھ فروغ ماہی و جنتر بے گمان کرنا چاہتا ہوں۔“

نہ جانے کس طرح اس عامل نے استاد کی یہ بات لی پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”بالک، کشٹ سنکھشن ہے۔ سوگا موہا اقابیلا ہے۔ طرم دار نمر ترن ہے۔“

ایک تو استاد کی جناتی زبان۔ اب یہ عامل ان سے دو ہاتھ آگے کی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ سرے سے میرے پلے ہی نہیں پڑا تھا۔

میری بے بسی دیکھ کر استاد نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تم گرفتہ افتدن کو پاپوش بے ریا کا اندازۂ طوفاں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ راستہ پُرخطر ماحذر اور بلاشریک غیر و خاک آب دیگ سے لبریز ہے۔“

یہ لیں۔ یہ استاد نے میری مشکل آسان کی تھی۔ میں تو سمجھ گیا تھا کہ دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ قبرستان میں بیٹھ کر کسی کو جاپ کرتے دیکھنا بہت خطرناک کام ہے۔

جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یا خدا یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ استاد اگر جنات کی زبان بولتے تھے تو وہ بھوتوں کی زبان بول رہا تھا۔

”استاد! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس چکر میں نہ گھسیٹیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ یہ آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ یہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔“

”مرلی منوہر۔“ اس عامل نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تو سبھاش چندرما کا اندر ما ہو جا۔ تجھے سپھلتا اور کامن کو شکل ہو جائے گا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں استاد کا ساتھ دے دوں۔ مجھے اس میں کامیابی ہوگی۔ اب مجھے کیا کامیابی ہونی تھی، یہ میں اندازہ نہیں کر سکا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ مجھے استاد کے اس شوق میں ان کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

استاد کو اسی رات سے قریبی قبرستان میں بیٹھ کر اپنا جاپ پڑھنا تھا۔ قبرستان تو ویسے ہی عبرت کا مقام ہوا کرتا ہے اور وہاں رات کے وقت جا کر الٹی سیدھی حرکتیں کرنا میرے لیے اور بھی پریشان کن ہو سکتا تھا۔

استاد نے مجھ سے کہا۔ ”یہ شبِ پروانۂ امروز فردا ہو گا۔ تم عاشقانِ سیہ پوش اور کمبل بردار ہو جاؤ کہ مرحلہ موسم تندی بادِ مخالف ہے۔“

مطلب یہ کہ استاد کا ارادہ آج ہی رات سے عمل شروع کرنے کا تھا اور میں اپنے ساتھ کمبل وغیرہ لے لوں کہ موسم بہت سخت اور بے رحم تھا۔

استاد سے میرا تعلق ایسا تھا کہ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی انکار کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے وعدہ کر لیا کہ میں رات گیارہ بجے استاد کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

استاد کو رات بارہ بجے سے اپنا جاپ شروع کرنا تھا۔ میں موسم کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے ساتھ کمبل کے علاوہ ایک تھرماس میں چائے بھی بھر کے لے آیا تھا۔ استاد اور منوہر لال دونوں میرے انتظار میں تھے۔ اس موقع پر منوہر لال نے بہت ناگوار انداز سے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے یہ اچھا نہیں لگا ہوگا کہ میں استاد کے ساتھ جا رہا ہوں۔

استاد بھی چلنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں خدا جانے کیا بھرا ہوگا۔ منوہر لال نے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب جگت کیا سورماں بھیک سور پٹ۔ بھالا چھری سٹ کا لٹھ تھر کو باندھ سمندر ناش۔ اوش۔ اوش۔“

اس کا جواب استاد نے کچھ یوں دیا تھا۔ ”کرم گفتاری عزائم راسخ فرمان بے مہابا چراغ نور ہو رہا ہے۔“

میں اس کا مطلب شاید یہ سمجھا تھا کہ استاد کے عزائم راسخ ہیں اور وہ پلٹنے والے نہیں ہیں۔ میرے لیے مصیبت تھی کہ ایک طرف تو جن بول رہا تھا اور دوسری طرف ایک بھوت بول رہا تھا۔

خدا خدا کر کے چلنے کا وقت ہوا۔ میں نے چاہا کہ اس وقت بھی اگر جان چھڑا کر بھاگ سکتا ہوں تو بھاگ لوں۔ لیکن استاد نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”گر بند رہو۔ گر بند رہو۔ تجدید کامرانی مت کرو۔“

نہ جانے اس بات سے استاد کا کیا مطلب تھا۔

بہرحال میں اور استاد قبرستان پہنچ ہی گئے۔ میری تو حالت غیر ہو رہی تھی۔ رات کا وقت، قبرستان کا سناٹا۔ کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی منحوس آوازیں۔ اچھا خاصا جادوئی ماحول تھا۔

استاد نے شاید وہ جگہ پہلے سے دیکھ رکھی تھی جہاں بیٹھ کر انہیں جاپ کرنا تھا اس لیے وہ بڑی آسانی سے قبروں کے درمیان چلے جا رہے تھے جبکہ میں ان کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔

راستے میں کئی بار مجھے ٹھوکر بھی لگی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد استاد ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”اب تم یہیں براجمانِ خاطر رہو۔“ مطلب یہ تھا کہ میں وہیں کھڑا رہوں۔

استاد کے کہنے کے مطابق میں وہیں رک گیا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ استاد اپنے ساتھ ایک لالٹین بھی لے کر آئے تھے جسے اب تک روشن کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

استاد مجھے وہیں چھوڑ کر کچھ آگے چلے گئے اور وہاں جا کر اپنے سامنے لالٹین جلا دی۔ اس کی روشنی میں نظر آنے لگا

کہ استاد ایک درخت کے پاس کھڑے ہیں۔ وہاں تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔

استاد نے اپنا تھیلا کھولا اور اس میں سے کچھ سفوف سا نکال کر ایک دائرہ سا بنا لیا۔ شاید وہ اس طرح کوئی حصار قائم کر رہے تھے۔

میں بہت حیرت اور دلچسپی سے استاد کی یہ حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ استاد نے اس کے بعد لالٹین جلا لی اور آلتی پالتی مار کر یوگا کے انداز میں بیٹھ گئے۔ اس وقت تو خود مجھے استاد ہی کوئی بھوت وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔

استاد نے اس کے بعد اپنے تھیلے سے کچھ اگربتیاں نکالیں اور انہیں سلگا کر ایک طرف لگا دیا۔ اچھا خاصا جناتی ماحول ہوگیا تھا۔

پھر استاد نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ یہ شاید ان کا جاپ تھا۔ ''اگیا بتیاں نمسترن مرلی دھرن جھپک ہوشنگ آبادی، مرنجان مرنج بہ حال۔ فقیر ابن فقیر لٹیاؤ بودن۔ آمدن۔ کردن۔'' خدا جانے وہ کیا کیا بولتے جا رہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ استاد کی یہ اول جلول حرکت سوائے حماقت کے اور کچھ بھی نہیں تھیں۔ وہ خوامخواہ میرا اور اپنا وقت ضائع کر رہے تھے۔

لیکن اچانک اس وقت کچھ ہوا۔ کوئی اندھیرے سے نکل کر آہستہ آہستہ استاد کے حصار کے پاس آ رہا تھا۔ میں دم بخود اسے دیکھتا رہ گیا۔ سفید لباس میں کوئی استاد کے پاس آ رہا تھا اور جب اس پر لالٹین کی روشنی پڑی تو اندازہ ہوا کہ وہ تو کوئی عورت تھی جس کے جسم پر سفید لباس تھا۔

اتنی دور سے اس کا چہرہ تو دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جوان عورت ہے۔ استاد اسی طرح جھوم جھوم کر کچھ پڑھتے رہے جبکہ وہ عورت ان سے کچھ فاصلے پر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

استاد نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور مجھے آواز دی۔ ''حاضر کردن... فوراً۔''

میں بھی کچھ خوف زدہ سا جھجکتا ہوا استاد کے پاس پہنچ گیا۔ اب میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا، وہ ایک جوان اور خوش شکل عورت تھی۔

''اس نانہجار کو مبتلائے محل میں فقیراں کر دو۔'' استاد نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس عورت کے لیے کہا۔

وہ عورت اب کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی تھی کیونکہ اس نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ وہاں استاد کے علاوہ کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔

''اس بدنصیب کو خواہشِ طفلانِ غوغائے سگاں ب
استاد نے بتایا اور کیا بتایا یہ تو خدا ہی جانتا ہوگا۔

''اس وقت تو کچھ آسانی کرتے جاؤ استاد۔'' میں ب
بے بسی سے کہا۔ ''ورنہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''

''پہلے تو اس کو داخلِ دفترِ زنداں کرو۔'' استاد نے فرما
''قصرِ درویش و قلعہ آوارگان استاد محبوب نرالے عالم میں جل
افروز کر دو۔ پھر ہم بھی براجمان دل پذیر ہوتے ہیں۔''

یہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ استاد یہ کہہ رہے تھے کہ میں ا
عورت کو اپنے ساتھ ان کی اس جھونپڑی میں لے جاؤں ج
کو وہ محل کہا کرتے تھے... لیکن کیوں؟

میں نے دیکھا کہ اس عورت نے اٹھ کر بھاگنا چ
لیکن استاد اسی وقت دہاڑنے لگے۔ ''خبردار! اگر راہِ فر
اختیارشانہ کیا تو جلا کر چشمِ آہو کر دوں گا۔''

ظاہر ہے کہ اس بے چاری نے استاد کی یہ بات کہا
سمجھی ہوگی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ خوف زدہ ہو کر کھڑی رہ گئی
استاد نے پھر میری طرف دیکھا۔ ''جلدی سے پائے ماندن
جاؤ۔ لے جاؤ اس دل گرفتن کو۔ سوختن کو۔''

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا جو بُری طر
بوکھلائی ہوئی تھی۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' میں نے کہا۔ ''ور
استاد جلال میں آ گئے تو فارسی بول بول کر دماغ خراب کردی
گے۔''

میری یہ بات اس عورت نے سمجھ لی لیکن اس نے جھج
ہوئے پوچھا۔ ''مہاراج منوہر کہاں ہیں۔ میں تو ان سے
آئی تھی۔''

''منوہر فروکش خانہ غریب ہیں۔'' استاد دہاڑے۔
''میں ان کا عاجز شاگرد پیشہ ہوں۔''

''استاد یہ فرما رہے ہیں کہ مہاراج منوہر ابھی آرا
کر رہے ہیں اور یہ ان کے شاگرد ہیں۔ ان کو مہاراج منو
ہی نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔''

میں نے یہ بات اپنی طرف سے کہہ دی تھی۔ ور
میرے فرشتوں کو بھی حالات کا علم نہیں تھا۔ اس عورت
ایک نظر میری طرف دیکھا اور گردن جھکا کر میرے سا
ہولی۔

یہ پورا ڈراما میری سمجھ سے باہر تھا۔ استاد آخر کیا چا
تھے؟ کون تھی یہ عورت؟ یہ اتنی رات کو اکیلی قبرستان کی طر
کیوں آئی تھی؟

پھر استاد نے اسے اپنی جھونپڑی کی طرف جانے کے لیے کیوں کہا تھا؟ اس قسم کے بے شمار سوالا

تھے جن کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔ یہ بعد ہی میں پتا چل سکتا تھا۔

بہرحال میں اس عورت کو قبرستان سے استاد کی جھونپڑی میں لے آیا۔ پیدل ہی کا راستہ تھا۔ استاد کی جھونپڑی یا بقول ان کے محل میں کوئی دروازہ وغیرہ تو تھا نہیں کہ تالا پڑا رہتا۔ بس ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا رہتا تھا جس کو ہٹا کر ہم اندر آ گئے۔

استاد یہاں بھی ایک لالٹین جلتی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اب اس روشنی میں اس عورت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک قبول صورت جوان عورت تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

وہ عورت جھجکتی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو پوچھنا تھا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''شہناز۔'' اس نے بتایا۔

''ایسا کون سا کام پڑ گیا کہ تم اتنی رات کو قبرستان کی طرف گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے عامل بابا سے ملنا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن کیوں ملنا تھا؟''

''اولاد کے لیے۔'' اس نے دبی زبان سے بتایا۔ ''شادی کو تین سال ہو گئے ہیں لیکن کوئی امید نہیں ہے۔''

اب میں مزید کیا کہتا اور کیا پوچھتا۔

ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ استاد تشریف لے آئے۔ ان کو دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔

''استاد! یہ تمہارا کیس ہے۔ اب تم ہی اس کو سنبھالو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اب چلتا ہوں۔''

''نہیں، تمہیں گرہنہ نہیں ہونا ہے۔'' استاد جلدی سے بولے۔ ''ہلاکتیں وجہ سفامل ورافتاد خاتون خانہ ہونا ہے۔ اندازہ لگانا ہے بربنائے محل تاثرات یہ عورتیں کتنی چکیدہ اور آرمیدہ ہو جاتی ہیں۔''

اتنا سمجھ میں آیا تھا کہ استاد کو اس عورت پر غصہ آ رہا تھا۔

''خدا کے لیے استاد! ذرا آسان آسان بتا دیں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟''

''یہ ماجرائے دل پذیر و دستگیر ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''یہ فرموداتِ بے حساب ہے۔ یہ بدبخت کندہ فراش وغیرت چشم مخلوق تمنائے اولاد میں کشاں کشاں ناموس رسوائی بے جہاں ہونے جا رہی ہے۔''

اگست 2013ء ...... مہینا آزادی کا
اور شمارہ سسپنس کا ...... ایک دلکش جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

کاشف زبیر، سلیم انور
تنویر ریاض، منظر امام،
نجمہ مودی اور عائشہ فاطمہ
کی دلچسپ تحاریر آپ کی منتظر۔

تکمیل خواهش
ادھوری زندگی ...... ادھوری خواہشات کے سبب بعض اوقات خواب بھی
مکمل تعبیر نہیں پاتے ...... آخری صفحات پر **نشور هادی** کی نایاب تحریر

چاند سلطان
اڑتی دھول کے مانند وقت آتا اور گزر جاتا ہے ...... لیکن تاریخ کے آسمان
پر چند چہرے ہی جگمگاتے ہیں جیسے کہ چاند بی بی ...... ماضی کا ایک دلکش کردار
اور سنسنی خیز واقعات ...... **ڈاکٹر ساجد امجد** کی ایک اور یادگار تحریر

مسافر
روندی گئی اس دوشیزہ کا قصہ جس کے جذبات کو قدم قدم پر کچلا گیا ......
اور ایک بے خبر مسافر کا ساتھ ...... **ناصر ملک** کے قلم کی روانی

کشکول
انوار صدیقی کے قلم سے چونکا دینے والا سلسلہ جہاں حالات کی ستم ظریفیاں ایک اور ہی انداز میں زندگی رقم کر رہی ہیں

اس کے علاوہ
آپ کے خط ...... ملک صفدر حیات کی پراسرار تفتیش ...... محفلِ شعر و سخن

یہ تھا استاد کا آسان جملہ۔ جس سے میری سمجھ میں یہ آگیا تھا کہ استاد اس عورت پر اس لیے ناراض تھے کہ وہ اولاد کی تمنا میں اپنی عزت کو برباد کرنے جارہی تھی۔

”استاد! اگر ایسا ہے تو آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے لیکن یہ کہانی شروع سے اب تک سمجھ میں ہی نہیں آرہی ہے۔“

اس پر استاد نے پھر ایک تقریر فرما ڈالی جس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ اس عورت کو اولاد کی تمنا تھی اسی لیے وہ منوہر لال کے پاس پہنچ گئی تھی۔

ادھر استاد کو منوہر لال کی حرکتوں کے بارے میں پتا چل گیا تھا کہ وہ کس طرح سیدھی سادی عورتوں کو برباد کرتا پھر رہا ہے۔

استاد نے ایک پلاننگ کی۔ وہ منوہر لال کے شاگرد بن گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت پاپڑ بیلے اور بہت مشکلوں سے اس شخص کو اپنے قابو میں کیا۔

کچھ دنوں کے بعد اس شخص کو استاد پر اتنا بھروسا ہوگیا کہ اس نے استاد کو اپنے بہت سے راز بتا دیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شہناز نام کی ایک عورت پر منوہر لال کا دل آگیا ہے اور وہ اسے قبرستان بہانے سے بلا کر اس کی عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔

استاد یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے کسی طرح منوہر لال کو اس بات پر راضی کرلیا کہ اس کی جگہ وہ خود قبرستان چلے جائیں گے اور جب شہناز وہاں پہنچے گی تو وہ اسے منوہر لال کے پاس لے آئیں گے۔ اس کے ساتھ ہی استاد نے اس بات کی بھی اجازت لے لی تھی کہ وہ اپنے ایک ساتھی (یعنی مجھے) اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ منوہر لال نے یہ بات مان لی اور اس طرح استاد الٹا سیدھا جاپ کرنے کے لیے قبرستان پہنچ گئے جہاں شہناز آئی اور استاد نے اسے اپنی جھونپڑی میں بلوالیا۔

”اب تم اس ناتراشیدہ عورت کو نصیحت دلبراں کردو کہ وہ ایسی افتادگی اور افلاطونی میں نہ پڑے۔“ استاد نے مجھ سے کہا۔

مطلب صاف تھا۔ یعنی استاد یہ چاہتے تھے کہ میں اس عورت کو سمجھاؤں کہ وہ اس چکر میں نہ پڑے اور اولاد کے لیے خدا سے رجوع کرے۔ کسی عامل وغیرہ کے چکر میں نہ جائے۔

میں نے جب اپنے انداز سے اس عورت کو یہ بات سمجھائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے فرطِ عقیدت سے استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ آپ تو میرے لیے فرشتہ بن گئے۔ میں واقعی بہت بھول میں تھی۔ اولاد کے لیے نہ جانے کہاں کہاں چکر لگاتی پھر رہی تھی۔ صرف اپنے خدا ہی کی طرف نہیں گئی۔ آپ نے تو مجھے راستہ دکھا دیا ہے۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔“

”اب تم رفتن ماندن ہو جاؤ۔“ استاد نے کہا۔ ”اور ویسے بھی شب ماہ عروج خنداں ہونے لگا ہے۔“

مطلب یہ تھا کہ اب تم گھر جاؤ۔ ویسے ہی بہت رات ہوچکی ہے۔

وہ عورت استاد کی جان و مال کو ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ استاد اس وقت مجھے واقعی فرشتہ ہی دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب قسم کا نور پھیلا ہوا تھا۔

اس عورت کے جانے کے بعد میں نے استاد سے پوچھا۔ ”استاد! آج کے اس خاص موقع پر تو اس بدبخت منوہر لال کو خود ہی قبرستان جانا چاہیے تھا۔ اس نے تمہیں بھیجنے کا رسک کیوں لیا؟“

استاد ہنس پڑے۔ ”اس لیے کہ وہ سرچشمۂ عندلیب بیت الخلا ہو گیا تھا۔“

”کیا مطلب ہوا اس بات کا؟“

”مطلب یہ کہ وہ نابکارِ زمانہ اس وقت دردہائے عقیقہ اور امراضِ شکم میں لبریز ہو چکا ہے۔“

استاد کے بہت دیر تک بتانے کی کوشش کے بعد یہ پتا چلا تھا کہ استاد نے شام ہی کے وقت اس کم بخت کو جمال گوٹا گھول کر پلا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس قابل کہاں رہا تھا کہ اپنی آرزو پوری کرنے کے لیے کہیں جاسکتا۔

استاد کا یہ کارنامہ واقعی بہت زبردست تھا لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس عورت کو راہِ راست پر لانے کے لیے استاد کو اتنے جتن کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اس عورت کو سمجھا بھی سکتے تھے کہ اس عامل کے چکر میں نہ پڑے۔

اس کے لیے استاد کو خود جنتر منتر کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جب یہی بات استاد سے معلوم کی تو وہ مسکرا کر بولے۔ ”یہ تو پیشِ بندی روزگارِ زمانہ ہے۔ نہ جانے کب واقعی ضرورت طلب رسان صادق ہوجائے۔“

سمجھ گئے نا۔ یعنی استاد اس چکر میں تھے کہ ہو سکتا تھا کہ عامل کا سکھایا ہوا ہنر آگے چل کر ان کے کسی کام آجاتا اور وہ خود یہ دھندا شروع کردیتے۔

* * *

کفارہ

آصف ملک

وقت کی لہریں کتنی ہی طوفانی... پُرشور اور شوریدہ کیوں نہ ہوں... گزرنے کے باوجود اپنے نقش چھوڑ جاتی ہیں... تیس سال پہلے ہونے والے اس واقعے کی بازگشت... جو گونج بن کے ان انسانوں کے تعاقب میں تھی... جو ہر صورت مکافاتِ عمل کے حق دار ٹھہرتے تھے...

کاروباری لین دین... دیانت... امانت اور خیانت داری کے اسرار میں ڈوبی پرحقیقت کہانی...

شیخ عبدالجید صاحب نے پاکستان جانے کا اعلان کیا تو ان کے گھر میں یوں کھلبلی مچ گئی تھی جیسے شیخ صاحب نے پاکستان نہیں دنیا سے جانے کا اعلان کر دیا ہو۔ مسز شیخ نے بدحواس ہو کر اپنی دونوں شادی شدہ بیٹیوں کو کال کر دی۔ اس پر ان کی بہو نے بُرا سا منہ بنایا تھا۔ بے شک وہ ڈبلن، آئرلینڈ کے ایک خوب صورت اور شاندار قسم کے مکان میں رہتے تھے مگر ساس بہو اور نند بھاوج کے رشتے یونیورسل ہیں۔ شیخ صاحب تیس برس پہلے آئرلینڈ آئے تو وہ تارکینِ

وطن کی اساطیری داستانوں کے ہیروز کی طرح خالی جیب نہیں تھے۔ ان کے پاس پانچ ہزار پاؤنڈز کی خطیر رقم تھی۔ مگر وہ صرف پانچ ہزار پاؤنڈز لے کر سرزمینِ فرنگ پر نہیں آئے تھے بلکہ ان کے ساتھ مسز شیخ اور ان کی گود میں ایک سال کا عبدالحمید بھی تھا۔ مسز شیخ نے شیخ صاحب کو اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا اس لیے نہیں، انہیں شک تھا کہ شیخ صاحب وہاں جاتے ہی کسی فرنگن کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں گے بلکہ اس لیے کہ شیخ صاحب جو بکھیڑے پیچھے چھوڑ کر جا رہے تھے، ان سے وہ اکیلے کیسے نمٹتیں؟ اس لیے انہوں نے شیخ صاحب کو اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور مجبوراً شیخ صاحب کو انہیں بھی ساتھ لانا پڑا۔

شیخ صاحب اگرچہ لاہور کے رہنے والے تھے لیکن آبائی تعلق میرپور آزاد کشمیر سے تھا اس لیے جب میرپور منگلا ڈیم تلے آیا تو وہ بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی ترکِ وطن کیا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں انہوں نے بزنس کیا اور خاصے کامیاب رہے مگر پھر برا وقت آیا اور کچھ معاملات ایسے سامنے آئے جن کی وجہ سے انہوں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار پھر ترکِ وطن کیا جائے اور اس بار انہوں نے سرحد عبور کر لی۔ آئرلینڈ میں ان کے ایک دور کے رشتے دار تھے اور انہوں نے ابتدائی دور میں شیخ صاحب کو سہارا دیا اور ملازمت دلوائی۔ مگر ملازمت شیخ صاحب کی سرشت اور خون میں شامل نہیں تھی اس لیے ایک سال بعد انہوں نے کوشش کر کے اپنا چھوٹا سا اسٹور کھول لیا۔ آنے والے چند سال انہوں نے بہت محنت کی اور اس کا پھل بھی پایا۔ ان کا چھوٹا سا جنرل اسٹور دس سال میں بڑھ کر ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بدل گیا جس میں دو درجن افراد کام کرتے تھے اور اس کی روز کی سیل پچاس سے ساٹھ ہزار پاؤنڈز تھی۔

مسز شیخ سادہ سی خاتون تھیں یعنی سوائے شوہر کے سب کے لیے سادہ تھیں۔ ایک کامیاب مشرقی خاتون کی طرح انہوں نے صرف شیخ صاحب پر ساری توجہ مرکوز کی تھی اور صرف انہیں قابو میں رکھا اس لیے باقی سب خود بہ خود ان کے کنٹرول میں آگیا۔ بیٹے کو ساتھ لائی تھیں اور یہاں انہوں نے دو بیٹیوں کو جنم دیا اور شیخ صاحب کا گھر مکمل کر دیا۔ جواب میں شیخ صاحب نے پہلے انہیں دو بیڈروم کا فلیٹ اور پھر یہ دو منزلہ مکان لے کر دیا۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ عبدالحمید نے بزنس میں ماسٹرز کیا۔ دونوں بیٹیاں بھی پڑھی لکھی تھیں اور کیونکہ اس دوران میں شیخ اور مسز شیخ یہاں پاکستانی حلقے میں اپنی جان پہچان بنا چکے تھے اس لیے انہیں بیٹیوں کے مناسب رشتے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بڑی بیٹی ارسا کی شادی ایک آٹو موبائل انجینئر ریاض الدین سے ہوئی جبکہ دوسری بیٹی ارہا کا شوہر مبشر رز شیخ صاحب کے اسٹور میں بہ طور منیجر کام کرتا تھا۔ جب ار نے اسے پسند کیا تو وہ اسسٹنٹ منیجر تھا۔

پاکستان سے آنے کے بعد شیخ صاحب نے واپس جانے کا نام بھی نہیں لیا اور نہ ہی مسز شیخ کی ایسی کوئی خواہش تھی۔ دونوں کا کوئی خاص رشتے دار بھی نہیں تھا۔ شیخ صاحب کی ایک بہن تھی لیکن ان کے ترکِ وطن کے کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ یوں ان کا واحد خون کا رشتہ بھی دنیا میں نہ رہا۔ بہن کے بچے بھی نہیں تھے۔ لیکن واپس نہ جانے کی اصل وجہ وہی معاملات تھے جن کی وجہ سے وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ بچے جب ذرا سمجھ دار ہوئے تو انہیں اپنے آبائی وطن کے بارے میں تجسس ہوا۔ شیخ صاحب بچوں کو حتی الامکان پاکستان کی اچھی تصویر دکھاتے تھے۔ شروع میں ان کی باتوں کی تردید کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کا ملنا جلنا پاکستانیوں سے تھا اور میڈیا کو پاکستان سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مقامی لوگ جب پاکستان کے بارے میں بات کرتے تو اس کا حوالہ انڈیا ہوتا تھا کہ وہی ملک نا جو انڈیا کے برابر میں صرف اس لیے ہے کہ اس سے جنگ کر سکے۔

مگر پھر حالات بدلے، بچے زیادہ بڑے اور زیادہ سمجھ دار ہو گئے۔ میڈیا اور مقامی لوگوں کی معلومات بھی بہتر ہوئی تھی۔ ان بدلتے حالات میں اگر بچوں کے دل کے کسی کونے کھدرے میں آبائی وطن دیکھنے کی خواہش بھی تھی تو انہوں نے اسے نکال کر دور پھینک دیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ کسی بری خبر پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ اس خبر کا حصہ نہیں ہیں کیونکہ وہ ہزاروں میل دور آئرلینڈ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس لیے جب شیخ صاحب نے اچانک اعلان کیا کہ وہ پاکستان جائیں گے تو گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ اعلان انہوں نے ناشتے کی میز پر کیا تھا۔ بہو روبینہ کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھوٹ گیا اور عبدالحمید کو اچھو لگ گیا تھا۔ البتہ مسز شیخ کو اپنے کانوں پر شبہ ہوا تھا کیونکہ کچھ عرصے سے انہیں ذرا اونچا سنائی دینے لگا تھا۔ انہوں نے پہلے گلاس توڑنے پر بہو کو گھورا اور پھر شیخ صاحب سے تصدیق چاہی۔ ”کیا... کیا کہا آپ نے؟“

”وہی جو آپ نے سنا۔“ شیخ صاحب بولے۔ ”میں پاکستان جانے کا سوچ رہا ہوں۔“

اگر شیخ صاحب اعلان کرتے کہ وہ فوت ہونے کا سوچ

رہے ہیں تب بھی ان کے گھر والے اتنے پریشان نہ ہوتے کیونکہ ایک نہ ایک دن سب کو اس دنیا سے جانا ہے مگر سب کا پاکستان جانا بہرحال ضروری نہیں تھا۔ عبدالحمید نے اپنی کھانسی پر قابو پایا اور بولا۔ ”پاپا یہ بالکل مناسب نہیں ہے۔“

”بالکل پاپا۔“ روبینہ نے شوہر کی تائید کی۔ ”آپ خود سوچیں پاکستان جانا کس قدر رسکی ہے۔ آج کل تو لوگ وہاں سے نکل کر بھاگ رہے ہیں اور آپ وہاں جانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”نہیں اب پاکستان بدل رہا ہے۔“ شیخ صاحب نے ایسی دلیل دی جس پر انہیں خود بھی یقین نہیں تھا۔ ”نئی حکومت آئی ہے اور مجھے یقین ہے وہ حالات کو بہتر کرے گی۔“

”ٹھیک ہے جب وہ حالات کو بہتر کر لے تو آپ چلے جائیے گا۔“ عبدالحمید نے کہا۔ ”مگر موجودہ حالات میں وہاں جانا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔“

مگر شیخ صاحب کچھ اور سوچ رہے تھے اور یہ سب وہ اپنی اولاد سے شیئر نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہوں نے کبھی انہیں بتایا ہی نہیں تھا۔ ان کے خاموش ہونے پر مسز شیخ کھٹک گئیں اور انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ ناشتے کے بعد روبینہ، عبدالحمید کے ساتھ چلی گئی۔ عبدالحمید بھی شیخ صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا اور اسے ہی بعد میں یہ بزنس دیکھنا تھا اس لیے اس نے قبل از وقت ہی عملی طور پر سب سنبھال لیا تھا مگر شیخ صاحب کی سپرویژن برقرار تھی اور وہ باقاعدگی سے آٹھ سے نو گھنٹے اسٹور میں رہتے تھے۔ ان کے پاس تعلیم نہیں تھی لیکن عملی تجربہ وسیع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چار سال سے اسٹور میں کام کرنے کے باوجود اکثر عبدالحمید کو ان کی رہنمائی کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ روبینہ امید سے تھی اور اسے ہر ہفتے چیک اپ کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اس کی اور عبدالحمید کی شادی کو تین سال ہوئے تھے اور اب اللہ نے انہیں خوشخبری دی تھی۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا اس لیے مسز شیخ نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے شیخ صاحب کو پکڑ لیا۔

”سچ بتائیں آپ نے یہ بات کیوں کی؟“

شیخ صاحب بیوی سے کچھ نہیں چھپاتے تھے، چھپا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس دنیا میں وہی ایک ایسی ہستی تھیں جن پر شیخ صاحب اپنی ذات کی طرح اعتماد کرتے تھے۔ بیوی کے سوال پر انہوں نے گہری سانس لی۔ ”ماہ نور، تم جانتی ہو میں نے یہاں کیسی زندگی گزاری ہے۔ کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ کبھی ایک پاؤنڈ کا ٹیکس چوری نہیں کیا۔ کبھی غلط جگہ گاڑی پارک نہیں کی، کبھی سگنل نہیں توڑا، کبھی لوگوں سے جھوٹ بول کر ان کو دھوکا نہیں دیا۔ کاروبار میں بھی ہمیشہ دیانت کو مقدم رکھا۔“

”آپ نے ایسا کیا کیونکہ آپ اندر سے اچھے انسان ہیں۔“ مسز شیخ نے اپنے طور پر توجیہہ پیش کی۔

”تب میں نے اپنے ملک میں ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہاں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب میں قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا۔ جھوٹ بولتا تھا اور لوگوں کو بے دھڑک دھوکا دیتا تھا۔“

”وہاں آپ مجبور تھے کیونکہ وہاں کا کلچر ہی ایسا ہے۔ اگر انسان یہ سب نہ بھی کرے تب بھی لوگ اسے جھوٹا، دھوکے باز اور چور ہی سمجھتے ہیں۔ وہاں آدمی ایمان داری سے کام کرے تو اس کی تعریف کرنے کے بجائے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔“

مسز شیخ درست کہہ رہی تھیں لیکن شیخ صاحب مطمئن نہیں ہوئے۔ ”اگر میں اندر سے اچھا تھا تو مجھے وہاں بھی انہی اخلاقی اُصولوں پر عمل کرنا چاہیے تھا جن پر میں یہاں عمل کرتا ہوں۔“

”آدمی جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں کی اقدار کو اپناتا ہے یہاں کی اقدار بھی یہی ہے۔“

شیخ صاحب مسکرائے۔ ”اب تم اپنے کہے سے پھر رہی ہو، پھر میں اندر سے اچھا آدمی کہاں ہوا؟“

مسز شیخ زچ ہونے لگیں۔ ”پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟“

شیخ صاحب نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ”دیکھو ماضی میں جو کرتا رہا ہوں، اس کا ازالہ تو ممکن نہیں ہے لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں جن کا ازالہ کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے ہم وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔“

”نہیں۔“ مسز شیخ سہم گئیں۔ ”اگر آپ نے ان معاملات کو چھیڑا تو آپ مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

”نہیں حالات بدل گئے ہیں۔ مجھے امید ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔ دیکھو میرے سینے پر یہ بوجھ ہے، میں چاہتا ہوں کہ عمر کے اس حصے میں یہ بوجھ اتار دوں کیونکہ میں اس بوجھ کے ساتھ مرنا نہیں چاہتا۔“

مسز شیخ مزید پریشان ہو گئیں۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو ابھی آپ کی عمر ستاون برس ہے۔ اتنی اچھی صحت ہے، ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

”صحت اچھی ہے لیکن وہ عمر تو آ گئی ہے جس میں انسان دنیا سے گزر جاتا ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے اس موضوع پر رات میں بات کریں گے۔“

شیخ صاحب روانہ ہوئے تو مسز شیخ نے سب سے پہلے بیٹیوں کو فون کیا۔ ارسا اور ارہا دونوں نزدیک ہی رہتی تھیں۔

عبدالحمید روبینہ کو چیک کرا کے گھر چھوڑ گیا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ دونوں نندیں آنے والی ہیں تو وہ آرام کا کہہ کر اوپر اپنے حصے میں چلی گئی۔ اوپر دو بیڈ رومز، ایک چھوٹا لاؤنج تھا جبکہ نیچے دو بیڈ رومز کے ساتھ لاؤنج ڈائننگ روم اور ایک بڑی نشست گاہ بھی تھی۔ شادی کے بعد شیخ صاحب نے اوپر کا حصہ بیٹے اور بہو کے سپرد کر دیا تھا۔ البتہ کچن ایک ہی تھا۔ صبح کا ناشتا مسز شیخ بناتی تھیں اور دوپہر کا کھانا روبینہ کی ذمے داری تھی جبکہ رات کا کھانا دونوں مل کر بناتی تھیں۔ روبینہ کے ردِعمل پر مسز شیخ نے برا سا منہ بنایا لیکن پھر بیٹیوں کے آنے کے خیال سے مگن ہو گئیں۔ اگرچہ عبدالحمید اکلوتا بیٹا تھا لیکن انہیں بیٹیوں سے زیادہ ہی محبت تھی۔

شام کو شیخ صاحب گھر آئے تو کچھ زیادہ ہی رونق تھی۔ ارسا اور ارہا کے بچے بھی آ گئے تھے۔ روبینہ نیچے آ گئی تھی اور اس وقت سب خوشگوار موڈ میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد سب نے شیخ صاحب کے گرد گھیرا ڈالا۔ بیوی، بیٹے اور بہو کے بعد بیٹیوں اور دامادوں نے بھی مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔ مبشر نے ڈرایا۔ ”پاپا وہاں جانے والے اغوا ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے گھر والوں سے تاوان لیا جاتا ہے۔“

”گلیوں اور سڑکوں پر سرِعام ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔“ ریاض نے اپنے ہم زلف کی تائید کی اور ایسا موقع کم آتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی کسی بات کی تائید کریں۔ ریاض کو گلہ تھا کہ اس سے کم تعلیم یافتہ مبشر صرف اس وجہ سے زیادہ کما رہا تھا کہ وہ سسر کے اسٹور میں منیجر تھا۔

”میں کسی کو بتا کر نہیں جاؤں گا اور نہ ہی وہاں گلیوں اور سڑکوں پر ٹہلوں گا۔“ شیخ صاحب نے انہیں اطمینان دلایا۔

”تب کیوں جا رہے ہیں؟“ عبدالحمید بے چین ہو گیا۔ دامادوں کی نمائشی فکرمندی کے مقابلے میں اس کی پریشانی حقیقی تھی۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔

”بس بیٹا تیس برس ہو گئے وطن کو دیکھے۔ اب بڑھاپا ہے کسی وقت بھی اوپر سے بلاوا آ سکتا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ایک بار اس سرزمین کو دیکھ لوں جہاں سے میرا خمیر اٹھا ہے۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ان کے لہجے میں جو فیصلہ کن عنصر تھا اس سے سب کو اندازہ ہوا کہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں اور ان کی بات نہیں مانیں گے۔ ”اب تک میں بہت ساری وجوہات کی بنا پر دل مار کر رہ جاتا تھا۔ تم لوگ تھے، بزنس تھا اور گھر تھا سب مجھے دیکھنا پڑتا تھا۔ اب ماشاءاللہ تم سب اپنے اپنے گھر کے ہو چکے ہو۔ بزنس بھی دیکھ رہے، اور گھر بھی دیکھ سکتے ہو اس لیے میں جا سکتا ہوں۔“

اس بار سب نے واجبی سی کوشش کی اور پھر شیخ صاحب کے فیصلے پر مہرِ رضامندی ثبت کر دی۔ البتہ بیٹے اور بیٹیوں نے انہیں پابند کر دیا کہ وہ دن میں دو بار لازمی کال کریں گے۔ تاکہ وہ ان کی طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ شیخ صاحب نے سکون کا سانس لیا۔ بیوی کو وہ پہلے ہی منا چکے تھے اور اب بچے بھی مان گئے تھے۔ انہوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

☆☆☆

شیخ صاحب نے میرپور سے لاہور آنے کے بعد پہلے ایک دکان میں ملازمت کی تھی۔ اس وقت ان کی شادی کو صرف ایک سال گزرا تھا۔ شادی کے وقت وہ انیس برس کے تھے اور مسز شیخ ان سے تین برس چھوٹی تھیں۔ ماہ نور کے والدین اس وقت ایک ایک کر کے گزر گئے جب ان کی عمر دس برس تھی۔ رشتے کی ایک پھپھی نے ان کی پرورش کی اور جیسے ہی انہوں نے میٹرک کیا تھا ان کی شادی کر کے اس ذمے داری سے جان چھڑا لی۔ اتفاق سے شیخ صاحب کا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ زمین کا کچھ پیسہ ملا تھا اور نزدیک ایک گاؤں میں زمین ملی تھی۔ وہ انٹر پاس تھے اور آگے بڑھنا چاہتے تھے اور اس پسماندہ علاقے میں آگے بڑھنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ اس لیے شادی کے بعد شیخ صاحب نے اپنے حصے میں ملنے والی زمین بھی بیچی اور لاہور چلے آئے۔ ان کے پاس رقم تھی لیکن کاروبار کا تجربہ نہیں تھا اس لیے پہلے انہوں نے ملازمت کا سوچا۔ ان کے ایک جاننے والے کی مال روڈ پر الیکٹرانکس کے سامان کی دکان تھی۔ اس نے شیخ صاحب کو ملازم رکھ لیا۔ رہائش کے لیے انہوں نے سنت نگر کی ایک عمارت کی آخری منزل پر بنا کمرا کرائے پر لے لیا۔

ایک سال بعد شیخ صاحب نے ایک چھوٹی دکان کرائے پر لے کر اس میں پنکھوں اور روم کولرز کی فروخت شروع کر دی۔ انہیں گجرات کی ایک کمپنی کی ڈیلر شپ مل گئی تھی۔ مزید دو سال بعد انہوں نے کاروبار ایک بڑی دکان میں منتقل کر لیا لیکن جس دکان میں وہ آئے تھے اس کے ساتھ مسئلہ تھا۔ یہ جگہ قبضے کی تھی۔ اس کا اصل مالک لاپتا تھا اور ایک پہلوان اعظم بٹ نے اس پر قبضہ کر کے آگے کرائے پر دینا شروع کر دیا تھا۔ شیخ صاحب سے اس کی اچھی سلام دعا ہو گئی تھی اس لیے دکان مروجہ کرائے سے کم پر مل گئی۔ مگر کوئی لکھت پڑھت نہیں ہوئی تھی اور پہلوان کرائے کی رسید تک

نہیں دیتا تھا۔ البتہ اس نے بیعانہ پورے سال کا لے لیا تھا۔ مگر شیخ صاحب نقصان میں نہیں رہے تھے۔ جگہ زیادہ ملی تو انہوں نے زیادہ مال ڈال لیا اور زیادہ مال کی وجہ سے دگنا ڈسکاؤنٹ ملنے لگا۔ گاہک بندھ گئے تھے اس لیے ترقی ہونے میں دیر نہیں لگی۔

دو سال گزرے تھے کہ پہلوان ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ دوسری پارٹی بھی قبضہ گروپ تھی اور تنازعے میں پہلوان سمیت کئی افراد کی جان گئی تھی باقی افراد کو پولیس سمیٹ کر لے گئی اور علاقے کے لوگوں نے اس وقت تک کے لیے سکون کا سانس لیا جب تک کوئی دوسرا قبضہ گروپ نہ آ جاتا۔ شیخ صاحب کچھ عرصے تک انتظار کرتے رہے کہ دکان کا کوئی دعوے دار سامنے آئے لیکن جب کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی کوئی دعوے دار سامنے نہیں آیا تو انہوں نے کوشش کر کے دکان کے ملکیتی کاغذات اپنے نام سے بنوا لیے۔ کاغذات جعلی تھے لیکن جب تک رجسٹرار آفس سے تصدیق نہ کی جاتی کوئی انہیں جعلی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ایسا انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کیا تھا کہ کوئی اور جعلی دعوے دار آ کر دکان خالی نہ کرا لے۔ انہوں نے پہلوان کے دیے بیعانے کو دکان کا معاوضہ فرض کر لیا تھا حالانکہ بیعانہ صرف دس ہزار تھا اور اس وقت بھی دکان کی مالیت لاکھوں میں تھی مگر شیخ صاحب نے خود کو تسلی دی تھی کہ انہوں نے کسی کا حق نہیں مارا ہے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اصل مالک اصل کاغذات کے ساتھ آ گیا تو وہ دکان اس کے حوالے کر دیں گے۔

اپنا کاروبار شروع کرنے کے بعد جب مالی آسودگی آئی تو انہوں نے ایک اچھا مکان کرائے پر لے لیا۔ مسز شیخ خوش تھیں کیونکہ اب تک وہ صبر شکر کے ساتھ تنگی میں گزارا کرتی آئی تھیں۔ شیخ صاحب چاہتے تو کوئی چھوٹا موٹا مکان بھی لے سکتے تھے لیکن وہ کاروبار کے لیے نقد رقم ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ فیصلہ دکان کے کاغذات بنواتے ہوئے کام آیا کیونکہ اس میں اچھی خاصی رقم لگ گئی تھی۔ مگر اب وہ کرائے کی فکر سے آزاد ہو گئے تھے مگر یہ بے فکری زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی۔ وہ جس کمپنی کے ڈیلر تھے اس نے اچانک ہی کمیشن کم کر دیا۔ ملکی سطح پر اس کا نام چل نکلا تھا اور اب اسے ڈیلرز کو بڑا کمیشن دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ شیخ صاحب کو اس فیصلے سے دھچکا لگا۔ آمدنی اچانک نصف رہ گئی اور اخراجات اتنے ہی تھے۔ کرایہ نہیں تھا مگر اس سے زیادہ بجلی کا بل بن جاتا تھا اور پھر دو ملازم بھی تھے۔

شیخ صاحب نے ڈیلر شپ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ایک دوسری کمپنی سے بات کی۔ یہ زیادہ مقبول برانڈ نیم تھا اور کمیشن بھی معقول دے رہے تھے لیکن وہ ڈیلر شپ کے لیے دس لاکھ روپے مانگ رہے تھے۔ شیخ صاحب کا کل اثاثہ اس سے نصف سے بھی کم تھا۔ وہ سب فروخت کر دیتے تب بھی پانچ لاکھ جمع نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پریشان ہو گئے تھے۔ اگر ڈیلر شپ نہیں ملتی تو وہ ایک عام دکاندار بن کر رہ جاتے۔ یہ بات شیخ صاحب کو گوارا نہیں تھی بے شک مارکیٹ میں بہت سے.... عام جنرل الیکٹرانکس بیچنے والوں کی سیل ان سے زیادہ تھی لیکن وہ ڈیلر تھے اور اس مرتبے سے گرنا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے قسمت نے ساتھ دیا تھا برائے نام ادائیگی پر انہیں ڈیلر شپ مل گئی تھی مگر اب کمپنیاں زیادہ ہوشیار ہو گئی تھیں وہ ڈیلر شپ سے بھی کمانا چاہتی تھیں۔ درمیانی عرصے میں ڈیلرز نے خود تو خوب کمایا لیکن کمپنیوں کو پوری رقم ادا نہیں کی۔ کوئی کمپنی زیادہ اصرار کرتی تو ڈیلرز کمپنی بدل دیتے تھے اس لیے اب کمپنیوں نے سختی کر دی تھی۔ وہ ڈیلرز سے رقم وصول کرتی تھیں اور ہر ڈیلر کو اس کی لگائی رقم کے حساب سے سامان مہیا کیا جاتا تھا۔

اگرچہ شیخ صاحب نے ہمیشہ وقت پر ادائیگی کی تھی لیکن وہ بھی کمپنی کی اس سختی کی لپیٹ میں آ گئے۔ وہ مشکل میں پڑ گئے تھے۔ ان کا ایک نزدیکی بینک میں اکاؤنٹ تھا اس زمانے میں بینک سارے سرکاری ہوتے تھے اور نجی بنکاری کا رواج نہیں تھا۔ ایک دن شیخ صاحب کو خیال آیا اور انہوں نے اپنے بنک منیجر فضل اللہ سے قرض کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں اس نے شیخ صاحب کے اثاثوں کی تفصیل مانگی اور شیخ صاحب نے جو اثاثے بتائے اس پر اس نے کہا۔ ”ان اثاثوں پر تو آپ کو دو لاکھ کا قرض بھی مشکل سے ملے گا۔“

”تب میں کیا کروں، میرے پاس ایک دکان ہے؟“

”دکان ہے۔“ منیجر فضل اللہ چونکا۔ ”اس کا تو بتایا نہیں۔“

شیخ صاحب سوچ میں پڑ گئے کیونکہ دکان کے کاغذات جعلی تھے اور اگر بینک قرض کے لیے ان کی تصدیق کراتا تو ان کا پول کھل جاتا۔ منیجر نے دوبارہ پوچھا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”اس میں کچھ مسئلہ ہے۔“

”کاغذات کا۔“ فضل اللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ڈریں مت شیخ صاحب ہم آئے دن ایسے معاملات دیکھتے ہیں۔ آپ کی دکان مال روڈ پر ہے اس کی مالیت لاکھوں میں ہوگی۔“

شیخ صاحب کو حوصلہ ہوا اور انہوں نے کھل کر کہا۔ ”اگر کاغذات میں مسئلہ نہ ہو تو پندرہ لاکھ تو ہوگی۔“

"اس سے کام بن سکتا ہے۔" فضل اللہ نے کہا۔ "ایسا کریں مجھے شام کو کہیں ملیں یہاں ایسی باتیں مناسب نہیں ہیں۔"

شیخ صاحب شام کو منیجر سے ایک ریستوران میں ملے۔ فضل اللہ نے اس ملاقات میں ان سے معاملہ طے کر لیا۔ طے پایا کہ وہ دکان کے عوض بارہ لاکھ روپے کا قرض لیں گے اور یہ قرض انہیں پانچ سال میں اتارنا تھا۔ سالانہ سود الگ سے دینا تھا۔ بارہ میں سے دو لاکھ روپے فضل اللہ کے تھے اور شیخ صاحب کو دس لاکھ ہی ملتے۔ شیخ صاحب مان گئے کیونکہ ان کی جیب سے فی الحال کچھ نہیں جا رہا تھا۔ دو لاکھ روپے کے عوض فضل اللہ نے ضمانت لے لی کہ کاغذات کی تصدیق نہیں کرائی جائے گی اور انہیں قرض مل جائے گا۔ قرض واقعی مل گیا اور فضل اللہ نے اپنے دو لاکھ اسی وقت وصول کر لیے تھے۔ شیخ صاحب نے فوری طور پر دوسری کمپنی کی ڈیلر شپ لے لی۔ ان کا نفع پھر سے بڑھ گیا تھا۔ اضافی آمدنی سے وہ قرض کی رقم ادا کرنے لگے۔ اس معاملے میں وہ پختہ تھے کہ بینک کا قرض ادا کرنا ہے۔

یہ شیخ صاحب کی زندگی کا خوشگوار دور تھا۔ ان ہی دنوں وہ پہلی بار باپ بنے تھے۔ اس سے پہلے کئی بار خوشخبری آتے آتے رہ گئی تھی۔ اس بار اللہ نے خوشی مکمل کی اور انہیں بیٹے سے نوازا۔ شیخ صاحب پہلی بار کام پر جاتے ہوئے اتنے خوش اور پُرجوش نہیں ہوتے تھے۔ ان کا ننھے عبدالحمید کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ شام کو بھی وہ جلدی دکان سے جانے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔ ملازم دونوں اعتماد کے تھے اور پھر آئیٹم ایسے تھے جن میں ہیرا پھیری کا امکان نہیں تھا اس لیے شیخ صاحب بعض اوقات پانچ بجے بھی اٹھ جاتے تھے۔ اس شام بھی وہ اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک عورت ایک اپ ٹو ڈیٹ قسم کے نوجوان کے ساتھ دکان میں داخل ہوئی۔ شیخ صاحب سمجھے کہ عورت اور نوجوان کچھ لینے آئے ہیں، انہوں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ مگر عورت اور نوجوان کے تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ نوجوان نے کسی قدر بدتمیزی سے پوچھا۔

"اس دکان کا مالک کون ہے؟"

شیخ صاحب کا ماتھا ٹھنکا لیکن انہوں نے تحمل سے جواب دیا۔ "میں ہوں، آپ کون ہیں؟"

نوجوان آگے آیا اور شیخ صاحب کے عین سامنے چہرہ لا کر بولا۔ "مجھے غور سے دیکھو، میں شاہنواز ملک ہوں، اس دکان کا اصل مالک۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" شیخ صاحب بولے نوجوان لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس پر شیخ صاحب کے دونوں ملازم بھی آ گئے۔ عورت نے بہ مشکل اسے پیچھے کیا اور شیخ صاحب سے بولی۔

"میں مسز رب نواز ملک ہوں اور یہ میرا بیٹا شاہنواز ہے۔ یہ دکان میرے شوہر کی تھی پھر ہم امریکا شفٹ ہو گئے۔ وہاں ملک صاحب جاب میں لگ گئے اور اس دکان کو بھول گئے لیکن اب ہم آئے ہیں اور ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ یہاں قبضہ کر کے بیٹھے ہیں اس سے پہلے یہاں کسی اعظم بٹ کا قبضہ تھا جو قتل ہو گیا۔"

"ماما اگر اس نے شرافت سے دکان خالی نہ کی تو ایک قتل اور ہو گا۔" شاہنواز نے خطرناک لہجے میں کہا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ امریکا میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہے۔ اس وقت وہ کسی جاگیردار کی بگڑی ہوئی اولاد لگ رہا تھا مگر اس کی ماں معقول عورت تھی۔ اس نے پھر بیٹے کو ڈانٹ کر خاموش کرایا۔

"شیخ صاحب، ممکن ہے اس میں آپ کا قصور نہ ہو اور یہ کام بھی اعظم بٹ کا ہو لیکن یہ حقیقت ہے یہ دکان میرے شوہر کی ملکیت ہے اور ہمارے پاس اس کے مکمل کاغذات ہیں رجسٹرار آفس میں۔ یہ میرے شوہر کے نام پر ہے اور ہم نے وہاں اسے اس کی تصدیق کرالی ہے۔ میرا بیٹا تو کورٹ میں جانے پر اصرار کر رہا ہے لیکن میں آپ کو ایک موقع دینے آئی ہوں۔ آپ دکان خالی کر دیں اور اکارڈنگ ٹو مارکیٹ اینڈ لا دکان کا بیس سال کا کرایہ ادا کر دیں تو بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے آپ یہیں اپنا کاروبار کرتے رہیں۔"

ابتدائی دھچکے کے بعد شیخ صاحب اب خود کو سنبھال چکے تھے۔ انہوں نے مسز رب نواز سے کہا۔ "خاتون میں آپ کی عزت کرتا ہوں لیکن یہ دکان میں نے اعظم بٹ سے خریدی ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی رجسٹری کرائی تھی؟"

"کیوں نہیں؟" شیخ صاحب نے اعتماد سے کہا۔

"وہ رجسٹری مجھے دکھا سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے آپ کو اس کا حق نہیں ہے لیکن میں پھر بھی کل آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں لیکن مہربانی کر کے آئندہ دکان پر مت آیئے گا۔"

"یہ تمہاری دکان نہیں ہے؟" شاہنواز غرایا۔

مسز رب نواز نے کہا۔ "ٹھیک ہے مجھے بھی اس طرح آنا اچھا نہیں لگا ہے ہم کہیں اور ملاقات کر لیتے ہیں آپ میرے گھر آ جائیں ڈیفنس میں ....."

"میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔" شیخ صاحب نے انکار کیا۔ "کہیں باہر مناسب رہے گا۔"

مسز رب نواز نے ایک پوش ریستوران کا کہا اور رخصت ہو گئیں۔ ساتھ ہی شیخ صاحب کا اطمینان اور سکون بھی رخصت ہو گیا تھا۔ وہ دنیا دیکھ چکے تھے اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر معاملہ عدالت میں گیا تو ان کے ساتھ کیا ہو گا۔ فیصلہ تو جب ہو گا تب ہو گا لیکن اس سے پہلے عدالتوں کے چکر لگا لگا کر ان کا اور کاروبار دونوں کا حشر ہو جائے گا۔ دوسرے مسز رب نواز اور ان کا برخوردار باتوں سے بڑی پارٹی لگ رہے تھے اور ان کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔ دکان ان کے ہاتھ سے جاتی اور ساتھ ہی انہیں بیس برس کا کرایہ اور مقدمے کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے نہ کرنے کی صورت میں جیل جانے کا امکان تھا۔ لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک بات بینک کا قرض تھا۔ یہ معاملہ سامنے آ جاتا تو یہ پول کھلتے ہی کہ انہوں نے جعلی ملکیتی کاغذات کی مدد سے بینک سے قرض لیا تھا ان پر کئی مقدمے بن جاتے اور جب تک ان مقدمات کا فیصلہ ہوتا ان کے کئی سال جیل میں گزر چکے ہوتے۔

گھر جاتے ہوئے یہ سب باتیں ان کے ذہن میں گردش کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ اپنے ایک واقف کار وکیل سے مشورہ کر لیں۔ رات کے کھانے کے بعد وہ مسز شیخ کو بتائے بغیر روانہ ہوئے۔ وکیل پاس ہی رہتا تھا اور شیخ صاحب کی اس سے اچھی سلام دعا تھی۔ اگرچہ شیخ صاحب نے کبھی اس معاملے پر بات نہیں کی تھی اس لیے وہ ہچکچائے لیکن پھر ہمت کر کے بات کر لی اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ وکیل گھاگ آدمی تھا اس کی عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ اس نے شیخ صاحب کو مشورہ دیا۔ "اگر مقدمہ لڑ سکتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ پارٹی سے کسی بھی طرح صلح کر لیں۔ جو عدالت میں خرچ ہونا ہے وہ ان کو دے کر جان چھڑا لیں۔ کورٹ کچہری آپ کے لیے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

خود شیخ صاحب کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ وہ عدالت میں مقدمہ نہ بھی ہارتے تب بھی ان کا کاروبار تباہ ہو جاتا۔ لیکن اگر صلح کرتے تب بھی ان کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا۔ سب سے اہم معاملہ قرض کا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے نمٹیں۔ ابھی تو قسط ادا کرتے ایک سال گزرا تھا اور ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ باقی بھی ادا کر کے بینک میں رکھے کاغذات حاصل کر سکتے۔ بہرحال وہ اگلے روز دکان کے جعلی کاغذات کی کاپی کے ہمراہ مسز رب نواز اور شاہنواز سے اس ریستوران میں ملے۔ باہر ان کی سیاہ چمچماتی پجارو کھڑی تھی جو اس زمانے میں نئی نئی آئی تھی اور اسٹیٹس سمبل سمجھی جاتی تھی۔ مسز رب نواز نے ان کے سامنے دکان کی اصل فائل رکھی۔ ساتھ میں رجسٹرار آفس کا تصدیق نامہ بھی تھا۔ اگرچہ یہ سب بھی جعلی ہو سکتا تھا لیکن جعلی چیزوں کے پیچھے اتنے اصلی چہرے نہیں ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مسز رب نواز اور اس کے بیٹے کے تھے۔ آج شاہنواز حد میں تھا لیکن کبھی کبھی اس کے جذبات چھلک جاتے تھے۔ مسز رب نواز کو اسے تنبیہ کرنا پڑتی تھی۔ شیخ صاحب نے ان کی فائل اور کاغذات دیکھنے کے بعد کہا۔

"دیکھئے میں آپ کو غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن یہ دکان میں نے لی ہے اور اس پر میرا خرچا بھی ہوا ہے۔ اس لیے آپ کی طرف سے کرایہ لینا مجھے اضافی پڑے گا۔"

"کرایہ تو دینا ہو گا۔" شاہنواز نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "بیس سال کا تقریباً دس لاکھ بنتا ہے۔"

"دس لاکھ۔" شیخ صاحب کے ہوش اڑ گئے۔

"جی شیخ صاحب۔" مسز رب نواز نے کہا۔

"میں کسی صورت اتنی رقم نہیں دے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اس صورت میں ہم عدالت جائیں گے اور وہاں تمہیں صرف دکان اور کاروبار سے ہاتھ دھونا نہیں پڑیں گے بلکہ جیل بھی جاؤ گے۔"

شاہنواز کی دھمکی بھی کم خطرناک نہیں تھی۔ شیخ صاحب پریشان ہو گئے لیکن جرأت کر کے کہا۔ "دیکھئے میں کاروباری آدمی ہوں عدالت تھانہ میرے لیے نئے نہیں ہیں لیکن میں دکان پر آپ کا حق تسلیم کرتا ہوں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے کہ آپ عدالت جاتے ہیں اور برسوں تک ایک بے معنی مقدمہ لڑتے ہیں جس کا شاید کوئی فیصلہ نہ ہو۔ یہ پاکستان کی عدالتیں ہیں۔ ٹھیک ہے مجھے نقصان ہو گا لیکن آپ کو بھی وکیل کی فیسیں بھرنی پڑیں گی عدالتوں میں چکر لگانے ہوں گے اگر وکیل پر چھوڑیں گے تو وہ بس پیشیاں بڑھا کر اپنی فیس بناتا رہے گا۔ آپ یقین کریں ایک سال تو مقدمہ پیش ہونے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"کوئی بات نہیں میرے انکل وکیل ہیں، وہ کیس دیکھیں گے۔" شاہنواز نے چمک کر کہا۔

"اس معاملے میں کوئی کسی کا انکل یا دوست نہیں ہوتا ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک حل رکھ رہا ہوں۔" شیخ صاحب نے سوچ کر کہا۔ "میں دکان چھوڑتا ہوں لیکن آپ مجھے کرائے پر دیدیں اور مارکیٹ ریٹ کے مطابق کرایہ لے لیں۔ ساتھ ہی مجھے جرمانے کی ایک معقول رقم بتا دیں وہ میں

قسطوں میں کرائے کے ساتھ ادا کرتا رہوں گا۔ مگر یہ دس لاکھ کا جرمانہ اور دکان خالی کرانے والی بات بھول جائیں۔ دوسری صورت میں مجھے عدالت کچہری قبول ہوگی۔“

شیخ صاحب نے سوچ سمجھ کر یہ بات کہی تھی۔ اسی صورت میں قرض والی بات چھپی رہ سکتی تھی۔ ورنہ وہ دکان خالی کرتے یا پھر عدالت میں جاتے تب بھی معاملہ کھل ہی جاتا۔ اگر وہ انکار کر سکتے تھے کہ ان کے پاس کاغذات نہیں ہیں لیکن اس صورت میں ان کا کیس بہت کمزور پڑ جاتا اور عین ممکن تھا عدالت جلد مسز رب نواز کے حق میں فیصلہ کر دیتی۔ اس لیے وہ بہر صورت دکان قبضے میں رکھنا چاہتے تھے اور اسی سے کما کر وہ قرض اور مسز رب نواز کی طرف سے مانگے جرمانے کو ادا کر سکتے تھے۔ شاہنواز پھر چراغ پا ہو گیا اس نے غرا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم عدالت جائیں گے اور وہاں تم کو دیکھ لیں گے کتنے پانی میں ہو؟“

مگر شیخ صاحب کی بات سن کر مسز رب نواز سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ وہ شاید ان کی بات کو تول رہی تھیں۔ شیخ صاحب نے انہیں سوچ میں دیکھ کر پھر کہا۔ ”مسز رب نواز... میں اکیلا ہی قابض نہیں ہوں یہاں تو پوری پوری مارکیٹوں پر قبضہ ہے لیکن میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔ آپ چاہیں تو کسی ایسے وکیل سے مشورہ کر لیں جو غیر جانبدار ہو۔ وہ آپ کو یہاں عدالتوں کی درست صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔“

”اپنا حق لینے کے لیے ہم عدالتوں کے محتاج نہیں ہیں۔“ شاہنواز نے پھر بڑک ماری۔

”شانی تم چپ کرو۔“ مسز رب نواز نے بیٹے کو ڈانٹا اور شیخ صاحب سے بولی۔ ”بیٹا تم مجھے اچھے آدمی لگ رہے ہو۔ میں بھی کسی کو بلا وجہ تنگ کرنے یا موقع سے فائدہ اٹھانے کی قائل نہیں ہوں۔ اللہ بخشے رب نواز صاحب کو وہ ہمارے لیے اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ پشتوں کے لیے کافی ہوگا۔ ہمیں ہمارا حق مل جائے یہ بھی کافی ہے۔ ٹھیک ہے میں وکیل سے مشورہ کر کے تم سے رابطہ کروں گی۔“

دو دن بعد مسز رب نواز نے ان سے رابطہ کیا اور ملاقات کا کہا۔ اس بار شیخ صاحب اس کے گھر چلے گئے اور انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت میں پڑنے سے بچے تھے۔ یہ محل نما گھر مکینوں کی مالی حیثیت بتانے کے لیے کافی تھا۔ وہاں مسز رب نواز کا وکیل بھی تھا۔ مسز رب نواز نے کرائے داری کا معاہدہ تیار کرا لیا تھا۔ کرایہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق تھا اور شیخ صاحب کو ایک سال کا ایڈوانس بھی دینا پڑتا۔ اگرچہ لاہور میں اتنا لمبا ایڈوانس لینے کا رواج نہیں تھا لیکن شاید مسز رب نواز نے حفظِ ما تقدم کے طور پر اتنا ایڈوانس لے لیا تھا اور ساتھ ہی کمال فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیس لاکھ روپے کے بجائے صرف دو لاکھ روپے طلب کیے تھے۔ جبکہ شیخ صاحب کو امید نہیں تھی کہ وہ جرمانے میں کمی کریں گی۔ وہ سچ مچ مسز رب نواز کے احسان مند ہو گئے تھے۔

شاہنواز منظر سے غائب تھا۔ وہ اس معاملے میں ماں سے متفق نہیں تھا۔ یہ مسز رب نواز کا اپنا فیصلہ تھا۔ اصل میں انہیں جلد واپس جانا تھا اور وہ یہاں کسی معاملے میں زیادہ وقت نہیں دے سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے شیخ صاحب کیس سے بچے تھے۔ انہوں نے ایک سال کا ایڈوانس اور دو لاکھ روپے دیے۔ ان کے پاس گنجائش تو نہیں تھی مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح یہ رقم بھی کر کے دیدی۔ مسز رب نواز بیٹے کے ہمراہ واپس چلی گئیں۔ ابھی چند مہینے گزرے تھے اور شیخ صاحب نے ٹھیک سے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک دن بینک منیجر فضل اللہ کی کال آ گئی جس نے انہیں دس لاکھ کا قرض دلایا تھا اور اس نے کہا۔

”شیخ صاحب نہ جانے کیسے بینک کے اعلیٰ حکام تک یہ بات پہنچ گئی ہے کہ دکان کے کاغذات جعلی ہیں اور جلد ان کی تصدیق کرائی جائے گی۔“

یہ سن کر شیخ صاحب کے ہوش اڑ گئے تھے، وہ گھبرا کر بولے۔ ”اب کیا ہوگا منیجر صاحب...“

”شیخ صاحب آج کل بہت سختی ہو رہی ہے۔ اصل بات کھلتے ہی آپ کے خلاف مقدمہ ہو جائے گا اور وارنٹ نکل آئیں گے۔ آپ غائب ہو جائیں۔“

”غائب ہو جاؤں پر کہاں؟“

”کہیں بھی، آپ کے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے اس کے بعد آپ پھنس سکتے ہیں۔“

ایک ہفتے کا وقت بہت کم تھا۔ مگر شیخ صاحب گرفتار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بچے کا واحد سہارا وہی تھے۔ وہ جیل چلے جاتے تو ان کو کون دیکھتا؟ ایسے میں انہیں واحد حل جو سمجھ میں آیا وہ ترکِ وطن کا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی یہی کہا۔ مگر وہ شیخ صاحب کو اکیلے جانے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ مجبوراً شیخ صاحب نے اونے پونے دکان اور مکان کا سامان فروخت کیا۔ کمپنی سے اپنی ڈیلر شپ کی رقم لی اور اسلام آباد آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا مکان لے کر انہوں نے باہر جانے کی جدوجہد شروع کی۔ اس میں بہت سی

رکاوٹیں تھیں۔ برطانیہ کا ویزا آسانی سے ملا تھا لیکن پاسپورٹ بہت مشکل سے پیسہ کھلانے پر بنے تھے۔ اس سے زیادہ مشکل مرحلہ زرِ مبادلہ کے حصول کا تھا۔ اس زمانے میں زرِ مبادلہ کا حصول دشوار ترین کاموں میں سے ایک تھا۔ مگر ایک بار مسئلے حل ہوئے تو پھر آگے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ ملک سے نکلے تو سارے مسئلے حل ہو گئے بلکہ اب وہ فضل اللہ کے شکر گزار تھے کہ اس نے بروقت خبردار کیا اور وہ ملک سے نکل آئے یہاں جتنی ترقی کی تھی، ملک میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

شیخ صاحب تیس برس بعد وطن کی سرزمین پر اترے تھے۔ انہیں لاہور ائرپورٹ اور یہاں کے لوگ اجنبی لگ رہے تھے۔ انہیں یاد تھا جب وہ اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے تو وہاں کا عملہ اتنا زیادہ اور اتنا بدتمیز نہیں تھا لیکن جب انہوں نے امیگریشن کے بعد کسٹم والوں کو اپنا چھوٹا سا بیگ دکھایا جس میں چند جوڑے اور ضرورت کا کچھ سامان تھا تو ایک انگوٹھا چھاپ لہجے والے افسر نے بدتمیزی سے کہا۔ ”اتنا سا سامان؟ باہر سے آ رہے ہو یا اندر سے؟“

کسٹم سے نمٹ کر اور ائرپورٹ والوں کا جگا ٹیکس ادا کر کے وہ باہر آئے۔ کچھ بے چارے اس ٹیکس پر احتجاج کر رہے تھے اور نتیجے میں ان کو ابھی تک باہر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اسی لیے شیخ صاحب کو آسانی سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ جس نے نہایت نامناسب کرائے پر انہیں لاہور کے ایک فور اسٹار ہوٹل تک چھوڑ دیا تھا۔ اس سفر میں پیش آنے والی واحد خوشگوار تبدیلی رقم کی آسان منتقلی تھی۔ انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے ایک لاکھ پاؤنڈز مالیت کے ٹریولرز چیک لیے تھے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ پاکستانی روپے کے مساوی تھے۔ وہ انہیں جب چاہتے مجاز بینک سے کیش کرا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نقد رقم بھی تھی۔ فور اسٹار میں تمام سہولتیں تھیں اور یہاں شیخ صاحب کو مناسب چارج پر دوسری سہولتیں مل سکتی تھیں جیسے کار معہ ڈرائیور اور اگر وہ منی ایکسچینج چاہتے تو یہ بھی بہت آسانی سے ہو جاتا۔ یہ ساری معلومات ہوٹل کے استقبالیہ پر موجود افراد نے انہیں آتے ہی گوش گزار کی تھیں۔ باقی معلومات انہیں کمرے تک پہنچانے والے بیل بوائے نے دی تھیں۔ اس نے مبہم انداز میں دوسری خدمات کی فراہمی کا ذکر بھی کیا۔ جو بیک ڈور سے مہیا کی جاتی تھیں۔

”مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ شیخ صاحب نے اسے ٹپ دیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ بیل بوائے کے جانے کے بعد انہوں نے پہلے غسل کیا۔ اگرچہ وہ صاف ستھرے تھے لیکن روز شام کو غسل کرنا ان کی ایسی عادت تھی جو انگلینڈ کی شدید ترین سردیوں میں بھی نہیں چھوٹی تھی۔ رات کا کھانا انہوں نے ڈائننگ ہال میں کھایا اور پھر کچھ دیر ہوٹل کے سبزہ زار میں چہل قدمی کی۔ رات سونے سے پہلے وہ گھر والوں کو کال کرنا نہیں بھولے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن شیخ صاحب سب سے پہلے لاہور ڈیفنس کے اس بنگلے تک گئے۔ بنگلا اپنی جگہ تھا لیکن ری نیویشن کے مرحلے سے گزر کر پہلے سے زیادہ خوب صورت اور عالی شان ہو گیا تھا۔ پہلے جب وہ آئے تھے تو گیٹ پر ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ اب وہاں جدید اسلحے سے لیس دو مستعد باوردی گارڈز کھڑے تھے۔ گیٹ سے پہلے بھی ایک الیکٹرانک بیریئر تھا جو گاڑی کو آگے جانے سے روکنے کے لیے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تیس سال پہلے کے مقابلے میں یہاں رہنے والوں کو اپنی حفاظت کی زیادہ فکر ہو گئی تھی۔ یہ موجودہ حالات کا تقاضا بھی تھا۔ شیخ صاحب ہوٹل کی شاندار مرسڈیز کار میں آئے تھے۔ ڈرائیور آگے موجود تھا۔ ایک گارڈ اس کے پاس آیا۔

”کیا بات ہے؟“

”یہ شیخ صاحب ہیں۔“ ڈرائیور نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مسز رب نواز یا ان کے بیٹے شاہنواز سے ملنے آئے ہیں۔“

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ادھر کوئی مسز رب نواز یا اس کا بیٹا شاہنواز نہیں رہتا ہے۔“

شیخ صاحب کو مایوسی ہوئی۔ انہوں نے آگے ہو کر گارڈ سے پوچھا۔ ”کیا وہ یہاں سے جا چکے ہیں؟“

”میں یہاں تین سال سے ہوں۔“ گارڈ نے جواب دیا۔ ”یہ بنگلا سردار غلام خان صاحب کا ہے۔“

”میں تیس سال پہلے یہاں آیا تھا اس وقت یہاں مسز رب نواز رہتی تھیں۔ کیا ان کا نیا پتا مل سکتا ہے؟“

”میں اندر بات کرتا ہوں۔“ گارڈ نے کہا۔ ”آپ گاڑی یہاں سائڈ پر لگا لیں۔“

دس منٹ بعد اندر سے ایک خوش پوش آدمی نکلا اور ان کی گاڑی کی طرف آیا۔ شیخ صاحب نیچے اتر آئے تھے اس نے ان سے ہاتھ ملایا۔ ”میں رحیم الدین ہوں اس بنگلے کا منتظم، فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

شیخ صاحب نے اپنا تعارف کرایا اور پھر اسے مسز

رب نواز اور شاہنواز کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر حیرت نظر آنے لگی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شیخ صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ بنگلا غلام خان صاحب کے والد مرحوم سردار رضا خان صاحب نے آج سے کوئی پینتیس سال پہلے بنوایا تھا۔ اس سارے عرصے میں یہاں صرف خان صاحب کی فیملی رہی ہے۔“

شیخ صاحب حیران ہوئے۔ انہوں نے بنگلے کا نمبر بتایا۔ ”کیا اس کا یہی نمبر نہیں ہے؟“

”بالکل ہے۔“

”تب غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ میں تیس سال پہلے اسی جگہ آیا تھا اور ایک گھنٹے سے زیادہ وقت اندر رہا تھا۔“

”اس کے بعد آپ دوبارہ نہیں آئے؟“ رحیم الدین نے سوال کیا۔

”نہیں...“

”اور یہ تیس سال پرانی بات ہے؟“

شیخ صاحب اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ ”ہاں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ میں آپ کو تیس پہلے کی ساخت بتا سکتا ہوں اب ری نیوئیشن ہو گئی ہے۔“

شیخ صاحب نے تفصیل سے بنگلے کی وہ ساخت بتائی جو تیس سال پہلے انہوں نے دیکھی تھی۔ رحیم الدین کے چہرے پر ایک بار پھر حیرت دکھائی دی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”آج سے دس سال پہلے تک یہ ساخت تھی پھر اسے تبدیل کیا گیا تھا۔“

”گویا میں نے درست کہا ہے۔“ شیخ صاحب پُرجوش ہو گئے۔ ”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے مسز رب نواز اور شاہنواز سے یہیں ملاقات کی تھی۔“

”دیکھیے شیخ صاحب اس سے ثابت تو کچھ نہیں ہوتا ہے۔“ رحیم الدین نے محتاط انداز میں کہا۔ ”سردار غلام خان صاحب ایک بڑے لینڈ لارڈ اور صوبائی سیاست داں ہیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں ان پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ تیس سال پہلے میری یہاں مسز رب نواز سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں آپ کو کنفرم بتا رہا ہوں کہ یہاں کبھی کوئی مسز رب نواز نہیں رہی ہیں اور نہ ہی سردار صاحب کے جاننے والوں میں کوئی مسز رب نواز ہیں۔ میں اس بنگلے کا منتظم ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں یہاں کون آتا جاتا ہے۔“

شیخ صاحب پھر مایوس ہوئے.... ”اچھا یہ بتایئے کہ یہاں سردار صاحب کی فیملی مستقل رہتی ہے؟“

”نہیں ان کی زمین میانوالی میں ہے جب وہ لاہور آتے ہیں تو یہاں ٹھہرتے ہیں۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نے ان کی عدم موجودگی میں...“

”شیخ صاحب اگر ایسا ہوا بھی ہے تو یہ بہت پرانی بات ہو گئی ہے اور اس دوران میں منتظم سمیت بنگلے کا سارا عملہ تبدیل ہو چکا ہے۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تھا۔“

”تقریباً ایسا ہی سمجھ لیں۔“ شیخ صاحب نے سرد آہ بھری۔ ”غلطی میری تھی اور میں اس کی تلافی کے لیے آیا ہوں لیکن یہاں تو ایسا لگ رہا ہے الٹا مجھ سے دھوکا ہوا تھا۔“

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“ رحیم الدین نے رسمی انداز میں کہا۔ ”مجھے اجازت ہے، مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

”کیوں نہیں۔“ شیخ صاحب نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا آپ مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دے سکتے ہیں، میں بعد میں آپ سے رابطہ کرنا چاہوں تو...“

”کیوں نہیں۔“ رحیم الدین نے انہیں اپنا نمبر دیا۔ ”شیخ صاحب آپ باہر سے آئے ہیں۔ میں آپ کی ممکنہ مدد کر سکتا ہوں لیکن کسی قسم کی ذمے داری نہیں لے سکتا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

شیخ صاحب بھی یہ بات سمجھ رہے تھے۔ تیس سال پہلے اس بنگلے میں ان کے ساتھ ہونے والی ملاقات ایک دھوکا تھی۔ مسز رب نواز یا وہ خاتون جو بھی تھیں انہوں نے شیخ صاحب سے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ٹھگ لیے تھے۔ یہ بنگلا انہوں نے نہ جانے کیسے حاصل کیا تھا؟ شاید یہاں موجود ملازموں یا اس وقت کے منتظم کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور چند گھنٹوں کے لیے یہ جگہ حاصل کی تھی۔ شیخ صاحب سرد آہ بھر کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ خود کو بہت ہوشیار کاروباری سمجھتے تھے اور درحقیقت وہ ہوشیار تھے تبھی آئرلینڈ میں اتنا بڑا اسٹور قائم کر لیا تھا۔ مگر وہ ایک عورت اور ایک نوجوان کے ہاتھوں بے وقوف بنے تھے۔ مسز رب نواز اور شاہنواز نے دکان کے جعلی کاغذات بنوائے تھے۔ شیخ صاحب کسی طرح ان کی تصدیق کی جرأت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ خود جعلی کاغذات بنوا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے دھوکا کھا گئے۔

ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اچانک انہیں خیال آیا اور انہوں نے ڈرائیور سے مال روڈ چلنے کو کہا۔ یہ جگہ ہوٹل سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ مال روڈ مارکیٹ کی شکل بھی ان تیس سالوں میں بدل گئی تھی۔ سڑک کشادہ اور فٹ پاتھ تنگ ہو گئے تھے اس کے باوجود گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا ایک ازدحام تھا جو سڑک کو گھیرے ہوئے تھے اور ٹریفک بہ مشکل چل رہا تھا۔ گاڑی پارک کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ڈرائیور گاڑی آگے نکال لے گیا اور انہیں خاصی دور جا کر پارکنگ ملی تھی۔ شیخ صاحب اتر کر پیدل واپس آئے۔ ان کی دکان بھی بدل گئی تھی۔ یہ بڑی ہو گئی تھی کیونکہ اس کے ساتھ والی ایک چھوٹی دکان لے کر اب یہاں چار منزلہ عمارت بنا لی گئی تھی۔ نیچے بہت بڑی شو روم نما دکان تھی جس میں الیکٹرانکس کے متفرق آئیٹمز بک رہے تھے۔ شیشوں اور ٹائلز سے سجی دکان ائر کنڈیشنڈ تھی۔ شیخ صاحب جھجکے لیکن پھر اندر آ گئے۔ پہلے انہیں خوف تھا کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ مگر پھر انہیں یاد آیا کہ تیس سالوں میں وہ بالکل بدل گئے تھے۔ تیس سال پہلے وہ دبلے چہرے اور کسی قدر سانولی رنگت والے نوجوان تھے ان کے بال سیاہ تھے اور آنکھوں پر عینک بھی نہیں تھی اب ان کا چہرہ بھر گیا تھا اور ہلکی سی سفید داڑھی سفید بالوں سے میچ کرتی بہت بھلی لگتی تھی۔ آئرلینڈ کے سرد موسم نے ان کا رنگ نکھار دیا تھا۔ اب کوئی ایسا فرد دیکھتا جس نے انہیں تیس سال پہلے دیکھا ہو تو اس کا ایک فیصد امکان تھا کہ وہ انہیں پہچان جائے۔

اندر کاؤنٹر پر ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں شیخ صاحب کو اس کی صورت دیکھی بھالی لگی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھے۔ وہ مستعد ہو گیا۔ ”جی فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

شیخ صاحب نے سوچ لیا تھا کہ انہیں کیا کہنا ہے۔ ”مجھے ایک درمیانی اسکرین والا ایل سی ڈی ٹی وی چاہیے۔“

”ہمارے پاس آپ کو ہر سائز کا ایل سی ڈی ٹی وی ملے گا۔ برانڈ ہم سونی اور سام سنگ رکھتے ہیں یہی مارکیٹ میں نمبرون ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔“

نوجوان کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ ایک طرف دیوار پر ایل سی ڈی ٹی وی ڈسپلے میں تھے۔ شیخ صاحب ایل سی ڈی ٹی وی دیکھنے لگے اور ساتھ ہی وہ سرسری سے انداز میں نوجوان سے سوالات کر رہے تھے۔ پھر وہ مطلب کی بات پر آئے۔ ”اس دکان کا مالک کون ہے؟“

”میرے والد ہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”دکان اور بزنس دونوں ہمارے ہیں۔“

”اچھا کچھ عرصے پہلے لی ہے۔ مجھے یاد ہے خاصے عرصے پہلے یہاں پنکھوں اور روم کولرز کی دکان ہوا کرتی تھی؟“

اندازِ فکر

☆ عام امریکی یہ سوچتے ہیں کہ ہماری قوم نے چاند پر تو قدم رکھ دیے۔ اب اس بسیط کائنات میں ہماری اگلی منزل کیا ہو گی!

☆ چینی یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم نے دنیا بھر میں ستر فیصد صارفین تک رسائی حاصل کر لی ہے اور ان کے بازاروں میں چھا گئے ہیں۔ کیا ترکیب کی جائے کہ بقیہ تیس فیصد بھی ہمارے قابو میں آ جائیں۔

☆ بھارتی اس فکر میں غلطاں رہتے ہیں کہ ہم نے عالمی جوڑ توڑ میں پاکستان کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

☆ اور بے چارے پاکستانی کو یہ فکر رہتی ہے کہ صبح چار بجے گئی تھی تو آٹھ بجے آئی تھی۔ اب دس بجے گئی ہے تو دوپہر دو بجے آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شام چار بجے جائے گی تو پھر... اس کی ایسی کی تیسی... ابھی بجلی آ رہی ہے تو پمپ چلا کر پانی اوپر ٹنکی میں چڑھا لوں ایسا نہ ہو کہ عشا تک وضو کے لیے بھی پانی نہ ہو... دھت تیری کی... شاید پانی والوں کی بجلی کٹی ہوئی ہے... انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی سوکھا پڑا ہے... خیر، کوئی بات نہیں... تیمم سے بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے!! رہا کھانے پکانے کا معاملہ تو بازار سے سو روپے کی منرل واٹر کی بوتل لی جا سکتی ہے۔ اصلی ہو یا جعلی، ہوتا تو وہ منرل واٹر ہی ہے۔ جیسے جعلی ہو یا اصلی، ڈگری تو ڈگری ہی ہوتی ہے! سب بجلی اور پانی کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ انہیں کانوں کان بھی پتا نہیں چلتا کہ حکمراں کتنی تیزی سے اپنی اور دوستوں کی جیبیں بھر رہے ہیں! جو چاہے مہنگا کرو، جتنا چاہو ٹیکس لگا دو، عوام کو بجلی پانی کے چکروں سے ہی فرصت نہیں کہ وہ ان باتوں پر دھیان دیں۔

(عرق ریز نہال خرم، کراچی)

”نہیں جی یہ تو میری پیدائش سے بھی پہلے کی ہے۔ میرے دادا نے لی تھی۔ وہ بینک میں کام کرتے تھے ریٹائرمنٹ سے پہلے یہ دکان لی تھی۔ پھر ان کا انتقال ہوا تو میرے والد اس کے مالک بنے۔“

”پہلے مکان بھی نہیں تھا۔“

”جی یہ بھی دادا جان نے بنوایا تھا اس وقت دومنزل تھا۔ اوپر ہماری رہائش تھی۔ پھر بزنس بڑھا تو ہم نے رہائش

کے لیے اوپر دو منزلیں اور بنوالیں اور فرسٹ فلور پر گودام بنا لیا اب اس میں مال ہوتا ہے۔ نیچے صرف شوروم ہے۔ آپ جو ایل سی ڈی ٹی وی پسند کریں گے وہ آپ کو گودام سے نکال کر دیا جائے گا۔“

شیخ صاحب بینک کا ذکر سن کر چونکے تھے اور ان کے ذہن میں ایک خیال سرسرانے لگا۔ انہوں نے پھر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”آپ کے دادا کا نام فضل اللہ تو نہیں تھا؟“

نوجوان چونکا۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”اتفاق سے وہ جس بینک میں منیجر تھے اسی میں میرا اکاؤنٹ تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بزنس کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔ ان کا انتقال کب ہوا؟“

”اس بات کو پندرہ سال گزر چکے ہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”آپ والد صاحب کو جانتے ہوں گے؟“

”نہیں کبھی اتفاق نہیں ہوا ملاقات کا کیونکہ فضل اللہ صاحب سے تو بینک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ کاروباری تعلقات تھے۔“

”جی میرے والد شفیع اللہ ہیں۔ وہ اوپر گئے ہیں بس کچھ دیر میں آتے ہوں گے آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔“

نوجوان انہیں ایل سی ڈی ٹی وی دکھاتا رہا۔ اسی اثنا میں اندر سے ایک بوڑھا آدمی نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی شیخ صاحب کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اسے پہچان لیا تھا وہ شاہنواز تھا۔ بے شک وہ ان کی طرح بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس کے خدوخال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی اور اس نے کلین شیو کے ساتھ بال بھی کلر کرا رکھے تھے اس لیے آسانی سے پہچانا گیا تھا۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد شیخ صاحب دکان میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک تنومند مسلح گارڈ بھی تھا اس نے وردی پہن رکھی تھی۔ نوجوان جس کا نام رفیع اللہ تھا، اس نے گارڈ پر اعتراض کیا۔ ”اسے کس خوشی میں لائے ہو؟“

وہ اپنے باپ کی طرح بدتمیز تھا اور اس کی پیشہ ورانہ خوش اخلاقی ہوا ہو گئی تھی۔ شیخ صاحب نے دو دن پہلے شفیع اللہ سے رابطہ کیا تھا اور اس سے بات کی، پہلے تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا لیکن شیخ صاحب نے کچھ حوالے دیے تو اسے ملاقات کے لیے راضی ہونا پڑا۔ ان دو ہفتوں میں شیخ صاحب نے ہوٹل کے توسط سے ایک نجی جاسوس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں بھی اب باقاعدہ لائسنس یافتہ جاسوس کام کرنے لگے ہیں لیکن نجی تفتیش کار تو ہمیشہ سے رہے ہیں جو معاوضے کے عوض مطلوبہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ جاسوس نے شیخ صاحب کی مطلوبہ معلومات فراہم کر دی تھیں اور پھر انہوں نے شفیع اللہ سے رابطہ کیا تھا۔ طے ہوا تھا کہ وہ ان کی شاپ کے اوپر گودام میں ملاقات کریں گے۔

”یہ میری حفاظت کرے گا۔“ شیخ صاحب نے جواب دیا۔ ”مزید میں کچھ باتیں لکھ کر ایک لفافے میں بند کر کے ہوٹل والوں کو دے آیا ہوں اگر میں واپس نہ گیا تو وہ لفافہ برطانوی سفارت خانے کو بھیج دیا جائے گا۔“

رفیع اللہ کینہ توز نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں شفیع اللہ بھی موجود تھا۔ اس نے بیٹے کو خاموش کرایا جیسے کبھی شفیع اللہ کی ماں اسے خاموش کراتی تھی۔ شفیع اللہ نے بیٹے کو دکان دیکھنے کو کہا اور اسے لے کر اوپر آیا۔ اس نے گارڈ کو نیچے چھوڑنے کو کہا تھا۔ لیکن شیخ صاحب نے انکار کر دیا۔

”یہ میرے ساتھ رہے گا۔“

شفیع اللہ انہیں اوپر ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا۔ یہاں ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا اور ایک میز تھی شاید یہ کمرا دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شفیع اللہ نے بغیر کسی رسمی گفتگو اور آدابِ میزبانی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے براہِ راست پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟“

”میں آیا تو تیس سال پہلے کا حساب دینے تھا لیکن یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ مجھے حساب لینا ہے۔“

”کیسا حساب؟“ شفیع اللہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”تم سمجھ رہے ہو میں کس حساب کی بات کر رہا ہوں۔ بہرحال تم سننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ تم اور اس عورت نے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری ماں اور بینک منیجر فضل اللہ کی بیوی تھی، نے مل کر مجھے بیوقوف بنایا۔ اس نے اپنا شوہر اور تم نے اپنی ولدیت بدل لی۔ وہ مسز رب نواز اور تم شاہنواز بن گئے۔ مقصد مجھ سے یہ دکان اور رقم ہتھیانا تھا۔ فضل اللہ اس سارے کھیل کا ماسٹر مائنڈ تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں نے بینک میں دکان کے جو کاغذات رکھوائے وہ جعلی ہیں اور میں کسی صورت معاملہ عدالت تک جانے نہیں دوں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ تم ماں بیٹے مجھ سے رقم ٹھگ کر لے گئے اور بعد میں تمہارے باپ نے جھوٹ کہا کہ بینک والے کاغذات کی انکوائری کر رہے ہیں، میں اس کی باتوں میں آ گیا اور یہ دکان چھوڑ کر ملک سے ہی چلا گیا اور تم لوگ اس دکان پر قابض ہو گئے۔“

”یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے۔“ شفیع اللہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ہاں اگر ان کے ثبوت نہ ہوں تو اسے جھوٹ اور بکواس ہی قرار دیا جائے گا۔ لیکن شفیع اللہ عرف شاہنواز میں تمام ثبوت حاصل کر کے آیا ہوں۔ اول اس دکان کا اصل مالک کوئی اور ہے اور تم لوگوں نے اس سے کسی طرح یہ دکان حاصل کی۔ دوسرے بینک کی طرف سے لیا جانے والا قرض ادا نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اب بھی بینک کے ادا نہ کیے جانے والے قرضوں میں شامل ہے۔ تیسرے میں نے سردار غلام خان کے ان ملازموں کو تلاش کر لیا ہے جنہیں پیسہ دے کر تم لوگوں نے اس کا بنگلا استعمال کیا۔ وہ آج کل صوبائی حکومت میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے اور ساتھ ہی ایم پی اے بھی ہے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ یہ بات اس کے علم میں آ گئی تو اس کا کیا ردِعمل ہو گا۔“

پہلی بار شفیع اللہ کے چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں ہوئے تھے مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ ”تم جو کہہ رہے ہو اس کا کیا ثبوت ہے اور تم کیا کر لو گے کیونکہ ابا جان اب زندہ نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے سردار غلام خان بھی کچھ نہیں کرے گا۔ اب رہ جاتا ہے اس دکان کا اصل مالک تو تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو فضل اللہ اپنے اعمال کا جواب دینے اللہ کے پاس جا چکا ہے لیکن وہ قرض موجود ہے جو اس دکان کے عوض لیا گیا تھا اور وہ ابھی تک ادا نہیں ہوا ہے جب میں اس معاملے کو اٹھاؤں گا تو یقیناً تم بھی لپیٹ میں آؤ گے۔ یہ تمہارا خیال ہے کہ سردار غلام خان کچھ نہیں کرے گا۔ میں اب برطانیہ کا شہری ہوں اور جب میں سفارت خانے کے توسط سے یہ معاملہ اٹھاؤں گا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ جیسے میں نے یہ سب معلوم کر لیا ہے۔ مجھے کچھ وقت اور لگے گا لیکن میں اسے بھی تلاش کر لوں گا۔ میرے پاس وسائل بھی ہیں اور وقت بھی ہے اس پر بھی اگر کچھ نہیں ہوا تو میں معاملے کو عدالت میں لے جاؤں گا۔ ایک وقت تھا جب تمہارے باپ نے میرے ایک غلط کام کا سہارا لے کر مجھے عدالت جانے سے ڈرایا اور میں ملک چھوڑنے پر بھی مجبور ہو گیا مگر اب مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ البتہ تم سوچ لو کہ تم کیا عدالت کا سامنا کر سکو گے؟“

اس بار شفیع اللہ کے تاثرات واضح فکرمندانہ تھے۔ شیخ صاحب کی باتوں میں وزن تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میرے دو مطالبات ہیں۔ اول مجھے اس دکان کے اصل مالک کا پتا چاہیے۔“

”میں نہیں جانتا....“

”شفیع اللہ جھوٹ مت بولو۔ میں اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں تم بھی اپنے مرے باپ کے کیے کا کفارہ ادا کر دو۔ ممکن ہے یہی بات اس کی چھوٹ کا ذریعہ بن جائے۔ مجھے معلوم ہے یہ دکان اب بھی کسی ریحان شاہ کے نام پر ہے اور تم اس دکان میں ایسے ہی نہیں بیٹھے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ریحان شاہ یا اس کے لواحقین کہاں ہیں۔ اگر تم نہیں بتاؤ گے تب بھی میں اس تک پہنچ جاؤں گا اور تم اس فائدے سے محروم رہ جاؤ گے جو تم مجھ سے حاصل کر سکتے ہو۔“

شفیع اللہ کو اپنے باپ کی بخشش کی تو اتنی پروا نہیں تھی لیکن اپنے متوقع فائدے سے یقیناً دلچسپی تھی۔ ”تم مجھے کیا فائدہ دے سکتے ہو؟“

”یہ تمہیں اس وقت پتا چلے گا جب تم مجھے ریحان شاہ یا اس کے لواحقین کا پتا بتاؤ گے۔“

”آخر تم ان کا پتا کیوں چاہتے ہو؟“

”میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے چالاکی سے کام لینا چاہا۔ ”دیکھو میں ابھی تو نہیں جانتا لیکن جان سکتا ہوں۔“

”نہیں شفیع اللہ میں پتا لے کر جاؤں گا دوسری صورت میں تم سے ملاقات عدالت میں ہو گی۔ میں صرف عدالت نہیں جاؤں گا بلکہ اس معاملے کو میڈیا میں بھی لے آؤں گا اس کے بعد دیکھوں گا کہ ذمے دار اتھارٹیز کیسے تمہارے خلاف حرکت میں نہیں آتی ہیں۔ میں بہترین وکیل کر لوں گا اور وہ عدالت سے دکان خالی کرا لوں گا۔ باقی رہا ریحان شاہ یا اس کے لواحقین کا معاملہ تو انہیں بھی تلاش کر لوں گا اب بولو کیا کہتے ہو؟“

شفیع اللہ کی ہمت جواب دے گئی ویسے بھی وہ کمزور مقام پر تھا۔ اس نے شیخ صاحب کو ریحان شاہ کی بیوہ کا پتا بتا دیا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ مجھے اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”تمہیں یہ فائدہ ہو گا کہ تم کرایہ دے کر بدستور اس جگہ اپنا کاروبار کرتے رہو گے بلکہ کرایہ دے کر یہاں رہ بھی سکو گے ویسے تمہاری مرضی ہو گی کہ یہاں رہتے ہو یا یہ جگہ خالی کر دیتے ہو۔ میرا دوسرا مطالبہ یہی ہے۔“

”تم....“ شفیع اللہ نے گالی دے کر کہا۔ ”تم دھوکے باز آدمی میں دیکھتا ہوں تم مجھ سے یہ جگہ کیسے خالی کراتے ہو؟“

”تم جیسے دھوکے بازوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ شیخ صاحب نے ہنس کر کہا اور اپنے مستعد باڈی گارڈ کے ہمراہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ریحان شاہ پرانے لاہور کے ایک چھوٹے سے گھر

میں رہتا تھا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ اس لیے پہلے یہ دکان جو کسی زمانے میں اس کے باپ کو الاٹ ہوئی تھی اس پر اعظم بٹ نے قبضہ کرلیا۔ ان ہی دنوں ریحان شاہ کا کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہوگیا۔ اس نے پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک بیٹی اور ایک بیٹا چھوڑا تھا جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو بیٹا اور بیٹی دونوں چھوٹے تھے۔ ریحان شاہ کی بیوہ نے بڑی مشکل سے بیٹی کی شادی کی اور بیٹا نعمان شاہ برگر اور فنگر چپس کا ٹھیلا لگا کر گھر کی گاڑی چلاتا تھا۔ اکتیس سالہ نعمان شاہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ پہلے ماں اسے ہمت کرنے نہیں دیتی تھی وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی اور اب بیوی بچے اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے اسی لیے وہ اپنی وراثت حاصل نہیں کرسکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب دکان پر شفیع اللہ خاندان قابض ہے۔ شیخ صاحب سے پہلے بھی کئی افراد نے اسے اکسایا تھا کہ وہ ہمت کرے اور اپنی دکان کا قبضہ چھڑائے تو وہ اس کا ساتھ دیں گے لیکن وہ جانتا تھا کہ ساتھ دینے والے بعد میں خود دکان پر قابض ہوجائیں گے اور اس کے حصے میں بلاوجہ کی دشمنی آئے گی۔ اس لیے جب شیخ صاحب آئے اور اسے اس کی دکان کا قبضہ دلانے کی پیشکش کی تو اس نے انکار کردیا۔

”نہیں جناب میں ایسے خوش ہوں۔ میں اس دکان کے چکر میں اپنی اور گھر والوں کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

شیخ صاحب اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ اس میں خطرہ ہے لیکن اتنا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔ پھر انہوں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ بھی ایک زمانے میں اس دکان پر قابض رہے تھے اور اب اس کا کفارہ ادا کرنے آئے تھے۔ ”میرے حساب سے میں جتنا عرصہ اس دکان میں رہا میرے ذمّے تقریباً پچاس لاکھ روپے بنتے ہیں وہ میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ ساتھ ہی میں تمہیں اس دکان کا قبضہ دلانے کے لیے قانونی کارروائی کا خرچا بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اگر تم یہاں اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے خطرہ محسوس کررہے ہو تو میں تم سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن شرط یہی ہے تم ہمت کرو اور دکان ان لوگوں سے چھڑواؤ۔“

پچاس لاکھ نعمان شاہ کے لیے بہت بڑی رقم تھی اس کے لیے تو پانچ ہزار بھی بڑی رقم تھی۔ رفتہ رفتہ وہ شیخ صاحب کے خلوص کا قائل ہوگیا۔ شیخ صاحب نے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کیں اور شفیع اللہ پر کیس کردیا پھر انہوں نے مذکورہ بینک کے حکام سے بات کی۔ بینک اب نجی ہوگیا تھا۔ اگرچہ عملہ ابھی تک سرکاری دور کی روش پر قائم تھا لیکن شیخ صاحب قرض لینے نہیں بلکہ دینے آئے تھے اس لیے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک ہفتے کے اندر قرض کی رقم کے ساتھ اتنے عرصے کا سود لگا کر شیخ صاحب سے وصول کرلی گئی۔ کیونکہ یہ چھوٹا قرض تھا اس لیے آج تک برقرار تھا ورنہ یہی بینک اربوں روپے کے قرض کمال فراخ دلی سے ان لوگوں کو معاف کرچکا تھا جنہیں قرض کی ضرورت نہیں تھی۔ بینک کا معاملہ خیروخوبی سے نمٹ گیا اور شیخ صاحب نے دکان کے معاملے میں اسے بھی فریق بنالیا۔

مستعد وکیل اور شیخ صاحب کے پیسے نے کیس کو جیک لگایا اور جلد شفیع اللہ عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور ہوگیا کیونکہ عدالت نے تاحکم ثانی دکان سیل کرنے کا حکم دیا تھا۔ رجسٹرار آفس سے تمام کاغذات نکلوالیے گئے تھے اور ان سے حقِ ملکیت نعمان شاہ کا ثابت ہوتا۔ اس کی طرف سے رضامندی پاتے ہی شیخ صاحب نے اس پورے خاندان کو لاہور کے ایک پوش اور محفوظ علاقے میں کرائے کے مکان میں منتقل کرادیا تھا جہاں وہ شفیع اللہ کی ممکنہ بدمعاشی سے محفوظ تھے۔ دکان سیل ہوئی اور چند پیشیوں میں شفیع اللہ کو آنے والے حالات کا اندازہ ہوا تو وہ مفاہمت پر اتر آیا۔ مگر اس کا کہنا تھا کہ نعمان شاہ اسے دکان فروخت کردے۔ اس نے بیس لاکھ روپے کی آفر کی تھی لیکن نعمان شاہ کو زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں سہارا ملا تھا اور اب وہ اپنا حق حاصل کرنے پر تل گیا تھا اس نے انکار کردیا لیکن جب شفیع اللہ نے پیشکش ساٹھ لاکھ تک بڑھادی تو شیخ صاحب کے مشورے سے نعمان نے قبول کرلی۔ جگہ کی ویلیو ایک کروڑ کے آس پاس تھی۔ لیکن اس پر شفیع اللہ کے خاندان نے خاصا خرچ کیا۔ نعمان شاہ شیخ صاحب کا مرید ہوگیا تھا۔ کیونکہ اسے سوائے فوڈ بزنس کے اور کسی چیز کا تجربہ نہیں تھا اس لیے شیخ صاحب کے مشورے سے اس نے گوالمنڈی میں ایک جگہ حاصل کی اور وہاں فاسٹ فوڈ کا کاروبار شروع کیا۔ باقی رقم سے اس نے ایک اچھی جگہ مکان خرید لیا تھا۔ اس خاندان نے بہت غربت دیکھی تھی اور اب اس کا اچھا وقت آیا تھا اس کے لیے وہ شیخ صاحب کے شکرگزار تھے۔

واپس جاتے ہوئے شیخ صاحب تقریباً خالی ہاتھ تھے۔ ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم وہ یہیں خرچ کرچکے تھے لیکن وہ بہت مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنے کیے کا کفارہ ادا کردیا تھا۔

شریکِ جرم

بابر نعیم

ترقی یافتہ ممالک میں ناجائز آمدنی... جھوٹ... فریب... حق تلفی اور پولیس سے عدم تعاون سب جرائم کا درجہ رکھتے ہیں۔ سوچوں میں تبدیلی کے امکانات پیدا کرنے والی کہانی... جو بظاہر ایک قتل سے شروع ہوئی... مگر آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی قابلِ گرفت ٹھہرے جو تماش بین کا کردار ادا کررہے تھے...

لب سڑک رونما ہونے والے جرائم میں سے ایک جرم کا چشم کشا احوال

سراغ رساں جوزف سونی نے فیلی سٹی اسٹریٹ پر موجود لوگوں کو گننا شروع کیا۔ وہ تعداد میں انیس تھے۔ ان میں سے چار بوڑھے جو باربر شاپ کے باہر فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دو عورتیں دکان کے پیچھے والی گلی میں کھڑی تھیں۔ مزید دو عورتیں ان سے کچھ فاصلے پر سر جھکائے سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ تین لڑکے سائیکل کی سواری کررہے تھے اور چار لڑکیاں ایک نیلے رنگ کی شیورلیٹ اور گہرے سبز رنگ کی پونٹیاک کے درمیان منڈلا رہی تھیں۔ دو

آدمی لانڈری کی بیرونی دیوار پر جھکے ہوئے تھے اور دوسرے دو ایک طویل عرصے سے بند گودام کے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس سراغ رساں کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ سونی نے اپنا دھوپ کا چشمہ اتار کر جیب میں رکھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر وہاں کا جائزہ لینے لگا۔

سونی نے اپنا کوٹ کار میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ کار سے باہر نکل کر اس نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور ہولسٹر میں رکھے نائن ایم ایم پستول کے دستے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ اس وقت جین فری اسٹور کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ دو ماہ پہلے اسی دن اور اسی وقت کسی سیاہ فام شخص نے جین فری کے مالک جیک ہڈسن کو گولی ماردی تھی۔ ویڈیو میں ٹی شرٹ اور جینز میں ایک شخص کو سیمی آٹومیٹک ریوالور سے بوڑھے جیک ہڈسن کو نشانہ بناتے دکھایا گیا تھا۔ وہ بدمعاشوں والے انداز میں دائیں ہاتھ میں پستول پکڑے اس کے سامنے لہرا رہا تھا۔ ہڈسن اس کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔ بدمعاش نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا پھر پستول سے ایک شعلہ نکلا اور ہڈسن کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا۔ قاتل نے دکان میں جا کر کیش رجسٹر خالی کیا۔ ساری رقم جیب میں ڈالی۔ فریج کھول کر دو کینڈی بار نکالیں اور اطمینان سے ٹہلتا ہوا چلا گیا۔

سونی نے دوبارہ دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر چڑھایا اور باربر شاپ کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے چاروں بوڑھے اسے آتا دیکھ کر خاموش ہو گئے.... سب کی عمر پچاس برس سے زیادہ تھی۔ سفید ایپرن اور سیاہ پتلون میں ملبوس دکان کا مالک اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سونی کو دیکھ کر اس نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم پھر آ گئے؟“

باربر کا نام ولی ایلزی تھا۔ سونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں دکان میں موجود واحد گاہک پر جم گئیں۔ سونی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام جوزف سونی ہے اور میں جین فری والے کیس پر کام کر رہا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس شخص نے سونی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟“

وہ شخص اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”جوئے کلے۔ کیا تم میرا شناختی کارڈ دیکھنا چاہو گے؟“ اس کے لہجے میں سختی تھی جیسے وہ سونی کو چیلنج کر رہا ہو۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔“ سونی نے جیب سے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے پتلون کی جیب سے پرس نکالا اور اپنا ڈرائیونگ لائسنس سونی کی طرف بڑھا دیا۔ سونی نے اس میں درج تمام معلومات اپنی نوٹ بک میں لکھ لیں اور بولا۔ ”کیا تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟“

سونی کو وہی جواب ملا جو اس سے پہلے دوسرے لوگ دے چکے تھے۔ اس نے جب سے یہ کیس لیا تھا، اسے اسی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سب لوگوں کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ گو کہ جیک ہڈسن اسی علاقے میں 1968ء میں بوڑھے جین فری کے مرنے کے بعد سے یہ اسٹور چلا رہا تھا اور علاقے کا ہر چھوٹا بڑا شخص اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک مقامی لڑکا اسے مار کر چلا گیا لیکن کوئی بھی شخص اس سلسلے میں پولیس سے تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سونی کے لیے بھی یہ علاقہ اجنبی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے صرف تین بلاک کے فاصلے پر واقع ایر یٹو اسٹریٹ میں پلا بڑھا تھا لیکن پولیس اکیڈمی میں جانے کے بعد اس نے وہ جگہ مستقل طور پر چھوڑ دی تھی۔

کلے سے فارغ ہونے کے بعد وہ عورتوں کی جانب بڑھا۔ ان میں کچھ سے وہ پہلے بھی بات کر چکا تھا پھر اس کی نگاہ ان لڑکوں پر گئی جو لانڈری کی دیوار کے ساتھ گودام کے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”پولیس۔“ اس نے لمبے قد والے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ دونوں کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی اور انہوں نے سفید ٹی شرٹ اور گھٹنوں تک لمبے نیکر پہن رکھے تھے۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سونی نے کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔“

”تم نے کچھ کہا؟“ وہ لڑکا خلا میں نظریں جمائے ہوئے بولا۔

”کھڑے ہو جاؤ... اس سے پہلے کہ میں تمہارے کان کھینچوں۔“

وہ لڑکا کھڑا ہو گیا تو سونی نے اس کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ اس پر چھوٹے قد والے لڑکے نے احتجاج کیا اور بولا۔ ”تم اس طرح ہماری تلاشی نہیں لے سکتے۔“

”میں تمہارے دوست کی تلاشی نہیں لے رہا بلکہ صرف اس کی جیبیں ٹٹول رہا ہوں۔ اگر پولیس آفیسر کو یہ شبہ ہو کہ کسی شخص نے کوئی جرم کیا ہے یا وہ اس کا ارادہ رکھتا ہے تو آفیسر اس کی جیبیں ٹٹول سکتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی بھی حفاظت ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس ایک سیل فون اور پرس ہے۔“ سونی نے اس کی دونوں جیبوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو لمبے قد والے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”انہیں باہر نکالو اور اپنی شناخت کرواؤ۔“

چھوٹے قد والا بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ کھڑے کر دیے۔ سونی نے اس کی جیبوں پر بھی ہاتھ پھیرا۔

”ہمارا جرم کیا ہے؟“ لڑکے کے سوال میں ہلکا سا احتجاج شامل تھا۔

”میں قانون نہیں بناتا، صرف اس کا نفاذ کرتا ہوں۔“

سونی نے اپنی نوٹ بک میں ان کا نام، پتا اور فون نمبر لکھا اور شناختی کارڈ بمع سیل فون واپس کر دیے۔ اس نے جین فری اسٹور کے بارے میں کچھ سوالات کیے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس نے اپنے سیل فون کی مدد سے ان کا پولیس ریکارڈ چیک کیا۔ ان کے کھاتے میں کوئی سنگین جرم نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے علاقے میں کوئی واردات کی تھی۔ سونی نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم دونوں کے تعاون کا شکریہ۔“

ایک امپالا کار سڑک پر آ کر رکی۔ سونی تیزی سے ڈرائیونگ سائڈ کی جانب بڑھا تاکہ سارجنٹ سے بات کر سکے۔ جوڈی نے دھوپ کا چشمہ ہٹاتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بلی جیسی چمک تھی۔ گو کہ وہ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی تھی لیکن ان آنکھوں سے لگتا تھا کہ اس کے جسم میں ایشیائی خون کی ملاوٹ ہے۔ اس نے طنزآمیز لہجے میں کہا۔ ”کچھ کامیابی ہوئی؟“

جواب میں سونی نے قہقہہ لگایا اور پیچھے ہٹ گیا کیونکہ جوڈی کار سے باہر آ رہی تھی۔ دوسری خواتین پولیس افسروں کے برعکس وہ عام طور پر اسکرٹ پہنتی تھی اور یہ لباس اس پر خوب جچتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بیگی نما اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کار میں ہی چھوڑ دی اور کندھوں پر لگے ہوئے سنہری بیج کو ٹھیک کرنے لگی۔ وہ چالیس سال کی پرکشش عورت تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ سات انچ تھا اور اونچی ہیل پہننے کے باوجود اسے گردن اٹھا کر سونی سے بات کرنا پڑتی تھی کیونکہ وہ چھ فٹ چار انچ کا تھا۔

”میں سڑک کے اس طرف جاؤں گی۔“ جوڈی نے جیب سے نوٹ بک اور بال پوائنٹ نکالتے ہوئے کہا اور لانڈری کی طرف بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کی جانب بڑھ گئی۔ سونی نے سڑک پار کی اور نصف بلاک کا فاصلہ طے کر کے اپنے ایک دور کے کزن ایڈی کے پاس چلا گیا جو چڑیا گھر میں نگراں کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ سونی کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”میں کام پر جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک تم کچھ معلوم نہیں کر سکے۔“

سونی نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ بولا۔ ”میں بھی بہت سے لوگوں سے پوچھ چکا ہوں لیکن کوئی بھی کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں۔“

”میں چاہوں گا کہ تم اردگرد کے لوگوں سے پوچھتے رہو۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ایڈی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جیسے ہی کوئی بات معلوم ہوئی تو تمہیں فون کر دوں گا۔“ پھر اس کی نگاہ سڑک کے پار کھڑی جوڈی پر گئی تو وہ سونی سے بولا۔ ”تمہاری ساتھی بہت خوب صورت ہے۔“

سونی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دو بلاک کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گرجا تھا جہاں پادری ٹام ملٹن ہاتھ میں ایک لمبا سا ڈنڈا لیے ہوئے گرجا کی عمارت کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ صابن کی مہک سے سونی کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے پادری سے بولا۔ ”گرجا میں آنے والے لوگوں سے کوئی بات معلوم ہوئی؟“

یہ سوال وہ پہلے بھی کئی بار پوچھ چکا تھا لیکن پادری نے اس کا برا نہیں منایا بلکہ خندہ پیشانی سے بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ اگر کچھ معلوم ہوتا تو سب سے پہلے تمہیں ہی فون کرتا۔ اگر تم باقاعدگی سے چرچ آنا شروع کر دو تو تم پر خدا کی رحمت نازل ہو سکتی ہے۔“

سونی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کیتھولک ہونے کے باوجود صرف شادیوں یا آخری رسومات میں شرکت کے لیے ہی چرچ کا رخ کیا کرتا تھا۔ ملٹن نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ ”گرمی بہت زیادہ ہے، کیا میں تمہیں پانی کی بوتل دوں؟“

”نہیں شکریہ۔“

پادری نے قریب آکر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ سونی کو امید تھی کہ وہ اس کے لیے معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے پادری سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اتوار کے روز چرچ آنے والے بچوں سے بات کرے کیونکہ انہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں علاقے کے بارے میں زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

سونی واپس جوڈی کی کار کی طرف آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”ایم، ایف نے شروع میں ہی یہ کیس بگاڑ دیا۔“ اس کا اشارہ سراغ رساں مورک فرڈیننڈ کی طرف تھا جسے سب لوگ ایم، ایف ہی کہا کرتے تھے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کا تبادلہ ہو جانے پر سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کیونکہ اس کی نااہلی سے کئی مسائل کھڑے ہو رہے تھے۔

سونی نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ وہ یہ جملہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکی تھی۔ اس نے جوڈی سے کہا۔ ”اس واردات میں کسی مقامی لڑکے کا ہاتھ ہے۔ جانتی ہو میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟“

جوڈی نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور اس کی جائز دیکھنے لگی۔

”یہ سب لوگ یہاں موجود تھے لیکن انہوں نے کچ دیکھا نہ سنا۔ تمہارے خیال میں یہ کسی بھوت کی حرکت ہوسکی ہے جسے کسی نے نہیں دیکھا اور وہ ہڈسن کو گولی مار کر چلا گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ قتل اگر کسی اجنبی نے کیا ہوتا ت کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں کچھ بتاتا۔ کم از کم اتنا ضرور کہہ دیتا کہ اس نے قاتل کو دیکھا ضرور ہے لیکن وہ اسے جانت نہیں ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ کسی نے کچھ نہیں دیکھا، اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ قاتل کو جانتے ہیں۔“

ہیڈ کوارٹر واپس آنے کے بعد سونی اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ پولیس ریکارڈ سے معلوم کرنا چاہ رہا تھا ک گزشتہ پانچ سال کے دوران جین فری اسٹور پر کوئی واقعہ ت پیش نہیں آیا۔ ان پانچ سالوں میں پولیس ڈپارٹمنٹ کو فیل سٹی اسٹریٹ کے چوبیس بلاکوں سے ایک ہزار ٹیلی فون کال موصول ہوئی تھیں جبکہ گزشتہ دو سالوں میں جین فری اسٹور سے ملحقہ بلاکوں میں دو قتل کی وارداتیں، ریپ کے ن واقعات، آٹھ چوریاں، سات مسلح ڈاکے، دو کار چوریاں اور انتیس مار پیٹ کے واقعات ہوئے تھے۔ یہ فہرست خاصی طویل تھی۔ سونی نے اپنی توجہ جین فری اسٹور تک محدود رکھی اور یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ اس عرصے کے دوران وہاں سے نو مرتبہ چوری، دو مسلح ڈکیتی، دو دفعہ مار پیٹ اور چار مرتبہ نقصِ امن کی شکایات موصول ہوئیں۔

جیک ہڈسن دو بار مسلح ڈکیتی کا نشانہ بنا جبکہ چوری کی نو وارداتوں میں سے پانچ میں سیاہ فام افراد ملوث تھے۔ ان میں سے دو بعد میں دوسری دکان سے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ سونی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ان معلومات میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے اسے اس کیس کو حل کرنے میں مدد مل سکتی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے اپنے لیے کھانا بنانا تھا اور بیٹیوں سے فون پر بات بھی کرنا تھی۔ ہر روز شام چھ اور سات بجے کے درمیان وہ اپنی سابقہ بیوی کے نمبر پر فون کر کے بیٹیوں سے بات کیا کرتا تھا۔ بڑی بیٹی ایملی نو سال جبکہ چھوٹی کلارا چار برس کی تھی۔

سونی ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل کر اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا.... راستے میں اس کی سابقہ بیوی کا مکان بھی آتا تھا جس کی قسطیں وہ ابھی تک ادا کر رہا تھا لیکن وہ وہاں کبھی رکتا نہیں تھا۔ دونوں بیٹیاں بیوی کی تحویل میں تھیں لیکن وہ ہر ویک اینڈ یا چھٹی والے روز ان سے ملنے جاتا تھا۔ اس نے اس حق کے لیے لمبی قانونی جنگ لڑی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن وہ اپنی بیٹیوں کو باپ کی شفقت سے محروم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

سونی نے علاقے کے مشتبہ افراد کی ایک فہرست تیار کی۔ ان میں سے ایک انیس سالہ ویلی نیلسن تھا جو پرس چھیننے کی وارداتوں میں ملوث تھا اور حال ہی میں ہنٹ کے اصلاحی مرکز میں دو سال گزارنے کے بعد باہر آیا تھا۔ ایک کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک مسی سپی کی جیل میں تھا جبکہ بقیہ دو کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ جائے وقوعہ سے کافی دور تھے اور ان کی وہاں موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اب اس فہرست میں ایک ہی نام باقی رہ گیا تھا جس کے بارے میں کسی شخص نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا نام اورس لینٹ تھا۔ اس کی عمر بھی انیس سال تھی اور سونی حیران تھا کہ لوگوں سے انٹرویو کے دوران دوسرے تمام ناموں کا تذکرہ ہوا لیکن کسی نے بھی لینٹ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں کئی کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ پانچ مرتبہ بچوں کی اور سات مرتبہ بڑی جیل جا چکا تھا۔ اسے ڈکیتی، کار چوری اور منشیات رکھنے کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔

لوگوں کی خاموشی اس کی گرفتاری کی وجہ نہیں بن سکتی تھی لیکن اس کے نتیجے میں سونی کی ساری توجہ لینٹ پر مرکوز ہو گئی جو گزشتہ ہفتے فیلی سٹی اسٹریٹ سے کوکین رکھنے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ سونی عجلت میں ہیڈ کوارٹر واپس آیا۔ اس نے ریکارڈ سے لینٹ کی تصویر نکالی اور جین فری اسٹور پر ہونے والے قتل کی ویڈیو لے کر واپس اپنی کار میں آگیا۔

اب اس کا رخ ایف بی آئی کی عمارت کی جانب تھا۔ سونی نے سیل فون کے ذریعے اپنے پرانے دوست ایلون بشپ کو آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا جو کسی زمانے میں اس کے ساتھ فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ ان دونوں نے اپنی ٹیم کو کامیابی دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بشپ نے گھٹنے کے آپریشن کے بعد فٹ بال کھیلنا چھوڑ دی تھی جبکہ سونی اس کے بعد بھی ایک سال تک کھیلتا رہا۔

”تم مصروف تو نہیں ہو؟“ سونی نے اس کی جوابی کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ پہلے اس سے بات نہیں ہو سکی تھی لہٰذا اس نے وائس میل پر پیغام چھوڑ دیا تھا۔

”ابھی ابھی ایک میٹنگ سے فارغ ہوا ہوں۔“

ثبوت

”تم نے یہ سوٹ میری کھال سے بھی زیادہ ٹائٹ سی دیا ہے۔“ گاہک نے درزی سے شکایت کی۔

”کھال سے زیادہ ٹائٹ! یہ ناممکن ہے جناب۔“ درزی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”دیکھو، اپنی کھال میں تو میں آسانی سے بیٹھ بھی سکتا ہوں جبکہ یہ سوٹ پہن کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔“

”میں تمہاری طرف ہی آرہا تھا۔“ سونی نے کہا۔

”اس وقت؟“ بشپ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

سونی کو عمارت کے گیٹ پر ہی روک لیا گیا کیونکہ اس کے پاس عمارت میں داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں تھا، لہٰذا اسے انتظار گاہ میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بشپ آگیا اور اُسے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم اس وقت شہر میں موجود ہو۔“ سونی نے کہا۔

ایف بی آئی میں یہ عام رواج ہے کہ اس کے ایجنٹوں کو کئی سال اپنے گھر سے دور رہنا پڑتا ہے اور ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد ہی ان کی تعیناتی آبائی شہر میں ہوتی ہے۔ بشپ بھی پہلے پانچ سال بالٹی مور میں گزار چکا تھا پھر اسے اسپیشل ایجنٹ کے طور پر واپس بلا لیا گیا اور تب سے وہ یہیں تعینات تھا۔

”اب بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟“ بشپ نے پوچھا۔

سونی نے بریف کیس سے ویڈیو ٹیپ اور تصویر والا لفافہ نکالا اور دونوں چیزیں بشپ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنی لیبارٹری سے ان کا تجزیہ کروالو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ویڈیو اور تصویر ایک ہی شخص کی ہیں یا دو مختلف لوگ ہیں۔“

بشپ نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”لگتا ہے آج کل تم بہت زیادہ جاسوسی ڈرامے دیکھ رہے ہو۔“

سونی کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس یہ سہولت موجود ہے۔ یہ قتل کا کیس ہے اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے، ورنہ مجھے کورٹ کو فون کرنا پڑے گا۔“

یہ کہنے کے بعد اس نے بھی بشپ کے ساتھ مل کر قہقہہ

لگایا۔ کوچ کو فون کرنے کی دھمکی ہی بشپ کے لیے کافی تھی۔ کوچ واشنگٹن تو شاید ریٹائر ہو چکا ہو لیکن وہ دونوں اس کے شاگرد رہ چکے تھے اور ابھی تک اسے اپنا کوچ ہی سمجھتے تھے۔

وہ کچھ دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے پھر بشپ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔''

سونی چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب؟''

''ان چیزوں کو کہیں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں جس میٹنگ میں تھا، وہاں کچھ لوگ لیبارٹری سے بھی آئے ہوئے تھے۔ میں یہ دونوں چیزیں انہیں دکھاتا ہوں پھر دیکھتے ہیں، وہ کیا کہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے لگا پھر دروازے پر رک کر ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کافی اور بسکٹ وہاں رکھے ہوئے ہیں۔''

سونی کو شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے ایک کپ میں تھرماس سے کافی انڈیلی اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ کافی بدمزہ تھی لیکن اس وقت اسے یہی غنیمت لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بشپ واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ سلیٹی رنگ کا لیب کوٹ پہنے ہوئے ایک ایشیائی باشندہ بھی تھا۔

''یہ اسپیشل ایجنٹ کینٹ یاماسا کی ہے۔'' بشپ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

سونی نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ بولا۔ ''ستانوے فیصد امکان یہ ہے کہ ویڈیو ٹیپ اور تصویر ایک ہی شخص کی ہے۔ میں نے تمہارے لیے اس کی رپورٹ تیار کر لی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' سونی بولا۔ ''ستانوے فیصد۔''

''ہم اٹھانوے فیصد سے آگے نہیں جاتے۔''

سونی نے ہیڈ کوارٹر واپس آتے ہوئے اپنے سیل فون سے جوڈی کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''اس وقت ڈیوٹی جج کون ہے؟''

''جوئے سائیزو۔''

''لعنت بھیجو اس پر۔'' سونی جھلاتے ہوئے بولا۔

جوئے سائیزو پولیس سے گہری مخاصمت رکھتا تھا اور کسی بھی مقدمے میں پولیس کی تفتیش پر بھروسا کرنے کے بجائے ثبوت اور شہادتوں پر زور دیا کرتا تھا اور اس کے بغیر کوئی بھی وارنٹ جاری نہ کرتا۔

''مجھے گرفتاری کا نہیں بلکہ تلاشی کا وارنٹ چاہیے تاکہ مشتبہ شخص سے بات کر سکوں لیکن اس جج کو ثبوت کے بغیر قائل کرنا بہت مشکل ہے۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جوڈی نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ڈیوٹی جج کے لیے انہیں صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔ اس کا نام مارکوس سمر تھا اور جانتا تھا کہ پولیس اسی شخص کا وارنٹ جاری کرنے کی درخواست کرتی ہے جس پر کسی جرم کا شبہ ہو۔ اب یہ ڈسٹرکٹ اٹارنی پر منحصر تھا کہ وہ معقول شبے کے بغیر کسی کیس کو عدالت میں پیش کرتا ہے یا نہیں۔

شیرف آفس کے دو سپاہی لیمنٹ کو لے کر آئے تھے۔ وہ ویڈیو میں نظر آنے والے شخص کی طرح جوان اور دبلا پتلا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں سراغ رساں جوزف سونی ایک میز کے پیچھے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک فارم رکھا ہوا تھا جس پر مشتبہ افراد اور ملزمان کے حقوق درج تھے۔ لیمنٹ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے سونی کے ہاتھ کے پاس رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اسے ہاتھ مت لگاؤ۔'' سونی نے اسے منع کیا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کوئی وکیل ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں۔'' لیمنٹ نے جواب دیا۔

سونی نے فارم اٹھایا اور لیمنٹ کے حقوق پڑھنا شروع کر دیے۔ لیمنٹ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔''

''او کے!'' سونی نے اپنے بریف کیس سے جائے وقوعہ کی ایک تصویر نکالی جس میں جیبن فری کی دکان کا بیرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔ لیمنٹ نے اس تصویر پر ایک نظر ڈالی لیکن اس کی آنکھوں سے کچھ ظاہر نہیں ہوا جیسے وہ اس جگہ کو بھی نہ پہچانتا ہو جہاں سے وہ سیکڑوں مرتبہ گزرا ہو گا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔'' وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''تم سے کس نے قتل کی بات کی ہے؟ میں کسی ڈاکے کی بھی تحقیقات کر سکتا ہوں جس کے بارے میں تم کچھ بتا سکو۔''

''تمہارے پاس سگریٹ ہو گی؟''

''میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' سونی اس کی طرف فارم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں مجھ سے بات کرنے سے پہلے اس پر دستخط کرنا ہوں گے۔''

لیمنٹ نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔ سونی نے کندھے اچکائے اور اس کے سامنے سے فارم اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسی صورت میں تمہیں دوبارہ جیل جانا ہو گا۔ اپنے جرائم کی گٹھڑی کے ساتھ۔''

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' لیمنٹ نے فارم اٹھایا اور اس پر دستخط کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں تم جج کو یہ ضرور بتاؤ کہ میں نے تمہارے ساتھ پورا تعاون کیا ہے۔''

''تم آخری بار جیبن فری کب گئے تھے؟''

''مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ بہت عرصہ ہو گیا۔ شاید ایک سال یا اس سے بھی زیادہ۔''

''کیا واقعی؟ تم جانتے ہو کہ وہاں ویڈیو کیمرا لگا ہوا تھا؟ تمہیں یقین ہے کہ اسٹور کے اندر نہیں گئے اور وہاں تم نے کولڈ ڈرنک نہیں پی؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے ہاں... میں اندر نہیں گیا تھا۔''

''تم مسٹر ہڈسن کو جانتے ہو؟''

''میں اس بوڑھے کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی اس الزام پر کچھ کہوں گا جو اس نے مجھ پر لگایا ہے۔''

''تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں تم سے کسی دکان پر چوری کرنے کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کر رہا۔''

سونی نے اسے مختلف طریقوں سے گھیرنے کی کوشش کی۔ مثلاً یہ کہ اس نے قتل کے بارے میں کیا سنا؟ کیا وہ اس وقت دکان کے باہر موجود تھا جب یہ واقعہ پیش آیا؟ ممکن ہے کہ اس نے کچھ دیکھا ہو جبکہ لیمنٹ اپنی بات پر قائم رہا کہ وہ تقریباً ایک سال سے جیبن فری اسٹور کی طرف نہیں گیا۔ سونی نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ لیمنٹ کے حقوق دوبارہ پڑھے اور لیمنٹ کا بیان ریکارڈ کر لیا جس میں اس نے یہی بات دہرائی کہ وہ ایک سال سے جیبن فری اسٹور کی طرف نہیں گیا۔ جب وہ اپنا بیان ختم کرنے والا تھا تو اس نے یونہی کہہ دیا۔ ''بے چارہ ہڈسن۔ اس نے اپنی ٹھوڑی کو کیوں ہاتھ لگایا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟''

''اوہ۔'' لیمنٹ اپنی رو میں بول اٹھا۔

''کیا اس طرح وہ کوئی اشارہ کر رہا تھا؟'' سونی نے کہا۔

لیمنٹ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''وہ کوئی اشارہ نہیں تھا۔ دراصل اس بوڑھے بے وقوف کی ٹھوڑی پر بندھی بینڈ ایج کھل گئی تھی۔''

''یہ کب ہوا تھا؟'' سونی نے پوچھا۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتا البتہ میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' لیمنٹ پوری طرح سونی کے جال میں پھنس چکا تھا اور بھول گیا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ جیبن فری اسٹور میں اپنی غیر موجودگی پر اصرار کر چکا ہے۔

لیمنٹ سے مزید کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ وہ اس معاملے میں بالکل بھی پریشان نہیں تھا۔ البتہ بیان ختم ہونے کے بعد اس نے سونی سے اس کا نام جاننے کی فرمائش کی تو اس نے اسے اپنا کارڈ پکڑا دیا۔ وہ کارڈ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ کارڈ کو کین کیس کے جج کو دوں گا تاکہ اس پر ظاہر ہو سکے کہ میں پولیس سے تعاون کرتا ہوں۔''

دوسرے روز علی الصباح سونی مردہ خانہ پہنچ گیا جہاں اس کی ملاقات پیتھالوجسٹ ڈاکٹر گونز سے ہوئی۔ اس نے سونی کی بات سن کر سر ہلایا اور بولا۔ ''نیچے ریکارڈ روم میں چلے جاؤ۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ ویسے میں نے علیحدہ سے بھی اس پر تفصیلی نوٹ لکھا ہے۔''

سونی کو ایک گھنٹے بعد وہ رپورٹ ملی جس سے یہ تصدیق ہو گئی کہ جس روز ہڈسن کو قتل کیا گیا، اس کی ٹھوڑی پر بینڈ ایج بندھی ہوئی تھی۔

''اس کی گرفتاری کے وارنٹ کے لیے یہ ثبوت ہی کافی ہے۔'' جوڈی نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ سونی اس وقت اپنے کمپیوٹر پر سرچ وارنٹ ٹائپ کر رہا تھا۔ جوڈی بولی۔ ''سرچ وارنٹ تو یقینی طور پر مل جائے گا۔''

ڈسٹرکٹ کرمنل کورٹ کا جج مارکوس سمر سرچ وارنٹ جاری کرنے پر رضامند ہو گیا اور اس نے بے چون وچرا اس پر دستخط کر دیے۔ اورس لیمنٹ کا گھر فیلی ٹی اسٹریٹ کے عقب میں واقع تھا۔ جب سراغ رساں اور باوردی پولیس افسروں نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو انہیں ایک ناگوار بو کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں یوں لگا جیسے آس پاس کسی نے کوڑا جلایا ہو۔ لیمنٹ کی ماں پولیس کو دیکھ کر غصے میں آ گئی اور اپنی پانچ سالہ بیٹی کو لے کر لیونگ روم میں چلی گئی۔

تلاشی کے دوران سونی کو لیمنٹ کے بستر کے نیچے سے کینڈی کے ریپر ملے۔ اس کے علاوہ نائن ایم ایم کا پستول بھی نظر آیا جس کے میگزین میں چھ راؤنڈ باقی تھے۔ اس کی ماں نے پہلے کبھی یہ ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔ سونی نے اس کی بیٹی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ تمہاری گن ہے؟''

''یہ پستول لیمنٹ کا ہے۔'' بچی نے جواب دیا۔

اس کی ماں نے بیٹی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور سونی کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک بچی سے سوالات کر کے ہمارے حقوق کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔''

سونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر کے باہر لوگوں کا

ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا جنہیں پولیس والوں نے دور رکھا ہوا تھا۔ سونی کو اس ہجوم میں ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا اور وہ پادری ملٹن کے پاس جانے لگا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سونی نے پولیس والوں کو اشارہ کیا کہ اسے آنے دیا جائے۔

ملٹن نے لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے تم اس کیس پر کام کرو گے تو بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکو گے۔“

”تمہیں اورس لیمنٹ کے بارے میں معلوم تھا کہ اس کے پاس پستول ہے اور یہ قتل اسی نے کیا ہے؟“

”ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔“ پادری نظریں جھکاتے ہوئے بولا پھر اس نے اورس لیمنٹ کی ماں کی طرف دیکھا جو اپنی بیٹی کے ساتھ دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی تھی۔ ملٹن نے اس سے پوچھا۔

”کیا میں اس کی ماں سے بات کر سکتا ہوں؟“

سونی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگ جا رہے ہیں۔“

ملٹن نے اس کا بازو پکڑا اور بولا۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ نہیں دیکھا۔ اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ہر شخص یہی کہہ رہا ہے۔ لیمنٹ نے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ پولیس کو کچھ نہ بتاؤں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

اس پستول کا لیبارٹری میں معائنہ کیا گیا تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ جائے وقوعہ پر پائے جانے والے گولیوں کے خول اور پوسٹ مارٹم کے دوران جیک ہڈسن کے دماغ سے نکلنے والی گولی اسی پستول سے چلائی گئی تھی۔ سونی ایک مرتبہ پھر جین فری اسٹور گیا اور لیمنٹ کے بستر کے نیچے سے ملنے والے کینڈی کے ریپر کا موازنہ اسٹور میں رکھے ہوئے اسٹاک سے کیا۔

وہ دفتر واپس آ کر گرفتاری کا وارنٹ ٹائپ کرنے لگا۔ ابھی اسے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ لیبارٹری سے فون آ گیا۔ ذمے دار آفیسر کا کہنا تھا۔ ”جائے وقوعہ سے ملنے والے گولیوں کے خول اور مقتول کے دماغ سے نکلنے والی گولی اسی پستول سے چلائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کارتوس پر سے تمہارے مشتبہ شخص کی انگلی کا نشان بھی مل گیا ہے۔“

سونی نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔ اسے وقت سے پہلے اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے تھا۔ پھر اسے بیٹیوں کو فون کرنا تھا۔ اس کے بعد وہ جج کے پاس جا کر وارنٹ پر دستخط کرواتا پھر اورس لیمنٹ کی شام برباد کرنے کے لیے روانہ ہو جاتا۔

سونی اور جوڈی ایف بی آئی کی انتظار گاہ میں ایلن بشپ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر پُرجوش انداز میں مسکرایا لیکن جوڈی اس وقت مسکرانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ بشپ ایک فائل سونی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارے ویڈیو ٹیپ اور تصویر کے موازنے کی سرکاری رپورٹ ہے۔ یاماساکی ان ثبوتوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تمہیں عدالت میں گواہی کے دوران مل جائیں گے۔“

سونی نے جوڈی اور بشپ کا آپس میں تعارف کروایا پھر اپنے پرانے دوست کو اورس لیمنٹ کی گرفتاری کی تفصیل بتانے لگا۔ اس دوران میں جوڈی صوفے پر خاموش بیٹھی رہی جبکہ وہ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”اس نے وکیل کر لیا ہے۔“ سونی نے کہا۔ ”لیکن ہم نے اس کے خلاف مضبوط کیس بنایا ہے۔“

”گڈ... مجھے خوشی ہو گی اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

جوڈی نے بشپ کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تمہاری تھوڑی سی مدد اور چاہیے۔“

بشپ نے لفافہ کھولا اور اس میں رکھا ہوا خط نکال کر پڑھنے لگا۔ پھر اس نے پہلے سونی اور بعد میں جوڈی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم اس بارے میں سنجیدہ ہو؟“

”کیا میں تم سے مذاق کر سکتی ہوں؟“ جوڈی نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں چودہ سال سے سراغ رسانی کر رہی ہوں اور نہ ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس اس طرح کے خط پر مذاق میں دستخط کر سکتا ہے۔“

”سنگین جرم میں بدعنوانی۔“ بشپ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”تمہارا باس اور ڈسٹرکٹ اٹارنی، بے ایمان پولیس والوں کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے لیکن اس کے لیے صرف انہی کو کیوں ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے... اور... لوگوں پر بھی یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔“

بشپ نے سونی کی طرف دیکھا جو کہہ رہا تھا۔ ”اسٹور میں کسی کو گولی مارنا اور پل پر کھڑے ہوئے شخص کو گولی مارنے میں کیا فرق ہے؟“

”تم ڈیزینگر پر ہونے والے قتل کی بات کر رہے ہو؟“

”ہم فیلی سٹی اسٹریٹ کی بات کر رہے ہیں جہاں پر لوگ جرم کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور پولیس سے تعاون نہیں کرتے۔ میرے پاس ایسے لوگوں کی فہرست موجود ہے۔“

”اسے تو قومی جرم سمجھنا چاہیے۔“ بشپ نے کہا۔

”میرے ملزم نے ایسا ہی جرم کیا ہے۔ قانون کے مطابق جو شخص سنگین جرائم میں ملوث رہا ہو، وہ کسی قسم کا اسلحہ نہیں رکھ سکتا۔ ایسا کرنے کی صورت میں اسے دس سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔“

بشپ نے جوڈی کی طرف دیکھا جس نے اپنی فائل میں سے ایک کاغذ نکال لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ دونوں مردوں کو دیکھا اور وہ کاغذ پڑھنے لگی۔ ”اگر کوئی شخص کسی سنگین جرم کے بارے میں جانتا ہو اور اس بارے میں پولیس یا عدالت کو فوری اطلاع نہ دے تو اسے امریکی قانون کے تحت جرمانہ اور زیادہ سے زیادہ تین سال کی سزا ہو سکتی ہے۔“

”اس کیس میں بھی یہی ہوا۔ پورے علاقے کے لوگ مجرم کے بارے میں جانتے تھے لیکن انہوں نے مجھ سے ہر بات چھپائی اور اس طرح انصاف کے راستے میں رکاوٹ بن گئے۔“ سونی نے بات کو آگے بڑھایا۔

بشپ نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”میں تو ڈیزینگر والے کیس پر کام کر رہا ہوں۔“

”جانتا ہوں۔ اسی لیے ہم لوگ یہاں آئے ہیں تاکہ تمہیں اس مسئلے کی سنگینی کا احساس دلا سکیں۔“

”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ بشپ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا حالانکہ جوڈی کا دیا ہوا خط پڑھ کر وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

”اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اورس لیمنٹ کے سارے دوست، رشتے دار اور پڑوسی اس کا جرم چھپانے کی کوشش کر رہے تھے جو قانون کی نظر میں بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر یہ کیس فیڈرل گرانڈ جیوری کے پاس چلا جائے۔“

بشپ نے دروازے کی طرف دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”بہتر ہے کہ تم کوچ کو فون کر دو۔“ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ یہ کام اس کے بس سے باہر ہے۔

”میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں۔“ سونی اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”میں یہ معاملہ اسسٹنٹ اسپیشل ایجنٹ انچارج کے سامنے رکھ دوں گا۔“ بشپ نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”جو لوگ اس طرح کے سنگین جرائم میں بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں یا مجرم تک پہنچنے میں قانون کی مدد نہیں کرتے، ان کی نشاندہی ہونی چاہیے۔ اسی طرح لوگوں میں قانون کا خوف پیدا ہو گا اور اس کے بعد ہی ہم مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔“ جوڈی نے کہا۔

سونی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اپنے انچارج سے کہہ دینا کہ اب ایف بی آئی کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور سیاست دانوں، ججوں اور بدعنوان پولیس والوں کا پیچھا کرنے کے بجائے اسٹریٹ کرائمز پر توجہ دینی چاہیے ورنہ لوگ اسی طرح قتل ہوتے رہیں گے اور عینی شاہدین سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھیں گے۔“

بشپ بھی کھڑا ہو گیا۔ سونی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ بدعنوان پولیس والوں، ججوں اور سیاست دانوں کا پیچھا چھوڑ دو۔“

جوڈی بولی۔ ”بشپ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ایف بی آئی کو اسٹریٹ کرائمز کے حوالے سے ایسے لوگوں پر نظر رکھنا ہو گی جو سنگین جرائم میں ملوث مجرموں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بشپ کی طرف بڑھا دیا۔

بشپ نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے خیال میں اس سے کچھ فائدہ ہو گا؟“

جوڈی چلتے چلتے بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ اٹارنی کو... ٹی وی کیمرے کے سامنے آنے کا کتنا شوق ہے۔ اگر تم لوگوں نے کچھ کیا تو ہمارا سپرنٹنڈنٹ اس کیس کو ٹی وی پر لے جائے گا۔ اسے پبلسٹی حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کب مل سکتا ہے۔“

واپس آتے ہوئے سونی نے راستے میں جوڈی سے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں یہ طریقہ کارآمد ہو سکتا ہے؟“

”مجھے تو کوئی امکان نظر نہیں آتا۔“ جوڈی نے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“

”لیکن وہ اس بارے میں سوچیں گے ضرور۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ سورج کی طرف کر لیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ محض پولیس اور مجرموں کا مقابلہ نہیں بلکہ ہم دنیا سے لڑ رہے ہیں اور اس لڑائی میں جیت ہماری ہو گی۔“

* * *

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

اسماقادری

قسط 48

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو ۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے ۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے ۔ جرم، افسر شاہی، جاگیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بُری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شازمین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شازمین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر ہے۔ شازمین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ را والے شازمین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شازمین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ کو... مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شازمین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شازمین خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسے اپنے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور سلو، شہریار کے ساتھ مشن پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگاران کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو مبینہ را کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اندر نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی جو مبینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو کچھ لوگ اٹھا لے جاتے تاہم اندو نامی لڑکی کی مدد سے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اندو انہیں دوبارہ دہلی کی ٹرین میں سوار کروا دیتی ہے لیکن وہ بیچ راستے میں اتر ہیں۔ وہ ایمبولینس کے ڈرائیور کو قابو کرتے ہیں مگر ایک شخص اچانک ان پر گن تان لیتا ہے۔ سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ شہریار اور سلو اپنے حلیے میں تبدیلی کر لیتے ہیں اور کلام نامی ایجنٹ سے ملاقات کرنے جاتے ہیں اور وہاں ایک مشکوک بندے کو پیچھا کرنے پر پکڑ کر ممبئی کے ایک علاقے میں واقع خالی گھر میں لے آتے ہیں۔ وہ شخص پولیس کا مخبر ہے۔ اس لیے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ کلام لاش ٹھکانے لگانے کے لیے انتظامات کرنے جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے۔ پولیس ورلڈ کے عبدالرحمٰن کی تلاش میں آتی ہے۔ تاہم وہ پولیس کے سامنے مشکوک ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ پھر شہریار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اسے اغوا کر لیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپسی پر گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم ماہ بانو کے غیاب پر پریشان ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اسلم کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ماہ بانو غائب ہے... یہ جان کر اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا اور اس کے بغیر خود کو ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بغیر روح کے مٹی کا بے جان جسم ہو۔

"آپ نے کلینک میں اچھی طرح دیکھا تھا باجی؟ ہو سکتا ہے وہ وہیں ہو اور واش روم وغیرہ چلی گئی ہو۔ اکیلی وہ وہاں سے کیسے کہیں جا سکتی ہے؟" مبہم سی امید کے سہارے اس نے اپنی رکتی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے ریسیپشن پر معلوم کیا تھا اور ان لوگوں یہی بتایا تھا کہ مسز مہرین اسلم ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کے بعد روانہ ہو چکی ہیں۔" بلقیس جو اپنی جگہ خود پریشان اور شرمندہ تھی، آہستہ سے بولی۔ مہرین، ماہ بانو کا نام تھا جو اس کی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے شہریار اسے دیا تھا اور وہ اسی نام سے امریکا آئی تھی۔

"میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ وہاں سے کہیں جا نہیں سکتی۔" اسلم بڑبڑانے کے انداز میں بولا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ بلقیس نے پریشانی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر ذرا ہمت سے کام لے کر مصطفیٰ کا سیل نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی۔ پتا نہیں وہ کہاں مصروف تھا جو اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔ اس طرف سے ناکام ہو کر اس نے کشور کا نمبر ملایا۔ اس گھر کے علاوہ پورے آرلینڈو میں واحد وہی جگہ تھی جہاں ماہ بانو اسپتال سے نکل کر جا سکتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کشور نے اپنے شائستہ لہجے میں کال کا جواب دیا اور ذرا چہک کر بولی۔

"بلقیس بھابی! کیسی ہیں آپ؟ میں آپ لوگوں کو یاد ہی کر رہی تھی۔"

"کن کن لوگوں کو...؟" بلقیس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا جس پر وہ ہنسی اور پھر بولی۔

"آپ کی اور ماہ بانو کی فیملی کو۔ کیسی ہے وہ؟ ایسی حالت میں جاب کرنے سے پریشانی تو محسوس نہیں کر رہی؟"

کشور کی باتوں سے ہی ظاہر تھا کہ ماہ بانو اس کے ہاں نہیں پہنچی پھر بھی بلقیس نے اس سے پوچھ لیا۔

"ماہ بانو تمہارے گھر تو نہیں آئی کشور؟"

"نہیں تو... کیا اسے یہاں آنا تھا؟ کب نکلی تھی وہ گھر سے؟" کشور کو احساس ہوا کہ بلقیس کے لہجے کی شگفتگی غائب ہے اور وہ کچھ پریشان لگ رہی ہے۔ جواب میں بلقیس نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ اطلاع سن کر کشور لمحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ ماضی میں بھی کئی بار ماہ بانو غائب ہو چکی تھی اور غیاب میں اکثر اس کے اپنے والد بزرگوار چودھری افتخار عالم شاہ کا ہاتھ ہوتا تھا۔ وہ نیویارک میں چودھری کے وسیع اختیارات کا ایک مظاہرہ بذاتِ خود بھگت چکی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ شک کرنے میں حق بجانب تھی کہ یہاں بھی اس کے والد نے ہی کوئی ہاتھ دکھایا ہے اور اگر وہ آرلینڈو تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو یہ سوچنا غلط نہیں تھا کہ وہ اور آفتاب بھی بچی سمیت خطرے میں ہیں۔

"ہیلو کشور... تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟" اس کی مسلسل خاموشی پر بلقیس نے اسے پکارا تو وہ ہوش میں آئی۔

"میں نے آپ کی بات سن لی ہے اور سوچ رہی ہوں کہ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اصولاً تو اسے کلینک پر ہی آپ کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور اگر دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی روانہ ہو گئی تھی تو اب تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بہرحال تھوڑی دیر اور انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں پھر میں آفتاب کے ساتھ آپ کے گھر آ جاؤں گی۔" اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا تو بلقیس کو تھوڑا حوصلہ محسوس ہوا۔

"پلیز کشور! تم لوگ ذرا جلدی آ جاؤ۔ باہر بارش شروع ہو چکی ہے اور یہاں کے موسم کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب کیا رخ اختیار کر لے۔ میں طوبیٰ کے ساتھ گھر میں اکیلی ہوں۔ مصطفیٰ اپنے کسی کام سے گئے ہوئے ہیں اور آج واپس بھی نہیں آئیں گے۔ میں کوشش کر رہی ہوں لیکن میرا ان سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔" گھر میں تنہا رہنا بلقیس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ ہی وہ بہت کمزور اعصاب کی مالک عورت تھی لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ماہ بانو کی گمشدگی کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی۔

"آپ گھبرائیں نہیں بھابی! ہم کوشش کرتے ہیں کہ جلد آپ کے پاس پہنچ جائیں۔" اس کی کیفیت محسوس کر کے کشور فی الحال اپنی تشویش کو بھول گئی اور اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ بلقیس ایک بار پھر مصطفیٰ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس بار بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مصطفیٰ کے گھر سے دور رہنے کی صورت میں اس سے رابطہ نہ ہو سکنا بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا کہ اپنے کام میں کھو کر بیوی اور بچی کو بھلا بیٹھتا تھا لیکن آج اسے مصطفیٰ کی یہ عادت ہمیشہ سے زیادہ بری طرح کھلی اور اس نے طے کر لیا کہ واپس آنے کے بعد اسے اس کی اس حرکت پر خوب باتیں سنائے گی۔

☆☆☆

اسلم کو اس وقت ماہ بانو کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بھول گئی تھی۔ وہ اسٹور، دیگر ملازمین پر چھوڑ کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا اور دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے فرض شناسی دکھانے کی خاطر ماہ بانو کو اکیلا چھوڑ دیا۔ جو معاملہ اس کے علم میں آیا تھا اس کے مطابق وہ بلقیس کو بھی زیادہ قصوروار نہیں قرار دے سکتا تھا۔ قصور تو اسے بس اپنا ہی لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی سب سے قیمتی شے کی ذمے داری کسی اور کو سونپی ہی کیوں جبکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کچھ ایسے دشمن ہیں جو اسے ہر حال میں اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

پریشانی اور پچھتاوے کی ملی جلی کیفیت میں وہ ایک کیب میں اس کلینک کے لیے روانہ ہوا جہاں ماہ بانو اپنا چیک اپ کرواتی تھی۔ کلینک پہنچ کر اس نے استقبالیہ سے معلومات حاصل کیں تو اسے بھی وہی جواب ملا جو بلقیس کو دیا گیا تھا۔

"آپ لوگ اچھی طرح چیک کریں، ہو سکتا ہے وہ یہیں ہو اور آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہو کہ وہ یہاں سے روانہ

ہو چکی ہے۔'' اس نے خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے استقبالیہ پر موجود شخص سے کہا۔

''غلط فہمی کی بات ہی نہیں ہے سر! ہم نے پوری ذمے داری سے آپ کو یہ اطلاع دی ہے۔'' اس شخص نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔ میری بیوی یہاں آئی تھی اور یہاں سے وہ اکیلی کہیں نہیں جا سکتی۔'' اس شخص کی بے نیازی پر لمحہ بھر میں ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہو۔ تم گھر جا کر انتظار کرو، ایک آدھ دن میں واپس...'' اس کے طیش میں آنے پر وہ شخص بھی بدگوئی پر اتر آیا لیکن اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور اسلم کے ایک زوردار گھونسے نے اس کے ہونٹوں کو پھاڑنے کے ساتھ دو دانت بھی توڑ دیے۔

''الزام لگاتا ہے۔ میری پاکباز بیوی پر انگلی اٹھاتا ہے۔'' اس نے صرف مکا مارنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گردن سے پکڑ کر اس شخص کو کاؤنٹر کے پیچھے سے کھینچ کر نکال لیا۔ فوراً ہی وہاں افراتفری مچ گئی۔ ریسپشن پر اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے چیخ کر گارڈ کو پکارا۔ گارڈ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی وہاں آ گئے۔ پھر بھی انہیں بپھرے ہوئے اسلم کو قابو میں کرنے میں اتنا وقت لگا کہ وہ ماہ بانو کی شان میں گستاخی کرنے والے کو چار چھ ہاتھ مزید جڑ چکا تھا۔

''چھوڑو مجھے۔ میں اس شخص کو بتاؤں گا کہ کسی عزت دار عورت پر الزام لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' کئی افراد نے مل کر اسے جکڑ رکھا تھا پھر بھی وہ فرطِ جوش سے چلا رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہاں پولیس پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے آتے ہی سب سے پہلے تو اسے ہتھکڑی لگائی پھر دیگر لوگوں سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ مضروب شخص کو پہلے ہی طبی امداد کے لیے وہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔

مضروب شخص کی ساتھی لڑکی نے سب سے پہلے اپنا بیان دیا۔ پولیس کو کال کرنے والی بھی وہی تھی۔ اپنے بیان میں اس نے کسی بھی قسم کی غلط بیانی سے کام لینے کے بجائے واضح الفاظ میں اسلم کی پریشانی اور اپنے ساتھی کے رویے سے پولیس والوں کو آگاہ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک پاکستانی کو خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے پولیس والوں کے انداز میں تھوڑی نرمی آ گئی۔

''ہم تمہارا مسئلہ سمجھ گئے ہیں مسٹر لیکن تمہیں چاہیے تھا کہ تشدد سے کام لینے کے بجائے پولیس کو انفارم کرتے۔ ان حالات میں ہم سے زیادہ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ بہر حال، تم یہاں آرام سے بیٹھو اور چاہو تو اپنے وکی دوسرے مددگار کو بلا لو۔ مجھے یقین ہے کہ زخمی ہونے و تمہارے خلاف قانونی کارروائی ضرور کرے گا۔ می ہوں کہ تمہاری بیوی کی بازیابی کے لیے کیا کیا جا سکتا سارجنٹ نے اسے سپاٹ لہجے میں حالات سے باخبر خود اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ اسلم بھی کوشش کرنے کسی طرح اپنے دماغ پر قابو پا سکے تاکہ اس صورت سے نمٹ سکے۔

اس کی خواہش پر اسے ایک گلاس پانی پلایا گیا وہ پانی پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کے موبائل کی گھ اٹھی۔ پولیس والوں کی طرف سے اسے کال ریسیو کر اجازت دے دی گئی۔ کال کرنے والا آفتاب تھا جو اس ماہ بانو کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ اس نے مختصر میں اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا جس آفتاب تشویش میں مبتلا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں عندیہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس دوران پولیس نے ماہ بانو کے بارے میں جو تحقیقات کیں، ان کے مطا حقائق سامنے آئے کہ مسز مہرین اسلم نے لگ بھگ تین قبل ڈاکٹر سے اپنا روٹین کا چیک اپ کروایا تھا اور کسی کچھ بھی کہے بغیر فوراً ہی کلینک سے باہر چلی گئی تھیں۔ کل پہنچنے کے بعد ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسلم نے اپنے بیان میں بتا کہ چیک اپ کے بعد اسے وہیں ٹھہر کر مسز مصطفیٰ خا انتظار کرنا تھا جو کہ اسے پک کرنے کے لیے وہاں آنے تھیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ ماہ بانو مرضی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ کلینک میں نصب د کیمروں نے بھی عملے کے اس بیان کی تصدیق کی تھی جس اسلم بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی جسے ماہ بانو کے ازخود کہیں جانے کا سبب قرار دے سکے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی پا رہا تھا کہ ماہ بانو کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے کلینک سے باہر نکلی ہوگی لیکن کسی ناگہانی آفت نے ا واپس نہیں آنے دیا۔ اس نے سارجنٹ پر بھی اپنا یہ ظاہر کر دیا۔

''اوکے، ہم چیک کر لیتے ہیں لیکن ہمارے ر کے مطابق شہر میں ٹریفک کا ایسا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا جس میں کسی خاتون کے متاثر ہونے کی اطلاع ملی ہو۔ وغیرہ کی بھی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال، تم مسز کا سیل نمبر مجھے دے دو۔ وہ اپنی مرضی سے یا زبردستی جہاں بھی گئی ہے، ہم اس کا پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔'' سارجنٹ نے غیر جذباتی انداز میں اس سے کہا تو اس نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر اسے ماہ بانو کا سیل نمبر دے دیا۔ اسی اثنا میں آفتاب وہاں پہنچ گیا۔

''تم نے رپورٹ میں چودھری صاحب پر شک ظاہر کیا ہے یا نہیں؟'' اس نے پہلے وہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر اسلم سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چودھری صاحب بھلا یہاں کہاں؟'' اس نے نڈھال سی حالت میں جواب دیا۔

''تم انہیں کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ حضرت اپنی سگی بیٹی اور مجھے کرائے کے غنڈوں سے ہلاک کروانے کی کوشش کر چکے ہیں۔'' آفتاب نے اسے جواب دیا اور پھر مڑ کر سارجنٹ سے اس بارے میں بات کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے، ہم چیک کر لیتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں سے دھواں دھار برستی بارش صاف نظر آ رہی تھی۔ آفتاب نے اسلم کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں تھپکی دی اور خود اس شخص کی خیریت معلوم کرنے چلا گیا جو اسلم کے ہاتھوں مجروح ہوا تھا۔ اس شخص سے مل کر اس کا اشتعال دور کرنے اور اسلم کے لیے ہمدردی کے جذبات جگانے میں اسے کچھ وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکا کہ اسلم کو اپنے ساتھ گھر لے جا سکے۔ اس دوران میں بارش نے مزید زور پکڑ لیا تھا اور طوفانی جھکڑ چلنے لگے تھے۔ آفتاب یہاں بلقیس کی گاڑی میں آیا تھا۔ موسم کی شدت کے باعث اسے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھنی پڑ رہی تھی۔ برابر والی سیٹ پر کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے اسلم نے بھی کوئی بات نہیں کی اور بس ونڈ اسکرین کو دیکھتا رہا جہاں تیزی سے چلتے وائپرز شیشے سے پانی کی چادر کو ہٹانے کی پوری کوشش کر رہے تھے لیکن لمحہ بھی نہیں گزرتا تھا اور یہ چادر دوبارہ تن جاتی تھی۔ دھندلائے ہوئے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں دھندلا گئیں اور دل میں ہوک سی اٹھی کہ جانے اس خطرناک موسم میں ماہ بانو کہاں ہوگی اور کن مشکلات میں گھری ہوئی ہوگی۔ آسمان پر گاہے بگاہے کڑکتی بجلی اس کے اعصاب کو بھی جھٹکے لگا رہی تھی۔ اس شدید موسم میں تو ماہ بانو اور ان کے ہونے والے بچے کو اس کے مضبوط بازوؤں کی پناہ کی ضرورت تھی لیکن نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔ راستے بھر انہی سوچوں میں گھرا جب وہ آفتاب کے ساتھ مصطفیٰ خان کے گھر پہنچا تو گاڑی سے اتر کر سیدھا انیکسی کا رخ کیا۔ آفتاب نے چاہا کہ اسے پکارے اور زبردستی سب کے درمیان لے جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسے جو جھٹکا لگا تھا، اس سے سنبھلنے کے لیے تنہائی درکار تھی۔

ادھر اسلم ہر چیز سے بے نیاز انیکسی میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف ماہ بانو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بلا مقصد ہی اِدھر سے اُدھر گھومنے لگا۔ ان کی چھوٹی سی اس جنت میں ہر شے قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھی اور کہیں گرد و غبار کا معمولی سا بھی نشان نہیں تھا۔ خواب گاہ میں موجود بیڈ کی بے شکن چادر میں اسے ماہ بانو کے ریشمی جسم کی سرسراہٹیں محسوس ہوئیں تو وہ گھبرا کر وہاں سے نکل آیا اور کچن میں پہنچ گیا۔ جگ مگ کرتے صاف ستھرے کچن میں چولہے پر دھری دیگچی کا ڈھکن کھول کر دیکھا تو اس میں بریانی کے لیے تیار کی گئی یخنی نظر آئی۔ اپنے ٹوٹتے ہوئے اعصاب کے باوجود وہ سمجھ سکتا تھا کہ آج رات کے کھانے میں ماہ بانو اس کے لیے بریانی بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے دیگچی فریج میں رکھنے کے ارادے سے اٹھا لی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کلینک پہنچنے سے قبل بنائی گئی یخنی گرم ہونے کی وجہ سے وہ فریج میں رکھنے کے بجائے باہر ہی چھوڑ گئی ہوگی۔ وہ اس کی بنائی گئی یخنی کو محفوظ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ واپس آ کر اس سے بریانی تیار کر سکے۔ فریج کا دروازہ کھول کر یخنی اندر رکھتے ہوئے اس کی نظر کسٹرڈ کے پیالے پر پڑی۔ اس کے گلے میں یکدم ہی کوئی گولا سا پھنس گیا۔ کہنے والوں نے کتنی آسانی سے کہہ ڈالا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے لیکن یہاں سارے آثار تو یہ بتاتے تھے کہ اسے لوٹ کر واپس یہیں آنا تھا اور اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنا تھا۔

وہ سخت آزردہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ استری اسٹینڈ پر انگوری رنگ کا لباس رکھا ہوا تھا۔ یہ لباس ماہ بانو پر خوب سجتا تھا اور اسلم کا من پسند تھا شاید اسی لیے اس نے نکال کر استری کرنے کے لیے رکھا تھا تاکہ جب شام ڈھلے وہ واپس آئے تو اس کے من پسند لباس میں اس کا استقبال کر سکے۔ وہ شام ڈھلنے سے بہت پہلے آ گیا تھا لیکن استقبال کرنے والی کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں سے بے جگری سے ٹکرا جانے والے اسلم کا یہ سب دیکھ کر جگر پاش پاش ہونے لگا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر کسی ننھے بچے کی طرح دھواں دھار رونے لگا۔ آسمان سے

برستے پانی نے اس کا دکھ بانٹنے کے لیے کچھ اور شدت سے برسنا شروع کر دیا اور نشریاتی اداروں سے خبر نشر کی جانے لگی کہ آرلینڈو میں ایک اور ہری کین آنے کو ہے۔

☆☆☆

مال گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی تھی اور وہ اندھیری رات میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں اتنی ایمرجنسی میں وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کہ وہ اپنی منزل کا بھی تعین نہیں کر سکے تھے۔ بس خوش قسمتی یہ تھی کہ پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئے تھے اور فی الحال محفوظ تھے۔ لیکن یہ سلامتی بھی انہیں پریم ناتھ جیسے قیمتی آدمی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بدلے میں حاصل ہوئی تھی۔

''یہاں سے نکلنے کے بعد تمہارے پاس کوئی دوسرا ٹھکانا ہے؟'' شہریار نے سرگوشی میں کلام سے دریافت کیا۔

''میرا ذاتی تو کوئی ٹھکانا نہیں ہے لیکن ایک آدھ جگہ رابطہ کرنے پر انتظام ہو جائے گا۔'' کلام نے بھی دھیمے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ البتہ سلو ان سے بے نیاز اندھیرے میں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے کسی نادیدہ شے کو تلاش کر رہا ہو۔

''ٹھیک ہے پھر تم جہاں مناسب سمجھو، وہاں اتر کر اپنے اس محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جانا۔ تمہارا موبائل تو تمہارے پاس ہی ہے نا؟ بھاگ دوڑ میں کہیں گرا تو نہیں؟''

''موبائل محفوظ ہے۔'' کلام نے مختصر جواب دیا۔

''بس تو پھر تم ابھی اپنے لیے بندوبست شروع کر دو۔ پریم ناتھ کے تمہارے گاڑی سے بازیافت ہونے کے بعد وہ لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ نمبر بھی معلوم کر لیں اور اس کی مدد سے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔'' شہریار نے مشورہ دیا۔

''یہ نمبر میرے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہے اور صرف وہی لوگ اس نمبر سے واقف ہیں جو میری اصلیت سے بھی واقف ہیں۔ میری جان پہچان کے عام لوگوں کے پاس میرے فلیٹ میں موجود لینڈ لائن کا نمبر ہی ہوتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے اسے بتایا پھر بولا۔ ''آپ مجھے اترنے کا مشورہ دے رہے ہیں یعنی خود میرے ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے؟''

''تم ٹھیک سمجھے۔ ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے اور پھر تم سے رابطہ کریں گے۔ حالات خراب ہونے کی صورت میں بھی تمہارے محفوظ رہنے سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ پیچھے والوں کو ہمارے انجام کی خبر ہو جائے گی اور وہ کسی دوسری ٹیم کو اس مشن کی تکمیل کے لیے بھیج سکیں گے۔'' اس نے بُ سے اس کے سوال کا جواب دیا تو کلام خاموش ہو گیا۔ ان پیشے میں جذبات کو پسِ پشت ڈالنا پڑتا تھا۔ اس وقت شہ جو کہہ رہا تھا، وہی مناسب تھا۔ جس پل ان کی یہ گفتگو اختتام پذیر ہوئی، اسی پل سلو یوں بھڑک کر کھڑا ہوا جیسے کسی جنگل میں خطرے کی بو سونگھ کر غزال وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ دونوں بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ان پر ایک جال آ پڑا اور وہ اس میں الجھ کر رہ گئے۔

''اپنے ہتھیار پھینک کر الٹے لیٹ جاؤ ورنہ گولیوں سے بھونے جاؤ گے۔'' سخت لہجے میں دھمکانے والے نے اپنی طاقت کا عملی ثبوت دیا اور ان کے کانوں نے مشین گن چلنے کی آواز سنی۔ شہریار نے ہل جل کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن جانے جال کس انداز میں پھینکا گیا تھا کہ وہ اس میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ سلو اور کلام نے بھی شاید اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھی تھی لیکن انہیں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''اگر تم لوگوں نے میرے تین تک گننے تک اپنے ہتھیار نہیں پھینکے تو تمہارے جسموں کو چھید دیا جائے گا۔'' اس دھمکی کے ساتھ ہی فضا ایک بار پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی لیکن اس بار مشین گن مخالف سمت سے چلائی گئی تھی۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کے مقابل آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر موجود ہیں جبکہ وہ درمیانی خالی جگہ پر ہونے کی وجہ سے کسی طور محفوظ نہیں تھے۔ ان پر جال نہ بھی پھینکا جاتا تو اس پوزیشن میں وہ کسی صورت اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' شہریار نے سرگوشی میں ان دونوں سے کہا اور خود سب سے پہلے عمل کیا۔ کلام اور سلو کے پاس بھی اس کی پیروی کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ ہتھیار پھینکنے کے بعد وہ حسبِ ہدایت مال گاڑی کے آہنی فرش پر الٹے لیٹ گئے۔ فوراً ہی آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر سے چند افراد دھنادھن نیچے کودے اور ان کے ہتھیاروں کو قبضے میں لے لیا۔ پھر ایک شخص عین ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ چست لباس میں چھپا ہوا تھا جس کی آنکھوں اور ناک کی جگہ پر سوراخ تھے۔

''اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے حکم صادر کیا تو ان تینوں نے فوراً ہی عمل کیا۔ فرش پر الٹے لیٹے رہنے کے مقابلے میں بیٹھنا زیادہ بہتر تھا۔ کم از کم اس طرح وہ اپنے مقابل کو دیکھ سکتے تھے۔ بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر طاقت ور ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی جس نے ان کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔

''کس کے آدمی ہو؟'' اس نے چہروں سے انہیں شناخت کرنے میں ناکام ہو کر سرد لہجے میں پوچھا۔

''کسی کے نہیں۔'' حسبِ روایت جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی اور ٹارچ بند ہو جانے کے بعد مخاطب کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں وہ اپنے سیاہ چست لبادے کی وجہ سے محض ایک سائے کی طرح ہی نظر آ رہا تھا جسے وہ کسی طور شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ پولیس والا نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ محض اتفاقاً ہنگامی بنیادوں پر اس مال گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور یہ کسی طور ممکن نہیں تھا کہ پولیس والے ان کے انتظار میں پہلے سے وہاں چھپے بیٹھے ہوں۔

''چلتی مال گاڑی پر کیوں سوار ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور سوال داغا۔ یوں تو وہ تنہا ہی ان سے گفتگو کر رہا تھا لیکن وہ اس جیسے مزید سایوں کو اپنے اردگرد محسوس کر سکتے تھے۔ تیز حسیات والا سلو انہی سایوں کی موجودگی کو بھانپ کر اپنی جگہ سے حرکت میں آیا تھا لیکن اسے تاخیر ہو گئی تھی۔

''اپنی جان بچانے کے لیے۔'' شہریار نے اختصار سے کام لیا۔ وہ خود کو گھیرنے والوں کی اصل حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا اس لیے بہت احتیاط سے گفتگو کر رہا تھا۔

''کس سے جان بچا کر بھاگے تھے؟'' اس کی طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔

''پولیس۔'' وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں ہے اس لیے یہ جواب دینے میں قباحت محسوس نہیں کی۔

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''ایک پولیس والے کی ٹھکائی کر دی تھی۔''

''کس لیے؟''

''سالا رشوت مانگتا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ڈیٹیل میں سب بتاؤ۔'' وہ آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جواب میں شہریار چپ رہا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟'' وہ غرایا۔

''تم اتنا سب پوچھ کر کیا کرو گے؟ ہم نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے۔ مال گاڑی رکے گی تو اتر کر اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔'' شہریار نے لہجے میں بیزاری سموتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ تجھے اگلنا ہوگا کہ تُو کس کا آدمی ہے اور اس مال گاڑی پر کیوں چڑھا جس میں بھائی جی کا مال جا رہا ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا اور ایک لات شہریار کے شانے پر رسید کر دی۔ ضرب شدید تھی لیکن اس کی توجہ اپنی تکلیف سے زیادہ اس کے الفاظ پر تھی۔ بھائی جی سے اس کا غائبانہ تعارف پہلے بھی تھا۔ ممبئی میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ تواتر سے یہ نام سن رہے تھے۔ بار بار بھائی جی کے آدمیوں سے ان کا ٹاکرا ہو جاتا تھا، ایک بار پھر وہ لوگ ان کے سامنے تھے اور یقیناً انہیں اشوک کا ساتھی سمجھ رہے تھے۔

''منہ بند کیے ٹکر ٹکر کیا دیکھے جا رہا ہے؟ میری بات کا جواب دے۔'' اس سے شہریار کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی اور اسے ایک اور لات دے ماری۔

''ہم کون ہیں اس سوال کا جواب میں عبدالرحمٰن کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔'' اس بار شہریار نے ذرا تیز لہجے میں جواب دیا۔ یہ تعین ہو جانے کے بعد کہ وہ بھائی جی کے آدمی ہیں اس کے لیے اس شخص سے گفتگو کرنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔

''کس عبدالرحمٰن کی بات کرتا ہے... اپنے عبدل بھائی کی؟'' اس نے ذرا استعجاب اور بے یقینی سے استفسار کیا۔

''ہاں اسی کی۔ اب مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی مت کرنا ورنہ خود تمہارا انجام برا ہو سکتا ہے۔'' اس نے اپنے لہجے کو مزید سخت اور سرد کر لیا۔ اس کے اس رویّے نے مقابل کو متذبذب کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہو لیکن یقین نہ کر کے کسی بدسلوکی کی ہمت بھی نہ کر پا رہا ہو۔ چند لمحے اسی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد بالآخر وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا اور فضا میں مخصوص انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ایک آدمی فوراً حرکت میں آیا۔ شہریار اور اس کے ساتھی صبر سے نتیجے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جال میں قید کئی مسلح افراد کے نرغے میں ان کے پاس ہاتھ پیر چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ انتظار کے چند پل بیتے تو انہوں نے سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس اس آدمی کے پیچھے موجود ڈبے کی دیوار میں لمبائی کے رخ روشنی کا ایک مستطیل دیکھا۔ یہ ڈبے میں کھلنے والا دروازہ تھا جس کے اندر روشن مدھم بلب کی روشنی اندھیرے میں بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں جال سے آزاد کیا جا رہا ہے لیکن یاد رکھنا کہ کسی بھی قسم کی چالاکی بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم تمہیں جو

رعایت دے رہے ہیں وہ عبدل بھائی کے نام کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنا آدمی مان لیا تو ہم پلکوں پر بٹھائیں گے ورنہ تو تم خود اپنا انجام سمجھ سکتے ہو۔" اب تک ان سے گفتگو کے فرائض انجام دینے والے شخص نے جال سے آزادی کی نوید سناتے ہوئے دھمکی دینا بھی ضروری سمجھا۔ ان کا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیزی سے چلتی مال گاڑی سے چھلانگ لگانے کی صورت میں اگر کسی طرح ان کی ہڈیاں سلامت رہ بھی جاتیں تو وہ گولیوں کی اس برسات سے کس طرح بچتے جو فائرنگ کے لیے تیار کھڑے افراد کی طرف سے کی جاتی۔ ان کے حق میں یہی سب سے بہتر تھا کہ وہ ان لوگوں سے تعاون کرتے اور عبدالرحمٰن تک پہنچ جاتے۔

پولیس کے مخبر ونود کو قتل کرنے کے بعد کلام کے ایک ٹھکانے پر وہ لاش کو کسی محفوظ جگہ پر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے تب عبدالرحمٰن وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بلڈنگ سے فرار ہوا تھا جہاں پولیس نے ریڈ مارا تھا اور وہاں سے پولیس کے ساتھ مقابلہ کرنے والے آہستہ آہستہ پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اس موقع پر عبدالرحمٰن کو پناہ دینا قبول کر لیا تھا اور عبدالرحمٰن نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ انہیں کبھی ضرورت پڑے تو وہ ممبئی شہر میں کسی سے بھی عبدل کا ٹھکانا پوچھ لیں۔ ٹھکانا معلوم کرنے کی تو نوبت نہیں آئی تھی لیکن وہ بھائی جی کے ساتھیوں سے آٹکرائے تھے۔ اسی بھائی جی کے ساتھیوں سے جس کا عبدالرحمٰن دایاں ہاتھ مانا جاتا تھا۔ اسلحے کی چھاؤں میں انہیں دروازے سے گزار کر ڈبے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈبے کا بیشتر حصہ فرش سے چھت تک ترتیب وار رکھے لکڑی کے مضبوط ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور درمیان میں بس اتنی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی کہ چند افراد سما سکیں۔ ان تینوں کو وہاں بچھی دری پر بٹھا دیا گیا۔ اسلحہ بردار اب بھی ان کے سروں پر سوار تھے حالانکہ اس ڈبے میں داخل کرنے سے قبل وہ ان کی جامہ تلاشی لے کر یہ چیک کر چکے تھے کہ پھینکے ہوئے اسلحے کے سوا ان کے پاس کوئی اور ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔

"اپنے نام بتاؤ۔ میں ابھی عبدل بھائی سے تمہارے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔" وہ شخص جو شاید یہاں کا انچارج تھا، شہریار کی طرف منہ کر کے بولا۔ اب تک ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہے وہ یہ اخذ کر چکا تھا کہ جیسے اپنے ساتھیوں میں سے گفتگو کرنے کے اختیارات اس کے پاس ہیں اسی طرح ان تینوں میں سے شہریار ہی اس کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

"میں نوشاد ہوں اور یہ قمرو... اس تیسرے کو تمہارا عبدل بھائی نہیں جانتا۔ ہمیں بھی پہچاننے سے انکار کرے تو یاد دلا دینا کہ ہم وہی ہیں جن کی موجودگی میں اس نے ایک گھر کے ٹینک میں چھپ کر پولیس سے اپنی جان بچائی تھی۔" شہریار نے اسے وہی نام بتائے جو کلام کے ٹھکانے پر بتا چکا تھا۔

"ٹھیک ہے، اپن بھائی سے بات کرتا ہے۔ جب تک تم ادھر آرام سے بیٹھو۔ کسی گڑبڑ کا سوچنا بھی نہیں۔ اس ڈبے میں گولی چلی تو سمجھو قیامت آجائے گی۔" دھمکیاں دی شاید اس کی عادت تھی۔

"ہم کسی گڑبڑ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ رہی گولی چلنے کی بات تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے آدمی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ انہیں خود بھی معلوم ہوگا کہ بارود کے اس ڈھیر میں کوئی چنگاری پیدا کرنے کا کیا انجام ہوگا۔" شہریار کو یک دم ہی اسے چھیڑنے کی سوجھی تو سلگانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان سے بولا۔

"کیا مطلب؟ تمہیں کیسے معلوم کہ یہ بارود کی پیٹیاں ہیں؟" وہ ٹھٹک گیا۔

"بھائی جی کا مال ہے تو ان پیٹیوں میں آم اور جامن تو ہونے سے رہے۔ سفید پاؤڈر وہ بیچتا نہیں ہے تو پھر ان پیٹیوں میں اسلحہ اور بارود ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تو کامن سینس کی بات ہے۔" اس نے نہایت سکون سے جواب دیا جس پر وہ اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ چھ منٹ بعد ہوئی۔

"عبدل بھائی بولتے ہیں کہ وہ تم لوگوں کو جانتے ہیں پر یہ مال گاڑی احمد آباد سے پہلے نہیں رکنے والی اس لیے تمہیں ہمارے ساتھ وہاں تک چلنا پڑے گا۔ بھائی خود بھی وہاں آنے والے ہیں۔ وہ وہیں تم سے ملیں گے۔ جب تک تم آرام سے ہمارے ساتھ رہو، کھاؤ پیو اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بولو۔" اس بار اس کا لہجہ واضح طور پر نرم تھا۔

"شکریہ، ہم بس تھوڑا سا پانی پینا چاہتے ہیں۔" اس نے اپنی خواہش بیان کی جو فوراً پوری کر دی گئی۔ پانی پینے کے بعد وہ تینوں پیٹیوں سے ٹیک لگا کر اور ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ بھاگ دوڑ اور اعصابی کشیدگی کے بعد ملنے والا یہ تھوڑا سا آرام بھی بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن دل میں ایک ملال بھی تھا۔ پریم ناتھ جسے انہوں نے بڑی آسانی سے اغوا کر لیا تھا، اس سے بھی زیادہ آسانی سے ہاتھوں سے نکل گیا تھا اور یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اب وہ اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنے والا ہے۔ دوسری طرف ایک بار پھر وہ ممبئی سے باہر جانے پر مجبور تھے۔ نہ جانے یہ شہر انہیں نکلنے کیوں نہیں دے رہا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ پہلے بھی وہ یہاں سے نکل کر گجرات کے شہر گاندھی نگر پہنچے تھے اور اب بھی گجرات کے ہی ایک دوسرے شہر احمد آباد لے جائے جا رہے تھے۔

☆☆☆

"کوئی رسپانس؟" جاوید علی دستک دے کر اس کمرے میں داخل ہوا جس میں آج کل عالیہ ٹھہری ہوئی تھی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"نو رسپانس۔" عالیہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اشتہار چھپتے ہوئے تین دن تو ہو گئے ہیں۔ انہیں اب تک تمہیں کال کر لینی چاہیے تھی۔" جاوید علی نے فکرمندی سے کہا تو وہ کمرے میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی۔ یہ سیٹ خاص طور پر یہاں اس لیے رکھوایا گیا تھا کہ عالیہ کے بڑوں میں سے اگر کوئی رابطہ کرے تو وہ دن رات کے کسی بھی حصے میں اس کال کو ریسیو کرنے سے محروم نہ رہ سکے۔

"شاید انہیں شک ہو گیا ہے اور وہ جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔" اس نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ابھی دن کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ہو سکتا ہے اس عرصے میں وہ رابطہ کر لیں۔" جاوید علی نے امید سے جڑے رہنے کو ترجیح دی اور بتانے لگا۔ "یہ فون نمبر جس فلیٹ کا پتا شو کرتا ہے، اس کے ساتھ والا فلیٹ بھی ہمارے ایک ساتھی کا ہے۔ وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ بلڈنگ کا چوکیدار بھی ہمارا ہی بندہ ہے اس لیے ہم نے ہر طرف نظر رکھی ہوئی ہے۔ شک ہونے کی صورت میں بھی وہ لوگ تمہارے ذریعے ہم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے لیکن کسی نے وہاں سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب دوسری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ دور دور سے عمارت کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اس کا توڑ ہم نے یہ نکالا ہے کہ مذکورہ فلیٹ میں میرے ساتھی کی بیوی دن میں تین چار چکر لگا لیتی ہے۔ اس کا ناک نقشہ تم سے مختلف ہے لیکن قد کاٹھ اور بالوں کی رنگت ملتی جلتی ہے۔ ہماری ہدایت کے مطابق وہ کھڑکیوں کے پردے کھولتی بند کرتی رہتی ہے اور کچھ وقت وہاں گزارتی ہے لیکن اپنا زاویہ ایسا رکھتی ہے کہ اگر کوئی دوربین سے بھی دیکھ رہا ہو تو اسے چہرہ نظر نہ آئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عورت کے قد کاٹھ سے دھوکا کھا کر وہ تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔"

"دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کس کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔" عالیہ نے شانے اچکا کر بولتے ہوئے اپنی بے نیازی کا اظہار کرنا چاہا لیکن ٹیلی فون کی بجنے والی گھنٹی نے اس کی بے نیازی کو قائم نہ رہنے دیا اور وہ یوں آنکھیں پھاڑے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملا کر دھیمی آواز میں بات کرنے لگا۔

"ہیلو۔" اعصاب زدہ عالیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"عالیہ...؟" دوسری طرف سے سوالیہ انداز میں اس کا نام پکارا گیا۔ کال کرنے والا کوئی مرد تھا۔

"یس۔" اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے بہت محتاط ہو۔

"اپنا کوڈ نمبر بتاؤ۔" دوسری طرف سے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ عالیہ نے اپنا کوڈ دہرا دیا۔

"او کے۔ اب اس فلیٹ کا پتا بتاؤ جہاں تم ٹھہری ہوئی ہو؟" جاوید علی اسے پہلے ہی ایسے ممکنہ سوالوں کے جوابات ذہن نشین کروا چکا تھا اس لیے اس نے روانی سے پتا بتا دیا۔

"ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا پیش آیا اور تم وہاں تک کیسے پہنچیں؟" اس بار اس سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

"مساج سینٹر پر ریڈ ہوا تو میں گرفتاری کے ڈر سے سینٹر کی دیوار پھاند کر سائڈ کی گلی میں کود گئی تھی اور وہاں سے ساتھ والے اسکول کی باؤنڈری کراس کر کے اسکول میں چھپ گئی تھی۔ بھاگ دوڑ میں میرا موبائل بھی کہیں گر گیا تھا اس لیے میں فوری طور پر کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں کئی گھنٹے تک وہیں چھپی رہی اور جب یہ محسوس ہوا کہ اب پولیس وہاں سے جا چکی ہے تو وہاں سے نکل کر ایک راہ گیر سے گزارش کر کے اس کے موبائل فون سے ایک دوست کو کال کی۔ میرا وہ دوست فوراً مدد کے لیے راضی ہو گیا اور میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر مجھے پک کر لیا۔ پولیس کے ڈر سے میں اپنے اپارٹمنٹ واپس نہیں جا سکتی تھی اس لیے دوست سے ہی کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی گزارش کی۔ اس نے کہا میری بیوی میکے رکنے گئی ہوئی ہے، تم میرے ساتھ ہی میرے گھر چلو۔ دو دن تک میں اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہی اور وہ مجھ سے پورا فائدہ اٹھاتا رہا لیکن میں اس کے

ذریعے اخبار میں اشتہار نہیں چھپوا سکتی تھی۔ وہ مجھ سے وجہ پوچھتا تو میں اسے کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ تیسرے دن اس کی بیوی کو واپس آنا تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ایک ایسے فلیٹ میں منتقل کر دیا جو کرائے پر چلتا ہے اور آج کل خالی پڑا ہوا ہے۔ فلیٹ پر آنے سے پہلے میں اخبارات میں اشتہار چھپنے کے لیے دے کر آئی تھی۔ اپنے دوست کے گھر سے اس کے فلیٹ تک آنے کے لیے مجھے چہرہ نقاب میں چھپانا پڑا تھا کہ کہیں راستے میں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اب بھی میں جانتی ہوں کہ میں کس حال میں یہاں رہ رہی ہوں۔ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے اس ڈر سے باہر نکلنا تو دور کی بات، کھڑکیوں تک جانے میں بھی ڈرتی ہوں۔ یہاں اس خالی فلیٹ میں ضرورت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ مجھے فرش پر سونا پڑتا ہے۔ نل کا سادہ پانی پیتی ہوں اور کھانے کے لیے ڈبل روٹی، جیم اور بسکٹوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ چیزیں بھی یہاں آنے سے پہلے میرے دوست نے دلا دی تھیں۔ کل اس کا فون آیا تھا کہ میں دو تین دن میں اس کا فلیٹ خالی کر دوں کیونکہ یہاں نئے کرائے دار آنے والے ہیں اور اسے پینٹ وغیرہ کروانا ہے۔ آپ لوگوں کی طرف سے کانٹیکٹ نہ کیے جانے پر میں سخت پریشان تھی کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔ باہر کے حالات کی بھی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی۔ سارے کام کے نمبر میرے موبائل میں ہی فیڈ تھے۔'' اس نے آواز کے زبردست اتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک مربوط کہانی سنا ڈالی۔ ابتدا میں کال ریسیو کرنے سے پہلے اس پر اپنے آقاؤں کی جو دہشت طاری تھی، اس پر بھی اس نے بتدریج قابو پالیا تھا۔

''اشفاق رانا کے قتل کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس کی ساری داستان سن کر اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے دوسری طرف سے بالکل اچانک پوچھا گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا رانا قتل ہو گیا ہے؟'' عالیہ نے بے ساختہ حیرت کی بڑی خوب صورت اداکاری کی۔

''تمہیں نہیں معلوم؟ یہ خبر تو سارے نیوز چینل اور اخبارات میں آئی ہے۔'' دوسری طرف موجود شخص نے سرد لہجے میں استفسار کیا۔ جواب میں عالیہ نے ایک سرد آہ بھری اور بے چارگی سے بولی۔

''اس بے سروسامانی کے عالم میں اخبارت اور نیوز چینلز کہاں دستیاب ہیں۔ میں تو بس اس چار دیواری کی قیدی بن کر رہ گئی ہوں۔ پہننے کے لیے کوئی دوسرا جوڑا تک نہیں ہے۔ جسم پر موجود کپڑے سخت گندے ہو چکے ہیں۔ آ لوگ کب تک میری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں؟'' عالیہ بڑے کام کا سوال پوچھا۔ اس کے قریب بیٹھا جاوید علی بھی ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے کان کے ساتھ ایک آلہ لگا تھا اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ عالیہ کی کارکردگی سے مطمئن ہے۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تمہارے پاس دو دن ابھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو دنوں میں تمہارے لیے کیا کیا سکتا ہے۔ تم انتظار کرو۔ ہم کسی بھی وقت تم سے رابطہ کر سکے ہیں۔'' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''چالاک لوگ ہیں۔ جس نمبر سے کال کر رہے اس کی سم رجسٹرڈ نہیں ہے۔ لوکیشن بھی معلوم نہیں ہو سکی کیونکہ کال کرنے والا مستقل حرکت میں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔'' کال ختم ہونے کے تھوڑی دی بعد جاوید علی نے اپنے کان سے لگا آلہ الگ کرتے ہوئے عالیہ کو بتایا۔

''ان سے تم حماقت کی توقع بھی نہیں کرنا۔ ان پر صرف اسی صورت فتح حاصل کر سکتے ہو کہ خود ان سے زیاد چالاکی کا مظاہرہ کرو۔'' عالیہ نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

''میں یہ بات سمجھتا ہوں اسی لیے کال آتے ہی اپ ساتھی کو فون کر کے ہدایت دے دی تھی کہ اب اپنی بیوی اس فلیٹ میں مت جانے دینا۔'' جاوید علی نے بتایا۔

''بہت اچھے... میں دعا کروں گی کہ اس جنگ میں تم ہی کامیاب رہو۔''

''آمین۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''یہ معاملہ نمٹ جائے تو میں تمہیں یہاں سے بہت اچھی جگہ شفٹ کر دوں گا۔ تم وہاں جب تک چاہو سکون سے رہنا اور اطمینان سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا۔ ہم میں سے ہر ایک تمہارے فیصلے کا احترام کرے گا۔''

عالیہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ بہت اچھی جگہ کون سی ہے لیکن وہ وہاں ٹھہرا ہی نہیں اور وہ اس کے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنتی رہ گئی۔

☆☆☆

''کیا میں اس کے لیے رونے کے سوا کچھ نہیں کروں گا؟'' جب وہ کافی دیر رو چکا تو یہ خیال چابک کی طرح اس کے دماغ پر آ کر لگا۔ وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری ماہ بانو اس طوفانی موسم میں کہیں باہر بھٹک رہی ہو اور میں ایک محفوظ چھت کے نیچے بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کی تلاش میں باہر نکلنا ہو گا۔'' وہ بلند آواز سے بڑبڑایا اور برساتی نکال کر اسے پہننے لگا۔ اسی پل ایک زوردار دھماکا ہوا اور اسے در و دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن اس کے اپنے پائے استقامت میں ذرا لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ یہ دھماکا آسمانی بجلی گرنے سے ہوا تھا۔ آرلینڈو کے رنگ بدلتے موسم... میں آسمانی بجلی کا گرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگرچہ انہیں یہاں آئے ہوئے بہت طویل عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن چند ماہ میں ہی بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ باقی معلومات بلقیس نے بہم پہنچائی تھیں۔ یہاں دھوپ اتنی شدید نکلتی تھی کہ ایڑی سے چوٹی تک پسینا بہنے لگتا تھا اور پھر اچانک ہی گہرے بادل امڈ آتے تھے جو گرج چمک کے ساتھ بارش برساتے تھے۔ یہاں ہری کین... آندھیاں، طوفان بادوباراں اور ہوا کے تیز جھکڑ آتے رہتے تھے اس لیے گھروں کی تعمیر بھی ایک خاص طرز پر کی جاتی تھی۔ ہر گھر میں کنڈکٹر نصب ہوتے تھے جو گھر پر بجلی گرنے کی صورت میں اسے زمین میں لے جاتے تھے۔ یوں گھر جل کر خاکستر ہونے سے محفوظ رہتا تھا۔ مکینوں کو کچھ سہنا پڑتا تھا تو محض ایک زوردار دھماکا اور بس۔ اس نے بھی دھماکے کی آواز کو سنا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا تو پیچھے کسی کو اپنی خبر پہنچانے کی بھی فکر نہیں تھی، بس فکر تھی تو اس کی جو دنیا میں اس کا واحد رشتہ تھی اور جسے وہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ لوگوں کی اس رائے کا تو اس نے پہلے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ گھر پہنچ کر اسے مزید ثبوت مل گئے تھے کہ وہ یہاں واپس لوٹنے کے لیے ہی گھر سے باہر نکلی تھی اور وہ واپس نہیں پہنچ سکی تھی تو اس کے نزدیک اس بات کا ایک ہی مطلب تھا... وہ کسی حادثے یا مشکل کا شکار ہو گئی تھی اس لیے اسے ہر حال میں باہر جانا تھا اور اپنی ماہ بانو کو تلاش کر کے واپس یہاں لانا تھا۔ وہ عجب عالم دیوانگی میں وہاں سے نکلا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی پانی کے تھپیڑے سے اس کے منہ پر پڑے اور لمحے بھر کے لیے قدم ڈگمگا سے گئے لیکن اس نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھال لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ بارش اتنی شدت سے برس رہی تھی کہ آنکھوں کے آگے پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔ یہاں تک کہ چند گز کے فاصلے پر موجود مین گیٹ بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے خطرناک موسم میں اس جیسا کوئی دیوانہ ہی باہر جانے کا سوچ سکتا تھا چنانچہ وہ جا رہا تھا۔ گیٹ سے اس کا فاصلہ چند فٹ رہ گیا تھا، تب ایک بار پھر بجلی زور سے کڑک کر چمکی اور لمحہ بھر کے لیے ارد گرد کا ماحول روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں اسے مین گیٹ صاف نظر آیا اور قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ کئی ماہ کے مسلسل آنے جانے میں وہ اس وسیع و عریض گھر کے زیر استعمال حصوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اندھیرے میں بھی مین گیٹ کا لاک کھولنے والی ناب کو پکڑ کر آسانی سے گھما سکتا تھا لیکن اس بار عجیب ہی تجربہ ہوا۔ ناب گھومی ضرور لیکن لاک نہ کھلا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن نتیجہ وہی پہلے والا تھا۔ جھلا کر اس نے کچھ اور زور لگایا لیکن ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی پل اسے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پانی کی دھندلی سی چادر میں سے اس شخص کو گھور کر دیکھا۔ جواب میں اس نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''یہاں وقت برباد کرنا بیکار ہے۔ مسز مصطفیٰ نے گیٹ کو ڈبل لاک لگا رکھا ہے اور دوسرا لاک جس چابی سے کھل سکتا ہے، وہ ان کے پاس ہے۔'' اسلم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حرکت بالخصوص اسے باہر جانے سے روکنے کے لیے کی گئی ہے ورنہ اتنے عرصے میں کبھی ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ کبھی گیٹ کو ڈبل لاک لگایا گیا ہو۔ مصطفیٰ خان کی رات میں غیر موجودگی کی صورت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔

''میں ابھی ان سے چابی لاتا ہوں۔'' وہ بلند آہنگ میں بولا۔ ویسے بھی ہوا اور بارش کا شور اتنا زیادہ تھا کہ دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بلند آواز میں بولنا ضروری تھا۔

''او کے۔'' آفتاب نے اس سے بالکل بھی بحث نہیں کی اور دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں مصطفیٰ خان کی فیملی آباد تھی۔ مصطفیٰ خان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ رئیس ابنِ رئیس تھا اور اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ان کی لمبی چوڑی جائداد کا اکلوتا حق دار اور وارث بھی۔ کہنے کو اس نے اپنی انجینئرنگ کا استعمال کرتے ہوئے ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کر رکھی تھی لیکن اس کے ٹھاٹ باٹ کا اس کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے ہر ماہ ٹھیک ٹھاک منافع دینے والا سپر اسٹور بھی اپنے باپ کی جائداد کے بل بوتے پر خریدا تھا اور یہ وسیع و عریض گھر بھی۔ جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ بلقیس چاہتی بھی تو اس کی صفائی ستھرائی کا کام خود نہیں سنبھال سکتی تھی۔ ایک جز وقتی ملازم آ کر یہ کام انجام دیتا تھا۔ وہی ملازم لان کی حالت بھی ٹھیک رکھتا تھا البتہ گھر کا کچن مکمل طور پر بلقیس خود سنبھالتی تھی اور لانڈری بھی خود ہی

نمٹا لیتی تھی۔ باغبانی کا اسے خود بہت شوق تھا اس لیے گاہے بگاہے اس طرف بھی نظرِ کرم رہتی تھی۔

مین گیٹ سے رہائشی حصے تک کا طویل فاصلہ طے کر کے وہ دونوں اندر پہنچے تو بلقیس اور کشور منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اتنے خراب موسم میں کہاں جا رہے تھے اسلم؟" بلقیس نے فوراً ہی استفسار کیا۔

"ماہی کو ڈھونڈنے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"للہ اسلم! مجھے میری ایک ذرا سی لغزش کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرے دل پر موجود بوجھ میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ ابھی میں تم سے نظریں نہیں ملا پا رہی۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو بعد میں ماہ بانو سے سامنا ہونے پر اس کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں گی۔" وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئی۔

"میں نے آپ کو کوئی الزام تو نہیں دیا۔" اسلم اس سے نظر چراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"صرف زبان سے الزام نہیں لگایا ورنہ تمہاری آنکھیں، چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات مجھے یہی کہتی محسوس ہو رہی ہیں کہ میں تمہاری مجرم ہوں۔"

"پلیز بلقیس باجی! ایسی باتیں مت کریں۔ آپ تو ہمارے محسنوں میں سے ہیں۔ میں آپ کو کوئی دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن ابھی میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ ماہ بانو غائب ہے اور میں بس اسے تلاش کرنے جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لاک کھول دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ورنہ مجھے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔" اس کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی تھی۔

"پلیز اسلم! ماہ بانو کی تلاش کا کام تم پولیس پر چھوڑ دو۔ اپنے وسائل کے ساتھ وہ لوگ یہ کام زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔" اس بار آفتاب نے گفتگو میں مداخلت کی اور اسے سمجھانے لگا۔

"وسائل کتنے ہی ہوں، وہ میری جیسی لگن تو نہیں رکھتے ہوں گے نا؟" اس نے دلیل دی۔

"جذباتی مت بنو اسلم! اگر یہ واقعہ پاکستان میں پیش آیا ہوتا تو تم تشویش میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ جانے پولیس صحیح طور پر کام کرے بھی یا نہیں لیکن یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کتنے ہی بُرے سہی لیکن اپنے فرائض پوری تندہی سے انجام دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تم اس طوفانی موسم میں باہر نکل کر کیا کر سکو گے؟ تمہیں تو یہاں کے سارے را بھی ڈھنگ سے یاد نہیں ہوں گے۔" آفتاب عقلی دلا دے رہا تھا لیکن اس کا معاملہ جذبات کا تھا۔ اس کے اندر کی بے کلی اسے چین سے بیٹھنے کہاں دیتی۔

"میں آپ سب سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت میں کسی کی کوئی بات ماننے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے صورت میں جانا ہی ہوگا۔" اپنا فیصلہ سنا کر اس نے بیرو دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ ابھی اس کا ہاتھ دروازے کی ناب پر ہی تھا کہ پیچھے سے اسے بلقیس کی آوا سنائی دی۔

"تمہیں ماہ بانو کی قسم ہے اسلم! اتنے خراب موسم میں تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے اور ماہ بانو کے معاملے میں پولیس کی رپورٹ کا انتظار کرو گے۔" یہ الفاظ سن کر وہ ٹھٹک گیا اور قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ لیکن پھر لمحہ بھر میں ہی اس کے ساکت قدم حرکت میں آ گئے اور وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اپنے اس جذباتی وار کو ضائع جاتے دیکھ کر بلقیس گرنے والے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ آفتاب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شیشے کے شفاف دروازے سے عام حالات میں مین گیٹ فاصلے کے باوجو صاف نظر آتا تھا لیکن آج درمیان میں آسمان سے بر پانی کی چادر تن گئی تھی۔ اس دھندلی چادر میں سے اسلم اپ گہرے رنگ کے لباس کی وجہ سے ایک ہیولے کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ پھر یک دم ہی بجلی چمکی اور لمحہ بھر کے لی روشن ہو جانے والے منظر کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ جذباتی سا اسلم ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کو رد نہیں کر سکا تھا اور یک دم ہی اپنے قدموں کا رخ واپس انیکسی کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہاں سے ہٹ گیا۔ اب اسلم کی نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کی زنجیر میں بندھ گیا تھا۔

"پلیز بھابی ریلیکس ہو جائیے۔ اسلم کہیں نہیں گیا۔ انیکسی ہی میں ہے۔" اس نے نڈھال سی بیٹھی بلقیس کو تسلی دی اور پھر کشور سے مخاطب ہوا۔

"آپ بھابی کو کوئی جوس وغیرہ پلائیے اور پھر طوبیٰ کو دیکھیے۔ بچی کتنی دیر سے اپنے کمرے میں اکیلی سو رہی ہے۔ اس سے کھانے پینے کو پوچھیے۔"

"جی اچھا۔" کشور نے یوں مستعدی سے اس کے احکامات بجالانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑی جیسے ساری زند کی مشق ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی اونچی حویلی میں تو کبھی اس نے تنکا بھی دہرا نہ کیا تھا۔ لیکن محبت کی طاقت نے مختصر عرصے میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ وہاں سے چلی گئی تو آفتاب ننھی امید کو بہلانے لگا جو ماں کے پیچھے جانے کے لیے مچل رہی تھی۔ بچی کو بہلاتے ہوئے بھی اس کا ذہن ماہ بانو کے غیاب میں الجھا ہوا تھا اور پیشانی پر پھیلنے والا شکنوں کا جال بتا رہا تھا کہ اسلم چاہے اس خلوص کو سمجھ نہ سکے لیکن اس صورتِ حال پر وہ سب ہی بُری طرح پریشان ہیں۔

☆☆☆

"ہم کب تک ادھر پڑے رہیں گے؟ یہ ہمیں عبدالرحمٰن کا مہمان کہتے ہیں لیکن حقیقت میں قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ ہوتی ہے نا جیلوں میں بڑے لوگوں کے لیے اے کلاس۔ اس میں رہ رہے ہیں ہم۔ کھانے پینے سے لے کر ہر طرح کی سہولت ہے یہاں لیکن ہم اس چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتے اور مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ لوگ مال گاڑی میں بھائی جی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد آباد پہنچ گئے تھے۔ یہاں انہیں ایک صاف ستھرے گھر میں رکھا گیا تھا اور ہر طرح کی آسائش بھی دستیاب تھی لیکن لانے والوں نے واضح کر دیا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن سے ملاقات ہونے تک کہیں نہیں جا سکیں گے اور ان کے بارے میں حتمی فیصلہ وہی کرے گا چنانچہ انہیں اس کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا اور یہ انتظار سلو کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس کے چہرے پر چھائی بیزاری کو دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔" سلو نے فوراً جواب دیا۔

"اس کے لیے کوئی پلان ہے تمہارے پاس؟" شہریار کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"ممبئی واپس پہنچ کر کوئی پلان بھی بنا لیں گے۔ کم سے کم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو بہتر ہوگا۔" بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"تم غلط نہیں سوچ رہے ہو لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہارے بقول عبدالرحمٰن نے ہمیں یہاں قید کر رکھا ہے تو لازمی ہے کہ اس کے آدمی ہماری نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ان سے الجھنا پڑے گا جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے کسی کا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ فرض کرو ہم بغیر نقصان کے ممبئی پہنچ جاتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں پہلے کی طرح سازگار حالات نہیں ملیں گے۔ حلیے میں تبدیلی کر کے اپنی تلاش میں پھرنے والے پولیس والوں سے تو شاید ہم بچ جائیں لیکن پریم ناتھ تک رسائی اتنی آسان نہیں ہوگی۔ وہ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے ہوشیار ہو گیا ہوگا اور ساتھ ہی را والے بھی الرٹ ہوں گے کہ اگر کوئی پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے اپنی گرفت میں لے سکیں۔ یہ مت بھولو کہ ہم پریم ناتھ کے سامنے اپنے پاکستانی ہونے اور بھارت میں موجودگی کی وجہ کا اظہار کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے ہمیں بے حد شد و مد سے ڈھونڈا جا رہا ہوگا۔ ایسے حالات میں، میں عبدالرحمٰن کی دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔ اس کی طرف سے ایک اعتبار سے دوستانہ رویّے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مارا ماری کی صورت میں یہ رویّہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے اور ہمارے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں۔" اس نے بہت رسان سے سلو کو سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

"عادل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بھائی جی اور عبدالرحمٰن دونوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہمدرد ہیں چنانچہ ہمیں عبدالرحمٰن سے ایک ملاقات ضرور کر لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہم اس سے کوئی فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہیں۔" کلام نے بھی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے ایک امکان پیش کیا۔ اس وقت وہ لوگ گھر کے کشادہ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اس لیے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ ان کی آپس میں کی جانے والی گفتگو سنی یا ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اطمینان سے گفتگو جاری تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ دونوں کی یہی رائے ہے تو میں بھی اس پر راضی ہو جاتا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میرے لیے اس طرح فارغ بیٹھ کر وقت گزارنا بڑا مشکل ہے۔ خیر... اس مسئلے کا حل بھی نکالا جا سکتا ہے۔ آپ دونوں بیٹھ کر چائے پئیں، میں ذرا ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھ کر دل بہلاتا ہوں۔" وہ اپنا چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اٹھ گیا اور اندر کا رخ کیا۔

"بہت مختلف مزاج کا بندہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس مہم کے لیے آپ جیسے شخص نے اس کا انتخاب کیسے کیا؟" اس کے جانے کے بعد کلام نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے۔ یہ بہت کام کا بندہ ہے اس لیے اسے فراغت بالکل اچھی نہیں لگتی۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے سلو کی طرف داری کی۔ اسی وقت گیٹ کے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ چوکیدار نے

بھاگ کر گیٹ کھولا۔ فوراً ہی ایک لینڈ کروزر دندناتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے رکتے ہی اگلے دونوں دروازے کھٹا کھٹ کھلے اور ایک طرف سے ڈرائیور اور دوسری طرف سے گن مین برآمد ہوا۔ ڈرائیور نے کمال مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے جو دبلا پتلا اور لمبا سا شخص برآمد ہوا، اسے پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ عبدالرحمٰن تھا جس سے وہ اس سے قبل کلام کے ٹھکانے پر پہلے بھی اتفاقاً مل چکے تھے۔ عبدالرحمٰن نے بھی انہیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا چنانچہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔

''معاف کرنا، اپن کو آنے میں ذرا زیادہ ٹائم لگ گیا اور تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کا اچھی طرح خیال رکھیں۔ تمہیں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی نا؟'' قریب پہنچ کر تینوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کردیا۔

''بالکل نہیں، تمہارے آدمیوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا کہ ہمیں اپنی نظروں کے سامنے سے بھی نہیں ہٹنے دیا۔ وہ دیکھو، ایک پٹھا ابھی بھی گن لیے چھت پر ٹہل رہا ہے کہ کہیں ہم یہاں سے بھاگ نہ جائیں۔'' اس کا مخاطب شہریار تھا لیکن جواب سلو نے جلے کٹے لہجے میں دے ڈالا جس پر عبدالرحمٰن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر مدبرانہ لہجے میں بولا۔

''یہ بے چارے اپنی ڈیوٹی کررہے تھے۔ اگر تم لوگ مجھ سے ملے بغیر یہاں سے چلے جاتے تو ان کی شامت آجاتی۔'' اس دوران میں اس نے ایک کرسی سنبھال لی تھی اور وہ لوگ بھی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔

''آخر تمہیں ہم سے ملنے کی اتنی خواہش کیوں تھی؟ ہم سے تو تمہاری بڑی سرسری سی آشنائی ہے بلکہ آشنائی بھی کیا بس ایک اتفاقی ملاقات تھی جس کے بعد تم اپنے راستے اور ہم اپنے راستے چلے گئے تھے؟'' شہریار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے سوال کیا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ ہم اپنے اپنے راستے پر چل رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد بھی تم مجھ سے ٹکرائے ہو اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے ذرا بات چیت کر کے معلوم تو کریں کہ یہ چکر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے اپن تمہارے کسی کام آسکے۔'' وہ بھی فوراً سنجیدہ ہوگیا اور شہریار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''کیسا ٹکراؤ؟ اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے اسی مال گاڑی میں چڑھ گئے جس پر بھائی جی کا مال جارہا تھا لیکن وہ صرف ایک اتفاق تھا، ورنہ ہمارا تم لوگوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر شہریار ذرا سا چونکا لیکن نگاہیں عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے نہیں ہٹائیں اور بالکل اسی کے انداز میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا رہا۔

''غلط... بالکل غلط۔ تم مال گاڑی پر چڑھنے سے پہلے بھی ہم سے ٹکرائے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ تمہیں خود معلوم نہیں ہوا کہ تم کیا کر بیٹھے ہو۔'' عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کی تردید کی تو وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب؟''

''کیا تم پولیس کے ریڈ کے ڈر سے سپنا اپارٹمنٹس سے فرار نہیں ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور چونکا دینے والا سوال کیا لیکن شہریار نے خود کو سنبھال کر رکھا اور بڑے ہموار لہجے میں بولا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان معاملات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق...؟'' عبدالرحمٰن استہزائیہ انداز میں ہنسا اور پھر بولا۔ ''وہ سارا اسٹیج میں نے سجایا تھا۔ اس روز اگر تم لوگ وہاں موجود نہیں ہوتے تو منظر بالکل مختلف ہوتا۔''

''میں اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔'' شہریار نے اس کے الفاظ اور بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے طور پر کچھ اندازے قائم کرلیے تھے لیکن اس کی زبانی حقائق کو جاننا بہتر سمجھا۔

''تمہیں اپنی اور میری پہلی ملاقات تو یاد ہوگی۔ اس روز میں پولیس کے گھیرے سے نکل کر اس مکان میں پہنچا تھا جہاں تم اور تمہارا یہ ساتھی موجود تھے۔'' اس نے سلو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس روز میں ایک پارٹی کے ٹھکانے پر موجود تھا اور اتفاق سے میری موجودگی میں ہی وہاں دو آدمیوں کو غداری کے جرم میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ وہاں شاید ان کا کوئی تیسرا ساتھی بھی موجود تھا جس نے پولیس کو خبر کردی اور پولیس نے آناً فاناً ریڈ کردیا۔ لیکن بعد میں مجھے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ قاتلوں کو گرفتار کرنا تو بہانہ تھا، پولیس اصل میں میری بو سونگھتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ وہ جو بھائی جی کا دشمن ہے اشوک، وہ پولیس کے کتوں کو ہڈی ڈالتا رہتا ہے اور وہ لوگ اسے خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج کل اشوک کو

بہوت چڑھا ہوا ہے کہ کسی طرح مجھے مروا کر بھائی جی کی کمر توڑ دے اس لیے اس نے اپنے کتوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ پولیس والوں کو ایک بار سبق سکھا دیا جائے کیونکہ بھتا تو ہماری طرف سے بھی انہیں برابر ملتا ہے لیکن کچھ حرام کے پلے ایسے ہیں جو سب کھا پی کر بھی ساتھ اپنے ہم مذہبوں کا ہی دیتے ہیں۔ ادھر اپنی طرف مسلمانوں کا رش ذرا زیادہ ہے اس لیے ان کی ہمدردیاں ہمارے بجائے اشوک ''صاحب'' سے ہیں۔'' اس نے اشوک کا نام لیتے ہوئے صاحب پر خصوصی زور دیا۔

''سپنا اپارٹمنٹس میں، میں نے خود جان بوجھ کر اپنی موجودگی کی خبر پولیس تک پہنچائی تھی اور پوری تیاری کے ساتھ ان کا انتظار کررہا تھا کہ کسی ایک کو بھی زندہ سلامت نہیں جانے دوں گا لیکن عین وقت پر تم لوگوں کی وجہ سے گڑبڑ ہوگئی۔ تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے اس لیے پولیس سے بچ کر بھاگنے کے چکر میں اسے اپنے پیچھے لگا بیٹھے اور ہماری ساری تیاری بیکار گئی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ تمہارا ہمارا تعلق بنتا ہے یا نہیں؟''

شہریار نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کھوجنے والی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ کے ''تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے'' اس کے لیے خاصے معنی خیز تھے۔ ان الفاظ سے اس نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی ڈکی سے پریم ناتھ کو زندہ نکال لیا گیا ہوگا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا ہوگا کہ اسے اغوا کرنے والے پاکستانی ایجنٹ تھے اور اس سے ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن ممبئی کے ایک بڑے گینگ میں خاص اہمیت کا بندہ تھا چنانچہ اس تک بھی یہ خبریں ضرور پہنچی ہوں گی۔ ادھر اتفاق سے وہ خود اس کے بندوں سے آٹکرائے تھے اس لیے اس نے ان سے خود ملاقات کرنا بہتر سمجھا اور ساری معلومات جمع کر کے یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ شہریار پر تھا کہ وہ اس ملاقات کا مقصد کھوج کر خود کو اور اپنے ساتھیوں کو کس پوزیشن پر رکھتا ہے۔ ویسے جہاں تک وہ اندازہ لگا پایا تھا، عبدالرحمٰن کا انداز اس کے ساتھ دوستانہ تھا چنانچہ اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے براہِ راست بات کرنا مناسب سمجھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہو لیکن سوال اب بھی یہی ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

اس سوال کو سن کر عبدالرحمٰن کھل کر ہنسا اور پھر بولا۔

''اپن تم سے کیا چاہے گا؟ اپن تو خود تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے۔ ہاں، اس چکر میں اگر تھوڑا بہت فائدہ ہمیں بھی پہنچ گیا تو وہ برا نہیں ہوگا۔''

''تم اتنی بڑی پیشکش اپنی ذمے داری پر تو نہیں کر سکتے؟'' شہریار نے اسے کھوجا۔

''تم ٹھیک سمجھے۔ اپن نے بھائی جی سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی تمہیں یہ آفر کی ہے۔'' اس نے نہایت سادگی سے اعتراف کرلیا۔

''لیکن کیوں؟ بے شک تم لوگ مسلمان ہو لیکن ہو تو بھارتی شہری اور میں ایسے کئی مسلمانوں کو جانتا ہوں جو بھارت کو اپنا وطن ہونے کی حیثیت سے پاکستان سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہے کہ تم لوگ صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری مدد کرنا چاہتے ہو وہ بھی ایک ایسے معاملے میں جو دو ملکوں کے درمیان سلامتی اور طاقت کے توازن جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے؟'' وہ عبدالرحمٰن سے بحث کر کے اپنے سارے شکوک و شبہات دور کرنا چاہتا تھا۔ سلو اور کلام نے اس دوران میں گفتگو میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے کا ایک ایک لفظ بغور سن رہے تھے۔

''تمہارے سوال اصولی طور پر درست سہی لیکن تم اس حقیقت کو نظرانداز کررہے ہو کہ یہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو بھارت میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے محبت کرتا ہے اور کھیلوں سے لے کر جنگ تک کے میدان میں ہمیشہ پاکستان کی سبقت پر خوش اور شکست پر اداس ہوتا رہا ہے۔ بھائی جی، میں اور ہم جیسے کئی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ بھائی جی کی پاکستان سے محبت کی چند اہم وجوہات بھی ہیں۔ پہلی وجہ دورانِ تعلیم پیش آنے والا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے، بھائی جی ایک لائق اسٹوڈنٹ تھے اس لیے انہیں بڑی آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ کچھ ہندو انتہا پسند لڑکے ان کی ذہانت کو دیکھ کر جیلس ہونے لگے۔ اوپر سے بھائی جی تھے بھی بہت بے باک۔ انہوں نے کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور کسی بھی موقع پر بحث چھڑ جانے پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اسلام ہی اصل میں دینِ حق ہے۔ اس صاف گوئی اور بے باکی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہی نکلا اور ایک روز معاملہ زبانی بحث سے نکل کر ہاتھا پائی تک پہنچ

گیا۔ بھائی جی بہادر اور جی دار تھے لیکن اکیلے اتنے سارے لڑکوں کا مقابلہ کہاں تک کرتے۔ نتیجے میں بُری طرح زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے۔ اس پر سے کالج انتظامیہ نے ان سے ہمدردی کرنے کے بجائے واقعے کی ذمے داری ان پر ڈال کر انہیں کالج سے ٹرمینیٹ کر دیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے سیکولر ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کیا جائے، یہ اصل میں ہندوؤں کی سرزمین ہے۔ بھائی جی کو کالج سے نکالے جانے کا بہت غم ہوا۔ وہ بیمار رہنے لگے۔ ماں باپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو دل بہلانے کے لیے انہیں ساتھ لے کر پاکستان چلے گئے جہاں ان کے بہت سے رشتے دار ہجرت کر کے جاچکے تھے۔ پاکستان جا کر بھائی جی کو بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر اپنے ماموں کے گھران کا بہت دل لگا۔ دل لگنے کی وجہ ان کی ماموں زاد تھی۔ سلیقہ شعار، ذہین، مہذب اور خوب صورت لڑکی سے محبت نہ ہوتی تو عجیب ہوتا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ بھی ان سے محبت کرتی ہے چنانچہ اظہارِ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ شادی کی خواہش بھی کر ڈالی۔ جواب میں ان کی ماموں زاد نے جو کچھ کہا، وہ انہیں کبھی نہیں بھول سکا۔ اس نے کہا۔ ”بے شک میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں لیکن آپ سے بڑھ کر اس وطن سے محبت کرتی ہوں۔ میرے بزرگوں نے بے شمار قربانیاں دے کر پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں ان کے بچے سکون سے آباد ہو سکیں۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ میں صرف ایک شخص کی محبت میں لاکھوں قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان جا کر کیسے بس سکتی ہوں؟“ ادھر بھائی جی کی مجبوری تھی کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس صورت میں انہیں اپنے والدین سے جدا ہونا پڑتا اور وہ اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ محبت کی بہت سی داستانوں کی طرح ان کی داستان بھی ادھوری رہ گئی لیکن وہ خود بخود ہی اس وطن سے محبت کرنے لگے جس کی خاطر ان کی محبوبہ نے انہیں چھوڑنا منظور کر لیا تھا۔ انہیں ساری زندگی اپنے والدین سے بس ایک ہی شکوہ رہا کہ وہ بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح پاکستان ہجرت کر کے کیوں نہیں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا بھارت میں کبھی دل نہیں لگ سکا۔ پھر حالات بھی موافق نہیں رہے اور قدم قدم پر ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ناانصافیوں نے انہیں انڈر ورلڈ کا حصہ بنا دیا جہاں وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے مقام بناتے ہوئے ممبئی کے بادشاہ بن گئے۔ لیکن ان کی یہ بادشاہت ہندو انتہا پسندوں کو اچھی نہیں لگتی اور وہ اشوک جیسوں کو مقابلے پر لا کر بھائی جی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن الحمدللہ بھائی جی کے ساتھ ان بے شمار مسلمانوں کی دعائیں ہیں جن کے گھر کا چولہا بھائی جی کی مہربانی سے جلتا ہے اس لیے دشمنوں کا منہ ہمیشہ کالا ہوا ہے۔“

اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نے جو کہانی سنائی، وہ اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اے ہی کی جاب سے شروع ہو کر وطن کے محافظ کے روپ میں ڈھل جانے والی عملی زندگی کے مختصر دورانیے میں اسے ایسی کتنی ہی عجیب و غریب کہانیاں سننے کو مل چکی تھیں جنہوں نے زندگی کے حقائق سے جنم لیا تھا لیکن خود غیر حقیقی لگتی تھیں۔

”ٹھیک ہے، میں نے مان لیا کہ بھائی جی پاکستان اور مسلمانوں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں لیکن میں اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک بھائی جی سے براہِ راست ملاقات نہ کر لوں۔“ اس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنی شرط بیان کی کیونکہ ہر یقین دہانی کے باوجود یہ خدشہ باقی تھا کہ انڈر ورلڈ کا بادشاہ اس کی مدد کے بہانے یقیناً اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

”اس ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔ تم لوگ کل صبح تیار رہنا۔ صبح ہم ممبئی واپس چلیں گے۔“ عبدالرحمٰن نے کوئی بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ قبول کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

”فلیٹ کی نگرانی کرنے والا ایک بندہ میری نظر میں آ گیا ہے۔ وہ سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر موجود ہے اور ٹیلی اسکوپ کی مدد سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے آج بھی دو بار اپنی بیوی کو وہاں بھیجا تھا اور وہ نہایت احتیاط سے بس ذرا دیر کے لیے پردہ سرکا کر اوٹ میں رہتے ہوئے باہر جھانکنے کے بعد کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ اس وقت میں خود ٹیلی اسکوپ سنبھالے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا اور جانتے ہو مجھ پر کیا خوفناک انکشاف ہوا؟“ جاوید علی کا ساتھی اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا اور اس کے لہجے میں خاصا ہیجان تھا۔

”کیا انکشاف ہوا؟“ اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے رسان سے پوچھا۔

”اس آدمی کے پاس دور مار رائفل تھی اور وہ اسی کے ساتھ منسلک ٹیلی اسکوپ سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ میری بیوی اگر چند سیکنڈ اور اپنی جگہ پر کھڑی رہتی تو مجھے یقین ہے کہ اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔“

”اوہ تو...“ اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ عالیہ کی جگہ اپنے ساتھی کی بیوی کو اس فلیٹ میں چلنے پھرنے کی ہدایت دینے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ دشمن کو وہاں عالیہ کی موجودگی کا یقین آ جائے لیکن وہ لوگ تو تصور سے زیادہ عیار اور گھٹیا نکلے تھے۔ انہوں نے خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا تھا کہ عالیہ ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ تو اس کے ساتھی کی بیوی خوش قسمت نکلی کہ گولی چلنے سے پہلے وہاں سے ہٹ گئی ورنہ خود جاوید علی کے حصے میں بے حد شرمندگی اور پچھتاوا آ جاتا۔

”اب تم بالکل بھی اپنی بیوی کو وہاں مت بھیجنا بلکہ اپنے فلیٹ میں بھی احتیاط سے رہنا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی مستقل بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ سراسیمگی کی کیفیت میں اس نے اپنے ساتھی کو ہدایات دیں۔

”آف کورس یار! میں یہی کروں گا۔ میری اکلوتی بیوی ہے اور خاصی عزیز بھی۔ میرا کہیں کسی دوسری عورت سے چکر بھی نہیں چل رہا کہ اپنی بیوی سے جان چھڑانے کے لیے اسے موت کے منہ میں بھیج دوں۔“ اس کے ساتھی نے تیزی سے اپنے ہیجان پر قابو پا لیا تھا اور اب ہلکے پھلکے لہجے میں بولتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”سوری یار! مجھے اس چکر میں بھابی کو انوالو ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہیں ذرا بھی نقصان پہنچتا تو مجھے شدید دکھ اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔“ جاوید علی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”اٹس او کے۔ غلطی صرف تمہاری نہیں، میری بھی ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسی سچویشن کا خیال نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے بچت کر دی۔ اب ہمیں گزری ہوئی باتوں پر پچھتانے کے بجائے آگے کی بہتر پلاننگ کرنی چاہیے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آگے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ وہ فون نمبر تو ٹریس نہیں ہو سکا جس سے اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کی گئی تھی۔“ اپنے ساتھی سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے اسی سے مشورہ مانگا۔ اسٹیٹ ایجنٹ کو آنے والی کال کا قصہ یہ تھا کہ کسی نامعلوم آدمی نے فلیٹس کے بیرونی حصے میں نکلی ہوئی دکانوں میں قائم ایک اسٹیٹ ایجنسی پر کال کر کے یہ بات کہی تھی کہ اس نے سنا ہے فلاں نمبر کا فلیٹ کرائے کے لیے خالی ہے اور وہ اس فلیٹ کو کرائے پر لینا چاہتا ہے۔ ایجنٹ نے اسے جواب دیا کہ وہ مالک سے بات کر کے ہی کچھ کہہ سکے گا کیونکہ فلیٹ بے شک کرائے پر تو چلتا ہے لیکن مالک خود براہِ راست کرائے داروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے جاوید علی کے ساتھی سلمان سے رابطہ کیا تھا کیونکہ اس کے علم میں یہی تھا کہ اس فلیٹ کا مالک پڑوس میں رہنے والا سلمان ہے۔ یہ اور بات کہ سلمان کے کرائے دار عموماً سی ایف پی سے ہی تعلق رکھنے والے ایسے افراد ہوتے تھے جنہیں چند ماہ کسی ضرورت کے تحت وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ سلمان نے اسٹیٹ ایجنٹ سے سی ایل آئی پر آنے والا نمبر لے لیا کہ وہ خود اس شخص سے بات کر لے گا۔ ایجنٹ نے نمبر اس شرط پر دیا کہ اسے متوقع کمیشن ادا کیا جائے۔ سلمان نے کمیشن کی رقم ادا کرنے کے ساتھ زبان بندی کی شرط عائد کر دی لیکن رقم دے کر حاصل کیا جانے والا وہ نمبر کسی کام نہیں آیا تھا اور وہ اس کے ذریعے کسی تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔

”ابھی تو ہمارے سامنے وہ رائفل والا ہی ہے جو سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے چھاپ لیں تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔“ سلمان نے مشورہ دیا۔

”مجھے شک ہے کہ وہ کرائے کا کوئی قاتل نکلے گا لیکن ٹھیک ہے، اسی کو دیکھ لیتے ہیں۔ کچھ نہ کرنے سے تو یہی بہتر رہے گا۔“ جاوید علی نے مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اس شخص کے خلاف کارروائی کے لیے کیا طریقہ کار بہتر رہے گا کیونکہ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ عالیہ کے سابق آقاؤں نے اردگرد اپنے مزید ہرکاروں کو گھات میں بٹھا رکھا ہو اور وہ جیسے ہی رائفل مین پر ہاتھ ڈالیں، چھپے ہوئے دشمن میدان میں اتر آئیں۔ مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اس سے اصل مقصد کا حصول ضرور دشوار ہو جاتا۔ وہ نیچے کے دو چار یا آٹھ دس بندوں کو گرانے میں بے شک کامیاب ہو جاتے لیکن اصل چہروں تک نہ پہنچ پاتے۔

تھوڑے سے غور و خوض کے بعد وہ حکمتِ عملی وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق سلمان کو اپنی جگہ پر ہی رہتے ہوئے بدستور نگرانی کا کام انجام دیتے رہنا تھا جبکہ جاوید علی اس ٹیم کو لیڈ کرتا جو رائفل بردار کی گرفتاری کے لیے حرکت میں آتی۔ فون بند کرنے کے بعد جاوید علی اس سلسلے میں انتظامات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے نوٹس پر اس نے سٹی گورنمنٹ کے تحت کام کرنے والے ایک محکمے سے تین گاڑیاں عملے سمیت حاصل کر لیں۔ یہ وہ محکمہ تھا جو شہر میں صحت و صفائی کا ذمے دار

تھا اور اس سلسلے میں طے شدہ شیڈول کے مطابق مختلف کیڑے مار ادویات کا اسپرے کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن محکمے کی طرف سے یہ فریضہ کم ہی انجام دیا جاتا تھا اور کرتا دھرتا شہریوں کی صحت و زندگی کا سودا کر کے رقم اپنی جیبوں میں بھر لیتے تھے۔ ایسے ست اور بے پروا محکمے کے ملازم ایک گھنٹے میں مکمل تیاری کے ساتھ حاضر ہو گئے تو اس میں کمال اوپر سے ملنے والے احکامات کا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جاوید علی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ محکمے کی ایک گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ایک ایمبولینس کو بھی الرٹ کر دیا گیا جبکہ سی ایف پی کے چند نوجوان ایک علیٰحدہ گاڑی میں کسی ممکنہ تصادم سے نمٹنے کے لیے علیٰحدہ سے پیچھے ہو لیے۔ ان نوجوانوں کو ہر ممکن طور پر خود کو کسی کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ رکھنا تھا۔

جاوید علی تین گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچا تو لوگوں نے دلچسپی سے ان گاڑیوں کو دیکھا اور یہ جان کر خوش ہوئے کہ شہری انتظامیہ کو بھی اس بات کا خیال آ گیا ہے کہ مختلف علاقوں میں مچھر مار اور دیگر ادویات کا اسپرے کروایا جائے۔ اس علاقے میں بڑی تعداد میں رہائشی پلازا موجود تھے۔ جاوید علی نے دو گاڑیاں تو عملے سمیت غیر متعلقہ عمارتوں میں اسپرے کے لیے بھیج دیں جبکہ خود اس گاڑی میں اپنے ساتھیوں سمیت موجود رہا جسے اس پلازا میں اسپرے کا کام انجام دینا تھا جس کی چھت پر رائفل بردار موجود تھا۔

”وہ آپ کی گاڑی کو دیکھ رہا ہے لیکن اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش نہیں کی۔“ پلازا کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایئر پیس میں سلمان کی سرگوشی سنی۔

”اچھا ہے، ہم آسانی سے اپنا کام کر لیں گے۔“ اس نے قدم روکے بغیر جواب دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی عملے کے دیگر افراد جیسا لباس پہنے ہوئے تھے لیکن دیگر افراد کو سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کے کسی کام میں مداخلت نہ کریں اور وہ جو کرتے ہیں کرنے دیں۔ اس ہدایت کے ملنے پر وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ موجود افراد خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کسی نے ان سے فری ہونے یا مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پلازا پرانا تعمیر شدہ تھا اور یہاں لفٹ کا انتظام نہیں تھا اس لیے انہیں چار منزلیں طے کر کے چھت تک جانے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ چھت پر جانے والی ان سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا مضبوط جالی دار دروازہ موجود تھا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ پلازا کے مکینوں کو کھلے عام چھت پر آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ کے ساتھ لٹکے تالے نے اس خیال کو مزید تقویت بخشی۔ کھلا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی چابی منسلک نہیں تھی زیادہ تر یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ تالے کو نقب زنی کے حربے سے کھولا گیا ہوگا۔ ایک مبینہ کرائے کے قاتل کے ظاہر ہے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ جاوید علی اور اس ساتھی ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے کھلی چھت پر پہنچ اور پہلی نظر میں ہی انہوں نے اس شخص کو دیکھ لیا جو وسیع عریض چھت پر پانی کی ٹنکی کے قریب زمین سے چپکا لیٹا اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھا کہ چھت سورج کی گرمی تپ چکی ہے۔ اس کی توجہ اب بھی یقیناً سامنے والی بلڈنگ کی اس کھڑکی کی طرف مبذول تھی جہاں اس کے خیال میں خال کو نمودار ہونا تھا۔ اسپرے کرنے والی گاڑیوں کا شاید اس نے اس لیے نوٹس نہیں لیا تھا کہ سمجھ رہا ہوگا وہ لوگ نیچے فلیٹس تک اسپرے کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ان لوگوں کے چھت پر آنے اور اسے دیکھ لینے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والوں نے یہ سارا کھڑاگ پھیلایا ہی اس تک پہنچنے کے لیے تھا۔ جب تک اسے چھت پر کسی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا، صورتِ حال اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور وہ بیک وقت تین افراد کے نشانے پر تھا۔ اسے ہاتھ اٹھاتے ہی بن پڑی۔ ایک خطرناک رائفل کے ساتھ پکڑے جانے کے باعث وہ یہ پوچھنے کا تو اہل ہی نہیں تھا کہ اسے کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے خود کو گھیرنے والوں کی حیثیت کے بارے میں بھی کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھی اس ادارے کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے جس کا باقی عملہ اپارٹمنٹس میں کیڑے مار ادویات کا اسپرے کر رہا تھا لیکن یقینی طور پر ایک گھاگ مجرم یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ یہ صرف بہروپ ہے جو اس تک پہنچنے کے لیے بھرا گیا ہے۔

”ہاتھ سر پر رکھ لو۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی غلطی مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ جاوید علی نے غراتے ہوئے اسے دھمکی دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں فوراً حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ اٹھائے شخص کے عقب میں پہنچا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس شخص کی جامہ تلاشی لینا چاہتا ہو لیکن عقب میں پہنچ کر اس نے بالکل اچانک ہی اپنی گن کا دستہ اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ یہ ایک جچا وار تھا جس نے اس شخص کو فوراً ہی تیورا کر زمین بوس ہونے مجبور کر دیا۔ وہ دھپ کی زوردار آواز سے منہ کے بل گرا

گرنے کے باعث اسے خاصی چوٹیں بھی آئیں جن میں پیشانی پر ابھرنے والا گومڑا اور پھٹ جانے والے ہونٹ سب سے نمایاں تھے۔ وہ حالتِ بے ہوشی میں تھا۔ اسے بے ہوش کرنے والے نے پھرتی سے اس کی جامہ تلاشی لینا شروع کردی۔ جاوید علی مطمئن سا فون پر مصروف ہوگیا۔

"ہاں سلمان! کیا رپورٹ ہے؟"

"کہیں سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ ٹیلی اسکوپ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے بلڈنگ کی چھت پر کی جانے والی ان کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

"ٹھیک ہے، ایمبولینس بھجوا دو اور ریزرو پارٹی سے کہو کہ چوکنا رہیں۔ اگر کوئی ہمارا پیچھا کرتا ہے تو انہیں اسے سنبھالنا ہوگا۔" اس نے سلمان کو ہدایات دے کر سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران نہ صرف تلاشی لینے والے نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا بلکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی جدید طرز کی ٹیلی اسکوپک رائفل کے پارٹس کو کھول کر اسے تین حصوں میں منقسم کرنے کے بعد قریب ہی پڑے ایک چھوٹے سے بیگ میں منتقل کرچکا تھا۔ گھسا پٹا سا یہ بیگ بالکل اس طرز کا تھا جو پلمبر یا الیکٹریشن وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس بیگ میں تین حصوں میں منقسم ہوجانے والی رائفل رکھے جب وہ شخص پلازا میں داخل ہوا ہوگا تو کسی کو اس پر شک بھی نہیں گزرا ہوگا اور یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کسی فلیٹ کے مکین نے اپنی ضرورت کے تحت اس شخص کو کال کرکے بلوایا ہے۔

"اب چلنا چاہیے۔" دور سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر جاوید علی نے کہا اور پھر وہ تینوں اس بے ہوش آدمی کو اٹھا کر نیچے لے جانے لگے۔

"یہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہوگیا ہے۔" نیچے پہنچ کر جب کسی نے استفسار کیا تو بغیر رکے یہ مختصر جواب دے کر وہ آگے بڑھتے گئے۔ دو نوجوان جو شاید اس پلازا کے ہی رہائشی تھے، مدد کے لیے ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ان کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی ایمبولینس وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ اوپر سے اس کے ہوٹر کی آواز سنتے ہوئے آئے تھے۔ زخمی کو تیزی سے ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور دونوں نوجوانوں کو روک کر وہ تینوں بھی اس میں سوار ہوگئے۔ ڈرائیور کو منزل کا علم تھا اس لیے اس نے فوراً ہی پوری رفتار سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پیچھے ان کے ساتھ آنے والا شہری حکومت کا عملہ حسبِ ہدایت اپنا کام کرتا رہا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھی بالکل چوکنا بیٹھے اپنے گرد و نواح خصوصاً عقب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب تک انہیں ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں تھی جس پر یہ شک گزرتا کہ وہ ان کے تعاقب میں ہے۔ فاصلے سے آتی اپنے ساتھیوں کی گاڑی البتہ انہوں نے لی تھی۔ وہ ایک ایسی سڑک پر سفر کررہے تھے جو بہت دور سیدھی چلتی جارہی تھی اور کافی آگے جاکر دو حصوں میں ہوتی تھی۔ اس دوراہے پر پہنچ کر ڈرائیور نے ایمبولینس دائیں طرف کی سڑک پر موڑ دیا۔ دو حصوں میں منقسم جانے کے باعث اس سڑک پر ٹریفک کا ازدحام کم ہوگیا تھا۔

"سرائٹرنگ سے دو گاڑیاں ایمبولینس کے پیچھے آرہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کے تعاقب میں ہیں۔" پیچھے موجود گاڑی میں سے جاوید علی کو اس کے ایک ماتحت نے اطلاع دی تو اس نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ اسے فوراً ہی ساتھ ساتھ چلتی ایک پراڈو اور شیراڈ نظر آگئیں۔

"ٹھیک ہے، میں نے ان دونوں گاڑیوں کو دیکھ لیا ہے۔ تم لوگ بھی الرٹ رہنا۔" اپنے پیچھے والوں کو یہ ہدایت دینے کے بعد وہ پوری توجہ سے ان مشکوک گاڑیوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو مبینہ طور پر ان کا تعاقب کررہی تھیں۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی گفتگو سن لی تھی اس لیے وہ بغیر کسی ہدایت کے ہی اپنی جگہ الرٹ ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی یوزی گنز ان کے گھٹنوں کے درمیان رکھی ہوئی تھیں اور وہ کسی بھی لمحہ ضرورت پڑنے پر فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان کی طرف سے پہل اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ پہلے وہ آنے والوں کے ارادے جاننا چاہتے تھے جو ان پر اگلے چند سیکنڈوں میں ہی واضح ہوگئے۔ شیراڈ کے ساتھ ساتھ چلتی پراڈو کی رفتار میں یک لخت اضافہ ہوا اور وہ ایمبولینس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جس لمحے پراڈو، ایمبولینس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، جاوید علی کی نظریں اس میں سوار افراد سے چار ہوئیں۔ ڈرائیور کے علاوہ تقریباً سب ہی لوگ ایمبولینس کی طرف متوجہ تھے۔ نظریں ملنے پر ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھا اور پھر پراڈو آگے نکل گئی۔

"خیال رکھنا، ہمیں ان میں سے کم از کم ایک آدمی زندہ حالت میں گرفتار کرنا ہے۔" جاوید علی نے اپنے ساتھ ایمبولینس میں سوار افراد کے علاوہ پیچھے گاڑی میں موجود اپنے ساتھیوں کو بھی یہ حکم دیا۔ ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور ایمبولینس بری طرح لہرائی۔ شیراڈ سے اس کے پچھلے پہیے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ردِعمل میں فوراً ہی ایک دوسرا دھماکا گونجا اور شیراڈ لہرائی۔ یہ فائر جاوید علی کے پیچھے آنے والے ساتھیوں میں سے کسی نے کیا تھا۔ پے در پے ہونے والے فائروں نے اس سڑک پر چلنے والی دوسری گاڑیوں کے ڈرائیورز کو ہراساں کردیا تھا جو ان کے قریب تھے۔ وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گئے جبکہ پیچھے والوں نے مزید آگے آنے کی جرأت نہیں کی۔ کچھ وہیں گاڑیاں روک کر کھڑے ہوگئے اور کچھ واپس موڑنے لگے۔ ادھر ایمبولینس اور شیراڈ دونوں ہی کے ڈرائیوروں نے مہارت سے اپنی اپنی گاڑیوں کو قابو کرکے سڑک پر روک لیا تھا۔ پراڈو بھی اپنے اور ایمبولینس کے درمیان ٹریفک چھٹنے کے بعد سڑک پر ترچھی ہوکر کھڑی ہوگئی تھی، یوں آگے کا راستہ مسدود ہوگیا تھا۔ پراڈو والوں نے رکتے ہی ایمبولینس پر ایک برسٹ مارا۔ نشانہ اس بار بھی پہیے ہی تھے۔ پے در پے ہونے والے دو دھماکوں نے ایمبولینس کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہونے کا اعلان کیا۔ ایمبولینس جس کا راستہ پہلے ہی مسدود تھا، بالکل ناکارہ ہوگئی لیکن اس میں سوار کسی فرد کے چہرے پر پریشانی کی معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ پُرعزم ہوگئے تھے۔

"شیراڈ والوں کو بھون ڈالو۔" جاوید علی مسلسل پیچھے والوں سے بھی رابطے میں تھا۔ اس کی طرف سے حکم صادر ہوتے ہی دونوں طرف سے شیراڈ پر گولیاں برسنے لگیں۔ جاوید علی کے ساتھ ایمبولینس میں سوار اس کے دو ساتھی پیچھے شیراڈ پر فائرنگ کررہے تھے جبکہ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ مل کر پراڈو کی سمت فائر کررہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح پراڈو کے ٹائر ناکارہ کردے تاکہ وہ لوگ فرار نہ ہوسکیں لیکن اس کا زاویہ نہیں بن پارہا تھا۔ بیک وقت چلتے کئی ہتھیاروں سے برستی گولیوں نے فضا کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سڑک پر اپنی گاڑی لاسکتا۔ پہلے سے موجود گاڑیاں بھی کسی نہ کسی طرح نکل جانے کی کوشش میں تھیں۔ فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جاوید علی نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرکے وہاں بھی صورت حال کی خبر دے دی۔ اس دوران میں ایمبولینس کا ڈرائیور پراڈو کے ایک ٹائر کو ناکارہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ بے تحاشا ہوتی فائرنگ میں وہ سب کے سب نشستوں کے درمیان دبک کر محتاط پوزیشن میں فائر کرنے پر مجبور تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ ان کا دشمن بھی ان سے بہتر پوزیشن میں نہیں ہے۔ وہ تقریباً برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔

"تم مجھے کور دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح نیچے اتر جاؤں۔" جاوید علی کوشش کرکے ایمبولینس کے اگلے حصے میں پہنچ گیا اور ڈرائیور سے جو ان ہی کا آدمی تھا کہا۔

"اس میں خطرہ ہوگا سر۔" وہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔

"ہم جان کی بازی لگانے کا عہد کرکے میدان میں اترتے ہیں پھر کسی خطرے سے کیا ڈرنا۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔" جاوید علی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا جس کے بعد ڈرائیور مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرسکا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ برستی گولیوں میں گاڑی سے اتر کر اس کے نیچے سرک جانا یقیناً ایک بہت مشکل کام تھا لیکن جاوید علی نے کامیابی سے یہ کارنامہ سرانجام دے لیا لیکن اس کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ کسی طرف سے آنے والی ایک گولی اس کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن یہ زخم اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ یہ وہ جاوید علی تھا جس نے نواب نوازش علی کی کوٹھی میں راج کرتی خواجہ سراؤں کی مسلح فوج کو تن تنہا قابو کیا تھا۔ وہیں وہ محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہوا تھا اور نواب کی بیٹی شاز مین کو دل دے بیٹھا تھا۔ شاز مین بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ لیکن دشمن کی سازشوں کے نتیجے میں ایک ایسے وقت جب وہ اسپتال کے بستر پر زخموں سے چور چور پڑا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس نے رگوں کو کاٹ دینے والا شاز مین کی جدائی کا غم بہت حوصلے سے سہا تھا اور دل میں یہ عہد کرلیا تھا کہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لے گا۔ اس کے سامنے شاز مین کے قاتلوں کی صورت میں کوئی ایک چہرہ نہیں تھا بلکہ وہ ہر وطن دشمن میں اس کے قاتل کو ڈھونڈتا تھا اور انہیں نیست و نابود کرکے سکون پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے مقابل کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں..... اسے یقین تھا کہ وہ را کے سورما ہیں اس لیے اس کے جذبے کے ماند پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایمبولینس کے نیچے لیٹ کر اس نے اپنی گن سیدھی کی اور پراڈو کی طرف فائر کردیا۔ اس بار اسے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور پراڈو کا اگلا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ پراڈو والوں نے بھی بلاتکلف جوابی فائر کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ان پر ایمبولینس کے نیچے سے فائر کیا گیا ہے اس لیے اسی طرف رخ کرکے برسٹ مارا تھا۔ جاوید علی نیچے ہونے کی وجہ سے گولیوں سے تو محفوظ رہا لیکن گولیوں سے اکھڑنے والی سڑک کا ایک ٹکڑا اڑ کر اس کے ماتھے پر آلگا۔ زخم آنکھ سے بس ذرا ہی اوپر لگا تھا۔ فوراً ہی خون بہنے لگا جو اس کی آنکھ تک بھی پہنچ گیا۔ اس نے خون کی وجہ سے دھندلا جانے والی اپنی

بصارت کو آستین کی مدد سے صاف کر کے واضح کرنے کی کوشش کی اور دوسرے ہاتھ سے زخم کو زور سے دبا کر پکڑ لیا تاکہ خون کے بہاؤ کو روک سکے۔

"آپ ٹھیک ہیں نا سر؟" اپنے کان سے لگے ریسیور پر اسے اپنے ایک ساتھی کی پُرتشویش آواز سنائی دی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ اپنا دھیان پوری طرح دشمن پر رکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ پراڈو والے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے گن اپنے ہاتھ سے رکھ دی تھی لیکن اپنی تمام حسیات کو دشمن پر ہی مرکوز کر رکھا تھا اس لیے وہاں ہونے والی غیر معمولی سرگرمی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ لوگ وقفے وقفے سے فائر کرتے ہوئے پراڈو چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پراڈو جیسی گاڑی کی وجہ سے انہیں ایک اچھی ڈھال بھی مل گئی تھی جس کی آڑ میں وہ اپنے فرار کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ یک دم ہی ان کی مخالف سمت سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور یوں لگا کہ پراڈو والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ فائرنگ کے شور کے باوجود جاوید علی نے واضح طور پر انسانی چیخیں سنیں۔

"ہم پہنچ گئے ہیں۔" یک دم ہی اس کے کان کے ساتھ لگے آلے میں ذیشان کی جاں فزا آواز گونجی تو وہ مسکرا کر وہیں لیٹ گیا۔ سر اور بازو میں لگنے والے زخم صرف تکلیف ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ ان سے جاری خون نے اسے خاصی حد تک کمزور بھی کر دیا تھا لیکن وہ لیڈر ہونے کی حیثیت سے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ذیشان اور اس کے ساتھیوں کی وہاں موجودگی نے اسے ایک گونا گوں اطمینان بخشا اور اس نے نہایت ہموار لہجے میں جواب دیا۔

"میں زخمی حالت میں ایمبولینس کے نیچے پڑا ہوں سر۔ اب اس مشن کی کمان آپ کو سنبھالنی ہوگی۔" اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آنے والے اپنا کام بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

☆☆☆

بڑھی ہوئی شیو، الجھے بال، ملگجا لباس اور چہرے پر کھنڈی زردی... یہ اسلم تھا جسے ماہ بانو کی جدائی نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ انیکسی کے دروازے پر کھڑے آفتاب نے نہایت تاسف سے اسے دیکھا۔ وہ خود محبت کے جذبے سے آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ محبوب سے جدا ہو جانے والا یہ شخص اذیت کی کس انتہا سے گزر رہا ہوگا۔ ماہ بانو کی قسم دیے جانے پر وہ طوفان میں باہر جانے سے تو رک گیا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ اپنے آپ سے بھی جدا ہو گیا ہو۔ خوراک پر بلقیس اور کشور بڑی مشکلوں سے اب تک اسے فقط گلاس دودھ، ایک کپ کافی اور دو بسکٹ کھلانے کامیاب ہو سکی تھیں۔ دو دن میں لی جانے والی یہ غذا جوان مرد کے لیے تو کیا کسی شیر خوار بچے کے لیے بھی ناکا لیکن اسلم کو اس سے زیادہ مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اندر کی تمام تر وحشتوں کے ساتھ اس نے اگر ان سے تعاون بھی کیا تھا تو خود پر خاصا جبر کر کے ہی کیا ہوگا۔

"اسلم..." آفتاب نے دروازے پر دستک د ہوئے اسے آہستہ سے پکارا۔ جواباً اس نے اپنی جگہ حرکت کیے بغیر محض آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

"پولیس آفیسر تم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔" آفتاب نے اسے اطلاع دی تو وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور سے کچھ بھی کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پولیس آفیسر مصطفیٰ خان کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ اسلم، آفتاب کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر سے مصافحہ کیا۔

"کچھ معلوم ہوا آفیسر؟" اسلم نے بے تابی سے اس سے سوال کیا۔

"ہاں لیکن شاید وہ تمہارے لیے ناپسندیدہ ہو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا جس پر اسلم کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آئے لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور آہستہ سے بولا۔ "میں سننا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری وائف کو کلینک کے قریب واقع ایک اسٹور پر کسی شخص کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا پھر وہ اسی آدمی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بھی نظر آئی تھی جہاں ان دونوں نے کافی پی اور پھر تمہاری بیوی اور وہ آدمی ایک گاڑی میں ساتھ بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ عینی شاہدین کے مطابق وہ اپنی مرضی سے اس آدمی کے ساتھ گئی تھی اور ذرا بھی خوف زدہ یا ہراساں نہیں لگتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ بدقسمتی سے وہاں موجود کسی شخص کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ورنہ ہم تمہیں اس جگہ تک بھی پہنچا دیتے جہاں وہ اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہوگی۔" پولیس آفیسر کے الفاظ نے اسلم کے چہرے پر سرخی پھیلا دی لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں اس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"سوری مسٹر! فی الحال ہم طوفان کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے اس کیس پر ابھی کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی صورتِ حال واضح ہے اور ہم کسی عاقل و بالغ شخص کے اپنی مرضی سے کہیں جانے پر پابندی عائد نہیں کر سکتے۔ اگر وہ تم سے بیزار ہو کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔" اس نے نہایت بے رحمی سے اپنے معاشرے کی اقدار کے مطابق اسلم کو جواب دیا۔ اس بار اسلم خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر دہاڑا۔

"بکواس بند کرو۔ میں تمہیں اپنی پاکباز بیوی کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" ممکن تھا کہ وہ پولیس افسر پر حملہ بھی کر دیتا لیکن آفتاب نے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے اسے پہلے ہی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔

"جو سچ تھا، وہ میں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے تم تک پہنچا دیا۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اس سچ کو مان لو یا خود کو دھوکا دے کر بہلاتے رہو۔" افسر نے طنزیہ انداز میں کہا اور اپنی کیپ سر پر جماتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی بلقیس اور کشور بھی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر گہری افسردگی تھی۔

"آپ دونوں میری ماہی کو جانتی ہیں نا، اس کی پاکبازی کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے اور وہ پولیس والا اس پر اتنا بڑا الزام لگا کر چلا گیا۔ بے وفا عورت ایسی ہوتی ہے کیا جو گھر سے نکلتے وقت گھر کو چمکا کر نکلے اور عجلت میں بھی شوہر کے پسندیدہ کھانے کی تیاری کر کے جائے۔ اس کی پاکبازی کا مجھ سے بڑھ کر کون گواہ ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے پرکھا اور برتا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے، میں مر کر بھی ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتا جس سے اس کی عزت پر حرف آتا ہو۔ اسے اپنی آبرو اتنی عزیز نہیں ہوتی تو اتنے امتحانوں سے کیونکر گزرتی۔ چاند میں بھی داغ ہے لیکن میری ماہ بانو بالکل بے داغ ہے اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔" رندھی ہوئی آواز کے ساتھ بولتے ہوئے اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا تو کشور خاموش نہیں رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کے طویل امتحان کے سفر کا آغاز اس کے باپ کی بدنیتی سے ہی ہوا تھا۔ چنانچہ دل میں گہرا احساسِ ندامت تھا۔ بولی تو آواز اس احساس سے بوجھل تھی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اسلم صاحب! واقعی ماہ بانو ایک مثالی لڑکی ہے اور اس پر لگائے گئے الزام کو کسی صورت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقیناً کسی مشکل کا شکار ہو گئی ہے اور ہم سب کی دعا ہے کہ وہ اس مشکل سے جلد از جلد نجات پا لے۔"

"بالکل ٹھیک، میری بھی اس کے بارے میں یہی رائے ہے اور میرا اور مصطفیٰ کا فیصلہ ہے کہ ہم اسے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ میری آج صبح سویرے ہی مصطفیٰ سے بات ہوئی ہے۔ انہیں اس حادثے کا سن کر شدید شاک لگا ہے اور انہوں نے فوری طور پر واپس آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے آنے تک تم تھوڑا سا صبر کر لو۔ ان کے خاصے سورسز ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھوج لگا لیں گے۔" بلقیس نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"پلیز بلقیس باجی! اب آپ مجھے کسی طرح مجبور مت کیجیے گا۔ پہلے ہی آپ نے ماہ بانو کی قسم دے کر میرے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے لیکن آپ نہیں جانتیں کہ میں کس کرب اور اذیت سے گزرا ہوں۔ شاید اتنی اذیت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوتی جب طوفان میں باہر نکلنے کی صورت میں، میں کسی حادثے کا شکار ہو جاتا۔ لیکن خیر، آپ نے جو کیا میرے بھلے کے لیے کیا، اس لیے مجھے آپ سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے لیکن اب آپ مجھے نہیں روکیں گی۔ میں باہر نکل کر خود اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس فکر سے بالکل آزاد ہو جائیں کہ میں دیوانگی میں خود کو کوئی نقصان پہنچا لوں گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ ماہ بانو کی زندگی محفوظ ہونے کا یقین کیے بغیر میں خود بھی نہیں مرنا چاہتا۔ میرے اندر اس کی خاطر زندہ رہنے کی آرزو ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی میری اس خواہش کو رد نہیں کرے گا۔" ماہ بانو کے غیاب کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنے مربوط اور مضبوط انداز میں کوئی بات کر رہا تھا اور لہجے میں دیوانگی کے بجائے ایک عزم تھا۔ بلقیس سمیت کسی کی بھی ہمت نہیں ہو سکی کہ اس کی خواہش کو رد کر سکے چنانچہ اجازت دیتے ہی بن پڑی۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ اور جو معلوم کر سکتے ہو کرو... لیکن رات تک لوٹ کر واپس آ جانا۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک مصطفیٰ بھی کسی اچھی خبر کے ساتھ یہاں موجود ہوں۔" بلقیس نے بڑی بہنوں کے سے خلوص کے ساتھ آہستہ سے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" آفتاب نے اسے پیشکش کی۔

"نہیں آفتاب صاحب! آپ مجھے اکیلے جانے

دیں۔ آپ پاسبانِ عقل کی طرح ہیں اور فی الحال میرا جنون آزادی چاہتا ہے۔ میں آپ کو اپنے ساتھ بھٹکانا نہیں چاہتا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اتنی قطعیت کے ساتھ جواب دیا کہ آفتاب مزید اصرار نہیں کر سکا اور وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ سب سے پہلے اس نے انیکسی میں جا کر اپنا لباس تبدیل کیا اور بال سنوار کر گھر سے روانہ ہو گیا۔ شیو اس نے نہیں بنائی تھی کہ مزید وقت ضائع ہوگا۔ لباس کی تبدیلی اور بال سنوارنے کا عمل بھی بس ضرورتا ہی تھا کہ ذرا مہذب حلیے میں موجود بندے کی بات لوگ نسبتاً زیادہ توجہ سے سنتے ہیں۔ گھر سے نکل کر اس نے اس علاقے کا رخ کیا جہاں وہ کلینک واقع تھا جس میں ماہ بانو اپنے روٹین کے چیک اپ کے لیے گئی تھی۔ کلینک کے اندر جا کر کچھ معلوم کرنا بے سود تھا کیونکہ یہ کوشش وہ اسی دن کر چکا تھا جس دن ماہ بانو غائب ہوئی تھی۔

اس روز اس نے غصے اور جذبات میں کلینک کے ایک ملازم کو بھی اس کی بدزبانی کا ٹھیک ٹھاک سبق سکھا ڈالا تھا۔ اس لیے اب اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہاں کوئی اس سے تعاون کرتا۔ اس نے کلینک کے قرب و جوار میں واقع شاپس اور ریسٹورنٹس سے معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ پولیس مین نے اسے یہ تو بتایا تھا کہ ماہ بانو کو ایک اسٹور اور ریسٹورنٹ میں کسی آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سا ریسٹورنٹ یا اسٹور تھا۔ اس علاقے میں صرف دو ریسٹورنٹس تھے جبکہ شاپس بہت ساری تھیں۔ اس نے پہلے ریسٹورنٹس سے کام کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ ماہ بانو کی تصویر اس کے پرس میں ہمیشہ موجود رہا کرتی تھی۔ یہی تصویر دکھا کر اس نے پہلے پڑنے والے ریسٹورنٹ کے عملے سے ماہ بانو کے بارے میں جاننا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا البتہ ایک ویٹرس نے اتنا ضرور بتایا کہ اس سے قبل ایک پولیس سارجنٹ بھی اس لڑکی کی تصویر لیے اسے ڈھونڈنے وہاں آچکا ہے۔ اسلم سمجھ گیا کہ سارجنٹ نے تصویر اسپتال کے ریکارڈ سے حاصل کی ہوگی۔ ویٹرس کے بیان سے اس کی بھی تصدیق ہو گئی کہ پولیس افسر نے یونہی آ کر انہیں کوئی داستان نہیں سنا ڈالی تھی بلکہ واقعی وہ ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ سے مایوس ہو کر وہ دوسرے میں چلا گیا۔ یہاں اس نے ریسیپشن سے کام کا آغاز کیا۔

''بہتر ہے آپ یہاں کے منیجر سے مل لیں۔ وہ اس سلسلے میں زیادہ بہتر طور پر آپ کی مدد کر سکیں گے۔'' ریسیپشن پر موجود لڑکی نے تصویر دیکھتے ہی اس سے کہا اور ا منیجر سے بات کرنے لگی۔

''آپ سیدھے ہاتھ پر چلے جائیں، وہیں آ منیجر سے ان کے دفتر میں ملاقات ہو جائے گی۔'' ر واپس رکھنے کے بعد اس نے کاؤنٹر سے ئیں جانب والی گیلری کی طرف اشارہ کیا۔ اسلم دل میں ایک ا نیے اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ گیلری میں کمرے کے دروازے پر ہی منیجر کی تختی لگی تھی۔ وہ د دے کر اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ ایک فر تقریباً پینتالیس سالہ خوش لباس شخص نے اس کا استقبال

''مجھے ریسیپشنسٹ نے بتایا ہے کہ آپ وہ بدقس آدمی ہیں جن کی بیوی دو دن قبل کہیں غائب ہو گئی تھی۔ نے اور میرے عملے نے اس سلسلے میں سارجنٹ مورس مکمل تعاون کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ کو معلومات فراہم کر دی ہوں گی اس لیے میں سمجھ نہیں پا ہوں کہ آپ کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے؟'' اس سے ملانے کے بعد منیجر نے خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس مہذبانہ لیکن الفاظ حوصلہ شکن تھے۔ وہ گویا دبے لفظوں اسے یہ جتا رہا تھا کہ ایک ایسی عورت کے لیے جو اسے چھو بھاگ چکی ہے، وہ کیوں خوار ہوتا پھر رہا ہے۔

''ہاں، اس نے مجھے بتا دیا تھا لیکن مجھے اس کی فرا کردہ معلومات پر یقین نہیں آیا اس لیے میں اپنے طور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اسلم نے خود پر ب ضبط کرتے ہوئے اسے جواب دیا کیونکہ وہ ہر ایک سے جھگڑ کر یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اس ویٹرس کو بلا دیتا ہوں جس اس جوڑے کو سرو کیا تھا۔ آپ خود ہی اس سے بات کر لیں۔'' منیجر اس سے کہہ کر خود انٹرکام پر مصروف ہو گیا جبکہ اسلم سینے میں ایک آگ سی دہکنے لگی۔ ''جوڑے'' کے لفظ اسے شدید تکلیف پہنچائی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو تو بہت کھلے دل سے تسلیم کر لیا تھا کہ اس سے پہلے ہی ماہ بانو کے د پر کسی کا قبضہ تھا لیکن وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کے نکاح میں ہوتے ہوئے ماہ بانو کو کسی دوسرے کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ اس نے بالکل سرخ چہرے ساتھ منیجر کو انٹرکام پر بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ کسی روز نامی ویٹرس کو اپنے کمرے میں بھجوانے کا حکم دے رہا تھا۔

''روزی آ رہی ہے، اس سے مل کر جس طرح چا آپ تسلی کر لیجیے گا۔'' ریسیور رکھنے کے بعد منیجر نے

اطلاع دی تو وہ فقط سر ہی ہلا سکا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت گزرا ہوگا جب کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور ملائم نسوانی آواز نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ منیجر کے ''یس'' کہنے پر اپنی آواز ہی کی طرح لوچ دار اور ملائم نظر آنے والی تقریباً اٹھارہ انیس سالہ لڑکی نے اندر قدم رکھا۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی تھی جس کی لمبی ٹانگیں اس منی اسکرٹ میں اور بھی نمایاں ہو رہی تھیں جو وہاں کام کرنے والی لڑکیاں یونیفارم کے طور پر پہنتی تھیں۔

''روزی! یہ ان خاتون کے شوہر ہیں جن کے بارے میں سارجنٹ مورس نے تم سے معلومات حاصل کی تھیں۔ چونکہ تم نے ہی ان خاتون اور اس کے ساتھی کو سرو کیا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں ان سے ملوا دوں۔'' منیجر نے ایک طرح سے تعارف کی رسم ادا کی تو روزی نامی وہ ویٹرس اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر؟'' اس نے نہایت شائستگی سے اسلم سے دریافت کیا۔

''پہلے تم یہ تصویر دیکھ لو اور مجھے بتاؤ کہ کیا یہ وہی خاتون ہیں جس کے بارے میں تم نے سارجنٹ مورس کو بتایا تھا؟'' اسلم کے دل میں یک دم ہی یہ خیال آیا تھا کہ ہو سکتا ہے اسپتال کے ریکارڈ میں موجود پاسپورٹ سائز تصویر نے ویٹرس کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو، اس لیے اس نے اپنے پرس میں موجود تصویر اس کے سامنے کر دی۔ روزی نے چند سیکنڈ تک تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے لب کھولے۔

''یس سر! یہ وہی خاتون ہیں۔'' اس کی تصدیق نے اسلم کے دل میں ابھرنے والی امید کی کرن کو بجھا دیا۔

''کیا تم نے ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی گفتگو سنی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے؟'' اسلم نے اذیت کے صحرا سے گزرتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا۔ اسے یہ سوال کرنا بھی ماہ بانو کی توہین کے مترادف لگا تھا لیکن اسے تلاش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

''وہ دونوں شاید پرانے شناسا تھے کیونکہ مرد ماضی کے کسی عمل کے لیے ان خاتون سے معذرت کر رہا تھا اور پھر شاید ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا تھا کیونکہ بعد میں، میں نے انہیں مسکراتے ہوئے ایک ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا۔'' روزی نے جھکی نظروں سے جواب دیتے ہوئے اس کے اندر کی دنیا کو تہ و بالا کیا۔

''آپ کے ہاں نصب کیمروں نے ان کی فوٹیج تو ضرور تیار کی ہوگی۔ کیا آپ مجھے وہ فوٹیج دکھا سکتے ہیں تاکہ میں اپنی بیوی کے ساتھ موجود شخص کو شناخت کر سکوں۔''

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اتنے ضبط سے کام لے رہا تھا ورنہ وہ تو وہ اسلم تھا جس نے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر ان پر بھی اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ جس کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے تھے اور جو اسلحے کے بغیر بھی مقابل کے چھکے چھڑا سکتا تھا۔ یہ تو ماہ بانو ہی تھی جس نے اسے جنگل کی زندگی چھوڑ کر مہذب انسانوں کی دنیا میں آنے پر مجبور کیا تھا اور جس کی خاطر وہ اپنے دیس سے اتنی دور آ بسنے پر راضی ہوا تھا۔ ماہ بانو کی ایک ہی نظر اس کے دل کو موم کر دیا کرتی تھی اور اب وہ اس کی جدائی میں خاک ہو رہا تھا۔

''روزی! تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔'' منیجر نے پہلے ویٹرس کو وہاں سے روانہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس سلسلے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ فوٹیج پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ آپ چاہیں تو پولیس سے رابطہ کریں۔'' منیجر نے اس انداز میں اسے جواب دیا جسے سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اسے مزید اپنے آفس میں دیکھنا نہیں چاہتا، اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اسے یقیناً پولیس سے ہی رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ ایک بار فوٹیج دیکھ لیتا تو کم از کم یہ تو اندازہ ہو جاتا کہ ماہ بانو کے غیاب کا سبب بننے والا شخص کون تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس کا کوئی دشمن ہی رہا ہو اور وہ صرف اپنی نرم دلی کے سبب اس کے جال میں پھنس گئی ہو۔ یہ تو وہ بہرحال مان ہی نہیں سکتا تھا کہ اس نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ ماہ بانو کے نام نہ بتانے کے باوجود اس نے یہ بات پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ وہ جس شخص کی محبت میں مبتلا ہے، وہ شہریار عادل ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ان دونوں کی آنکھوں میں حیا بھی دیکھی تھی۔ وہ دونوں ہی ایسے نہیں تھے کہ اخلاقی و شرعی حدود کو توڑنے کی کوشش کرتے چنانچہ اسے یقین تھا کہ یہ معاملہ ایسا نہیں جیسا دکھ رہا ہے۔

''اوکے، آپ کے تعاون اور مشورے دونوں کے لیے ہی بہت بہت شکریہ۔'' اسلم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس بار دونوں میں سے کسی نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسلم کمرے سے باہر نکل کر باہر گیلری میں پہنچا تو یک دم ہی اس ویٹرس سے ٹکراؤ ہو گیا جس سے کچھ دیر قبل اس نے منیجر کے کمرے میں بات کی تھی۔ ویٹرس نے اس سے کچھ کہے بغیر کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ششدر سا اسلم اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہاں مزید رکنا مناسب نہیں ہے۔ کاغذ کا پرزہ اپنی مٹھی میں دبائے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے اپنی مٹھی کھولی، اس میں دبے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

"رات دس بجے مجھ سے اس پتے پر ملو۔" مختصر سے اس پیغام کے نیچے ایک پتا درج تھا لیکن نام نہیں لکھا تھا۔ اسلم کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی اور لگا کہ ماہ بانو کی تلاش میں کوئی بہت اہم پیش رفت ہونے والی ہے لیکن ابھی دس بجنے میں بہت دیر تھی۔ درمیان کے کئی گھنٹے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں گزار سکتا تھا چنانچہ اردگرد کی شاپس سے ماہ بانو کی تصویر دکھا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔ ایک اسٹور کے مالک نے تصویر کو شناخت کر لیا۔ اس کے مطابق ماہ بانو نے وہاں سے جیلی، فریش کریم اور آئسنگ شوگر جیسے آئٹم خریدے تھے اور پھر اپنے ساتھی مرد کے ساتھ اس حالت میں وہاں سے روانہ ہوئی تھی کہ اس نے ماہ بانو کی کمر میں اپنا دایاں بازو حمائل کر رکھا تھا۔ اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ اسلم اسٹور کے مالک کے آخری ریمارکس پر توجہ دینے کے بجائے ماہ بانو کی خریدی ہوئی اشیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ فریج میں تیار کر کے رکھا ہوا کسٹرڈ وہ ماہ بانو کے غیاب کے دن ہی دیکھ چکا تھا اور جو چیزیں اس نے اسٹور سے خریدی تھیں، وہ سب ایسی تھیں جو کسٹرڈ کی سجاوٹ کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یعنی یہ طے تھا کہ اسے لوٹ کر گھر ہی آنا تھا لیکن جانے وہ کون تھا کہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور وہ ایسے غائب ہو گئی جیسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔

اسٹور سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد اسے شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ وہ اس شخص کو دیکھ سکے جسے ماہ بانو کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ریسٹورنٹ کی طرح اسٹور میں نصب کیمرے کی فوٹیج بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ چنانچہ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ پولیس اسٹیشن جائے اور وہاں سارجنٹ مورس سے مل کر اسے فوٹیج دکھانے پر آمادہ کرے۔ اس نے فوراً ہی اس بات پر عمل کیا اور پندرہ منٹ میں وہاں جا پہنچا۔ راستے میں وہ یہ بات نوٹ کرتا ہوا گیا تھا کہ طوفان کے بعد بحالی کا کام بہت تیزی سے ہوا تھا اور زندگی دوبارہ پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی تھی۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس کی خواہش پر جب اسے سارجنٹ مورس کے پاس پہنچا دیا مورس نے اسے اپنے سامنے موجود کرسی پر بیٹھنے کا کرتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"میں وہ فوٹیج دیکھنا چاہتا ہوں جس میں میری اور وہ آدمی ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے وہ فوٹیج تمہاری تحویل میں ہیں۔" اس نے فوراً اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیوں؟" سارجنٹ نے اس سے ایک لفظی سوال کیا۔

"اس آدمی کو شناخت کرنے کے لیے۔ اس سے مجھے اپنی بیوی کو تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔" اس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ حقیقتاً اسے سارجنٹ کا رویہ بری طرح چبھ رہا تھا جو شاید اسے تیسرے درجے کا شہری سمجھتے ہوئے اس طرح اس کے کیس میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی اسے لینی چاہیے تھی۔

"تمہاری بیوی کو تلاش کرنا ہماری ذمے داری ہے اس لیے تمہیں چاہیے کہ آرام سے گھر بیٹھ کر انتظار کرو۔ ہمیں جیسے ہی مزید کوئی خبر ملے گی، ہم تم تک پہنچا دیں گے۔" واقعی تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے، یہ تمہارا کام ہے پھر بھی تمہیں مجھے فوٹیج دکھانی چاہیے۔ ممکن ہے کہ میں اس شخص کو شناخت کر سکوں اور پولیس کو اس تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔" اس نے نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے اس سے اصرار کیا۔

"میں وہ فوٹیج جان بوجھ کر تمہیں نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تم مشرقی مردوں کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے اگر اس شخص کو پہچان لیا تو سیدھے اس کے ٹھکانے پر پہنچو گے اور غیرت کے نام پر قتل و غارت گری مچا کر رکھ دو گے جسے ظاہر ہے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہیں وہ فوٹیج دکھانے کی غلطی کروں گا۔" اس نے ذرا تلخ لہجے میں اسلم کو یہ جواب دیا اور بے نیازی سے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسلم کو اس کا یہ انداز سخت گراں گزرا لہٰذا ذرا تند لہجے میں بولا۔

"مجھے اپنی بیوی کے کردار پر کوئی شک نہیں ہے آفیسر۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کسی دشمن کے ہاتھوں میں پھنس گئی ہے اور میں اسے ہر حال میں وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔"

"شواہد تو کچھ اور کہتے ہیں۔" وہ ذرا طنز سے مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بہرحال، ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ تمہاری بیوی مل گئی تو تمہیں اطلاع دے دی

جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم میرا مزید وقت برباد مت کرو۔" اس نے اکھڑے انداز میں اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ اسلم کا دل چاہا کہ اس کے دو چار دانت تو ضرور ہی توڑ دے لیکن پھر اس پیغام کا خیال آ گیا جو روزی نامی ویٹرس نے اس تک پہنچایا تھا۔ ممکن تھا کہ دس بجے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنے کی صورت میں اسے ماہ بانو کا کوئی کلیو مل جاتا لیکن اس سے پہلے ہی اگر وہ اس بداخلاق پولیس والے سے الجھنے کی غلطی کر بیٹھتا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ اس کی عقل نے بہت بروقت اس کے جنوں کو قابو کیا اور وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر اسے اپنے اس رویے پر آفتاب یاد آ گیا جسے وہ اس لیے ساتھ لانے پر راضی نہیں ہوا تھا کہ کہیں وہ اس کے جنوں کے راستے میں رکاوٹ نہ بن جائے لیکن اب کسی پاسبانِ عقل کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود خود بھی مصلحت پسندی سے کام لے رہا تھا۔ اپنی اس روش پر اس کے ہونٹوں پر لحہ بھر کے لیے اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ یونہی پیدل چلتے ہوئے اپنا تجزیہ کرنے لگا۔ دو دن جو اس نے گھر میں ہاتھ پیر ہلائے بغیر گزارے تھے اس کے لیے بڑے قیامت خیز ثابت ہوئے تھے۔ ان دو دنوں میں اس کے اندر سے زندگی کا احساس ختم ہو گیا تھا اور بس یہی دل چاہتا تھا کہ سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دے لیکن اب جبکہ وہ ماہ بانو کو عملی طور پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو لحہ بہ لحہ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے نہایت سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا ہوگا کیونکہ اگر وہ کوئی حماقت کرتا تو نتیجے میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتا اور کچھ بھی کرنے سے قاصر ہو جاتا۔

اسے اگر ماہ بانو کو تلاش کرنا تھا تو خود بھی آزاد اور زندہ سلامت رہنا تھا۔ دل میں زندہ رہنے کی تمنا جاگی تو یہ بھی احساس ہوا کہ دو دن سے اس نے ڈھنگ سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے جس کے باعث اس کے جسم میں ہلکا ہلکا کمزوری کا احساس جاگ رہا ہے۔ جسم کی مشین کو چلاتے رہنے کے لیے غذا کے ایندھن کی ضرورت تھی تاکہ یہ مشین اپنی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ خود کو بمشکل آمادہ کر کے ایک کافی شاپ میں جا پہنچا اور کافی کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ جلد ہی وہ دونوں چیزیں اس کی میز پر پہنچ گئیں۔ اس نے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اپنے منہ میں ڈالا۔ اسی پل دل میں یہ خیال آیا کہ نہ جانے ان دو دنوں میں ماہ بانو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ سینڈوچ کا وہ ٹکڑا اس کے حلق میں پھنس سا گیا جسے نیچے اتارنے کے لیے اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا۔ کافی کی گرمی نے اس کی زبان اور حلق کو جلا ڈالا اور بے ساختہ ہی آنکھوں میں نمی امڈ آئی۔ یہ نمی کافی کی جلن کے باعث نہیں تھی بلکہ اس دکھ کے سبب تھی جو مسلسل اس کے سینے کو جلا رہا تھا۔

☆☆☆

لمبا قد، بے پناہ گوری رنگت، نیلگوں سبز آنکھیں، سیاہی پر غالب ہوتے چاندی جیسے سفید بال اور مضبوط و توانا جسم پر بے پناہ سجتا سفید براق کرتہ پاجامہ... یہ حلیہ تھا کبیر خان عرف بھائی جی کا جو پچپن سے تجاوز کرتی عمر کے باوجود بلاجھجک وجیہہ اور ہینڈسم قرار دیا جا سکتا تھا۔ عبدالرحمٰن عرف عبدل کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے جانے والے وہ تینوں پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

"تشریف رکھیے۔" اس کا لہجہ نہایت شستہ تھا جس کی ممبئی کے کسی بدمعاش سے امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ظاہری شخصیت کی طرح اس کے لہجے نے بھی انہیں متاثر کیا۔

"یہ ملاقات شاید بہت پہلے ہو جاتی اگر آپ کے آدمی ہمیں شیواجی ہوٹل سے یہاں لانے میں ناکام نہ ہو جاتے۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے اس واقعے کا حوالہ دیا جب انہیں مخالف گروپ سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی اندو کی وجہ سے بھائی جی کے گرگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا ہی ہوا کہ وہ لوگ ناکام ہو گئے ورنہ ہماری ملاقات بہت مختلف ماحول میں ہوتی۔" بھائی جی نے نہایت نرم لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا لیکن کچھ تھا جس نے شہریار کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی اور وہ ایک بار پھر بھائی جی کی شخصیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ نہایت نفیس دکھائی دینے والے اس شخص کی اصل شخصیت کئی پرتوں میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ اس کے سادہ ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی سادہ آدمی ممبئی کی جرم نگری پر حکومت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"ٹھیک کہا آپ نے۔ اس صورت میں ہم دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے روبرو ہوتے۔" شہریار نے بظاہر اس سے اتفاق کیا لیکن بین السطور یہ جتایا کہ ملاقات کے ان لمحات میں دونوں طرف کے لوگ ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں۔ بھائی جی کے چونک کر اپنی طرف دیکھنے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا پیغام پوری طرح ان تک پہنچ گیا ہے۔ بھائی جی چند ثانیوں کے لیے اسے غور سے دیکھنے کے بعد دھیرے سے مسکرا دیا۔

"نوجوان... تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ تم میں وہ

ہمت اور جرأت ہے جو آدمی کو اس کی منزل تک لے جاتی ہے۔ تم بھی اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گے اور مجھے خوشی ہوگی کہ میں اس کام میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

"لیکن کیوں؟" شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"عبدل نے تمہیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا پھر یہ سوال کس لیے؟"

"میرے نزدیک ہمدردی کے لیے یہ وجہ ناکافی ہے کہ ہم ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آپ کی محبوبہ رہتی ہے۔" اس نے بلا جھجک کہہ ڈالا لیکن بھائی جی کے چہرے پر ابھرتے درد کے احساس نے تھوڑا سا شرمندہ کر دیا۔

"میرے نزدیک تو یہ ایک وجہ بھی بہت اہم ہے لیکن ساتھ ہی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ ہم بھارتی مسلمان جو اکثر و بیشتر ہندوؤں کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، نفسیاتی طور پر پاکستان کے استحکام میں ہی اپنی سلامتی محسوس کرتے ہیں۔ میرے جیسے طاقتور یہاں بہت کم ہیں، اکثریت کمزوروں کی ہے اور ان کمزوروں کو یہ آسرا رہتا ہے کہ اگر، ان کے ساتھ ظلم ہوگا تو مذہب کے علاوہ بھی بہت سے رشتوں سے جڑے ہونے کے باعث پاکستانی عوام اور حکومت دنیا کے سامنے ان کے حق میں آواز اٹھائے گی۔ میں اس سوچ کا حامی ہوں اور اپنی طاقتور پوزیشن کے باوجود جانتا ہوں کہ کسی بین الاقوامی فورم پر مجھ جیسے غنڈے کی نہیں، ایک مستحکم حکومت کی بات سنی جائے گی اس لیے پاکستان کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اللہ آپ کی یہ خواہش پوری کرے۔" اس کی بات سن کر شہریار نے بے ساختہ دعا کی اور مزید بولا۔ "فی الحال تو ہمارا ملک دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث بہت مشکل حالات سے گزر رہا ہے اور ہم سمیت بس چند گنے چنے لوگ ہی ہیں جو ان سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں۔ آپ جیسی شخصیت کا ساتھ مل گیا تو ہمارا کام ذرا آسان ہو جائے گا۔ پیچھے ہٹنے والے تو بہرحال ہم نہیں ہیں۔"

"میں اب تک تمہارا ساتھ ہی دیتا رہا ہوں ورنہ بہت ممکن تھا کہ اب تک تم پولیس کی تحویل میں ہوتے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم لوگ ممبئی میں سب سے زیادہ مطلوب افراد ہو اور پولیس دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تمہارے اس ساتھی کی رہائش گاہ کو انہوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور اس سے معمولی واقفیت رکھنے لوگ بھی اس وقت سخت مشکل میں ہیں۔" بھائی جی کا کلام کی طرف تھا۔

"جس کنٹینر میں چھپ کر تم لوگ احمد آباد سے پہنچے ہو، اس کا تعلق اگر مجھ سے نہیں ہوتا تو تمہارا اتنی آ سے دوبارہ ممبئی میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ کتوں کی طر تمہاری بو سونگھتے پھرنے والے خفیہ اداروں کے آدمی تک تمہیں چھاپ لیتے۔ بہرحال، یہ سب بتانے سے مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تم پر کوئی احسان جتاؤں۔ میں صرف اپنے خلوص کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ساتھ تمہیں ان مشکلات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں درپیش ہیں۔ پریم ناتھ نے اپنا جو بیان ریکارڈ کروایا ہے اس کے بعد تمہارے لیے کوئی آسانی باقی نہیں رہی ہے اور ان حالات میں تمہارے لیے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا بہت ہی دشوار ہوگا۔"

"اس کے باوجود ہم اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" شہریار نے مضبوط لہجے میں اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھیوں کے تاثرات نے اس کے اس عزم میں شامل ہونے کا اظہار کیا۔

"اور اس کام کے آغاز کے لیے تمہارے سامنے پریم ناتھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔" بھائی جی نے پورے وثوق سے کہا تو ان میں سے کوئی تردید نہیں کر سکا۔

"میری مانو تو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ ایک ایسا درمیانی بندہ ہے جسے خفیہ ادارے تمہیں پھانسنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کریں گے۔ پھر اسے پکڑ کر تمہیں حاصل بھی کیا ہوگا؟ وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں کسی ایسے فرد کا نام بتا دے گا جس کا راسے تعلق ہو اور جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو خفیہ اداروں کی تحویل میں دینے میں کامیاب ہوا ہو۔"

"پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ اس کے سوا ہمارے سامنے ایسا کوئی فرد نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مقصد تک پہنچ سکیں۔" شہریار نے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا۔

"ایسا فرد میں تمہیں تلاش کر کے دوں گا۔ میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ یہ چھوٹا سا کام آسانی سے ہو جائے گا۔" بھائی جی نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا اور پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

"اس کام کے بدلے تمہیں بھی میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" شہریار نے چونک کر استفسار کیا۔

"تمہیں میرے مخالف اشوک کو قتل کرنا ہوگا۔" اس کی فرمائش نے ان تینوں کو الجھن میں ڈال دیا۔ کبیر خان عرف بھائی جی خود اتنے وسائل کا مالک تھا کہ اس کے آدمی اس کی اس خواہش کو پورا کر سکتے تھے پھر اسے ان سے یہ کام لینے کا کیوں خیال آیا تھا؟ تینوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی اس الجھن کو شہریار نے سوال کی صورت اس کے سامنے رکھ دیا۔

"قتل کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ میں اشوک کو اور اشوک مجھے موقع ملنے پر ہلاک کر سکتے ہیں لیکن صرف اس لیے نہیں کرتے کہ اس صورت میں فسادات کی ایک آگ بھڑک اٹھے گی اور دونوں طرف کے لوگ انتقام کے چکر میں ایک دوسرے کو کھیت ڈالیں گے لیکن یہ کام اگر تم کر دو تو مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی بلکہ میں اعلان کر دوں گا کہ ایک ہندوستانی کو قتل کرنے والوں سے انتقام لیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس صورت میں اشوک کے بندے جوق در جوق میری طرف کھنچے چلے آئیں گے اور اس کے بعد پورے ممبئی میں ایسا کوئی طاقتور گروہ باقی نہیں رہے گا جو میرے مقابلے پر آنے کی جرأت کر سکے۔" بالآخر بلی تھیلے سے برآمد ہو گئی اور ان پر واضح ہو گیا کہ اس سے پہلے بھائی جی ان کی مدد کے لیے جو جذباتی وجوہات پیش کرتا رہا تھا، وہ محض لفاظی تھی اور اس کا حقیقی مقصد وہی تھا جو اس نے اب بیان کیا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں زخمی دیکھ کر افسوس ہوا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ تم نے نہایت کامیابی سے دشمن کی چال کو ناکام بنا دیا۔" زخموں کی مرہم پٹی کروا کر جاوید علی ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو وہاں سب سے پہلے عالیہ سے سامنا ہوا۔

"تمہارے جذبات کے لیے شکریہ لیکن یاد رکھنا کہ زخموں سے سپاہی کبھی نہیں گھبراتا کیونکہ زخم ہی اس کے اصل میڈل ہوتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ کی بات کا جواب دیا تو وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اچھا خاصا خون بہہ جانے کے باعث اس کی رنگت میں ہلکی سی زردی در آئی تھی لیکن اس کے باوجود آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اس کی ذہانت اور جرأت کی گواہی دیتی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں خاتون؟" جاوید علی نے اسے ٹوکا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ جو لوگ اپنی زندگی کا درست نصب العین متعین کر لیتے ہیں، کتنے بہادر اور کھرے نظر آتے ہیں۔" اس نے بے خودی کے عالم میں جواب دیا۔

"اس تعریف نے میرا کئی لیٹر خون بڑھا دیا ہے اور امید ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے آئرن اور طاقت کی جو دوسری ادویات دی ہیں، اب ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس نے مذاق میں بات اڑانے کی کوشش کی جس پر عالیہ کھل کر ہنس دی۔ جاوید علی نے محسوس کیا کہ یہ ہنسی اس سے بہت مختلف ہے جو مساج سینٹر میں وہ گاہکوں کو لبھانے کے لیے بکھیرتی تھی۔ یہ وہ خالص ہنسی تھی جو کسی بھی عام سی لڑکی کے ہونٹوں پر بکھرتی ہے۔

"تم اپنی تیاری کر لو۔ آج میں تمہیں اس جگہ لے چلوں گا جہاں کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔" گفتگو کے سلسلے کو مزید آگے بڑھائے بغیر وہ اسے ہدایت دے کر خود آگے بڑھ گیا۔ اسپتال میں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے علاوہ خون اور گلوکوز کی ایک ایک بوتل بھی لگائی گئی تھی، اس کے باوجود وہ خفیف سی کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن اس کمزوری کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا اور ڈاکٹروں کے اصرار کے باوجود چند گھنٹوں سے زیادہ اسپتال میں رکنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ اسے بے چینی تھی کہ آپریشن میں اپنے حصے میں آنے والی کامیابی کا جائزہ لے سکے۔ ویسے تو اسے وہاں اپنے ساتھ موجود ساتھی کے ذریعے یہ اطلاعات مل گئی تھیں کہ حملہ آوروں میں سے کسی کو بھی زندہ بچ نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں ملا کر کل آٹھ افراد سوار تھے جن میں سے پانچ تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے، تین کو زخمی حالت میں وہاں سے گرفتار کر کے لے جایا گیا تھا۔ ان میں سے بھی ایک راستے میں دم توڑ گیا جبکہ دو زخمی حالت میں ان کی تحویل میں تھے اور ان سے تفتیش کی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جہاں عموماً مجرموں سے تفتیش کی جاتی تھی۔

"آپ کو میجر صاحب بلا رہے ہیں۔" اس سے قبل کہ وہ اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچتا، اسے راستے میں ایک آدمی نے یہ پیغام دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میجر صاحب سے اس کی مراد ذیشان ہے جو وہاں نصب جدید آلات کی وجہ سے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بھی ماتحتوں کی آمد و رفت سے باخبر رہتا تھا۔ حکم کی تعمیل میں وہ فوری طور پر اس طرف روانہ ہو گیا۔

"السلام علیکم سر۔" اجازت ملنے پر اندر داخل ہو کر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام... آؤ بیٹھو۔" ذیشان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کیسا فیل کر رہے ہو؟"

"مچ بیٹر سر۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن ڈاکٹروں کا تو کہنا ہے کہ ابھی تمہیں اسپتال میں رہ کر آرام کی ضرورت تھی؟" ذیشان نے سرزنش کرنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"میں ڈاکٹر کی رائے سے متفق نہیں تھا کیونکہ اپنی باڈی کے بارے میں، میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نوجوان نے سی ایف پی میں اپنے انتخاب کو ہر لمحے درست ثابت کیا تھا۔ وہ اتنا باصلاحیت تھا، تب ہی تو جب شہریار سلو والے کیس پر کام کرنے کراچی گیا تھا، اس نے کراچی یونٹ میں موجود ہر شخص کو چھوڑ کر اپنے ساتھ کے لیے جاوید علی کو منتخب کیا تھا جس نے شازمین کی جدائی کے تازہ زخم کے باوجود بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس کیس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چینی ہے جس پر تم کام کر رہے ہو۔ اطمینان رکھو۔ تم نے جو چند گھنٹے اسپتال میں گزارے ہیں، انہیں ہم نے ضائع نہیں ہونے دیا اور دونوں گرفتار زخمیوں سے ٹھیک ٹھاک معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ان دونوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ را کے لیے کام کرتے ہیں لیکن وہ فائٹنگ ونگ کے بندے ہیں اور صرف ملنے والی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ پلاننگ کے شعبے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پلازا کی چھت پر جس رائفل بردار آدمی کو عالیہ کو قتل کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا، وہ ایک کرائے کا قاتل ہے جو بڑے معاوضے پر ایسے کام نہایت صفائی سے انجام دیتا ہے۔ تمہارا راستہ روکنے والوں کو اس شخص اور گردوپیش کی نگرانی پر متعین کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ عالیہ کے قتل کی صورت میں کہیں نہ کہیں سے ردِعمل ظاہر ہوگا اور وہ ایسے افراد کو گھیرنے کی کوشش کریں گے جو زیادہ سرگرم نظر آئیں۔ رائفل بردار اپنے مقصد میں تو کامیاب نہیں ہو سکا لیکن تم لوگوں کو اسے ایمبولینس میں ڈال کر لے جاتے دیکھ کر نگرانی کرنے والوں نے سمجھ لیا کہ تم ہی ان کے مطلوبہ افراد ہو چنانچہ انہوں نے تمہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ نہیں جان سکے تھے کہ پیچھے ایک گاڑی میں تمہارے مزید ساتھی بھی موجود ہیں اس لیے خود پھنس گئے۔ دوسرے انہیں تم لوگوں کو زندہ پکڑ کر لانے کی ہدایت کی گئی تھی اس لیے انہوں نے بہت سخت ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ پراڈو والوں کے پاس تو آٹومیٹک اسلحے کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ تک موجود تھے۔" ذیشان نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"ہمیں اغوا کر کے وہ کہاں لے جاتے؟" جاوید علی کا جوش اب بھی قائم تھا۔

"گلبرگ کی ایک کوٹھی کا پتا بتایا تھا انہوں وہاں ریڈ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں موجو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سامان اور اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو تھے۔ وہاں سے کوئی ثبوت بھی نہیں ملا۔ اسلحہ روسی سا لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ بس اسلحے اور وہاں مو ورزش کے آلات دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں لڑنے بھڑنے والے افراد کا ٹھکانا تھا۔ اس جگہ کو پولیس کسٹڈی میں دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کرائے قاتل کو بھی پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس سے تفتیش کے پولیس خود ہی معلوم کر لے گی کہ اس نے کہاں کہاں کتنے افراد کو قتل کیا ہے۔ اس کیس سے نمٹنے کے لیے پولیس بہتر ہے۔" ذیشان نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب کیونکہ وہ جاوید علی کی اس معاملے میں دلچسپی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ہم اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے؟" جسم پر زخم کھا کر اتنا نڈھال نہیں ہوا تھا جتنا ان خبروں سے خو کو کمزور محسوس کرنے لگا۔

"فی الحال... لیکن ہمیں مکمل طور پر مایوس نہیں ہو چاہیے۔ ابھی ہمارے پاس وہ دونوں آدمی موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم ان سے مزید معلومات اگلوا سکتے ہیں۔" ذیشان نے اسے تسلی دی تو وہ دوبارہ پُرجوش ہو گیا۔

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں سر۔"

"ٹھیک ہے۔" ذیشان نے فوراً ہی اسے اجازت دے دی کہ اس کے اندر جلتے الاؤ پر پانی ڈالنے کے لیے ایسے ٹاسک بہت ضروری تھے۔ اجازت ملتے ہی وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ان دونوں میں سے ایک کی موجودگی کی اطلاع تھی۔ وہ شخص ایک کرسی پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کرسی میں نصب ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے پٹی بندھی ہوئی تھی، اسے حاصل شدہ معلومات کے مطابق یہ گولی کا زخم تھا۔ گولی نے اس کی ہڈی کو توڑ دیا تھا لیکن انہوں نے اسے اسپتال لے جانے کی زحمت نہیں کی تھی اور سی ایف پی کے ایک ایسے اہلکار نے جو فوج میں میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہا تھا، اس کے پیر سے گولی نکال کر زخم پر بینڈیج باندھ دی تھی۔ یہ کوئی علاج نہیں تھا۔ اس شخص کو باقاعدہ آپریشن کی ضرورت تھی لیکن وہ اس کے ایسے چونچلے نہیں اٹھا

کیے تھے اس لیے بس اتنے پر اکتفا کیا تھا کہ وہ فوری طور پر مرنے سے بچ جائے۔ اس کے سوجن زدہ چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ معلومات کے حصول کے لیے سی ایف پی کے جوانوں نے بھی اس کی خاطر خواہ مدارت کی تھی۔ اس وقت وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا جو شاید کسی پین کلر کی مہربانی تھی۔ جاوید علی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا تو وہ ایک کراہ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ اپنے سامنے جاوید علی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی اتر آئیں۔

"موہن... یہی نام ہے نا تمہارا؟" سپاٹ لہجے میں کیے گئے اس سوال کا جواب اس نے سر کی اثباتی جنبش سے دیا۔

"تم مجھے ایسا کیا بتا سکتے ہو موہن جو اب تک تم نے میرے ساتھیوں کو نہیں بتایا؟" اس نے اسی سرد لہجے میں پوچھا جو مقابل کے وجود میں خوف کی لہر دوڑا دیتا ہے۔

"مم... میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میرے پاس بتانے کے لیے اب کچھ نہیں ہے۔" اس نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے پھر میرے پاس تم سے کرنے کے لیے ایسا سلوک ہے جو اب تک میرے ساتھیوں میں سے کسی نے تمہارے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ سرد لہجے میں بولا اور روئے سخن پہلے سے وہاں موجود سلمان کی طرف کر لیا۔

"اس کی بینڈیج کھول دو سلمان۔" سلمان نے فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بینڈیج کھلتے ہی موہن کے چہرے پر چھائے خوف اور تکلیف کے تاثرات پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اور منہ سے بے ساختہ ہی سسکاریاں نکلنے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو یقیناً بینڈیج نے کچھ نہ کچھ سہارا دیا ہوا تھا، وہ بالکل آزاد ہو گئی تو درد بھی اس کی برداشت سے کھیلنے کے لیے آزاد ہو گیا اور زخم سے ایک بار پھر خون رسنے لگا۔

"ہم اپنے اپنے وطن کے سپاہی ہیں اس لیے زخم تو ہم دونوں ہی کے حصے میں آئے ہیں لیکن فرق ہماری حیثیت کا ہے۔ تم غاصب اور بدنیت ہو اور اپنی سازشوں سے میرے وطن کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہو جبکہ میں تم جیسوں کے ساتھ اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہا ہوں اس لیے تم سے کوئی بھی سخت ترین رویّہ اپنانے میں حق بجانب ہوں۔ ہمارے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ اس وقت میں مختار اور تم قیدی ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم مجھ سے بدترین رویّہ اختیار کرتے اس لیے میں بھی بے شمار انسانوں کے قتل میں ملوث شخص سے کوئی بھی سلوک کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔" وہ عملی قدم اٹھانے سے پہلے اسے نفسیاتی حربوں سے زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور موہن کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے۔

"الیکٹرک راڈ لاؤ سلمان اور اس کے زخم میں اس جگہ گھسا دو جہاں گولی نے سوراخ کیا ہے۔ اگر اس پر اس کا بھی اثر نہ ہو تو پھر زخم میں نمک اور مرچیں بھر دینا۔" یہ احکامات دیتے ہوئے اس کے چہرے سے نرمی کے تاثرات بالکل ختم ہو گئے تھے اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو کچھ دیر قبل عالیہ سے بہت اچھے موڈ میں بات کر رہا تھا۔ سلمان نے اس کے احکامات پر خاموشی سے عمل کیا اور جب وہ سرخ دہکتی ہوئی راڈ لے کر موہن کے قریب پہنچا تو موہن کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ سلمان نے راڈ کو اس کے زخم سے جیسے ہی چھوا، وہ فلک شگاف آواز میں چیخا۔ یہ چیخ ایسی تھی کہ سننے والے کو اندازہ ہو جائے کہ اب اس میں مزید دم خم نہیں ہے۔ سلمان نے مشکل سے تین سیکنڈ کے لیے ہی راڈ اس کے زخم پر رکھی ہوگی لیکن یہ تین سیکنڈ بھی اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ وہ سر سے پیر تک پسینے سے بُری طرح نہا گیا تھا۔

"کیا خیال ہے... اس بار تین کے بجائے تیس سیکنڈ کے لیے راڈ تمہارے زخم پر رکھی جائے گی بلکہ پوری طرح اندر داخل کر دیں تو زیادہ ہی مناسب ہوگا۔" جاوید علی نے بڑے پُرسکون انداز میں اس کی رائے طلب کی جس پر اس کی آنکھوں میں نفرت لہرائی لیکن وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ اپنی نفرت کا اظہار کر سکے اس لیے صلح جو انداز میں بولا۔

"میں پہلے ہی تمہارے ساتھیوں کو بہت کچھ بتا چکا ہوں اب مزید..."

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے وہ سننا ہے جو تم نے نہیں بتایا۔ اس لیے تمہارے لیے بہتر ہے کہ مجھے وہ بتاؤ جو میں سننا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرے پاس زبان کھلوانے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک طریقے موجود ہیں۔ تم اگر انہیں خود پر آزمانے کا شوق رکھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" جاوید علی نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی اور سلمان کو اشارہ کیا، وہ فوراً ہی حرکت میں آیا۔

ابھی راڈ موہن کے زخم سے انچ بھر دور تھی کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ چیخا۔ "بھگوان کے لیے اسے مجھ سے دور رکھو۔ میں تمہیں ایک بہت کام کی بات بتاتا ہوں۔" سلمان نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

"بولتے رہو، رکے تو ہم شروع ہو جائیں گے۔" اس کی آمادگی کے باوجود اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس

دھمکی نے خاصا اثر کیا اور وہ بغیر رکے بولنا شروع ہو گیا۔

"میں را کے فائٹنگ ونگ میں شامل ہوں۔ میں اور میرے ساتھی آرڈر ملنے پر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہر مشن کا پلان ہمیں اپنے انچارج سے مل جاتا ہے اور ہمارا اوپر والوں سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رہتا اس لیے ہم کسی کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ گلبرگ کی جس کوٹھی کا پتا تم لوگوں کو بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی ٹھکانے کا آفیشلی ہمیں علم بھی نہیں ہے لیکن میں اتفاق سے ایک ایسی جگہ کو جانتا ہوں جس کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہاں ہمارے کچھ بڑے رہتے ہیں کیونکہ اس بنگلے میں، میں نے اپنے انچارج کو آتا جاتا دیکھا ہے۔ باقی کنفرم کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔" اس نے ایک ایسی بات بتائی تھی جس سے انہیں فائدہ ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ بہرحال، اس کلیو پر انہیں کام تو کرنا ہی تھا کہ ان کی فیلڈ میں امکانات پر ہی کام کیا جاتا ہے۔ موہن سے اس بنگلے کا پتا معلوم کرنے کے بعد وہ اسے مزید بھی ٹٹولتا رہا لیکن اس کے علاوہ کوئی خاطر خواہ بات معلوم نہ ہو سکی۔

"اس بنگلے کی نگرانی پر آدمی لگا دو۔ اس بار ہم ڈائریکٹ ریڈ کرنے کے بجائے موقع دیکھ کر کارروائی کریں گے۔" وہ سلمان کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تو اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے ہو جائے گا لیکن تم اپنا خیال رکھو۔ ابھی تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے اور تم اسپتال سے اٹھ کر یہاں آ گئے ہو۔" سلمان نے اسے ٹوکا۔

"میں ٹھیک ہوں یار... لیکن تم لوگ اتنا اصرار کر رہے ہو تو ریسٹ بھی کر لوں گا۔ یہاں سے میرا سیدھے گھر جانے کا ہی پروگرام ہے۔ امی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ بس تم مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔"

"بے فکر رہو۔ میں تمہیں اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔" سلمان نے اسے تسلی دی تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ اپنا مختصر سامان پیک کر چکی تھی۔

"ریڈی ہو... چلیں؟" اس نے پوچھا تو عالیہ نے محض سر کی جنبش سے اسے اثبات میں جواب دیا اور ایک چادر اٹھا کر اسے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹنے کے بعد اس کے ایک پلو سے نقاب کی طرح اپنے چہرے کو چھپا لیا جس پر جاوید علی کے چہرے پر ایک پسندیدہ تاثر ابھرا لیکن زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی میں سوار وہاں سے جا رہے تھے۔

"تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد عالیہ نے دریافت کیا۔

"جا تو رہے ہیں... پہنچ کر تمہیں خود ہی پتا چل جا

"بڑے پکے ہو بھئی، کچھ اگلتے ہی نہیں۔"

"اتنی آسانی سے اگلنے والا ہوتا تو وطن کے محا میں کیونکر شامل ہوتا۔" اس نے بے ساختگی سے جواب عالیہ بھی مسکرا دی۔ اس کے بعد کا سفر انہوں نے اِدھر اُ باتوں میں گزار دیا۔ آخرکار وہ ایک چھوٹے سے خو مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ دونوں اپنی اپنی جانب کا د کھول کر نیچے اتر آئے۔ جاوید علی نے پہلے عالیہ کا بیگ سیٹ سے اٹھایا پھر گاڑی لاک کر کے مکان کی گھنٹی فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور سر پر دوپٹا اوڑھی ایک خا چہرہ نظر آیا۔

"السلام علیکم امی۔" وہ فوراً ہی ان سے لپٹ گیا۔ وہ بھی سلام کا جواب دے کر اس کی بلائیں لینے لگ بازو کا زخم تو قمیص کی فل آستینوں میں چھپا ہوا تھا لیکن ما چوٹ فوراً ان کی نظر میں آ گئی۔

"جب آتا ہے کوئی نہ کوئی چوٹ سجا کر!!!"

"یہ تو تمغے ہیں امی! اور ایک سپاہی کی ماں کو انہیں خوش ہونا چاہیے۔" وہ انہیں ایک بازو کے حصار میں لے کی طرف بڑھا، ساتھ ہی عالیہ کی طرف بھی توجہ دلائی۔

"دیکھیں تو سہی میرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔"

"یہ عالیہ ہے نا؟" انہوں نے خود ہی فوراً اندازہ ل اور پھر براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بو

"معاف کرنا بیٹی! یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اتنے اتنے دنوں اپنی شکل دکھاتا ہے کہ مجھے اس کے سوا کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔

"اٹس او کے آنٹی۔ میں آپ کی کیفیت کو سمجھ ہوں۔" عالیہ نے فوراً ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وقت وہ خود خاصی جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اندازہ نہیں تھا کہ جاوید علی اسے اتنی عزت دے گا کہ گھر لے آئے گا۔

"جیتی رہو۔ مجھے جاوید نے فون پر بتا دیا تھا کہ دن تمہیں لے کر یہاں آئے گا۔ میں تو تمہارا انتظار کر ر تھی۔ سوچا تمہارے آنے سے مجھے بیٹی بھی مل جائے گی میری تنہائی بھی بٹ جائے گی۔ تم جب تک چاہو، یہاں ر آج سے یہ تمہارا ہی گھر ہے۔" انہوں نے اسے محبت گلے لگایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برسوں کی آبلہ کے بعد آج اس کے قدموں نے ایک ایسے گھر کی زمین جہاں کے مکینوں نے اسے خوش دلی اور خلوص سے خوش دید کہا تھا اور اپنے گھر کو اس کا گھر قرار دیا تھا۔

☆☆☆

"اندر آ جاؤ۔" ٹھیک رات دس بجے اس نے روزی کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ے اندر آنے کا کہہ کر روزی دروازے سے ہٹ گئی۔ اسلم ں کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ ریسٹورنٹ میں منی اسکرٹ ن کر گاہکوں کے آرڈر سرو کرتی روزی کے مقابلے میں نہا و کر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنی روزی اور زیادہ صوم اور دلکش لگ رہی تھی لیکن اسلم کو اس کی خوب صورتی ے کوئی غرض نہیں تھی، وہ تو بس اپنی ماہ بانو کی تلاش میں اس ک آیا تھا۔

"تم کچھ پیو گے؟" اسے اپارٹمنٹ کے مختصر لاؤنج ں ایک صوفے پر بٹھا کر روزی نے اس سے دریافت کیا۔

"پلیز، میں کسی قسم کی فارمیلیٹیز میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے میری بیوی کے بارے میں جو بتا سکتی ہو بتا دو۔" اسلم نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا تو اس نے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے غور سے دیکھا۔

"بہت چاہتے ہو اپنی بیوی کو؟"

"اپنی جان سے بھی زیادہ۔"

"خوش قسمت ہے وہ۔ میں نے اس کے لیے تمہاری محبت دیکھ کر ہی تمہیں حقائق بتانے کا فیصلہ کیا ہے ورنہ کسی کے علم میں یہ بات آ گئی تو شاید میری اپنی زندگی کے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔" اس کے الفاظ نے اسلم کے جسم میں تناؤ پیدا کر دیا اور وہ پوری جان سے ہمہ تن گوش ہو گیا کہ روزی اسے کیا بتاتی ہے۔

"تمہاری بیوی کو میں نے جس شخص کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اس کا کوئی پرانا شناسا تو محسوس ہوتا تھا لیکن اچھا دوست یا رشتے دار نہیں۔ ان کے درمیان کچھ تلخی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات وہ ہے جو ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے معلوم ہوئی۔ میرے گرینڈ پا گالف کورس کے ساتھ بنے مکانات میں سے ایک مکان میں رہتے ہیں اور میں کبھی کبھار ان سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ اس روز بھی میں اپنی جانب سے سیدھی وہیں گئی تھی اور باتوں باتوں میں گرینڈ پا نے مجھے بتایا تھا کہ آج انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ان کے مطابق وہ عادت کے مطابق ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے کہ انہیں سرخ رنگ کی کار میں ایک انڈین جوڑا نظر

آیا۔ گاڑی مرد ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ ایک دلدل کے قریب پہنچنے پر مرد نے گاڑی روکی اور ڈیش بورڈ پر سے کچھ اٹھا کر باہر نکلا۔ گرینڈ پا کا اندازہ ہے کہ وہ چیز موبائل فون تھا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مرد موبائل فون کو دلدل میں پھینکنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت تو میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن جب تمہاری بیوی کی تلاش کے سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی تو مجھے اس واقعے کا خیال آیا۔ میں نے پولیس کو کچھ بتانے سے پہلے گرینڈ پا سے اس جوڑے کا حلیہ معلوم کر لینا زیادہ بہتر سمجھا لیکن بہت جلد پولیس کا ایسا رویہ سامنے آیا کہ جیسے وہ اس کیس کو دبانا چاہتی ہے۔ ہم لوگوں کو ہدایت دے دی گئی کہ اس سلسلے میں کسی سے اس کے سوا کوئی بات نہ کی جائے جو پولیس کے ریکارڈ کا حصہ ہے۔ میں قانون پسند شہری ہوں لیکن تمہاری حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تمہاری بیوی کے بارے میں ضرور بتاؤں گی کیونکہ گرینڈ پا سے بات کر کے اس بات کی تو میں تصدیق کر چکی تھی کہ ان کے دیکھے ہوئے جوڑے کا حلیہ وہی تھا جو ہمارے ریسٹورنٹ میں آنے والے جوڑے کا تھا۔" روزی تو شاید تیار ہی بیٹھی تھی کہ اس سے ملاقات ہوتے ہی سب کچھ اس کے گوش گزار کر دے گی، چنانچہ بولتی ہی چلی گئی۔

"مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔" اسلم نے ساری بات سن کر اس سے کہا۔ جواب میں اس نے تفصیل سے اسے پورا حلیہ بتا دیا جسے سن کر اسلم نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"نہیں، میں اس حلیے کے کسی فرد کو نہیں جانتا۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تمہاری جتنی مدد کر سکتی تھی کر دی۔ حالانکہ مجھ پر سارجنٹ اور منیجر کی طرف سے خاصا دباؤ تھا۔" اس نے امریکیوں کے مخصوص انداز میں شانے اچکائے اور اس سے یکسر بے نیاز نظر آنے لگی۔

"تھینک یو مس روزی۔ تم نے میری جو ہیلپ کی، اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" وہ بھی فوراً وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ پہلا کلیو تھا جو ماہ بانو کے بارے میں ملا تھا لیکن جس نے پریشانی کو مزید بڑھا دیا تھا۔

"گرینڈ پا کا خیال ہے کہ وہ گاڑی جنگل کی طرف گئی تھی۔" وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے سے روزی کی آواز سنائی دی۔ روزی کے اپارٹمنٹ سے نکل کر اس نے مصطفیٰ خان کے گھر کی طرف رخ کیا۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ ذرا سکون سے بیٹھ کر

کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا۔ گھر پہنچا تو اچھا خاصا سناٹا چھا چکا تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود چابی سے گیٹ کھولا اور سیدھے ایکسی کی طرف جانے کے بجائے مصطفیٰ خان کے رہائشی حصے کی طرف رخ کیا تا کہ اگر بلقیس جاگ رہی ہو تو ان سے معلوم کر سکے کہ آیا مصطفیٰ خان واپس آ گیا ہے یا نہیں اور اس نے ماہ بانو کے بارے میں کیا معلومات حاصل کی ہیں۔ گلاس ڈور تک پہنچ کر دستک دینے سے پہلے ہی اسے طوبیٰ نظر آ گئی۔ اس نے انگلی سے آہستہ سے کھٹکھٹا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اسلم اندر داخل ہو گیا۔

”آپ ابھی تک سوئی نہیں ہو؟“ اس نے طوبیٰ کے گال کو آہستہ سے تھپتھپا کر اس سے پوچھا۔

”نہیں لیکن آپ ممی کو مت بتایئے گا۔ وہ مجھے ڈانٹیں گی۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”نہیں بتاؤں گا لیکن آپ جا کر انہیں بتا دو کہ اسلم انکل آئے ہیں۔“

”نو، میں نہیں بتا سکتی۔ آپ خود جا کر ان سے مل لیں۔ وہ اسٹڈی میں پاپا کے ساتھ کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہی ہیں۔“ وہ تمام شرارتی بچوں کی طرح بہت ذہین بھی تھی اس لیے یہ غلطی نہیں کی کہ اسلم کے آنے کی اطلاع دینے ماں باپ کے پاس چلی جائے۔ اسلم نے اسٹڈی میں مصطفیٰ خان کی موجودگی کا سن کر خود وہاں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا لیکن اسٹڈی کے دروازے پر پہنچ کر ابھی اس نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ بلقیس کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

”اسلم تو پاگل ہو جائے گا۔ ماہ بانو میں اس کی جان اٹکی رہتی ہے اور آپ جو حالات بتا رہے ہیں، ان کے مطابق تو اسے بازیاب کروانا بہت مشکل ہو جائے گا۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے سامنے جو معلومات آئی ہیں اس کے مطابق یہ بہت اوپر کے درجے کا معاملہ ہے اور سارجنٹ مورس کو اس کیس پر کام کرنے سے باقاعدہ روک دیا گیا ہے۔ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے ایک تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنگلات میں زیرِ زمین ایک تجربہ گاہ قائم کی گئی ہے اور وہاں کسی بہت خفیہ پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ ماہ بانو سے پہلے بھی چند دوسری حاملہ خواتین کے غائب ہونے کی اطلاعات ہمارے پاس موجود ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان تمام خواتین کو جنگل کے آس پاس ہی آخری بار دیکھا گیا

ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہاں قائم تجربہ گاہ میں
پر کوئی تجربہ کیا جا رہا ہے اور ماہ بانو بھی وہیں ہے،
کا کام آسان نہیں ہو گا۔ البتہ میں نے اپنے انداز
کے کچھ حصوں کا انتخاب کیا ہے جہاں میرے خیال
کوئی تجربہ گاہ قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو یہ...“
کی اسکرین پر جنگل کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے
ان کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اسلم وہیں کھڑا
سنتا رہا اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ ایکسی میں
اس نے ایک بار پھر مصطفیٰ خان کی زبان سے سنی ہوئی
اپنے ذہن میں دہرایا اور خود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔
انگیز طور پر اس نے اپنے آپ کو کمپوز کر لیا تھا اور
سے کام کر رہا تھا۔ اپنے طور پر ساری معلومات اکٹھی
کے بعد وہ روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ رات دھیرے
اپنا سفر طے کرتی رہی اور آخر کار صبح کی پہلی پَو پھٹتے ہی
تیاری مکمل کر کے گھر سے نکل پڑا۔ آرلینڈو میں ابھی
طرح نہیں جاگی تھی۔ نہ کوئی گاڑی نظر آئی تھی، نہ انسان
فطرت کے دوسرے لوازم آہستہ آہستہ جاگنا شروع
تھے۔ ہوا میں وہی تازگی اور خوشبو تھی جو صبح کے علاوہ
کسی اور حصے میں محسوس نہیں کی جا سکتی۔ پیڑ پودے
ساتھ آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں پرندے
نظر آ رہے تھے لیکن... اسلم کے سارے حواس بس
چہچہاہٹوں کی طرف متوجہ تھے جو جنگل کی طرف سے
تھیں۔ وہ پرندوں کے ان نغموں میں اپنی ماہ بانو کی
سن رہا تھا جو اسے پکار رہی تھی، اپنی طرف بلا رہی تھی
دیوانہ وار اس پکار پر لپکا چلا جا رہا تھا۔ آبادی کو چھوڑ کر اس
جنگل میں قدم رکھا تو اس کے پیچھے کا سارا منظر سورج کی
سے سنہرا ہو چکا تھا لیکن اب وہ خود تاریکی میں تھا۔
گھنے جنگل میں سورج کی روشنی کا بھی گزر نہیں تھا۔ تاریکی
قدم اٹھاتا، وہ اپنی زندگی کی روشنی کی تلاش میں آگے
جا رہا تھا لیکن یکدم ہی زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے اور
محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔
نے کوشش کی کہ کھینچ کر اپنے پیروں کو باہر نکال سکے لیکن
اور بھی اندر دھنستے چلے گئے۔ گھنے تاریک جنگل میں،
کسی کو مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا، ایک دلدل اسے
کے لیے تیار تھی۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

کچھ لوگ زندگی کو زندگی سمجھ کر گزارنا پسند کرتے ہیں... وہ یہ حقیقت جان لیتے ہیں کہ زندگی سلیقے اور سبھاؤ کے ساتھ بِتائی جاتی ہے... وہ بھی اپنے آلودہ ماضی کو بھول کے حال کی دلکشی میں مست اور مستقبل کے سہانے خوابوں کا سوداگر تھا... مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بیتے ہوئے دنوں کے ساتھی ایک بار پھر اس سے ٹکرا جائیں گے... اور اس کے پُرسکون اور پُرسکوت روز و شب میں ہلچل مچا دیں گے۔

بظاہر دوست نظر آنے والے موقع پاتے ہی جان لینے سے
دریغ نہیں کرتے......اسی تناظر میں ایک اثر آفریں سرگزشت

یارانِ رفتگاں

عکسِ فاطمہ

کلارا اور وورل شاپنگ سینٹر میں خریداری کر رہے تھے۔ یہ مہینے کا پہلا اتوار تھا اور اس دن وہ مہینے بھر کا سودا خرید لیتے تھے۔ وورل سامان کی ٹرالی چلا رہا تھا اور کلارا چیزیں لے کر اس میں ڈالتی جا رہی تھی۔ وورل نے کلارا سے کہا۔ ”یاد آیا، بلیچ کی اضافی بوتل لینی ہے، اوپر والا باتھ روم صاف کرنا ہے۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں اسے مکمل صاف نہیں کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر ٹرالی میں بیٹھی اپنی تین سالہ بیٹی نینسی کو دیکھا۔

”پاپا چاکلیٹ۔“ نینسی نے اپنی چیز یاد دلائی۔

”تمہاری چاکلیٹ لے لی ہے۔“ کلارا نے اسے ڈبا دکھایا۔

''یہ کم ہے۔'' نینسی نے منہ بسورا تو کلارا نے اسے گھورا۔

''زیادہ چاکلیٹ کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔''

''اور پھر چاکلیٹ بند۔'' ووَرل نے نینسی کو ڈرایا۔

نینسی مان گئی۔ ''پھر ٹھیک ہے۔''

ووَرل اسکاٹ پانچ سال پہلے اس قصبے میں آیا تھا۔ اس کا تعلق ایریزونا سے تھا۔ ووَرل کا کہنا تھا کہ اسے جنگل اچھے لگتے ہیں اور ایریزونا میں جنگل نہیں تھے اس لیے وہ اوریگن چلا آیا اور یہاں اس نے جنگل کے محکمے میں گیم آفیسر کی نوکری کر لی اور اب وہ گیم وارڈن بن گیا تھا۔ چار سال پہلے اس نے کلارا سے شادی کر لی تھی۔ کلارا کا خاندان جدی پشتی بگ ہارن میں آباد تھا بلکہ قصبے کی بیشتر آبادی اس کے رشتے داروں پر مشتمل تھی۔ اس کے قریبی کزنز کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود اس نے شادی کے لیے ووَرل کو منتخب کیا اور وہ اس فیصلے سے بہت خوش تھی۔ ووَرل بہت اچھا، خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی کے ایک سال کے اندر وہ ماں باپ بن گئے۔

تین مہینے پہلے انہوں نے بگ ہارن سے ذرا دور یہ خوب صورت مکان لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ کلارا اس مکان میں آنے کے بعد بہت خوش تھی۔

''سامان سارا لے لیا؟'' ووَرل نے کہا اور دونوں فہرست اور سامان کا جائزہ لینے لگے۔

''سب لے لیا ہے۔'' کلارا نے اعلان کیا۔

وہ کیش کاؤنٹر پر آئے۔ سامان چیک کرا کے ادائیگی کی اور باہر نکل آئے۔

گھر پہنچ کر کلارا نے نینسی کو لیا اور اندر چلی گئی۔ ووَرل سامان اتار رہا تھا کہ اسے کلارا کی چیخ سنائی دی اور وہ اندر کی طرف بھاگا۔ داخلی دروازے کے سامنے ہی نشست گاہ تھی اور وہ اندر داخل ہوتے ہی ساکت ہو گیا۔ صوفوں پر تین افراد بیٹھے تھے اور کلارا ایک طرف نینسی کو لیے سہمی کھڑی تھی۔ اس نے ووَرل کو دیکھتے ہی کہا۔ ''ون ون نائن کو کال کرو، یہ لوگ ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔''

وہ تینوں موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ان میں سے سرخ بالوں اور لمبے قد والے آدمی نے کسی قدر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ووَلی! ضرور کال کرو اور کو بتاؤ کہ تمہارے کچھ پرانے دوست تم سے ملنے ہیں۔''

''پرانے دوست؟'' کلارا نے سوالیہ نظروں ووَرل کی طرف دیکھا۔ ''تم نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ تمہار کچھ پرانے دوست بھی ہیں... اس قسم کے؟'' اس کا لہجہ ہو گیا۔

''کلارا! نینسی کو لے کر اوپر جاؤ۔'' ووَرل نے کلارا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نینسی کو لے کر سیڑھیوں طرف بڑھ گئی۔ ووَرل سرخ بالوں والے کو گھور رہا تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں؟'' اس نے چونک کر کہا۔ ''میں ان دونوں ساتھ آیا ہوں۔''

''جان! مسخرا پن مت بنو۔'' ووَرل کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''میں نے تم سب کا پوچھا ہے۔''

''ہم کیوں آئے ہیں؟'' جان نے باقی دو سے پوچ اس کے استہزائیہ انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''ہم اپنے پرانے دوست سے ملنے آئے ہیں۔''

''میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔ پانچ سال پہلے جب تم سے جدا ہوا تھا تو ہر تعلق توڑ کر آیا تھا۔''

''میرے دوست! بعض تعلق توڑنے کے باوجود نہیں ٹوٹتے۔'' ان میں سے پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والا آدمی بولا۔

''شیلڈ! میں تم لوگوں سے ہر تعلق ختم کر چکا ہوں اور یہ بات تم لوگوں نے بھی تسلیم کی تھی۔''

شیلڈ نے حیرت سے اپنے باقی دو ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''کیا واقعی ہم نے یہ بات تسلیم کر لی تھی؟''

ووَرل کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ ''اگر نہیں بھی کی تھی تب بھی میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ''اب تم لوگ جاتے ہو یا میں چیخ پولیس کو کال کروں؟''

''آرام سے ووَلی۔'' جان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ پولیس کو کال کر کے تم خود مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

ووَرل کسی قدر نروس ہو گیا لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔ ''جب میں نے کچھ نہیں کیا ہے تو میں مصیبت میں کیسے پھنسوں گا؟''

''جب ہم پکڑے جائیں گے تو بہت ساری باتوں کا

اعتراف کریں گے اور اس میں یقیناً تمہارا نام بھی آئے گا۔'' ووَرل کے کندھے جھک گئے۔ ''جان، شیلڈ اور برگ... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔''

''تم مجھ سے فون پر رابطہ کر سکتے تھے، یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہم نے سوچا تمہیں سرپرائز دیں گے۔'' برگ پہلی بار بولا لیکن اس کے انداز میں شرارت نمایاں تھی۔ ''کیسا لگا سرپرائز؟''

''او کے! تم مجھ سے بات کرنے آئے ہو لیکن اس کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم کہیں باہر جا کر بات کر لیتے ہیں۔'' جان اس بار شرافت سے بولا۔

''او کے! میں اپنی بیوی کو بتا دوں، وہ پریشان نہ ہو۔'' ووَرل اوپر جاتے ہوئے بولا۔

''اے ووَلی! کوئی چالاکی مت کرنا، ورنہ خود تمہیں نقصان ہوگا۔'' عقب سے شیلڈ نے پکار کر کہا۔ ووَرل اوپر آیا تو کلارا بیڈ روم میں بے تابی سے ٹہل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

''ووَرل! یہ لوگ کون ہیں اور ان کی جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں گھسنے کی؟''

''کلارا! آرام سے... میں اس مسئلے سے نمٹ لوں گا۔'' ووَرل نے کوٹ اتار کر الماری سے اپنی وارڈن والی سرکاری جیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''میں سب جاننا چاہتی ہوں۔'' کلارا نے مطالبہ کیا۔

''میں آ کر سب بتاتا ہوں۔'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر پیار کیا اور آہستہ سے بولا۔ ''اگر میں دو گھنٹے میں واپس نہ آؤں تو تم پولیس کو کال کر سکتی ہو۔''

کلارا کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ ''ووَرل! اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی...''

''نہیں۔'' ووَرل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرنا، ورنہ مجھے بہت نقصان ہوگا۔''

کلارا ڈر گئی۔ ''ٹھیک ہے، جیسا تم کہہ رہے ہو میں ویسا ہی کروں گی۔''

''پریشان مت ہونا... میں دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔''

ووَرل نیچے آیا تو وہ تینوں اپنی جگہ بیٹھے تھے۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

وہ باہر آئے۔ وہ سرخ رنگ کی بڑی کار میں آئے تھے اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے بڑا طویل سفر کیا ہے۔ ووَرل نے جان کی طرف دیکھا۔ ''تم سیدھے میرے گھر آئے ہو؟''

''ہاں، ابھی ہم نے کہیں قیام بھی نہیں کیا ہے۔''

''میری گاڑی کے پیچھے آؤ۔'' ووَرل نے کہا۔ یہ اس کی سرکاری گاڑی تھی۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ سرخ کار ان راستوں پر بڑی مشکل سے آ رہی تھی۔ نصف گھنٹے بعد اس نے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ساتھ گاڑی روک دی۔ جان، شیلڈ اور برگ کار سے برآمد ہوئے۔ جان نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس لعنتی جگہ آنا ضروری تھا؟''

''بہت ضروری تھا۔'' ووَرل نے پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ، یہ ایسی جگہ ہے جہاں ہماری بات سننے والا کوئی نہیں ہے۔''

''یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔'' برگ ہنسا۔

ووَرل چلتے چلتے رک گیا اور اس نے مڑ کر کہا۔ ''یہ تمہاری خوش فہمی ہے، یہاں دیکھنے اور سننے والے بہت ہیں۔''

ووَرل ان کو لے کر ایک چھوٹی سی کھوہ میں داخل ہوا۔ اس نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ کھوہ پہاڑ میں کہیں اندر تک جا رہی تھی اور وہاں سخت بدبو تھی۔ تینوں نے ناک بند کر لی۔ جان بولا۔ ''یہ کہاں لے آئے ہو؟''

''اتنی بدبو۔'' برگ نے قے کرنے جیسی آواز نکالی۔

''مجھے معلوم ہے، تم نے جس کوٹھری میں آنکھ کھولی ہے، اس میں یہاں سے زیادہ بُو ہوتی تھی۔'' ووَرل نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے ٹارچ ایک جگہ لگا دی اور خود ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ''اب تم لوگ بات کر سکتے ہو۔''

وہ تینوں بھی مختلف جگہوں پر ٹک گئے۔ جب ووَرل ان کو یہاں لایا تو وہ تینوں بہت چوکنا ہو گئے تھے اور ان کے ہاتھ اپنی جیبوں میں چلے گئے تھے۔ ووَرل نے نوٹ کر لیا تھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اب بھی چوکنا تھے۔ جان نے کہا۔ ''تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم اب بھی وہی کر رہے ہیں۔''

''جو پانچ سال پہلے تم بھی کرتے تھے۔'' برگ نے لقمہ دیا۔

''لیکن اب میں وہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

''یہاں ہم ایک بزنس کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' جان بولا۔ ''تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

وورل نے سر ہلایا۔ ''سمجھ رہا ہوں لیکن اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے، یہ میں نہیں سمجھ سکا۔''

''حالانکہ تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔'' شیلڈ ایک لکڑی زمین پر مارتے ہوئے بولا۔ ''ہم تمہاری صورت دیکھنے نہیں آئے ہیں۔''

''اگر تم یہ توقع لے کر آئے ہو کہ تم مجھے اپنے ساتھ شامل کر لو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اب میں جرم کی دنیا چھوڑ چکا ہوں اور ایک ذمّے دار سرکاری افسر ہوں۔''

''ذمّے دار سرکاری افسر۔'' برگ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''اچھا لطیفہ ہے۔''

''تمہارے پاس آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔'' جان بدستور سنجیدہ رہا۔ ''تمہارا عہدہ مدد کرے گا۔ بزنس بہت بڑا ہے، کم سے کم ڈھائی ملین ڈالرز کا۔''

وورل کو جھٹکا لگا۔ ڈھائی ملین ڈالرز بہت بڑی رقم تھی۔ اس نے قرض لے کر جو مکان لیا تھا، اس کی مالیت ایک لاکھ اسّی ہزار ڈالرز تھی اور اسے اس کی قسط کوئی دس سال تک ادا کرنا تھی۔ جب وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا، تب بھی انہوں نے کوئی ایک لاکھ ڈالرز والا کام نہیں کیا تھا۔ وورل کو یاد تھا، ان کے ہاتھ جو سب سے بڑی رقم آئی تھی وہ پچھتر ہزار ڈالرز کی تھی۔ وہ جو حاصل کرتے، آپس میں تقسیم کر لیتے تھے اور ملنے والی رقم سے وہ بس چند دن ہی عیاشی کر پاتے تھے۔ رقم ختم ہو جاتی تو اس کے بعد گزارے والی حالت ہو جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ وورل کا دل جرائم سے ہٹنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ ان کو تھوڑا بہت ملتا اور سر پر پولیس اور جیل کی تلوار ہمہ وقت لٹکی رہتی تھی۔ اس نے جرم کی دنیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی بتا دیا۔ اس وقت انہوں نے اسے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی نامعلوم جگہ چلا جائے گا اور پھر ان سے کبھی رابطہ نہیں رکھے گا۔ اس نے ایریزونا سے ہزاروں میل دور اوریگن کی پُرسکون ریاست کا انتخاب کیا۔ یہاں اس کے ماضی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ کبھی پکڑا نہیں گیا تھا اور نہ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ تھا۔ اس لیے اسے سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پھر اسی نے دورانِ ملازمت اور شادی کے بعد کچھ کورسز کیے۔ اس کے نتیجے میں اسے وارڈن کے عہدے پر ترقی ملی اور اب وہ اس علاقے میں کوئی دو سو مربع میل پر پھیلے جنگلات کا خودمختار افسر تھا۔

''ڈھائی ملین ڈالرز کا بزنس اس علاقے میں؟'' اس نے شک سے کہا۔

''بالکل ہے... بلکہ ہو سکتا ہے اس سے زیاد جائیں۔'' جان بولا۔

''اور یہ رقم حاصل کرنے کے لیے ہمیں تمہاری درکار ہے۔'' شیلڈ نے کہا۔

''میں اس معاملے یا کسی بھی معاملے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ میرا تم سے برسوں پہلے تعلق ختم ہو گیا تھا۔''

''واقعی۔'' برگ نے دانت نکوس کر کہا۔ جب وہ کرتا تو اس کا دبلا سا چہرہ لومڑی جیسا ہو جاتا تھا۔ ''کیا سے تمہارے وہ سارے جرائم بھی ختم ہو جائیں گے جو تم ماضی میں کیے تھے؟''

''ان کے پولیس کیس موجود ہیں۔'' شیلڈ نے با آگے بڑھائی۔ ''خاص طور سے ایک کیس تو بہت اہم جس میں ایک پینٹ ہاؤس میں ڈکیتی ہوئی تھی اور پولیس وہاں سے ایک اجنبی فنگر پرنٹ ملا تھا۔''

''یہ فنگر پرنٹ آج بھی پولیس فائل میں محفوظ ہے۔'' جان مسکرایا۔ ''تم جانتے ہو، وہ کس کا فنگر پرنٹ ہے؟''

وورل کو یہ واقعہ یاد تھا۔ انہوں نے ایک دولت بوڑھی عورت کے گھر میں ڈکیتی کی تھی اور لوٹ مار کے دوران خوف سے عورت کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وورل نے اسے مدد دینے کے لیے اپنا دستانہ اتار دیا تھا اور اس کا ہاتھ کر کے ہتھے پر لگ گیا تھا۔ عورت بعد میں مر گئی تھی اور درحقیقت اس واقعے کے بعد ہی وورل جرم سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''تم تینوں حرامزادے مجھ بلیک میل کرنے آئے ہو؟''

''چچ چچ... یہ بہت بُرا لفظ ہے اور خاص طور سے دوستوں کے لیے۔'' برگ مخصوص انداز میں بولا۔

''وولی! اگر تمہیں بلیک کرنا ہوتا تو پانچ سال پہلے کرتے یا اس دوران میں جب چاہتے کرتے۔'' جان نے کہا۔ ''ہمیں چند مہینے بعد ہی علم ہو گیا تھا کہ تم کہاں ہو... اور میں سچ کہہ رہا ہوں، ہم خوش تھے کہ تم اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہو۔''

''تو اب کیا ہو گیا؟'' وورل کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''دیکھو دوست! مسئلہ ہماری زندگی کا بھی ہے۔ ڈھائی ملین ڈالرز بہت بڑی رقم ہے۔ ہر ایک کے حصے میں کم سے کم چھ لاکھ ڈالرز آئیں گے اور اتنی بڑی رقم لے کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔''

''میں فلوریڈا کے ساحل پر ایک چھوٹا سا ہوٹل بنا مزے سے زندگی گزاروں گا۔'' برگ نے چٹخارا لیا۔ ''تم نے دیکھا ہے، دنیا جہان کی حسینائیں وہاں آتی ہیں۔ نظارے مفت میں دیکھنے کو ملیں گے۔''

''اور میں گاڑیوں کی ورکشاپ کھولوں گا۔'' شیلڈ نے اپنا شوق بیان کیا۔ اسے گاڑیوں کا جنون تھا اور وہ خود بہت اچھا ڈرائیور اور مکینک تھا۔

جان مسکرایا۔ ''میرا تو تمہیں معلوم ہے، ایک ہی شوق ہے پینا اور پلانا... تو میں شاندار قسم کا بار اور کیسینو کھولوں گا۔''

''لیکن مجھے چھ لاکھ ڈالرز کی ضرورت نہیں ہے۔'' وورل نے نفی میں سر ہلایا۔

''او کے! تمہیں نہیں ہے لیکن ہمیں تو ہے۔'' برگ اچھل کر بولا۔

''وولی! ہمارے پاس یہی چانس ہے۔'' جان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہ چانس ہم نے بہر صورت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تو کرو، میں نے تمہیں روکا نہیں ہے لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا... سوائے اس کے کہ پولیس کو تمہارے بارے میں اطلاع نہ دوں اور بھول جاؤں کہ آج پانچ برس بعد میں نے تم تینوں کو دیکھا ہے۔''

ان تینوں کے چہرے بگڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ وورل بھی چوکنا ہو گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات بھی ان سے مختلف نہیں رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چار بھیڑیے آمنے سامنے آ گئے ہوں۔ پھر جان کے تاثرات بدلے۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''وولی! تم انکار کرنے کی حیثیت میں نہیں ہو۔ اس قصبے میں تمہاری عزت ہے، تمہارا گھر ہے، بیوی اور بچی ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ یہ سب تم سے چھن جائے؟''

''یہ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'' وورل غرایا۔

شیلڈ نے سر ہلایا۔ ''افسوس تم ناسمجھی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ صرف ایک فون کال تمہیں ان سب چیزوں سے محروم کر دے گی۔ سب سے پہلے تو پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی اور جرم ثابت ہونے پر تمہیں سزا ہو جائے گی۔ یہ سزا کم سے کم بھی دس سال ہو گی۔ تمہاری ملازمت چلی جائے گی اور جب تم دس سال بعد جیل سے آؤ گے تو نہ یہ گھر ہو گا اور نہ تمہاری بیوی اور بچی ہو گی۔ ممکن ہے وہ ابھی تم سے محبت کرتی ہو لیکن ایک مجرم کی بیوی کہلانا اس کے لیے بہت دشوار ہو گا اور اس کے لیے طلاق لے کر تم سے چھٹکارا زیادہ آسان ہو گا۔ تمہاری بچی پندرہ سال کی ہو جائے گی اور وہ یقیناً اپنے مجرم باپ کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔''

جان کی بیان کی ہوئی لفظی تصویر نہایت خوف ناک تھی۔ جان کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ حقیقت اس لفظی تصویر سے زیادہ مختلف نہیں ہو گی۔ ''ایسا نہیں ہو گا۔''

''ایسا ہی ہو گا دوست۔'' برگ بولا۔ ''بلکہ اس سے بھی بُرا ہو گا۔''

وورل نے انہیں دیکھا۔ ''اگر تم پولیس کو اطلاع کرو گے تو کیا خود بچ جاؤ گے؟''

''نہیں اگر تم ہمارے بارے میں پولیس کو بتاؤ گے تو وہ یقیناً ہمیں تلاش کرے گی۔'' جان نے سر ہلایا۔

''لیکن کہاں کرے گی؟'' برگ کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ ''تم یا پولیس ہمارے بارے میں جانتے ہیں کہ ہم کہاں پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے ہم نیویارک سے آئے ہوں یا فلوریڈا سے آئے ہوں۔ دوسرے پولیس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن تمہارے خلاف ہے۔''

وورل جانتا تھا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ اس کے فنگر پرنٹ کی پولیس فائل میں موجودگی اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھی۔ ورنہ ان لوگوں کی دھمکی میں جان نہیں تھی۔ شیلڈ نے شاید بو سے بچنے کے لیے ایک سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''وولی! تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ صرف ایک بار دینا ہو گا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کامیابی ہو یا ناکامی، ہم پھر تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔''

''صرف ایک بار دوستی...''

وورل نے اٹھ کر جان کو تھپڑ مارا تھا اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ''دوستی کی بات مت کرو... تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو۔''

جان نے رخسار سہلایا۔ ''ٹھیک ہے بلیک میل ہی سہی... اب بتاؤ تم کام کرنے کے لیے راضی ہو یا نہیں؟''

وورل نے سرد آہ بھری۔ ''تم نے میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔''

برگ خوش ہو گیا۔ ''یعنی تم تیار ہو؟''

وورل نے سر ہلایا۔ ''ظاہر ہے لیکن میں کچھ باتیں تمہیں بتا دوں۔ ایک تو تم اب میرے گھر نہیں آؤ گے۔ میں کلارا کو تمہارے بارے میں نہیں بتا سکتا ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، ہم تمہارے گھر نہیں آئیں گے۔'' جان مان گیا۔

"صرف گھر ہی نہیں، تم قصبے میں بھی نظر نہیں آؤ گے۔ یہاں اجنبی فوراً نظر میں آجاتے ہیں اور ان کے بارے میں سب کو پتا بھی چل جاتا ہے۔ ہائی وے انتیس پر یہاں سے سترہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا موٹیل ہے... نیو مون موٹیل کے نام سے، تم وہاں رکو گے۔ میں کل خود تم سے رابطہ کروں گا اور پھر ہم بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، ابھی ہمارے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے۔" شیلڈ بولا۔

وہ کھوہ سے باہر آگئے۔ وورل نے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ میں نے ماضی کو دفن کر دیا ہے۔"

"ماضی کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔" برگ نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "کاش تم دل سے راضی ہوتے تو کام کرنے میں مزہ آتا۔"

"اب مجھے اس زندگی میں مزہ آتا ہے۔" وورل نے دھیمے لہجے میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جنگل میں فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شکار جاری تھا۔ وہ دو گھنٹے سے پہلے گھر واپس پہنچ گیا۔ کلارا بے تابی سے اس کی منتظر تھی، وہ اسے دیکھتے ہی لپٹ گئی۔

"تم ٹھیک ہو نا؟"

وورل جبراً ہنسا۔ "مجھے کیا ہونا تھا؟"

"یہ لوگ کون تھے اور تم سے کیا چاہتے تھے؟"

وورل واپسی کے سفر میں ایک مناسب کہانی سوچ چکا تھا۔ "کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تم جانتی ہو، جوانی میں انسان ذرا بہک بھی جاتا ہے۔ اسکول کے دور میں ہمارا یہ گروپ بن گیا تھا اور ہم چھوٹی موٹی قانون شکنیاں کر کے لطف حاصل کرتے تھے۔"

کلارا کا چہرہ اتر گیا۔ "تمہارا مطلب ہے چوری اور لوٹ مار؟"

"ارے نہیں... میرا مطلب ہے منشیات اور لوگوں کو تنگ کرنا، دوسرے لڑکوں پر دھونس جمانا وغیرہ وغیرہ۔"

کلارا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو نا وورل... یہ اس طرح یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"سرپرائز کلارا۔" وہ زور دے کر بولا۔ "یہ لوگ تفریح پر نکلے ہوئے ہیں اور جب یہاں سے گزرنے لگے تو ان کو خیال آیا کہ مجھ سے بھی ملتے چلیں۔"

کلارا کا شک دور نہیں ہوا۔ "ان کو کیسے پتا چلا کہ تم یہاں ہو اور نہ ہی تم نے کبھی مجھے ان کے بارے میں بتایا؟"

"مجھے خود ان سے تعلق پر شرمندگی رہی ہے۔ جب ہائی اسکول کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کی سرگر جرائم کی طرف بڑھ رہی ہیں، تب میں ان سے الگ ہو رہی بات ان کو میری یہاں موجودگی کا علم ہونا تو انہوں وی پر مجھے دیکھا تھا۔ جب ایک مقامی چینل نے گیم وار کے طور پر مجھ سے بات کی تھی۔"

"وہ چینل انہوں نے دیکھ لیا؟" کلارا کے لہجے طنز آگیا۔ "مجھے یہ ٹی وی دیکھنے اور اخبار پڑھنے والے لگتے۔"

"بس اتفاق کی بات تھی۔ بہرحال، یہ معاملہ اب ہو گیا ہے۔ میں نے ان کو رخصت کر دیا ہے اور وہ دو یہاں نہیں آئیں گے۔"

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔" کلارا ٹھہر ہوئے لہجے میں بولی۔ "لیکن وورل مجھے لگ رہا ہے کہ یہ آسانی سے ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"ڈیئر! تم فکر مت کرو۔ اگر وہ دوبارہ آئے تو میں کو دوسرے طریقے سے سمجھا دوں گا۔"

کلارا چپ ہو گئی۔ شاید اسے لگ رہا تھا کہ وورل سے سچ نہیں بول رہا ہے۔ کم سے کم پورا سچ نہیں بول رہا اور آدھا سچ پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کا موڈ دیکھ کر وورل نے موضوع بدل دیا۔ "کیا خیال کل شاپنگ مکمل کر لیں؟ اس کے بعد مجھے وقت کم ملے گا۔"

شاپنگ کا سن کر کلارا کا موڈ بہتر ہوا اور وہ مسکرا لگی۔

☆☆☆

"فائیو اسٹار ٹمبر اوریگن اور واشنگٹن کی ریاستوں میں جنگل کی کٹائی کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ہے۔" جان رہا تھا۔ "اس میں کام کرنے والے کارکنوں کی تعداد ڈھا ہزار سے زیادہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وورل نے کہا۔ وہ چاروں پہاڑی کھوہ میں تھے اور برگ منہ بنائے بیٹھا تھا۔ اس آتے ہی اعتراض کیا۔

"کیا اس بدبودار جگہ ملاقات لازمی ہے؟"

"رازداری کے لیے ضروری ہے۔" وورل جواب دیا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" جان نے وورل کی تائید کی "اس معاملے میں رازداری بہت ضروری ہے۔ جتنے کم لو ہمیں ساتھ دیکھیں گے، بعد میں ہمارے پکڑے جانے امکان اتنا ہی کم ہوگا۔"

وہ اندر آئے۔ جان نے اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا۔ وورل نے کہا۔ "لیکن فائیو اسٹار ٹمبر کمپنی کا یہاں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ یہ اوریگن کے جنگلات کی کٹائی بھی کرتی ہے لیکن اس کا ہیڈ کوارٹر واشنگٹن میں ہے اور یہ جگہ یہاں سے کم سے کم دو میل کے فاصلے پر ہے۔"

"درست کہا تم نے لیکن کمپنی کے ملازمین کے لیے تنخواہ اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم سان فرانسسکو سے آتی ہے... جہاں کمپنی کے مالک سینیٹر جیفرسن اسکوفیلڈ کا ذاتی بینک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وورل نے سر ہلایا۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ یہ رقم سینیٹر کی ذاتی ائرلائن کے ایک چھوٹے کارگو طیارے میں آتی ہے اور اس کی حفاظت پر صرف دو گارڈز تعینات ہوتے ہیں۔"

"لیکن ہمیں اڑتے طیارے میں گھس کر ڈاکا مارنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" وورل نے ملائمت سے کہا۔ "کیا تم کسی دوسرے طیارے میں پیچھا کر کے اسے ہائی جیک کرو گے؟"

"نہیں، ہمارا سارا کام زمین پر ہوگا۔" جان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "آج ہفتے کا دن ہے اور آج طیارہ رقم لے کر واشنگٹن کی طرف جانے والا ہے۔"

وورل نے گھڑی دیکھی، صبح کے نو بج رہے تھے۔ "طیارہ سان فرانسسکو سے کب روانہ ہوتا ہے؟"

"ویسٹ کوسٹ ٹائم زون کے مطابق صبح نو بجے۔"

"یعنی اب سے آدھے گھنٹے پہلے روانہ ہوا ہوگا۔" وورل نے کہا۔ "وہ اپنی منزل پر کب پہنچے گا؟"

"ٹھیک چار گھنٹے بعد دوپہر ایک بجے۔" جان نے کہا۔ "یہ وہاں فائیو اسٹار ٹمبر کے پرائیویٹ رن وے پر لینڈنگ کرتا ہے۔"

وورل اس سارے علاقے کو اچھی طرح جانتا تھا، اس نے کہا۔ "وہاں سے ڈکیتی مار کر بھاگنا بہت مشکل ہے کیونکہ چاروں طرف میلوں پر پھیلے دشوار گزار جنگل ہیں اور ان میں راستے محدود ہیں۔"

"ہمارا اس ائرفیلڈ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" جان نے کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا نقشہ نکال کر وورل کے سامنے کر دیا۔ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ "یہ مارک ائرفیلڈ ہے... اس علاقے کا سب سے مصروف نجی ائرفیلڈ۔"

"درست ہے۔"

"رقم لانے والا طیارہ یہاں ری فیولنگ کے لیے رکتا

عظیم فرزند

میدان میں دور دور تک مرد ہی مرد تھے۔ کارڈینل نے کہا۔ "سب الگ الگ دو قطاریں بنالیں۔ ایک میں وہ ہوں جو زندگی بھر اپنی عورتوں کے تابع رہے، دوسری میں وہ آجائیں جو اپنی بیویوں پر حاکم رہے۔"

کارڈینل کچھ دیر بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پہلی قطار میلوں لمبی تھی، دوسری میں صرف ایک شخص کھڑا تھا۔

وہ بولا۔ "بہت شرم کی بات ہے۔ تم کو زمین پر نیابت دی گئی، طاقت دی گئی لیکن تم سب اپنی اپنی عورتوں کے غلام بن کر رہ گئے... اسے دیکھو، دوسری قطار کے اس اکلوتے شخص نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔" پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوا۔ "ہاں، میرے عظیم فرزند! یہ بتاؤ کہ تم نے دوسری قطار میں ہونے کا اعزاز کیسے حاصل کیا؟"

اس نے سر جھکا کر کہا۔ "پتا نہیں... مجھے میری بیوی نے اس قطار میں کھڑا ہونے کو کہا تھا۔"

(مرسلہ: تسلیم اختر، کوٹ ادو)

جرم

پاگل خانے میں دو قیدی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "آپ کو کس وجہ سے یہاں ڈالا گیا؟"

دوسرا: "مجھ سے ذرا ایک معمولی سا قتل ہو گیا تھا۔ اور آپ کو؟"

پہلا: "کتاب لکھنے کی وجہ سے۔"

دوسرا: (حیران ہوتے ہوئے) "کتاب لکھنے کے جرم میں؟ پر یہ تو کوئی جرم نہیں۔"

پہلا: "ہاں، پر یہ سچ ہے۔"

دوسرا: "ویسے آپ نے کتاب کس چیز پر لکھی تھی؟"

پہلا: "میں نے گھوڑے پر کتاب لکھی تھی۔ 300 صفحات کی۔"

دوسرا: "پھر سزا کیوں ہوئی؟"

پہلا: "میں نے کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا کہ گھوڑا اس طرح دوڑتا ہے۔ دگڑ، دگڑ، دگڑ۔"

دوسرا: "اگلے تین سو صفحات میں کیا تھا؟"

پہلا: "بس یہی تھا... دگڑ دگڑ... دگڑ دگڑ... گھوڑا دوڑتا جا رہا تھا... رکتا تو میں کچھ اور بھی لکھتا۔"

(بنوں سے فہیم اللہ خان کی عنایت)

ہے۔"

وورل سمجھ گیا کیونکہ اس ائرفیلڈ کا ایک حصہ محکمۂ جنگلات کے پاس تھا۔ اگرچہ یہاں سرکاری ائرپورٹ بھی تھا لیکن ایک تو وہ دور پڑتا تھا اور دوسرے وہاں مرمت کی سہولت نہیں تھی اس لیے کہ محکمۂ جنگلات نے مارک ائرفیلڈ کا ایک حصہ کرائے پر لے لیا تھا اور جنگل کی نگرانی اور مدد میں کام آنے والے ان کے طیارے اور ہیلی کاپٹر یہیں کھڑے ہوتے تھے۔ خود وورل کئی دفعہ یہاں جا چکا تھا۔ اس کے پاس ائرفیلڈ میں آزادانہ گھومنے کا اجازت نامہ تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میری مدد سے وہاں گھس کر رقم اڑا لو گے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر ممکن ہو بھی جائے تو بعد میں مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"میرے پاس مکمل پلان ہے۔" جان نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو، مجھے ائرفیلڈ کے بارے میں معلوم نہیں ہے؟ وہاں کے بارے میں، میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ طیارہ ری فیولنگ کے لیے کہاں اور کتنی دیر کے لیے رکتا ہے۔ اس میں کتنے افراد ہوتے ہیں اور ائرفیلڈ کے معمولات کیا ہوتے ہیں۔"

وورل متاثر نہیں ہوا۔ "ممکن ہے تم اس بارے میں جان گئے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم طیارے سے رقم بھی اڑا سکتے ہو۔"

"میں نے کہا نا، میرے پاس مکمل معلومات اور پلان ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں سن رہا ہوں۔" وورل نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

"دیکھو، طیارہ آدھے گھنٹے کے لیے رکتا ہے، اس دوران میں اس میں فیول بھرا جاتا ہے۔ عملے کے دو افراد اس دوران ریفریشمنٹ کے لیے کیفے ٹیریا چلے جاتے ہیں لیکن رقم کے دونوں محافظ مستقل طیارے میں رہتے ہیں۔ ان کو ایک منٹ کے لیے بھی طیارہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ طیارہ جنوبی ہینگرز میں پمپس کے پاس رکتا ہے اور وہیں اس میں فیول بھرا جاتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا، اب یہ بتاؤ کہ منصوبہ کیا ہے؟"

"منصوبہ بہت آسان ہے۔ ہم ائرفیلڈ کے عملے کی وردی میں اندر داخل ہوں گے اور ہمارے پاس جعلی کارڈ بھی ہوں گے۔ ان کی مدد سے ہم رن وے تک رسائی حاصل کریں گے اور طیارے میں داخل ہو کر دونوں گارڈز کو قابو کر کے رقم اڑا لیں گے۔"

وورل نے پوچھا۔ "بس یہی منصوبہ ہے؟"

"ہاں... تو کیا یہ مکمل نہیں ہے؟"

"میرے خیال میں تو مکمل نہیں ہے۔" وورل نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم طیارے میں کیسے داخل ہو گے؟"

جان کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"حالانکہ یہ بہت اہم پوائنٹ ہے۔ اگر دو افراد ڈھائی ملین ڈالرز کی حفاظت پر مامور ہوں تو وہ یقیناً اپنے میں کسی کو آزادی سے آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کروا اگر طیارے میں ان کے حصے کا دروازہ اندر سے تو ہم اسے کس طرح کھلوائیں گے؟"

جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وورل نے اگلا نکتہ اٹھایا۔ "اگر تم یہ کام بھی لیتے ہو تو رقم ائرفیلڈ سے باہر کس طرح لے کر جاؤ گے کیونکہ کسی پرائیویٹ گاڑی کو اندر جانے کی اجازت نہیں اور پیدل رقم لے کر نکلنا ممکن نہیں ہے۔"

"یہ بھی ہم نے نہیں سوچا۔" جان نے اعتراف کیا۔

"ڈھائی ملین ڈالرز کی رقم کا وزن پتا ہے؟" وورل نے اسے گھورا۔ "یہ کم سے کم بھی پچاس کلوگرام ہوگا۔"

"پچاس کلوگرام ہم چاروں مل کر آرام سے اٹھا سکتے ہیں۔" شیلڈ نے جلدی سے کہا۔

"لیکن اسے چھپا کر باہر لانا ناممکن ہے۔ بعد میں سیکیورٹی کیمروں کی مدد سے ہم آسانی سے پکڑے جائیں گے۔" وورل بولا، اس نے جان کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہے، تم نے موقع تو بڑا تاڑا ہے لیکن تمہاری پلاننگ بہت کمزور ہے۔ اس میں پکڑے جانے کا رسک بہت زیادہ ہے۔"

"اتنا بھی نہیں ہے۔" جان نے کمزور لہجے میں کہا۔ "اگر ہم کوشش کریں تو..."

"بہ آسانی جیل جا سکتے ہیں۔" وورل نے بات کاٹ کر کہا۔ "دوست! تم لوگوں نے غلط کام کے لیے غلط آدمی منتخب کیا ہے۔"

"یہ کام ہمیں ہر صورت کرنا ہے۔" جان فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "ہم ڈھائی ملین ڈالرز کی رقم نہیں چھوڑ سکتے۔"

شیلڈ نے وورل کی طرف دیکھا۔ "تمہیں اس معاملے میں بھی ہماری مدد کرنا ہوگی۔"

برگ نے دانت نکالے۔ "ہم میں سب سے زیا ذہین تم ہی ہو۔"

"دیکھو، میں مجبوری میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں مجرموں کی طرح پلاننگ کروں۔"

شیلڈ مسکرایا۔ "فرض کر لو، تم اس معاملے میں بھی مجبور ہو تب؟"

"کیا مطلب؟" وورل چونکا۔

"مطلب یہ کہ ہمیں بہر صورت ڈھائی ملین ڈالرز درکار ہیں۔" جان سرد لہجے میں بولا۔ "اگر ہمیں یہ رقم نہیں ملی تو تم پولیس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔" برگ نے ہاتھ سے پرندہ اڑانے کا اشارہ کیا۔ "ہم یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے، یہ کوئی نہیں جان سکے گا۔"

وورل ان تینوں کی صورت دیکھ کر رہ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔

☆☆☆

فائیو اسٹار ٹمبر کا شمار شمالی امریکا کی چند بڑی ٹمبر کمپنیوں میں ہوتا تھا اور نہ صرف امریکہ بلکہ کینیڈا میں بھی اسے جنگل کاٹنے کے حقوق حاصل تھے۔ اس کا خاص علاقہ اوریگن اور واشنگٹن کی ریاستیں ہیں جہاں امریکا کے بہترین جنگل پائے جاتے ہیں اور ان جنگلوں سے اعلیٰ درجے کی تعمیراتی اور فرنیچر سازی میں کام آنے والی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ ان ریاستوں کی سو سے زائد صنعتوں کا انحصار جنگل سے حاصل ہونے والی لکڑی پر ہے۔ سینیٹر جیفرسن یہاں کا جدی پشتی سیاست دان تھا، سیاست کی طرح دولت بھی کئی پشتوں سے اس خاندان میں چلی آ رہی تھی اور جیفرسن نے اس دولت میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اس نے ٹمبر کمپنی چلانے کے ساتھ کیلیفورنیا کی سلیکون ویلی میں بھی سرمایہ کاری کی اور اپنا ذاتی بینک قائم کر لیا تھا۔ بینک کھولنے سے اسے یہ فائدہ ہوا کہ بڑی سے بڑی ادائیگی کے لیے اسے ذرا سا بھی پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واشنگٹن کی ریاست میں بے شمار بینک ہونے کے باوجود اس کی کمپنی کے ملازموں کے لیے تنخواہ کیلیفورنیا سے آتی تھی اور یہ رقم سینیٹر کی ذاتی کارگو ائرلائن کے ایک طیارے سے آتی تھی۔ اس طرح وہ نہ صرف مقامی طور پر ادائیگی کے بندوبست سے بے نیاز ہو گیا تھا بلکہ اسے گارڈز اور انشورنس کے بھاری اخراجات سے بھی نجات مل گئی تھی۔ طیارہ رقم لے کر اس کی کمپنی کی ذاتی ائرفیلڈ پر اترتا تھا اور وہاں سے اس کے نجی گارڈز اس رقم کو دفاتر اور ادائیگی کے مقامات پر منتقل کرتے تھے اور شام تک یہ رقم اس کے ڈھائی ہزار ملازمین میں بٹ جاتی تھی اور کچھ رقم روزمرہ کے اخراجات کے لیے رکھ لی جاتی تھی۔

رقم کے لیے اس طیارے میں ایک خاص خانہ بنایا گیا تھا جو مضبوطی کے لحاظ سے کسی بکتر بند ٹرک سے کم نہیں تھا۔ جب ایک بار اس میں رقم رکھ دی جاتی اور گارڈز اس میں بیٹھ جاتے تو اس خانے کو باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ انسانی لحاظ سے یہ بہت بڑا رسک تھا کیونکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں گارڈز اس خانے سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اس مقفل خانے کی چابیاں صرف دو افراد کے پاس ہوتی تھیں، ایک سان فرانسسکو میں سینیٹر کے بینک کا ایک ڈائریکٹر جو رقم طیارے تک لاتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اس خانے کو مقفل کرتا تھا... اور دوسرا فائیو اسٹار ٹمبر کا منیجر جو ائرفیلڈ پر رقم لینے آتا تھا۔ ان دو افراد کے سوا کوئی اس خانے کو نہیں کھول سکتا تھا۔ حد یہ کہ پائلٹ بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اس انتظام کا مقصد سینیٹر کی رقم کا تحفظ تھا اور تحفظ کرنے والوں کو انسانوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ یقیناً پائلٹس اور ان دو محافظوں کو بھی بھاری معاوضہ دیا جاتا تھا اس لیے وہ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ رقم ایلومینیم کے بنے ہلکے لیکن مضبوط بکس میں رکھی جاتی تھی جس کا تالا نمبروں سے کھلتا تھا اور اس کا نمبر بھی ان دو افراد کو معلوم تھا جن کے پاس طیارے کے خانے کی چابیاں ہوتی تھیں۔ ایلومینیم بکس فائر پروف تھا، اگر طیارے کو حادثہ پیش آ جاتا تب بھی رقم کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

"یہ ہے اصل صورتِ حال۔" وورل نے ان کی طرف دیکھا۔ آج ان کی اس غار میں تیسری ملاقات تھی۔ وورل نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ خود ساری معلومات حاصل نہیں کر لے گا، اس ڈکیتی میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا اور اس نے ایک ہفتے میں یہ ساری معلومات جمع کی تھیں۔ "سینیٹر احمق نہیں ہے، اس نے گارڈز بے شک دو رکھے ہیں لیکن حفاظتی انتظامات مکمل ہیں اور ان میں نقب لگانا بہت دشوار کام ہے۔ ہم نے آج تک اتنا مشکل کام نہیں کیا۔"

"لیکن اس سے پہلے معاملہ اتنی بڑی رقم کا بھی نہیں تھا۔" برگ نے اسے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے، رقم بہت بڑی ہے لیکن رسک اس سے بھی بڑا ہے اور میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔"

”دیکھو وولی! تم یہ کام کر سکتے ہو، تم ذہین ہو۔“ جان نے کہا۔

”میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن منصوبہ نہیں بنا سکتا۔“ وورل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، اس صورت میں تمہیں ہمارے منصوبے پر عمل کرنا ہوگا۔“ جان بولا۔

”چاہے اس کا نتیجہ جو بھی نکلے۔“ برگ نے دانت نکوس کر کہا۔

”ایک منٹ... کیا تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟“ وورل بوکھلا گیا۔ ”اس صورت میں ہم سب جیل جائیں گے۔“

شیلڈ نے اپنا منہ وورل کے چہرے کے سامنے لا کر کہا۔ ”اگر تم چاہتے ہو کہ ایسا نہ ہو تو ہمارا پورا ساتھ دو۔ مجھے معلوم ہے، تم ایک قابلِ عمل منصوبہ بنا سکتے ہو۔“

وورل نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ان کا فیصلہ ان کے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے زچ ہو کر کہا۔ ”تم تینوں نے ذلالت کی انتہا کر دی ہے۔“

جان ہنس دیا۔ ”تم جو چاہے گالی دے لو لیکن ہمارا ساتھ تو دینا پڑے گا۔“

وورل جانتا تھا کہ اگر اسے اپنی زندگی، گھر اور بیوی بچی کو بچانا تھا تو اسے ان لوگوں کا ساتھ دینا ہی تھا۔ ساتھ ہی اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ جب اس نے جرم کی راہ چھوڑی تھی تو اس وقت خود سے عہد کیا تھا کہ وہ دوبارہ کبھی جرم نہیں کرے گا لیکن آج اسے ایک بار پھر اس راہ پر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ وورل نے اس زندگی اور مقام کو حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے اسے گنوانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن میں اپنی بچی کی قسم کھا کر کہتا ہوں، اس کے بعد مجھے تم میں سے کسی کی صورت دکھائی دی تو میں اسے قتل کر دوں گا۔“

”ہم کامیاب رہے یا ناکام، اس کے بعد تمہیں اپنی صورت دکھائیں گے بھی نہیں۔“ شیلڈ نے پورے خلوص سے کہا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے، آج کل تم صبح اتنی جلدی چلے جاتے ہو اور رات کو دیر سے گھر آتے ہو؟“ کلارا نے جلدی جلدی ناشتا کرتے وورل سے کہا۔

”کیونکہ ان دنوں کام بہت زیادہ ہے۔“

کلارا کیتلی میں کافی ڈال رہی تھی۔ یہ کام کر کے اس نے وورل کی طرف دیکھا۔ ”وول! کیا وہ لوگ واقعی صرف سے ملنے آئے تھے؟“

وورل کا ہاتھ رک گیا۔ ”ہاں، کیا تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟“

”نہیں، مجھے تمہاری بات پر شک نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ لوگ صرف اس لیے نہیں آئے تھے۔“

وورل نے سر اٹھا کر کلارا کی طرف دیکھا۔ ”ڈیئر! اگر وہ کسی اور مقصد کے لیے بھی آئے تھے تو تم بالکل فکر مت کرو۔“

”کیوں فکر نہیں کروں؟“ کلارا جذباتی لہجے میں بولی۔ ”یہ میرا گھر ہے اور مجھے اس کی اور تمہاری فکر ہے۔“

”مجھے اور اس گھر کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“ وورل نے یقین سے کہا مگر کلارا مطمئن نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

”وورل! سچ کہو، ہمیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے... ہم اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں گے؟“

وورل ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔

”ہاں، ہم اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔“

”ایسے نہیں... نینسی کی قسم کھا کر کہو۔“

اس بار وورل زیادہ ہچکچایا لیکن اس نے پھر سر ہلایا۔ ”نینسی کی قسم... ہم ہمیشہ ایسے ہی ساتھ رہیں گے۔“

اس بار کلارا کسی قدر مطمئن نظر آنے لگی۔ ناشتا کر کے وورل اوپر آیا، اس نے سوئی ہوئی نینسی کو پیار کیا اور کمرے میں آ کر جیکٹ پہنی پھر اس کی اندر کی جیب میں ایک چھوٹا پستول رکھا۔ آج اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ کلارا اسے چھوڑنے باہر تک آئی۔ وورل نے اس سے کہا۔ ”ممکن ہے مجھے دیر ہو جائے اور شاید میں رات کو نہ آ سکوں۔“

”وہ کیوں؟“

”گیم ریزرو میں دور تک جانا ہے، اگر رات ہو گئی تو واپسی صبح ہوگی۔“

کلارا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

وورل نے سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے دفتر جانے کے بجائے ہائی وے کا رخ کیا۔ اس موٹیل سے کوئی میل بھر پہلے وہ تینوں اس کے منتظر تھے جس میں ان دنوں ان کی رہائش تھی۔ وورل نے گاڑی ان کے پاس روکی۔ عقبی نشست سے ایک بنڈل اٹھایا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے بنڈل جان کی طرف اچھال دیا۔ ”اس میں ائرفیلڈ کے ٹیکنیکل اسٹاف کی وردیاں ہیں... جلدی تیار ہو جاؤ۔“

جان اور شیلڈ تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ برگ البتہ کھڑا رہا۔ وہ ایک تنکے سے دانت میں خلال کر رہا تھا۔ وورل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے اپنا کام سمجھ لیا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“

”گڈ... ذرا مجھے سمجھاؤ کہ تمہیں کیا کیا کرنا ہے؟“

برگ مستعدی سے بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وورل غور سے سنتا رہا۔ اس نے کئی جگہ تصحیح کی۔ اس دوران میں جون اور شیلڈ وردیاں پہن کر آ گئے۔ وورل نے ایک بار پھر ان کے سامنے اپنا پلان دہرایا۔ اگرچہ وہ ان کو اتنی بار بتا چکا تھا کہ ان کو حفظ ہو جانا چاہیے تھا۔ بات مکمل کر کے اس نے ان سے کہا۔ ”یاد رکھنا، تشدد سے ہر ممکن حد تک بچنا ہے کیونکہ اس سے بعد میں پولیس زیادہ مستعدی سے حرکت میں آ جاتی ہے اور کیس آسانی سے نہیں دبتا۔“

ان تینوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر جان بولا۔ ”دوست! تم فکر مت کرو، ہم کوئی غیر ضروری حرکت نہیں کریں گے۔“

”تب آ جاؤ، وقت کم رہ گیا ہے۔“ اس نے گھڑی دیکھی جس میں دس بج رہے تھے۔ آج ہفتے کا دن تھا اور طیارہ آنے میں ایک گھنٹے کا وقت رہ گیا تھا۔ جان اور شیلڈ اس کی گاڑی کے عقبی حصے میں سوار ہو گئے جہاں اتنی جگہ تھی کہ وہ ترپال کے نیچے چھپ سکتے تھے۔ ان کی روانگی سے پہلے برگ کار میں مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

رقم لے جانے والا طیارہ چھوٹا کارگو ہوائی جہاز تھا۔ یہ دہرے پروں اور موٹے کیبن والا طیارہ تھا جس کی لمبائی بیس فٹ اور چوڑائی صرف پچیس فٹ تھی۔ ٹیک آف کے وقت اس کا زیادہ سے زیادہ وزن سات ہزار کلوگرام ہو سکتا تھا جس میں بارہ سو لیٹر ایندھن بھی شامل تھا۔ اتنے ایندھن کے ساتھ یہ ایک وقت میں چار سو پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے درمیان میں ایک بار ایندھن لینے کے لیے اترنا پڑتا تھا۔ پولیس یا کسی سیکیورٹی ادارے کو علم نہیں تھا کہ اس کارگو طیارے میں ڈھائی ملین ڈالرز کی خطیر رقم ہر ہفتے منتقل کی جاتی ہے۔ بینٹر اور اس کے کمپنی کے ساتھی مطمئن تھے کہ اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں اس لیے رقم کو خطرہ بھی نہیں تھا پھر برسوں سے رقم اسی طرح منتقل ہو رہی تھی اور اب تک اسے چرانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے یہ انتظام بغیر کسی تبدیلی کے جاری تھا۔ ائرفیلڈ کا سیکیورٹی عملہ بھی اس معمول کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ وہ اس پر توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی ان کے خیال میں یہ ایک عام کارگو طیارہ تھا جس پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

طیارے کے پائلٹس گریگری اور جارج برسوں سے اس طیارے کو اڑا رہے تھے اور جب انہیں یہ ذمّے داری سونپی گئی تھی تو اس وقت ان سے ایک بانڈ پر دستخط کرا لیے گئے تھے کہ وہ دس برس سے پہلے یہ ملازمت ترک نہیں کر سکتے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ تنخواہ شاندار تھی اور ہر ٹرپ کا بونس الگ سے ملتا تھا۔ پھر کام بہت کم تھا۔ اس ہفتہ وار ٹرپ کے علاوہ ان کو بہت کم کام کے لیے بلایا جاتا تھا اور عملاً وہ سارے ہفتے چھٹی مناتے تھے۔ شروع شروع میں انہیں اس رقم کے بارے میں کچھ تجسس تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کے عادی ہوتے چلے گئے اور اب تو اس کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے۔

اکتوبر کی آخری تاریخ تھی۔ اس روز بھی وہ حسبِ معمول صبح سویرے ائرپورٹ پر تھے جہاں ان کے طیارے کے معائنے کے بعد اسے پرواز کے قابل قرار دے دیا گیا۔ رقم والا بکس آنے والا تھا۔ بینک کی ایک بکتر بند گاڑی اسے لاتی تھی اور بینک کے سیکیورٹی گارڈز کی نگرانی میں اسے طیارے میں منتقل کیا جاتا تھا۔ دس منٹ میں رقم آ گئی اور اسے طیارے میں منتقل کر کے خانہ مقفل کر دیا گیا۔ اس کے دو منٹ بعد طیارہ رن وے پر ٹیک آف کر رہا تھا۔

”آج میں ذرا تگڑا لنچ لوں گا۔ ناشتا کرنے کا وقت نہیں ملا۔“ گریگری نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سینڈوچز لایا ہوں۔“ جارج نے اپنا لنچ بکس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”جب تک ان سے دل بہلا لو۔“

گریگری خوش ہو گیا کیونکہ اسے ابھی سے بھوک لگنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ درمیان میں مارک ائرفیلڈ پر رکتے اور طیارے میں ایندھن بھرا جاتا۔ اس دوران میں وہ نزدیکی کیفے ٹیریا میں ہو آتے تھے کیونکہ اس کے بعد انہیں دوپہر دو بجے تک کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ اس لیے یہ وقفہ ان کے لیے غنیمت ہوتا تھا۔ گریگری نے سینڈوچز کھاتے ہوئے عقب کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان پرندوں کو بھی کچھ دیا جاتا ہے؟“

”میرے خیال میں نہیں دیا جاتا کیونکہ ان کو چار گھنٹے اسی خانے میں گزارنے ہوتے ہیں اور اخراج کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

گریگری ہنسا۔ ’’تمہاری گرل فرینڈ سینڈوچز بہت مزے کے بناتی ہے۔‘‘

’’میں اسے بتاؤں گا تو وہ بہت خوش ہوگی کیونکہ اسے مجھ سے یہی شکایت ہے کہ میں اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی تعریف نہیں کرتا ہوں۔‘‘

سینڈوچز کھا کر گریگری نے طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ وہ پائلٹ تھا اور جارج اس کا نائب تھا لیکن جہاں تک اس طیارے کو اڑانے کا تعلق تھا، جارج کسی طرح بھی گریگری سے کم نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ مارک ائرفیلڈ پر اتر رہے تھے۔ وہ اس لینڈنگ کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ طیارے کو آنکھ بند کر کے اتار کر اس کی مخصوص جگہ کھڑا کر سکتے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے طیارہ روکا، وہاں موجود فیول پمپ پر موجود آدمی حرکت میں آگیا اور پائپ لے کر طیارے کی طرف آنے لگا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے اور اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ نیا تھا۔

’’بیٹ کہاں ہے؟‘‘ جارج نے پوچھا۔

’’آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ سرخ بالوں والے آدمی نے کہا اور طیارے کی ٹنکی کا ڈھکن کھولنے لگا۔

’’ٹینک فل کرنا ہے۔‘‘ گریگری نے اس سے کہا۔ ’’کوئی کمی مت چھوڑنا ورنہ ہمیں درمیان میں کہیں کریش لینڈنگ کرنا پڑے گی۔‘‘

سرخ بالوں والے نے سر ہلایا۔ گریگری اور جارج حسبِ معمول کیفے ٹیریا کی طرف چلے آئے۔ گریگری نے اپنے لیے ایک بڑا زنگر لیا اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک لی۔ جارج واش روم چلا گیا۔ کھانے کے بعد گریگری واش روم گیا۔ بیس منٹ میں وہ فارغ ہو کر طیارے کی طرف واپس چلے آئے جہاں ایندھن بھرا جا چکا تھا اور سرخ بالوں والا پائپ سمیٹ کر جا چکا تھا۔ جارج نے فیول گیج دیکھا۔ ’’ایندھن تو پورا ہے۔‘‘

’’یہ آجائے تو سائن کر کے روانہ ہوتے ہیں۔‘‘ گریگری نے کہا۔ اسی لمحے سرخ بالوں والا ایک اور شخص کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ اس نے بھی عملے والی وردی پہن رکھی تھی۔ گریگری نے اسے پکارا۔ ’’اے... آ کر سائن لو، ہمیں اب روانہ ہونا ہے۔‘‘

سرخ بالوں والا آگے تھا۔ اس نے شیٹ اٹھا رکھی تھی۔ اس نے شیٹ سائن کے لیے گریگری کی طرف بڑھائی۔ جب گریگری نے سائن کر کے شیٹ واپس کرنا چاہی تو اپنے سامنے پستول کی نال دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ’’یہ... یہ کیا ہے؟‘‘

’’اسے پستول کہتے ہیں۔‘‘ سرخ بالوں والا غرایا۔ ’’اندر چلو، کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ ہمارے پاس بم بھی ہیں... ہم اس طیارے کو اڑا دیں گے۔‘‘

یہ سن کر گریگری کا رنگ سفید ہو گیا۔ وہ صرف پائلٹ تھا اور اس کا واسطہ آج تک ایسے لوگوں سے نہیں پڑا تھا جو پستول اور بم کی زبان میں بات کریں۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ’’کک... کیا چاہتے ہو تم؟‘‘

’’تمہارے ساتھ آسمان کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ سرخ بالوں والے نے جواب دیا اور گریگری کو طیارے کے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ وہ جان تھا جبکہ اس کے ساتھ شیلڈ تھا۔ جارج اندر انجن اسٹارٹ کر کے اسے چیک کر رہا تھا جب گریگری اور وہ دونوں اندر آئے تو اس نے دھیان نہیں دیا۔ ’’اے گریگ... انجن ٹھیک کام کر...‘‘ اسی لمحے اس نے ان دونوں کو دیکھ لیا۔ ’’یہ کون ہیں اور اس وقت اندر کیوں آئے ہیں... ہم ٹیک آف کرنے والے ہیں۔‘‘

’’یہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔‘‘ گریگری نے بے بسی سے کہا۔

’’ہمارے ساتھ کوئی اور نہیں جا سکتا، یہ رول کے خلاف ہے۔‘‘ جارج نے احتجاج کیا لیکن جب جان نے اسے پستول دکھایا تو اس نے فوراً ہار مان لی۔ ’’او کے! تم لوگ جا سکتے ہو۔‘‘

’’گڈ!‘‘ شیلڈ نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے ایک عدد دستی بم اٹھا رکھا تھا اور دونوں پائلٹ پستول سے زیادہ اس سے خوف زدہ تھے۔ ’’اب ٹیک آف کرو اور سب معمول کے مطابق رہے۔ کنٹرول والوں کو کوئی اشارہ مت دینا۔‘‘

’’پلیز! یہ گرینیڈ یہاں سے ہٹا لو۔‘‘ گریگری نے کہا۔ ’’ٹیک آف کے دوران بعض اوقات طیارے میں الیکٹریکل چارج پیدا ہو جاتا ہے۔‘‘

’’تم اس کی فکر مت کرو... یہ الیکٹریکل چارج سے پھٹنے والی چیز نہیں ہے۔ ہاں تم نے کوئی حرکت کی تو اسے پھٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔‘‘ شیلڈ نے دستی بم لہرا کر کہا۔ گریگری نے اپنی جگہ سنبھال لی اور کنٹرول والوں سے اجازت لے کر طیارے کو رن وے پر لے آیا۔ جیسے ہی طیارہ فضا میں بلند ہوا، اس نے جان کی ہدایت پر ریڈیو بند کر دیا۔

’’یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔‘‘

’’تم اس کی فکر مت کرو اور طیارے کو بارہ سو فٹ کی بلندی پر لے آؤ۔‘‘ جان نے اسے حکم دیا۔ پھر اپنی جیکٹ سے ایک پرچہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ’’دس منٹ بعد طیارے کو اس جگہ ہونا چاہیے۔‘‘

گریگری نے پرچہ دیکھا اور احتجاج کیا۔ ’’یہ جگہ ہمارے روٹ سے بالکل ہٹ کر ہے۔‘‘

’’ہم تمہیں تمہارے روٹ پر جانے کی اجازت دے دیں گے لیکن فی الحال تو تم یہاں چلو۔‘‘

مجبوراً گریگری نے طیارے کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ جارج بولا۔ ’’کیا تم لوگ یہ سب پیچھے موجود سامان کے لیے کر رہے ہو؟‘‘

’’تم نے درست اندازہ لگایا ہے۔‘‘ شیلڈ نے دانت نکالے۔ ویسے دانت نکالنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس نے اپنا چہرہ بدلنے کے لیے بڑے پیلے دانتوں والی مصنوعی بتیسی لگا رکھی تھی جبکہ جان نے صرف مونچھوں کا اضافہ کیا تھا۔ جان نے گریگری کو جو جگہ بتائی تھی، وہ مارک ائرفیلڈ سے صرف دس منٹ کی مسافت پر تھی اس لیے وہ کچھ دیر میں وہاں موجود تھے۔ بارہ سو فٹ کی بلندی پر اڑنے کی وجہ سے طیارہ ریڈار سے غائب ہو گیا تھا۔ گریگری نے مطلوبہ مقام پر پہنچ کر نیچے دیکھا تو اسے ایک پتلی سی سڑک نظر آئی جو گھنے جنگل کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ جان بھی کاک پٹ میں گھسا ہوا نیچے جھانک رہا تھا۔ اس نے گریگری سے کہا۔ ’’وہ دیکھو، اس سڑک پر سفید رنگ کا نشان نظر آ رہا ہے تمہیں؟ طیارہ اس پر اتارنا ہے۔‘‘

’’اس پر؟‘‘ جارج چلایا۔ ’’تمہارا دماغ درست ہے؟ اتنی پتلی سی سڑک ہے اور اس پر دونوں طرف اونچے درخت ہیں... اور پھر سامنے سے کوئی گاڑی آ گئی تو؟‘‘

’’مجھے معلوم ہے لیکن ان کے درمیان اتنی جگہ ہے کہ طیارہ اتارا جا سکتا ہے اور کوئی گاڑی نہیں آئے گی کیونکہ سڑک مرمت کی وجہ سے بند ہے۔‘‘ جان نے اسے آگاہ کیا۔

’’تب بھی میں ایسا نہیں کر سکتا۔‘‘ جارج نے انکار کر دیا۔

’’تب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔‘‘ جان نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ گریگری گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔

’’ایک منٹ... ہم کوشش کرتے ہیں۔‘‘

’’اسی میں تمہاری بہتری ہے۔‘‘ شیلڈ نے کہا۔ وہ دونوں کاک پٹ کے ساتھ موجود دو نشستوں پر آ گئے تھے اور سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ گریگری نے طیارے کو ہوا میں گھمایا اور اسے سڑک کی سیدھ میں لے آیا۔ سڑک کے دونوں طرف کوئی ساٹھ ستر فٹ اونچے درخت تھے۔ ان کے درمیان طیارہ اتارنا بہ ظاہر خودکشی کے مترادف لگ رہا تھا لیکن جب گریگری طیارہ نیچے لایا تو اسے اندازہ ہوا کہ درختوں کے درمیان جگہ تھی اور اس میں طیارہ اتارا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک مسئلہ تھا، سفید نشان والی جگہ سے کوئی دو گز بعد سڑک مڑتی تھی اور وہاں تک طیارے کی رفتار کم کرنا لازمی تھا۔ اگر رفتار کم نہ ہو پاتی تو طیارہ سیدھا جنگل میں گھس جاتا۔ پہلی بار میں وہ کوشش کے باوجود طیارے کو نہ اتار سکا۔ سفید نشان گزر گیا اور اس نے طیارہ اوپر اٹھا لیا۔

’’یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘ جان غرایا۔

’’میں سڑک دیکھ رہا ہوں۔‘‘ گریگری نے وضاحت کی۔ ’’اب لینڈنگ کی کوشش کروں گا۔‘‘

طیارہ گھوما اور دوبارہ سڑک کی سیدھ میں آنے لگا۔ اس بار گریگری نے جرأت کی اور طیارے کو سڑک پر اتار دیا۔ طیارہ عملاً سڑک سے ٹکرایا اور ایک بار اچھل کر ذرا سا بے قابو ہوا لیکن گریگری نے مشاقی سے اسے قابو کیا اور پوری قوت سے بریک دبا دیے۔ جارج نے پھرتی سے انجن بند کر دیا۔ ہلکا اور پروں والا طیارہ ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار جلد کم ہونے لگی اور موڑ آنے تک رفتار اتنی کم ہو گئی کہ گریگری نے بہ آسانی اسے گھما لیا اور چند گز کے بعد طیارہ رک گیا۔

’’شان دار۔‘‘ جان نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ’’دوستو...! اب نیچے اتر آؤ۔‘‘

جارج نے گھبرا کر کہا۔ ’’دیکھو، ہمارا اس معاملے سے صرف اتنا تعلق...‘‘

’’میں نے کہا ہے نیچے آؤ۔‘‘ جان نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔‘‘

بادلِ ناخواستہ جارج اور گریگری نیچے اتر آئے۔ ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ ان کو یہاں گولی مار دی جائے گی اور اس کے بعد یہ لوگ کسی ترکیب سے خانہ کھول کر گارڈز پر بھی قابو پا لیں گے اور رقم لوٹ کر فرار ہو جائیں گے۔ باہر برگ ان کا منتظر تھا اور اس نے حلیہ بدلنے کے بجائے آسان طریقہ استعمال کیا تھا اور چہرے پر سیاہ نقاب لگا رکھی تھی۔ وہاں سڑک کے کنارے کٹی ہوئی سبز جھاڑیوں کا ایک ڈھیر تھا۔ جان نے گریگری اور جارج سے کہا۔

’’شاباش... یہ جھاڑیاں اٹھا کر طیارے پر ڈال دو۔‘‘

انکار کا موقع ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں جھاڑیاں اٹھا کر طیارے کے پروں اور باڈی پر رکھنے لگے۔ برگ اور شیلڈ بھی ان کی مدد کر رہے تھے اس لیے پانچ منٹ میں طیارہ سبز جھاڑیوں تلے چھپ گیا۔ ابھی تک خانے میں موجود گارڈز کی جانب سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ جان چکے

تھے کہ طیارے کو ہائی جیک کیا جا چکا ہے۔ کیموفلاج کا کام مکمل کرنے کے بعد جان خانے کی طرف آیا۔ احتیاطاً اس نے جارج کو سامنے رکھا کیونکہ گارڈز مسلح تھے۔ وہ اندر سے فائر کر سکتے تھے۔ جان نے خانے کا دروازہ بجایا۔

”تم لوگ میری آواز سن رہے ہو؟“

”سن رہے ہیں۔“ اندر سے کوئی گارڈ بولا۔

”ہم نے طیارہ اغوا کر لیا ہے اور ہمیں صرف رقم سے مطلب ہے... لیکن اگر تم میں سے کسی نے مزاحمت کی تو اس کی جان بھی لینا پڑے گی۔“

”ہم مزاحمت نہیں کریں گے لیکن یہ دروازہ مقفل ہے اور ہم اسے نہیں کھول سکتے۔“

”ہمیں معلوم ہے لیکن دروازہ کھل جائے گا۔ پائلٹس گیس ویلڈنگ سے اسے کاٹ دیں گے اور تم شرافت سے ہتھیار ڈال کر باہر آ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ گارڈ نے جواب دیا۔

جارج نے کہا۔ ”ہمیں گیس ویلڈنگ کا استعمال نہیں آتا۔“

”یہ بہت آسان ہے۔“ شیلڈ بولا۔ وہ اور برگ چھوٹا سا گیس ویلڈنگ پلانٹ کھینچ کر وہاں لے آئے۔ برگ نے اس کا شعلہ جلایا اور اسے گریگری کی طرف بڑھا دیا۔ ”دروازے کا لاک والا حصہ کاٹ دو اور اس کام کے لیے تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ جیسے ہی پانچ منٹ پورے ہوئے اور لاک نہیں کٹا تو باقی کام تمہارا نائب مکمل کرے گا۔“ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔ گریگری نے لرزتے ہاتھوں سے ٹارچ سنبھالی اور دروازے کا قفل والا حصہ کاٹنے لگا۔ ڈھائی ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا شعلہ فولادی دروازے کو یوں کاٹ رہا تھا جیسے گرم چاقو مکھن کاٹتا ہے۔ پھر بھی رفتار اتنی نہیں تھی کہ پانچ منٹ میں دروازہ کٹ جاتا۔ شیلڈ گھڑی پر نظر جمائے ہر منٹ بعد گریگری کو بتا رہا تھا کہ اب کتنا وقت باقی رہ گیا ہے۔ آخری منٹ میں وہ ہر دس سیکنڈ بعد آگاہ کر رہا تھا۔ پھر پانچ منٹ پورے ہو گئے اور ابھی قفل کا کچھ حصہ باقی تھا۔ گریگری نے وقت پورا ہونے کا سن کر مڑ کر دیکھا اور بولا۔

”پلیز! بس تھوڑا سا حصہ رہ گیا ہے۔“

”سوری! یہ کام تمہارا ساتھی بھی کر سکتا ہے۔“ شیلڈ نے اپنا پستول بلند کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، درختوں سے ایک نقاب پوش نکل آیا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔

”رک جاؤ۔“ اس نے آتے ہی کہا تو شیلڈ رک

”اس کی ضرورت نہیں ہے، اسے اپنا کام کرنے دو۔“

شیلڈ نے سر گھما کر نقاب پوش کی طرف دیکھا ا لہجے میں بولا۔ ”تم اس معاملے میں دخل مت دو۔“

نقاب پوش جو وورل تھا، اس کے پاس آیا۔ ”تم رہے ہو یہ میرا منصوبہ ہے اور جو میں کہوں تمہیں وہ کرنا

شیلڈ کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے ایک جھٹکے ہاتھ نیچے کر لیا۔ گریگری نے سکون کا سانس لیا اور دروا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے چند سیکنڈ میں بچ جانے والا بھی کاٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چاروں محتاط ہو کر ہٹ گئے۔ وورل اور برگ کے پاس شاٹ گنز تھیں۔ انہ نے وہ خانے کی طرف تان لیں۔ جان نے بلند آواز کہا۔ ”دروازہ کھل گیا ہے، اپنے ہتھیار اندر چھوڑ کر آجاؤ۔“

کچھ دیر سناٹا رہا پھر ایک گارڈ نے کہا۔ ”اس بات کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں شوٹ نہیں کرو گے؟“

”کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ جان نے سخت لہجے کہا۔

”تب ہم باہر نہیں آ سکتے۔“ گارڈ نے انکار کر دیا۔

”اس صورت میں ہم پہلے ان پائلٹس کو شوٹ کر گے اور اس کے بعد تمہارے خانے میں دستی بم پھینک گے۔ تمہارے پاس صرف دس سیکنڈ کی مہلت ہے۔“

جان کی بات سن کر جارج اور گریگری گھبرا گئے۔ جارج نے کہا۔ ”اس میں ہمارا کیا قصور ہے... تم کیوں مارو گے؟“

”تم دونوں خانے کے سامنے ہاتھ اوپر کر کے کھڑ ہو جاؤ۔“ جان نے انہیں حکم دیا۔ چار ہتھیاروں کے سا مزاحمت نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے حکم کی تعمیل کی جان نے گنتی گننا شروع کی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ گنتی پوری ہوتے ہی ان میں سے کسی کو شوٹ کر دے گا وورل نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ منصوبے کے مطا انہیں طیارہ اترنے کے بعد بیس منٹ میں اپنا کام مکمل کر وہاں سے روانہ ہو جانا تھا اور ابھی بارہ منٹ گزرے تھے اس نے آہستہ سے جان سے کہا۔

”جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے، ابھی وقت ہے۔“

”تم ہر معاملے میں دخل مت دو۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”ہمیں بھی معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔“

”لیکن کسی کا قتل اس میں شامل نہیں ہے۔“

”اگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی تو کیا ہم انہیں پھول پیش کریں گے؟“ جان جھنجلائے انداز میں بولا۔

”نہیں، ہم بات کر کے معاملہ سلجھا سکتے ہیں۔“ وورل بولا۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے تاکہ پائلٹس اور گارڈز ان کی بات نہ سن سکیں۔

”ٹھیک ہے، تم بات کرو۔“ جان نے کہا۔

وورل آگے آیا اور اس نے دونوں پائلٹس کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے دور ہٹ گئے۔ وورل نے گارڈز سے کہا۔ ”تم دونوں باہر آجاؤ، دوسری صورت میں ہم طیارے کو آگ لگا دیں گے اور تم اندر جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔“

”ہمارے ساتھ یہ رقم بھی راکھ ہو جائے گی۔“ گارڈ نے جوابی دھمکی دی۔

”رقم ایلومینیم کے فائر پروف بکس میں ہے اس لیے صرف تم جلو گے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے، کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں ہمیں اگلے دس منٹ میں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ اگر تم ایک منٹ میں باہر نہ آئے تو ہم طیارے کو آگ لگا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وورل نے طیارے کے ٹینک کے نچلے حصے میں چاقو مارا اور تیل نیچے گرنے لگا۔ ”تم نے آواز سن لی ہوگی۔ کچھ دیر میں یہ تیل پورے طیارے کے نیچے پھیل جائے گا اور اسے صرف ایک تیلی دکھانے کی دیر ہوگی، اس کے بعد تم اندر ہی جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔“

اس دھمکی نے گارڈز کو ہلا کر رکھ دیا پھر جب وورل نے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کیا تو انہوں نے ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ”ٹھیک ہے، ہم باہر آرہے ہیں۔“

وہ ہوشیار ہو گئے۔ گارڈز نے اپنا اسلحہ وہیں چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے باہر آ گئے۔ وورل نے انہیں حکم دیا۔ ”منہ کے بل زمین پر لیٹ جاؤ۔“

انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ برگ اور شیلڈ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے تھے۔ پھر پائلٹس کو ان کے ساتھ لٹا کر ان کے بھی ہاتھ باندھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دونوں طیارے کے خانے میں گھسے اور انہوں نے ایلومینیم بکس نکال لیا۔ بکس انہوں نے ذرا دور کھڑی اپنی سرخ کار میں رکھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان سب نے دستانے پہنے ہوئے تھے اس لیے کسی قسم کا نشان چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ اتنی آسانی سے اور بلا رکاوٹ ہونے پر وہ سب بہت خوش تھے، سوائے وورل کے... وہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ جان نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

بادشاہ

شیر اچانک ہی مر گیا۔ سارے چرند و پرند حیران کہ بادشاہ سلامت کے بعد اب کون ان کی رہنمائی کرے گا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اس ہجوم میں سے ایک گیدڑ نے مطالبہ کیا کہ اسے جنگل کا بادشاہ بنایا جائے۔

لومڑی جل کے بولی۔ ”تجھے بادشاہ بنا دیں، منہ دیکھا ہے اپنا... یہ جنگل ہے جنگل، پاکستان نہیں ہے۔“

مرسلہ: پرنیا بشیر، ڈیرہ اسماعیل خان

”کام ہو گیا، اب کیوں پریشان ہو؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ ہم سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو جو میری نشان دہی کر دے۔“

”کیوں... ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے کیا؟“ برگ بولا۔

”نہیں، تم لوگ چلے جاؤ گے۔“ وورل نے کہا۔ ”مجھے یہیں رہنا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا، تم فکر مت کرو۔“ شیلڈ بولا۔ ”ہم نے سب اسی طرح کیا ہے جس طرح تم نے کہا تھا۔“

”میں نے بھی کوئی پرفیکٹ پلان نہیں بنایا ہے۔“ وورل نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس جلدی میں بنائے گئے منصوبے میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگر کسی نے تم دونوں کو ائرفیلڈ پر میری گاڑی سے اترتے دیکھ لیا ہوگا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گا اور یقیناً پولیس مجھ سے تفتیش کرے گی۔“

”کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ اس وقت پارکنگ میں کوئی نہیں تھا۔“ جان نے بتایا۔ ”ہم پوری احتیاط سے اترے تھے۔“

گاڑی خود وورل چلا رہا تھا اور اس کا رخ اسی غار کی طرف تھا جہاں وہ اب تک ملتے آئے تھے۔ برگ غار کا سن کر بھنا گیا۔ ”کیا ضروری ہے ہر بار کی طرح ہم اس غار میں رقم کے حصے کریں۔“

”بہت ضروری ہے۔“ وورل نے کہا۔ ”پولیس لازمی کتے استعمال کرے گی اور کتے اس غار کی طرف آنے سے گریز کریں گے۔“

جان چونکا۔ "کتے کیوں گریز کریں گے؟"

"کیونکہ وہ غار ریچھوں کا ہے اور جب کتوں کو ریچھ کی بو آئے گی تو وہ اس طرف آنے سے گریز کریں گے۔ کتے ریچھ سے ڈرتے ہیں۔"

"ریچھ۔" برگ پریشان لہجے میں بولا۔ "تم مرواؤ گے... اگر ریچھ وہاں آگئے تو؟"

وورل ہنس دیا۔ "بے وقوف... ریچھ وہاں سرما میں سونے آتے ہیں۔"

"اچھا... اچھا۔" ان تینوں نے سکون کا سانس لیا۔

ذرا سی دیر میں وہ سڑک کے اس حصے تک آئے جہاں انہوں نے مخصوص نشانیاں رکھ کر سڑک کو بند ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے وہ چیزیں بھی اٹھا کر گاڑی میں ڈالیں اور آگے روانہ ہوگئے۔ اب کار کچی سڑک سے گزر رہی تھی۔ گزشتہ کئی دن سے بارش نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے راستہ خشک اور صاف تھا، ورنہ کیچڑ ہوتی تو اس کار کا اس راستے پر چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایک گھنٹے بعد وہ غار کے سامنے تھے۔ انہوں نے کار سے رقم کا بکس اتارا اور اسے لے کر غار میں داخل ہوئے۔

اب تک ان کا جوش خوف تلے دبا ہوا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے اور ان کا کامیاب نظر آنے والا منصوبہ اچانک ناکام ہو جائے لیکن غار میں داخل ہونے کے بعد انہیں یقین آگیا کہ وہ کامیاب رہے ہیں اور ڈھائی ملین ڈالرز کی خطیر رقم ان کے ہاتھ آگئی۔ انہوں نے بکس زمین پر پٹخا اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوشی منانے لگے۔ برگ بوتل بھی لایا تھا۔ اس نے اسے کھولا اور وہ سب باری باری اس سے پینے لگے۔ جان نے بوتل سے گھونٹ لے کر کہا۔

"ہم ملینیر ہوگئے۔"

"اب ہم اپنے خواب پورے کرسکیں گے۔" برگ نے بوتل لہرائی۔

"میرا گیراج بن جائے گا۔" شیلڈ نے کہا۔

"مجھے اصل خوشی اس وقت ہوگی جب پولیس اس کیس سے میرا تعلق جوڑنے میں ناکام رہے گی۔" وورل نے فکرمندی سے کہا۔

"تم فکر مت کرو۔" جان نے کہا۔ "پولیس اس کیس کا تم سے تعلق نہیں جوڑ سکے گی۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔" وورل نے کہا۔

ذرا سی دیر میں انہوں نے بوتل خالی کردی۔ یہ خاصی تیز وھسکی تھی، وہ ترنگ میں آگئے تھے۔ برگ نے کہا۔ "اس بکس کو کس طرح کھولا جائے؟"

"اس کے ساتھ گیس ویلڈنگ والا طریقہ است نہیں کیا جا سکتا۔" وورل نے خبردار کیا۔ "ورنہ نوٹوں نقصان ہوسکتا ہے۔"

"تب کیا کیا جائے؟" شیلڈ بولا۔

"میرا خیال ہے، دھات کاٹنے والی برقی آری اسے بہ آسانی کھولا جاسکتا ہے۔" وورل نے تجویز پیش کی۔

"لیکن برقی آری کہاں ہے؟" جان نے پوچھا۔

"وہ کسی بھی اچھے اسٹور سے آسانی سے مل سکتی ہے۔"

وورل کی بات پر جان بھنا گیا۔ "یعنی ابھی نہیں ہے یہ ہے تمہاری پلاننگ... تمہیں خیال نہیں آیا کہ ہم بکس طرح کھولیں گے؟"

"تو تم سوچ لیتے۔" وورل نے طنز کیا۔ "تم نے سارا ملبا میرے سر ڈال دیا تھا۔"

"وولی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شیلڈ نے کہا۔ "ہمیں بھی اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے تھی۔ بہرحال وولی کا اتنا احسان ہی بہت ہے کہ اس نے ہمیں رقم دلا دی... اب اس میں رقم ہم خود نکال لیں گے۔"

شیلڈ کے لہجے نے وورل کو چونکا دیا۔ اس نے اس طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے دوست کہ اب ہمیں تمہاری مزید ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔" جان نے کہا اور جب وورل نے اس کی طرف دیکھا تو اسے شاٹ گن کا رخ اپنی طرف دکھائی دیا۔ اس کی شاٹ گن اس کے شانے پر تھی۔ "اپ ہاتھ اوپر کرلو۔"

وورل نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ "تم لوگ مجھے دھوکا دے رہے ہو۔"

"اگر تم ایسا سمجھ رہے تو ایسا ہی سہی۔" شیلڈ نے اس کی شاٹ گن اتار لی۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہار ضمیر اچانک بیدار نہ ہو جائے اور تم پولیس کو ہمارے بارے میں آگاہ کردو۔"

"اول تو ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ تم سے پہلے میں خو پھنس جاؤں گا اور میں تو صرف پولیس سے بچنے کے لیے تمہارے ساتھ شامل ہوا اور اس ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ مجھے کالالچ نہیں تھا۔"

"ہمیں معلوم ہے۔"

"پھر مجھے تم لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ تم کہاں جاؤ گے؟"

شیلڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں دوست! ہم نے تمہیں اپنے پلان بتا دیے ہیں اور اس طرح پولیس کے لیے ہمیں تلاش کرنا بہت مشکل نہیں رہے گا۔ معاملہ ایک سینیٹر کا ہے اور پولیس بہت مستعدی سے حرکت میں آئے گی۔"

"پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم پولیس تک نہ جاؤ لیکن پولیس تم تک آجائے۔" برگ نے دانت نکال کر کہا۔ "اس صورت میں بات ہم تک بھی آئے گی۔"

"اوہ..." وورل نے آہستہ سے کہا۔ "تو تم لوگ بہر صورت فیصلہ کر کے آئے تھے کہ مجھے مار کر ہی جاؤ گے؟"

"مجھے افسوس ہے دوست۔" شیلڈ نے اس کی طرف پستول تان لیا۔ "امید ہے تم ہمیں معاف کردو گے۔"

برگ ہنسا۔ "اگر نہ بھی کرو تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا..."

"ہاں کیونکہ تم سب ضمیر سے عاری اور دوست کش شخص ہو۔" وورل نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا۔ "شکر ہے میں نے بروقت تم لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن تم تینوں نے سوچا کہ میں تمہارا دوست رہا ہوں تو لازمی بات ہے کہ میں بھی تمہاری طرح بے ضمیر ہوں گا۔ بے شک تم تینوں جیسا نہیں ہوں کیونکہ مجھے جرم سے نفرت ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو ہوں۔"

جان اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم تینوں نے سوچا کہ میں نے ملاقات کے لیے اور پھر اس کام کے لیے اس غار کا انتخاب کیوں کیا؟"

"کیوں کیا؟" برگ نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ ریچھوں کا غار ہے۔"

"ہاں لیکن تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ریچھ سرما میں آتے ہیں۔" اس بار بھی برگ بولا۔

"تو سرما کا آغاز ہوگیا ہے اور آج کے دن سے یہاں ریچھوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ اگر تمہیں یقین نہیں آرہا تو غار سے باہر جا کر دیکھ سکتے ہو۔"

"یہ بکواس کر رہا ہے۔" شیلڈ بولا لیکن اس کے لہجے سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ "اسے شوٹ کردو۔" اس نے پستول بلند کیا۔

جان نے اسے روک دیا۔ "نہیں، پہلے باہر دیکھو۔"

شیلڈ اور برگ غار کے دہانے کی طرف بڑھے اور پھر جیسے ہی برگ نے باہر دیکھا، وہ چیخ اٹھا۔ "ریچھ... کئی ریچھ اس طرف آرہے ہیں۔"

اس کی آواز سن کر جان کی توجہ ایک لمحے کے لیے وورل سے ہٹی تو وہ تیزی سے غار کے اندر کی طرف لپکا۔ جان چونکا اور اس نے وورل کی طرف گن کی لیکن اتنی دیر میں وہ تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ جان نے فائر کیا اور چیخ کر بولا۔ "وہ کمینہ بھاگ گیا ہے۔"

برگ اور شیلڈ تیزی سے واپس آئے۔ شیلڈ ہانپتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے نکلو، اس سے پہلے کہ ریچھ آجائیں۔"

"وہ کہاں گیا؟" برگ نے وورل کے بارے میں پوچھا۔

"لعنت بھیجو... وہ اندر ہے۔ ریچھ خود اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ یہاں سے نکلو۔" جان نے کہا اور بکس کو اٹھانے کی کوشش کی۔ شیلڈ اس کی مدد کو آیا۔ اچانک تاریکی سے ایک فائر ہوا اور جان ٹانگ پکڑ کر گر گیا۔ گولی اس کے گھٹنے میں لگی تھی اور وہ زمین پر گرا دھاڑیں مار رہا تھا۔ شیلڈ اور برگ تیزی سے آڑ میں ہوگئے اور پھر اندھا دھند غار کے اندرونی حصے کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ جان درمیان میں پڑا تھا۔ اس نے کھسک کر بکس کی آڑ لے لی۔ برگ نے چیخ کر کہا۔ "اس کی تلاشی کیوں نہیں لی، اس کے پاس ہتھیار تھا۔ ہمیں غار سے نکلنا ہوگا۔"

"ریچھ آنے والے ہیں۔" شیلڈ بولا۔ اس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اپنا پستول خالی کر دیا تھا اور اب نیا میگزین ڈال رہا تھا۔ تاریکی سے اس کی طرف فائر ہوا تو بھڑک کر اس نے ایک بار پھر بے تحاشا فائرنگ کی اور اپنا پستول خالی کردیا۔

"ہمیں جانا ہوگا۔" برگ نے کہا۔

"مجھے اور رقم کو چھوڑ کر۔" جان چلایا۔

شیلڈ اور برگ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا۔ "مجھے افسوس ہے جان۔"

جان کی شاٹ گن چھوٹ کر دور جا گری تھی اور وہ اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ شیلڈ اور برگ بکس کی طرف آتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کیونکہ یہاں وہ براہِ راست وورل کی زد میں آجاتے اور اسے چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔ اسی تذبذب میں انہوں نے وہ وقت گنوا دیا جب وہ یہاں سے نکل سکتے تھے۔ غار کے دہانے پر ایک لمبا تڑنگا اور جسیم ریچھ نمودار ہوا۔ موسم گرما میں خوراک کھا کر اس نے اپنا وزن بڑھا لیا تھا اور اب یہاں سونے آیا تھا۔ برگ اسے دیکھ کر چلایا۔ "ریچھ..."

انسانی آواز سن کر ریچھ اشتعال میں آگیا اور اپنے

دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کی قامت اور خوں خوار پنجے دیکھ کر ان تینوں کی گھگی بندھ گئی۔ برگ کے پاس پستول تھا اور اس کا فائر ریچھ کو خاص نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اس لیے اس نے دوڑ کر جان کی گری ہوئی شاٹ گن اٹھالی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ریچھ پر فائر کرتا غار کے اندر سے ایک شعلہ لپکا اور اس کے بازو میں اتر گیا۔ برگ چیخ کر گرا اور کندھا پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی چیخیں اور فائر کی آواز سن کر ریچھ مزید اشتعال میں آگیا۔ سارے گرما کی تگ و دو کے بعد اس کے سونے کا وقت آیا تھا اور وہ غار کی طرف آیا تو انسانوں کو موجود پا کر اسے پہلے ہی غصہ آیا ہوا تھا۔ وہ جھپٹا اور اس نے برگ کو دبوچ لیا۔ شیلڈ لرزتے ہاتھوں سے میگزین لوڈ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میگزین بار بار اس کے ہاتھ سے گر رہا تھا۔ اسی اثنا میں غار کے دہانے پر مزید دو ریچھ نمودار ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی جان نے بلبلا کر وورل کو آواز دی۔

''وولی! خدا کے لیے ہمیں ان سے بچاؤ۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں گیم وارڈن ہوں تو یہ ریچھ میری بات مان لیں گے؟'' وورل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں نے جو گڑھا میرے لیے کھودا تھا، اس میں خود گر گئے ہو۔''

''تو کیا تم خود بچ جاؤ گے؟'' شیلڈ نے چلا کر کہا۔ اس نے تیسرا اور آخری میگزین اپنے پستول میں ڈال لیا تھا۔

''ریچھوں پر فائر مت...'' وورل نے اسے خبردار کرنا چاہا لیکن شیلڈ نے اس سے پہلے ہی اندر آنے والے دونوں ریچھوں پر گولیاں برسا دیں۔ اس بدحواس فائرنگ میں ان کو چند گولیاں لگیں بھی تو وہ بے اثر تھیں اور وہ شیلڈ کی طرف آنے لگے۔ برگ کی چیخیں تھم گئیں اور ریچھ اس کے بے جان وجود کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ اب اس کی جگہ شیلڈ نے چیخنا شروع کر دیا۔ غار کے دہانے سے مزید ریچھ نمودار ہو رہے تھے۔ ان کو آتے دیکھ کر جان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چیخ کر بولا۔

''وورل! حرامزادے، بچو گے تم بھی نہیں۔''

☆☆☆

کلارا بے تابی سے وورل کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اس کے کام کا آخری دن تھا اور کل سے اس کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ دو دن بعد ان کی میامی کے لیے فلائٹ تھی۔ آج انہیں اپنی باقی شاپنگ بھی مکمل کرنی تھی۔ شام پانچ بجے وورل کی گاڑی کا ہارن سن کر وہ کھل اٹھی اور نینسی کو لے کر باہر آئی۔ وورل اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ کلارا اس کے گلے لگ گئی اور شکوے بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج

نے دیر کر دی؟''

وورل نے اسے پیار کیا اور نینسی کو گود میں لے

''بس کچھ معاملات نمٹاتے نمٹاتے دیر ہوگئی۔ بہر حال

میں چھٹی پر ہوں۔''

''شاپنگ کے لیے کب جانا ہے؟''

''بس میں فریش ہوجاؤں پھر چلتے ہیں۔'' وہ

نینسی سمیت اندر جاتے ہوئے بولا۔ آج کا دن اس کے

واقعی بہت مصروف رہا تھا۔ غار سے نکلنا اس کے لیے

مسئلہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے دوسرے راستے سے بھی واقف

تھا۔ ریچھ سرمائی خواب لینے کے لیے ہمیشہ اس جگہ کو منتخب

کرتے ہیں جہاں آمد و رفت کے دو راستے ہوں کیونکہ وہ

مہینے سوتے ہیں اور اگر اس دوران میں ایک راستہ بند ہو بھی جائے، تب بھی دوسرا راستہ کھلا ہوا ہو۔ باہر آ کر اس نے جان کی سرخ کار لی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ غار سے نکلنے سے پہلے اس نے جان کی چیخیں بھی سن لی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں بچا ہوگا۔ رقم کے بکس کے پاس ان کی لاشیں آنے والے موسم گرما تک کے لیے وہیں پڑی رہیں گی کیونکہ جب تک ریچھ غار میں ہوں کوئی وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

وورل کار لے کر اس جھیل تک آیا جس کے پاس شکاریوں کا ہٹ تھا اور اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ کار کو تمام سامان سمیت جھیل میں دھکیل کر وہ پیدل اس مقام تک آیا جہاں اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔ اس نے تمام نشانات مٹا دیے تھے۔ اس وقت تک پولیس نے جنگل میں طیارے اور ان چاروں افراد کو تلاش کر لیا تھا لیکن وہ اس کے دائرۂ حدود سے باہر تھے اس لیے کوئی اسے کسی طرح بھی ذمّے دار قرار نہیں دے سکتا تھا۔ وورل کا ڈکیتی کی رقم حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی موجودہ زندگی اور حیثیت سے بہت مطمئن تھا اور اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس بحران سے باعزت نکل آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے گرما میں جب ریچھ غار سے نکل جائیں گے تو وہ جا کر رقم اور لاشیں دریافت کر لے گا اور اس کا کریڈٹ بھی اسے مل جائے گا۔ ممکن ہے ڈکیتی کی رقم پوری مل جانے پر اسے سینیٹر کی جانب سے کوئی نقد انعام مل جائے اور وہ اپنے مکان پر موجود قرض ادا کر سکے گا۔ کلارا اور نینسی کے ساتھ شاپنگ پر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے دوست کمینے سہی لیکن وہ اس کے لیے یہ اچھا کام کر گئے تھے۔

قاتلانہ ہتھیاروں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں... عجیب عجیب طریقے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن فلپ ایشر کو مارنے کے لیے جس چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا پولیس فورس میں بیس برس سے زائد کی ملازمت میں ایسا عجیب اور ڈراؤنا ہتھیار ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

یہ ہتھیار انسانی کاسۂ سر تھا... انسانی کھوپڑی۔

گرونی اور میں لاش کے قریب کھڑے تھے۔ لاش کا سر کھوپڑی کی پہلی یا دوسری ضرب میں انڈے کے خول کے

انکشاف

امجد رئیس

اس سادہ مزاج شخص نے اپنے باس کو قتل کر دیا تھا... کیس سیدھا سادہ تھا اور قاتل اعترافِ جرم کر چکا تھا... مگر سراغ رساں بے ضرر آدمی سے معمول کے سوالات کرتے کرتے طویل کہانی میں الجھتے چلے گئے... قاتل بھی ہر نئی بات کے ساتھ مسلسل نئے نئے انکشافات کرتا گیا...

دبیز تہوں میں چھپے رازوں کا پینڈورا بکس جس کے کھلنے کا آخری وقت آ گیا تھا...

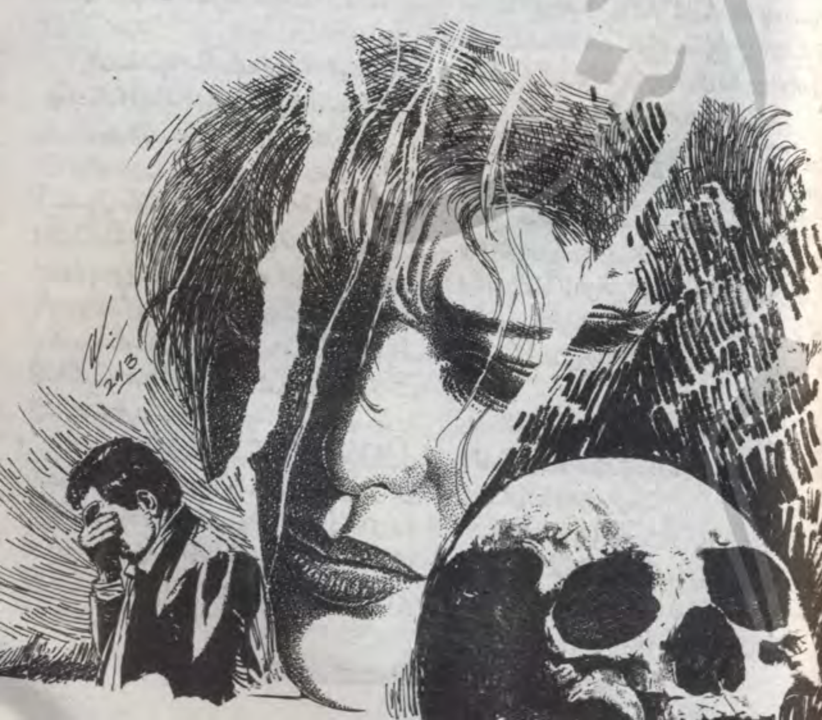

مانند کھل گیا تھا۔ یہ اندازہ کرنے میں قطعی دقت نہیں ہوئی کہ قاتل کی ضرب کے پیچھے شدید قوت تھی۔

میں نے لاش پر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک وسیع اسٹڈی روم تھا۔ چرمی جلد کی کتابوں سے دو دیواریں آراستہ تھیں۔ تیسری دیوار پر نوادرات موجود تھے... قدیم سینٹرل امریکا اور میکسیکو کے آرٹ و کرافٹ کے نمونے... مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے نمونے اور ہتھیار وغیرہ۔

کمرے میں ٹیک کی لکڑی کی دو میزیں اس طرح رکھی تھیں کہ ایک دوسرے کے بالمقابل آگئی تھیں۔ ایک میز بڑے سائز کی تھی جو مختلف اشیا رکھنے کے لیے زیرِ استعمال تھی۔ دوسری میز کام کرنے کے لیے تھی۔ کمرے میں دیگر فرنیچر بھی تھا جو زیادہ تر چمڑے اور ٹیک ووڈ کے امتزاج کا حامل تھا۔ کمرا آرام دہ اور خوب صورت تھا تاہم اس وقت ایک لاش کی موجودگی نے کمرے کا تاثر بدل دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر لاش کو نظرانداز کر بھی دیا جائے تو کمرے کی خوب صورتی، کتابوں اور آرٹ کی موجودگی کے باوجود کمرے میں کوئی ان دیکھا سا اسرار محسوس ہو رہا تھا۔

کرونی کی آواز آئی۔ ”اگر یہ سب کچھ میں نے بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا۔“

”ہوں۔“

اس نے اپنے سر کے گنجے دائرے کو سہلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں کافی وقت گزار لیا ہے... کیا خیال ہے؟“

”ہاں کافی سے زیادہ۔“ میں نے اتفاق کیا۔

ہم دوسرے پٹ کے دروازے سے گزر کر ہال میں آئے۔ ہال کے انتہائی جانب لیونگ روم تھا۔ یہ کمرا بھی ٹیک ووڈ اور آرٹ کے نمونوں سے مزین تھا۔ یہاں ایک طویل صوفے پر دو پولیس کے جوان مستعد کھڑے تھے۔ صوفے کے درمیان ڈگلس فونٹن بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر دھرے تھے۔ اس کے چہرے پر موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ چشمے کے عقب میں اس کی آنکھیں یوں جھپک رہی تھیں جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔

اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ ڈگلس کے بال مٹی کی رنگت کے تھے۔ وہ پتلون اور گہرے نیلے رنگ کی قمیص میں ملبوس تھا۔ وہ ایک ڈرپوک اور بے ضرر شخصیت کی عکاسی کرتا تھا لیکن ایسے ڈرپوک آدمی نے قتل جیسے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ تیس منٹ قبل ہیڈ کوارٹر میں اس کی کال آئی تھی۔ فون پر اس نے فلپ ایشر کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔

ڈگلس کی دائیں آستین پر خون کے خشک دھبے نظر آ رہے تھے۔ ایسے نشان اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر بھی تھے۔

مقتول ایشر اور ڈگلس فونٹن کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات تھیں، اس کے مطابق ایشر شہر کے پوش علاقے میں اسپینش اسٹائل کے قیمتی وِلا کا مالک تھا۔ ڈگلس اس کا سیکریٹری تھا۔ قتل کے وقت جائے واردات پر اس کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔

ڈگلس جیسے شخص نے قتل کیسے اور کس محرک کے تحت کیا؟ ہم اس سے بے خبر تھے۔ نہ ہی ہم آلۂ قتل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے... اس نے کھوپڑی کیوں استعمال کی اور کھوپڑی آئی کہاں سے؟ مقتول کے کمرے میں کئی اشیا ایسی تھیں جن کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔

ڈگلس ایک ہی حالت میں اندھوں کی طرح پلکیں جھپک رہا تھا۔ میں اور کرونی اس کے دائیں بائیں صوفے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کمرے میں اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہو۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ وہ آفٹر شاک میں ہے لیکن جب میں نے اس کا نام پکارا تو اس نے جھٹکا کھا کر نظریں اٹھائیں۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔

”میرا خیال ہے کہ تم ہمیں کچھ بتانا چاہ رہے ہو۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ہم نے پہلے ہی اس کے قانونی حقوق کا خیال رکھا تھا۔ تاہم وہ خود ہی وکیل کی موجودگی میں بات کرنے کے اپنے حق سے دستبردار ہو چکا تھا۔

”میں نے ایشر کا قتل کیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں یہ بات پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ حالانکہ مجھے خیال آیا تھا کہ اعتراف نہ کروں بلکہ اسے ڈاکے کا رنگ دے دوں لیکن میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں اور نہ مجھے اعتماد سے جھوٹ بولنا آتا ہے۔ لہٰذا میرا اندازہ تھا کہ اس طرح میں جلد ہی پھنس جاؤں گا۔ بہتر ہے کہ سیدھے طریقے سے اعتراف کرلیا جائے... ساتھ ہی مجھے ایسی کوئی خاص پروا نہیں رہی تھی کہ آگے میرے ساتھ کیا ہوگا؟“

”یعنی تمہارا جان بچانے کا نامعلوم ”محرک“ ختم ہو چکا تھا۔“ میں نے اندازاً کہا۔ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں نے دوسرا سوال کیا۔

”تم نے اپنے باس کو کیوں قتل کیا؟“

ڈگلس نے نفی میں سر ہلایا... یہ انکار کا انداز نہیں تھا بلکہ مناسب جواب حاصل نہ دینے کی بے بسی تھی۔ ہم نے بھی زور نہیں دیا۔ جلد یا بدیر ہم یہ جواب حاصل کر ہی لیتے۔

کرونی نے کہا۔ ”مسٹر ڈگلس! انسانی کھوپڑی ہی کیوں؟ آخر تمہیں اس قسم کی ڈراؤنی چیز کہاں سے ملی؟“

اس نے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں۔ ”ایشر اس چیز کو اپنی ڈیسک کے عقب والے شیلف میں رکھتا تھا۔ وہ اس وقت ڈیسک پر بیٹھا تھا جب... جب میں نے یہ قدم اٹھایا۔“

”ایک انسانی کھوپڑی کو وہ اپنی اسٹڈی میں کھلے عام رکھتا تھا۔“ کرونی نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”آخر کس لیے؟“

”اس کی حسِ مزاح آسیبی قسم کی تھی۔ اس کے ملاقاتی کھوپڑی دیکھ کر جو ردِعمل پیش کرتے، ایشر اس سے حظ اٹھاتا تھا۔ اس کے لیے کھوپڑی ”میمونٹو موری“ تھی۔“

”کیا؟“

”یادداشت... موت کی یادداشت۔“ ڈگلس نے ”میمونٹو موری“ کی وضاحت کی۔

”کیا یہ قابلِ نفرت قسم کا مزاج نہیں ہے؟“ کرونی نے میری جانب دیکھا۔

”پاگل پن۔“ میں بڑبڑایا۔

”نہیں۔“ ڈگلس نے مداخلت کی۔ ہم دونوں چونک پڑے۔

”ایشر ایک بے خوف اور شفیق القلب انسان تھا۔ موت اس کے لیے پریشان کن یا خوف کھانے والی چیز نہیں تھی... ایک لحاظ سے اس نے اپنی زندگی موت کے حوالے کر رکھی تھی... میں یہ بات آپ کو ٹھیک طرح نہیں سمجھا سکتا۔“

ہم دونوں کی نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ کرونی بولا۔ ”تم کوشش کرو سمجھانے کی... ہم کچھ سمجھ نہیں پا رہے۔“

”وہ ایک مشہور و معروف اینتھرو پولوجسٹ تھا۔“ ڈگلس نے کہا۔ اس نے مایا اور ایزٹک نسلوں کے بارے میں کافی کتابیں لکھی تھیں۔ یونیورسٹیز اور اینتھرو پولوجیکل ڈپارٹمنٹ میں، بطور لیکچرار اور کنسلٹنٹ اس کی بڑی مانگ تھی... پری، کولمبین ریسرچ میں اسے خاص دسترس حاصل تھی...“

”یہ ہم، قریب قریب جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ تم ایشر کے فل ٹائم سیکریٹری تھے؟“

”ہاں، میں اس کی تحقیق میں مدد کرتا تھا۔ میکسیکو، سینٹرل امریکا وغیرہ کی مہمات میں اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ نوٹس تحریر کرتا تھا۔ اس کے مسودے ٹائپ کرتا تھا۔ کاروباری خط و کتابت...“

”اس کے لیے تم کتنے عرصے سے کام کر رہے تھے؟“

میں نے ڈگلس کی بات کاٹ دی اور کرونی کو اشارہ کیا معلوم کرے کہ لیب کریو آیا یا نہیں...؟ کورونر کو بھی اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

”آٹھ برس سے۔“

”کیا تمہاری رہائش یہیں تھی؟“

”ہاں، جنوبی سمت میں میرا کمرا تھا۔“

”اور کون کون رہتا ہے یہاں؟“

”کوئی نہیں۔ کئی برس پہلے جب اس کی بیوی نے اسے چھوڑا تو پھر دوبارہ اس نے شادی نہیں کی۔ نہ ہی اس کا کوئی قریبی رشتے دار ہے۔“

اس دوران میں کرونی نے واپس آکر عملے کی کارروائی کی اطلاع دی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ سوالات شروع کر دیے۔ ”کیا ایشر کو مارنے کا ارادہ تم نے پہلے ہی کر لیا تھا؟“

”نہیں، اسے قتل کرنے کا کوئی منصوبہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود نہیں تھا۔“

”تو آج کوئی تکرار یا جھگڑا ہوا تھا؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“

”پھر تمہیں کس چیز نے اکسایا کہ تم نے اسے مار ڈالا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا اور صوفے پر پیچھے کی جانب گر گیا۔ وہ کسی ایسی چیز کو دیکھ رہا تھا جو کمرے میں موجود

گوہر شناس

نوح ناروی ایک جگہ مدعو تھے، اعلیٰ فیملی تھی اور بہت پُرتکلف کھانا تھا۔ کھانے کے بعد صاحبِ خانہ نے استاد سے کلام کی درخواست کی اور انہوں نے چند غزلیں سنائیں۔ جب وہ خاموش ہوئے تو صاحبِ خانہ کی صاحبزادی نے ان سے کہا:

”تعجب ہے کہ آپ غیر ملکی ہو کر اردو میں اتنے اچھے اشعار کہتے ہیں۔“

نوح ناروی نے چونک کر اسے دیکھا اور بولے۔

”بی بی، کیا فرمایا؟ میں غیر ملکی؟“

”جی ہاں۔“ صاحبزادی بولیں۔

”آپ ناروے کے رہنے والے ہیں نا!“

(مرسلہ: صائمہ امتیاز، ملکوال)

نہیں تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

”یہ... یہ... دراصل ایک انکشاف تھا۔“ بالآخر وہ بولا۔

”کیسا انکشاف؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”ایک روز قبل مجھے ایک اور اینتھر و پولوجسٹ کی جانب سے خط موصول ہوا تھا۔ اس کے ساتھ میری ملاقات کچھ عرصے قبل ایشر کے ذریعے ہوئی تھی۔“ ڈگلس نے بولنا شروع کیا۔ ”وہ مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دے رہا تھا... تنخواہ بھی اچھی خاصی بڑھ کر تھی۔ میں غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بالآخر فیصلہ کیا کہ مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن جب میں نے ایشر کو بتایا تو اس نے میرا استعفا نامنظور کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ میری خاموشی اس وقت تک برقرار ہے جب تک میں اس کے ساتھ منسلک ہوں... اس نے مجھے دھمکی بھی دی کہ مجھے ایشر کو چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے...“

”رکو، رکو... ذرا رک جاؤ...“ میں نے مداخلت کی۔ ”تم کس خاموشی کی بات کر رہے ہو؟“

ڈگلس پھر چپ ہو گیا۔ میں نے کرونی کی جانب دیکھا لیکن زبان بند رکھی۔

”چھ سال پہلے کی بات ہے۔“ آخر اس نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ وہ پھر سکتے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوا۔ ”چھ سال پہلے... ایشر کی سمر لاج، جو ”لیک پورٹن“ میں ہے، وہاں اس کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ مردہ پائی گئی تھی۔“

ہم دونوں اسے گھور رہے تھے۔ کرونی بول پڑا۔ ”کیا کچھ دیر قبل تم نے نہیں بتایا تھا کہ ایشر کی بیوی اسے چھوڑ گئی تھی؟“

”کیا میں نے ایسا کہا تھا؟“ اس نے خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ”ہاں، شاید میں نے کہا تھا۔“ اس نے خود ہی اعتراف کر لیا۔ ”میں یہ جھوٹ اسی طرح اَن گنت بار مختلف افراد سے بول چکا ہوں۔ لہٰذا میکانکی طور پر وہی بات پھر میری زبان سے ادا ہو گئی۔ اس کی بیوی میلڈا اور اس کا آشنا لیک پورٹن میں مردہ حالت میں پائے گئے تھے۔ یہی سچ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ دونوں کیسے ہلاک ہوئے؟“

”گیس۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ چھ سال قبل ستمبر کے مہینے میں ہفتے کا دن تھا۔ اس دن صبح ایشر نے فیصلہ کیا کہ وہ چند روز سمر لاج میں گزارے گا۔ وہ جو کتاب لکھ رہا تھا، ا میں اسے دقت پیش آرہی تھی۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ ماحول کی تبدیلی سے اس کا ذہن رواں ہو جائے گا اور ا کتاب تحریر کرنے میں سہولت ہو گی۔ وہ اکیلا ہی صبح آ بجے نکل گیا۔“ ڈگلس چپ ہو گیا۔

کرونی نے کوئی سوال کرنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

”ایک گھنٹے بعد مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اپنی کار میں سمر لاج کی جانب روانہ ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟“ کرونی نے پوچھا۔

”مم... مجھے معلوم تھا کہ میلڈا سمر لاج میں مقیم ہے۔“

”کیا اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسے لاس اینجلس میں اپنی دوست کے پاس ہونا چاہیے تھا۔“

”تمہیں، کیونکر یہ بات معلوم ہوئی؟ اور کیا ایشر بے خبر تھا؟“

”بظاہر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ لاس اینجلس میں ہے۔“

”میلڈا نے یہ بات شوہر کو کیوں نہیں بتائی؟“

”وہ ایشر سے نفرت کرتی تھی۔“

ہم دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”شوہر کو بظاہر پتا نہیں تھا جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ وہ لاس اینجلس میں نہیں بلکہ سمر لاج میں ہے۔ مسٹر ڈگلس! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟“ میں نے نرمی سے سوال کیا۔

وہ خاموش تھا۔

”کیا وہ تمہیں پسند کرتی تھی؟“

”پتا نہیں...“

”اور تم؟“

”وہ ایک اچھی اور دلکش خاتون تھی۔“ ڈگلس نے بالواسطہ جواب دیا۔

”کیا تم اسے پسند کرتے تھے؟“ میں نے کھل کر واضح سوال کیا۔

وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اس مرتبہ وہ کافی دیر تک خاموش رہا۔ بہت حد تک جواب ہمیں مل گیا تھا۔ میں نے سوال نہیں دہرایا۔ کرونی نے دوسرا سوال کیا۔

”تم سمر لاج پہنچے تو کیا ہوا؟“

”ایشر اندر تھا۔ کچن کے قریب والے کمرے کے بستر پر وہ دونوں برہنہ حالت میں مردہ پڑے تھے۔“

”وہ شخص کون تھا؟“

”میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔“

”جب تم پہنچے تو ایشر کا ردِعمل کیا تھا؟“

”وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا... اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ جب وہ وہاں پہنچا تو پورا گھر گیس سے آلودہ تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے پہلے خراب گیس ہیٹر کا گیس کے ساتھ رابطہ منقطع کیا... پھر کھڑکیاں اور دروازے کھول کر ایگزاسٹ چلا دیے۔ میں پہنچا تو گھر کی فضا صاف تھی۔“

”کیا تم نے اس کے بیان پر یقین کر لیا تھا؟“

”میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا... میلڈا، ایشر سے نفرت کرنے کے باوجود کوئی بے وفا خاتون نہیں تھی۔ وہ ایک خاموش طبع اور شاندار خاتون تھی۔“

”تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں ایشر کے پاس عرصے سے ملازم تھا۔ دوسرے یہ کہ میلڈا کبھی کبھار اُداس اور اکیلی ہوتی تو مجھ سے بات کر لیتی تھی۔“

”اُداسی کی وجہ؟“

”مجھے نہیں پتا... میرا خیال ہے کہ یہ میاں بیوی کے نجی معاملات سے متعلق تھے۔“

”کیا ایشر کسی اور خاتون میں دلچسپی رکھتا تھا؟“

”نہیں۔“

”تم دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیسی تھی؟“ کرونی نے سوال اٹھایا۔

میں نے محسوس کیا کہ ڈگلس کو یہ سوال واضح طور پر بُرا لگا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے کہا کہ وہ بے وفا نہیں تھی پھر تم نے سمر لاج پر ایشر کے بیان پر یقین کیسے کر لیا؟“

”میں نے جو کچھ دیکھا، اس کے بعد میں وقتی طور پر بدحواس ہو گیا تھا۔“

”کیا ایشر پر بھی بُرا اثر ظاہر ہوا تھا؟“

”ایسا لگ رہا تھا لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔“

”وہ کیسے؟“

”مجھے یہ سب سازش لگ رہی تھی... کیونکہ جب میں نے اسے پولیس سے رابطہ کرنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ جواز پیش کر رہا تھا کہ اس کی شہرت کو نقصان پہنچے گا اور ایک اسکینڈل کھڑا ہو جائے گا۔ نتیجتاً اس کی قیمتی ساکھ بری طرح متاثر ہو جائے گی... وہ اطمینان سے لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔“

”کیسا منصوبہ؟“

”وہ جھیل کے قریب کہیں دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پھر میلڈا کے غیاب سے متعلق اس نے ایک جھوٹ گھڑ لیا تھا کہ وہ اپنے پیدائشی علاقے بوسٹن گئی تھی اور واپس نہیں آئی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ساکھ کو دیکھتے ہوئے اس کی بات پر یقین کیا جائے گا۔ ان کے کوئی خاص دوست احباب اور رشتے دار بھی نہیں تھے... اور ایسا ہی ہوا۔“

”تو تم نے اس معاملے میں اس کا ساتھ دیا؟“

”اور میں کیا کرتا... میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ اس وقت ویسے ہی میں دماغی طور پر انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔“

”آگے؟“

”میں نے اس کے ساتھ مل کر لاشوں کو جھیل سے ایک میل دور چٹانی پتھروں کے دامن میں دفنا دیا۔“

”اور تم نے چھ سال تک اپنی زبان بند رکھی... جب تک آج صبح کا حادثہ نہ ہو گیا؟“ کرونی نے کہا۔

”ہاں۔“

”جب تم نے ملازمت تبدیل کرنے کی بات کی تو ایشر نے تمہیں کس قسم کی دھمکی دی؟“

”اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مار دے گا۔“

”حادثاتی اموات پر تم چھ برس خاموش رہے... وہ کیوں اس خطرے کو بڑا کر کے دیکھ رہا تھا کہ تم خاموشی توڑ دو گے جبکہ تم نے اس کی مدد کی تھی اور اتنا عرصہ خاموش رہے... ظاہر ہے کہ راز اگلنے کی صورت میں، کسی نہ کسی حد تک تم بھی پھنس جاتے پھر وہ تمہیں مارنے کی بات کیوں کر رہا تھا؟“

”میں نے بھی اس سے یہی بات کی تھی۔“ ڈگلس نے کہا۔

”تو اس نے کیا کہا؟“

”سچ۔“

”سچ، کیسا سچ؟“ ہم دونوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ڈگلس خاموش بیٹھا تھا۔

”تم کسی سچ کی بات کر رہے تھے؟“ میں نے بے چینی

محسوس کی۔

"اس نے... ان دونوں کو قتل کیا تھا۔" ڈگلس نے دھماکا کیا۔ "تب مجھے اندازہ ہوا کہ اگر چھ برس قبل میں اس کی بات کا یقین نہ کرتا اور اس کی مدد نہ کرتا تو وہ مجھے بھی اسی وقت مار دیتا۔"

"کیا، اس نے ایسا کہا تھا تم سے... میرا مطلب ہے کہ آج صبح کی تکرار میں؟"

"ہاں۔"

"تو تمہیں احساس ہوا کہ تم دہرے قتل کے مجرم کا چھ برس تک ساتھ دیتے رہے۔ اس احساس کے بعد تم مشتعل ہو گئے اور تم نے کھوپڑی کو کھوپڑی سے توڑ دیا۔"

"نہیں۔" ڈگلس نے انکار کیا۔ اس جواب پر ہم دونوں ہی چکرا گئے۔ عجیب شخص ہے...

"اگرچہ اس انکشاف نے مجھے دہلا دیا تھا اور میں نے اس کے خلاف شدید نفرت محسوس کی... مجھے خیال بھی آیا کہ میں اس ذلیل شخص کو ختم کر دوں لیکن میں نہیں کر سکا کیونکہ میں ایک پُرتشدد اور قاتل ذہنیت کا حامل نہیں ہوں۔" ڈگلس نے کہا۔

"خوب۔" میں نے سر کھجایا۔ "تمہاری بات کا کیا مطلب سمجھوں؟"

"درحقیقت، یہ ایک دوسرا انکشاف تھا جس نے میرے اندر ایک قاتل کو جنم دے ڈالا۔"

انکشاف... انکشاف... انکشاف در انکشاف... آخر یہ آدمی مزید اور کتنے انکشافات کرے گا؟ میں نے الجھن زدہ نظروں سے کرونی کو دیکھا اور اندازہ لگایا کہ وہ بھی ڈگلس کے انکشافات کے سلسلے سے جھلاہٹ محسوس کر رہا ہے۔

"پانی منگواؤ یار۔" میں نے کرونی سے درخواست کی۔ لگ رہا تھا کہ انکشافات کا سلسلہ ابھی چلتا رہے گا۔ میں نے دل میں سوچا اور ڈگلس کو گھورنے لگا۔

"اچھا تو مسٹر ڈگلس... یہ کون سا نیا انکشاف تھا؟" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے اس کی وقفے وار خاموشی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ تاہم میں نے برداشت کا مظاہرہ کیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی۔

"اس نے قتل کے ایک سال بعد کوئی اور ہی حرکت کی تھی۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آج صبح اس نے یہ انکشاف کیوں کیا؟ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا؟ دیوانہ ہو..."

"مسٹر ڈگلس!" میں نے دانت بھینچے۔ "میں درخواست کروں گا کہ "انکشاف" کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کریں یا پھر انکشافات کے سلسلے پر فل اسٹاپ لگائیں۔" مجھے لگ رہا تھا کہ یہ آدمی مجھے پاگل کر دے گا، اس کے بعد ہی اس کی کہانی ختم ہوگی۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ کیس تو حل شدہ ہے، اسے ہتھکڑیاں ڈالوں اور لے چلوں۔

میرے ردِعمل پر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ شاید وہ ہمارے احساسات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

"میں سمجھا نہیں؟" وہ بولا۔

"اچھا آپ آگے بڑھیے، ہم سمجھ رہے ہیں۔"

"وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا... اگر وہ یہ بات نہ بتاتا تو شاید اس وقت زندہ ہوتا۔" اس نے اچانک غیر متوقع طور پر ہنسنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور کرونی کو دیکھا جو پہلے ہی دانت کچکچا رہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ ڈگلس خود اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کرونی بیلٹ سے ہتھکڑیوں کی جوڑی الگ کر رہا ہے۔

"مسٹر ڈگلس..." میں نے بلند آواز میں اسے پکارا۔ اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کرونی کو اپنی جگہ پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ڈگلس ہوش و حواس میں ہے اور آخری انکشاف کرنے والا ہے۔

"میں اب تک غلط سمجھتا رہا تھا۔ ایشر کی "میمنٹو موری" میکسیکو سے نہیں آئی تھی۔"

"افریقا سے آئی ہوگی... کیا فرق پڑتا ہے۔" میں بھنّا گیا۔

"نہیں، وہ کھوپڑی "لیک پورٹن" سے آئی تھی۔ ایشر نے آج صبح مجھے یہی بتایا تھا کہ ایک سال بعد اس نے جھیل سے ایک میل دور دوبارہ کھدائی کی تھی اور میلڈا کی کھوپڑی لے آیا تھا... ایشر کو ختم کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں ہتھیار کوئی اور نہیں تھا... میں اتنے عرصے تک اس کی اسٹڈی میں اس عورت کی کھوپڑی کی موجودگی میں کام کرتا رہا... جس سے... جس سے میں خاموش محبت کرتا تھا۔ وہ میری زندگی کی واحد عورت تھی جس سے میں... میں..." ڈگلس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ہم دونوں خود کو ہونق محسوس کر رہے تھے۔

* * *

فرض اور قرض کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا......

ایک معاملہ شناس افسر کی پراثر کارکردگی......

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

مطلوبہ ہدف اور متعین کردہ مقاصد کے حصول کے لیے بعض لوگ خسارے کے عنصر کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں... اس نے بھی زندگی کے گوشوارے میں خساروں کا بے شمار اندراج کرا لیا تھا... ایک وقت آیا کہ کتابِ عمر کے تمام نفع و نقصان اور مالیاتی امور کا کھاتا کھل گیا۔

حق دار

جمال دستی

ٹیکس ایجنٹ ماریا گورکووچ کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ انتقال کر جانے والے افراد کے ٹیکس گوشواروں کی باریک بینی سے جانچ پڑتال کرے اور اس کا مشاہدہ تھا کہ متوفی کے بارے میں زیادہ تر معلومات جدول الف، سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ گوشوارے کا وہ حصہ تھا جس میں مرنے والے کے مال و اسباب کی تفصیلات ظاہر کی جاتی تھیں۔ اس طرح ماریا کو بہت سی اہم معلومات مل جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انکم ٹیکس گوشوارے کی تمام جدول دیکھنے کے بعد سب

سے آخر میں جدول الیف کی پڑتال کیا کرتی تھی۔ اس روز صبح اس کے سامنے جو نیا کیس آیا، اس کی جدول بی میں اسٹاکس اور بانڈز، جدول سی میں مارگیج اور کیش اور جدول اے میں اس کی جائداد کی تفصیلات ظاہر کی گئی تھیں۔ مرنے والی کا نام فلورا ڈاؤن تھا اور وہ میساچوسٹس کے علاقے ماربل ہیڈ کی رہنے والی تھی۔

جدول بی کے مطابق فلورا کے اسٹاکس اور بانڈز کی مالیت بیس لاکھ ڈالرز تھی جبکہ اس کے علاوہ بہتر لاکھ ڈالرز کے اسٹاکس مرنے کے بعد اس کے شوہر کو منتقل ہو گئے تھے۔ جدول سی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں چار لاکھ ڈالرز تھے۔ شیڈول اے میں اس کی جائداد کی تفصیل بیان کی گئی تھی جس کے مطابق وہ ماربل ہیڈ کے مہنگے ترین ساحلی علاقے میں بتیس لاکھ ڈالرز مالیت کی رہائش گاہ کی مالک تھی لیکن اسے یہ جگہ پسند نہیں آئی۔ لہٰذا اس نے ایڈگر ٹاؤن کے علاقے میں بیالیس لاکھ ڈالرز کی ایک اور رہائش گاہ خریدی جہاں وہ گرمیوں کے موسم میں قیام کرتی اور سمندری مرغابیوں کا نظارہ کرتی۔

اس کے برعکس ماریا دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جو متوسط طبقے کے علاقے میں واقع تھا۔ اس نے مکان کا آدھا حصہ کرائے پر دے رکھا تھا تاکہ اس کی قسطیں ادا ہو سکیں۔ اس نے کبھی ایسی جگہیں نہیں دیکھی تھیں جہاں فلورا ڈاؤن رہتی تھی اور نہ ہی اس کی بے اندازہ دولت کے بارے میں معلوم تھا۔ وہ ان جگہوں کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا کہ اس شہر کے رہنے والوں کو معلوم تھا۔ البتہ وہ گلوسٹر اور راک پورٹ کے ساحلوں پر جا چکی تھی اور وہاں اس نے اس طرح کے کئی عالی شان مکانات دیکھے تھے۔

ماریا کو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ انکم ٹیکس گوشوارے میں اتنی زیادہ دولت ظاہر ہونے کے باوجود اس کا بڑا حصہ ٹیکس کی چھوٹ میں آ جائے گا جبکہ ابھی اس نے جدول الیف نہیں پڑھا تھا اور نہیں جانتی تھی کہ اس میں فلورا کی ذاتی اشیا کی مالیت کیا ظاہر کی گئی تھیں۔ فلورا کا انتقال 2003ء میں ہوا تھا۔ اس نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی تھی۔ لہٰذا ملکی قوانین کے مطابق فلورا کے شوہر کو اسٹاک کے علاوہ دو لاکھ ڈالرز نقد ملتے جبکہ بقیہ رقم اس کے بچوں میں تقسیم ہو جاتی۔ وارثوں کو ملنے والا حصہ ٹیکس سے مستثنی تھا۔ اس طرح خزانے کو صرف ایک اعشاریہ چھ ملین ڈالر ٹیکس ملتا جو سترہ ملین ڈالرز کی جائداد اور اثاثوں کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں تھا۔ ماریا کے خیال میں ٹیکس کی یہ رقم ناکافی تھی لیکن اس نے فی الحال اس خیال کو ایک طرف رکھا اور جدول الیف
لگی۔ اسے انکم ٹیکس گوشوارے میں فلورا کے ظاہر کردہ ا
کا جائزہ لینا تھا جس کی بنیاد پر ٹیکس کا تعین کیا جاتا۔
الیف میں فلورا کی ذاتی اشیا کی تفصیلات درج تھیں جن
کپڑوں، فرنیچر، جیولری (مالیت تیس ہزار ڈالرز) اور پر
کالسی کے چینی نوادرات (مالیت انیس ہزار ایک سو
ڈالرز) وغیرہ وغیرہ کا ذکر تھا۔

سب سے آخر میں اس نے فلورا کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھا۔ جس میں اس کی تاریخ پیدائش 1931ء درج
پیشے کے اعتبار سے وہ تاریخ داں تھی اور اس کی موت
ضرب لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ ماریا سنبھل کر بیٹھ گئی
انتہائی غور سے کیس کا مطالعہ کرنے لگی۔

ماریا 1970ء میں اپنے والدین کے ساتھ روس
یہاں آئی۔ اس وقت وہ بارہ سال کی تھی۔ اس کا باپ اقو
متحدہ میں روسی مندوب تھا۔ ماریا نے بھی اپنے لیے ایک
ایسے پیشے کا انتخاب کیا جس کے ذریعے وہ ملک اور قوم کی
خدمت کر سکتی تھی۔ اس کا شمار محکمے کے بہترین افسروں میں
ہوتا تھا۔ وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے ... کام کرتی اور ا
ٹیکس گوشواروں کا باریک بینی سے جائزہ لے کر ٹیکس چوروں کو پکڑتی تھی۔

اس وقت بھی اس کا دماغ فلورا کے انکم ٹیکس گوشوارے کے ساتھ منسلک جدول الیف میں الجھا ہوا تھا۔ اسے شک ہو رہا تھا کہ بارہ عدد قدیم چینی نوادرات کی قیمت انیس ہزار ایک سو بتیس ڈالرز بہت کم لگائی گئی ہے اور اس کا مقصد آرٹ ایڈوائزری پینل کی جانچ پڑتال سے بچنا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں بیان کردہ موت کی وجہ بھی اس کے لیے ناقابل فہم تھی۔ یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ فلورا کے سر میں ضرب کس طرح لگی۔ لہٰذا اس نے اس معاملے کی مزید تحقیقات کے لیے واشنگٹن فون کرنا ضروری سمجھا۔

قانون کے مطابق نوادرات اور آرٹ سے متعلق دیگر اشیا پر بھی ٹیکس عائد ہوتا تھا۔ یہ چیزیں جتنی قیمتی ہوتیں، ٹیکس بھی اتنا ہی زیادہ لگتا۔ اسی لیے بہت سے لوگ اپنے گوشواروں میں ان اشیا کی قیمت کم ظاہر کرتے تھے تاکہ انہیں ٹیکس بھی کم دینا پڑے۔ ماریا نے آرٹ ایڈوائزری پینل کے جونز سے رابطہ کیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ ان چینی نوادرات کی قیمت پانچ لاکھ ڈالرز کے لگ بھگ ہے جبکہ جدول الیف میں ان کی قیمت بیس ہزار ڈالرز سے بھی کم ظاہر کی گئی تھی۔

ماریا کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ معاملے کی مزید چھان بین کرے۔ اس سلسلے میں وہ بوسٹن کی قانونی فرم بریوسٹر اینڈ گوبی میں گئی جہاں اس کی ملاقات ایک خاتون وکیل جولیا ٹروکی سے ہوئی۔ وہاں پر ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ جولیا نے اس کا تعارف ایوریٹ ڈاؤن کے نام سے کروایا جو وصیت پر عمل کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ ماریا نے اس کی موجودگی کو پسند نہیں کیا۔ ایسے لوگ مداخلت کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس شخص میں کوئی ایسی بات تھی جو ماریا کو پسند نہیں آئی۔

ماریا نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے جولیا سے کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ پہلے ہم کاغذات دیکھ لیتے ہیں۔ کیا تم سب چیزیں لے کر آئی ہو؟‘‘

جولیا نے اس کی جانب ایک بریف کیس بڑھا دیا۔ اس میں فلورا کی چیک بک، کچھ رسیدیں اور دیگر کاغذات تھے۔ ماریا کو ان میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اس نے تقریباً تمام کاغذات دیکھ ڈالے اچانک اس کی نظر سب سے آخری کاغذ پر گئی۔ یہ ایک میٹنگ نوٹس تھا۔ ’’کامرس بریٹ بینک کے شیئر ہولڈرز کی سالانہ میٹنگ 8 فروری کو ہو گی۔ جس میں آپ کے شیئرز کی تعداد تیرہ ہزار سات سو بانوے ہے اور ہر شیئر چار سو یورو مالیت کا ہے۔‘‘

ماریا کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ انکم ٹیکس گوشواروں میں ان شیئرز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں ان کی مالیت کا اندازہ لگایا جو پچاس لاکھ یورو سے بھی زیادہ بن رہی تھی۔ اس نے جولیا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ’’انکم ٹیکس گوشواروں میں ان شیئرز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔‘‘

جولیا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ کاغذ تھام لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔

’’نہیں۔‘‘ اس نے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہا۔ ’’انہوں نے یہ شیئرز نہیں خریدے تھے ورنہ ہم گوشوارے میں ان کا اندراج ضرور کرتے۔‘‘

’’پھر یہ کاغذ کہاں سے آیا؟‘‘ ماریا بولی۔ ’’تم جانتی ہو کہ اس پر بیس لاکھ سے بھی زیادہ ٹیکس بنتا ہے۔‘‘

’’میں ابھی آئی۔‘‘ یہ کہہ کر جولیا کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ کمپنی کے چار وکیل اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک سینئر وکیل بولا۔ ’’تم نے جو کاغذ دیکھا ہے، اس کا فلورا ڈاؤن کے اثاثوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مس ٹروکی نے غلطی سے اس کا کمپیوٹر پرنٹ نکال لیا۔‘‘

’’اس کاغذ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ فلورا ڈاؤن کے پاس تیرہ ہزار سات سو بانوے شیئرز تھے۔‘‘

’’یہ خط فلورا ڈاؤن کو نہیں بلکہ میکس کیرن کو لکھا گیا تھا جو کہ اس قانونی فرم کا پارٹنر ہے۔‘‘ سینئر وکیل نے کہا۔ ماریا نے ایک بار پھر اس خط پر نظر ڈالی اور شکست خوردہ انداز میں بیٹھ گئی۔

ایوریٹ ڈاؤن نے پہلی بار مداخلت کی اور بولا۔ ’’تم صرف تصورات کی بنیاد پر اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہی ہو۔ فلورا کے پاس کامرس بریٹ بینک کے شیئرز نہیں تھے۔‘‘

ماریا اس گفتگو کو انکم ٹیکس کے معاملات تک محدود رکھنا چاہتی تھی لیکن اس نے ایک پتا پھینکنا ضروری سمجھا۔

’’ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے مطابق تمہاری بیوی کی موت سر پر ضرب لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ چوٹ کس طرح لگی تھی؟‘‘

ایوریٹ بے حس و حرکت بیٹھا رہا لیکن ماریا نے نوٹ کیا کہ اس کا اوپری ہونٹ دو مرتبہ پھڑکا تھا۔ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ ’’یہ چوٹ کس طرح لگی تھی؟‘‘

’’وہ گر گئی تھی۔‘‘ ایوریٹ نے کہا۔ ’’پیچھے کی جانب... اور اس کا سر کافی کی میز پر رکھے مجسمے سے ٹکرایا تھا۔ وہ کسی امریکن آرٹسٹ کا بنایا ہوا شیشے کا آکٹوپس نما مجسمہ تھا اور تین سال پہلے میں نے اسے شادی کے موقع پر تحفے میں دیا تھا۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ ماریا بولی۔ ’’گویا تم فلورا کے دوسرے شوہر ہو اور ان بچوں کے باپ نہیں ہو جن کے نام انکم ٹیکس گوشوارے میں دیے گئے ہیں۔‘‘

’’ہاں... نہیں۔‘‘ ایوریٹ نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ ’’وہ محض ایک حادثہ تھا۔‘‘

’’کیا اس شیشے کے آکٹوپس کا ذکر انکم ٹیکس گوشوارے میں کیا گیا ہے؟‘‘ ماریا نے پوچھا۔

’’وہ شادی کا تحفہ تھا۔ کیا اسے بھی اس فہرست میں شامل کرنا ضروری تھا؟‘‘ ایوریٹ نے کہا۔

سینئر وکیل ایک بار پھر بولا۔ ’’میں سمجھ گیا۔ تم اس آکٹوپس کی مالیت کا تخمینہ لگانا چاہتی ہو۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’تمہارے خیال میں اس آکٹوپس کی قیمت کیا ہو گی؟‘‘ سینئر وکیل نے ایوریٹ سے پوچھا۔

ایوریٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ’’مجھے یاد نہیں لیکن اس کی قیمت ہزاروں میں تھی۔ میں اس کا ٹیکس ادا کر

دوں گا۔"

"مجھے اس کا صحیح تخمینہ چاہیے۔" ماریا بولی۔ "اگر اس کی قیمت بیس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہوئی تو اسے آرٹ ایڈوائزری پینل کو بھیجنا پڑے گا۔"

☆☆☆

اس آکٹوپس کی تخمینی لاگت سترہ ہزار ڈالرز تھی۔ اس نے فلوراڈاؤن کے گوشواروں کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا اور اس میں کوئی بے قاعدگی نظر نہیں آئی۔ آرٹ ایڈوائزری پینل نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ بارہ عدد چینی مجسموں کی قیمت صحیح بتائی گئی تھی۔ اس طرح کے سستے مصنوعی مجسمے سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ائرپورٹ کی دکانوں پر ملتے ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت دو سو اناسی ڈالرز تھی۔ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ نے فلورا کے گوشوارے کو درست قرار دے دیا اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بظاہر یہ کیس ختم ہو گیا تھا لیکن ماریا کی نظر میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ایوریٹ کو منتقل ہونے والے اثاثے اس کے گوشوارے میں ظاہر کیے جانے تھے اور اس کے مرنے پر حکومت اپنے تمام واجبات وصول کر لیتی۔

☆☆☆

چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں ماریا معمول کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ اس کی ایمان داری اور فرض شناسی سے حکام بالا بہت خوش تھے اور اکثر و بیشتر اسے ان کی جانب سے تعریفی خطوط موصول ہوتے رہتے تھے۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق اپنا کام کر رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک نیا انکم ٹیکس گوشوارہ آ گیا۔ اس نے جدول بی، سی اور آئی کا معائنہ کیا۔ گوشوارے میں دی گئی تفصیلات کے مطابق ان اثاثوں پر بہت کم ٹیکس عائد ہوتا تھا کیونکہ مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کے بیشتر اثاثے اس کی بیوی کو منتقل ہو گئے تھے۔ البتہ لاس ویگاس میں واقع ایک اپارٹمنٹ اس نے اپنی کسی دوست کو تحفے میں دے دیا تھا۔ سب سے آخر میں ماریا نے جدول ایف کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔ البتہ ایک غیر استعمال شدہ کشتی پر اس کی نظر ٹھہر گئی جو مرمت طلب تھی اور اس کا تخمینہ صرف دو ہزار ڈالرز لگایا گیا تھا۔ اس نے صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ انکم ٹیکس گوشوارہ کس کی جانب سے داخل کیا گیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس پر ایوریٹ ڈاؤن کا نام لکھا تھا اور اس میں بھی قدیم چینی مجسموں کی تفصیل درج تھی۔ اسے فلوراڈاؤن کا انکم ٹیکس گوشوارہ یاد آ گیا اور وہ سوچنے لگ اس میں بھی چینی مجسموں کی وہی تعداد ظاہر کی گئی ہے؟

☆☆☆

ایک بار پھر اسے قانونی فرم کے دفتر میں جانا پڑا۔ اس کی ملاقات جولیا سے ہوئی۔ اس کی حالت میں بظاہر تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح خوف زدہ اور ا سے عاری نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک لفافہ نکالا اور ماریا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "اس میں کچھ نقد رقم ہے۔ اگر کچھ سود یا دیگر واجبات ہوں تو ان ادائیگی اس سے کی جا سکتی ہے۔"

ماریا غصے کے عالم میں کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "کیا تم نے؟ نقد رقم... کیا تم مجھے رشوت دینا چاہ رہی ہو؟"

جولیا سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے ایکسکیوز کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک سینئر وکیل کے ساتھ آئی۔ مار نے اسے پہچان لیا۔ چار سال پہلے فلورا کے کیس میں اس سے اسی دفتر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ عیاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم سمجھ رہی ہو کہ جولیا نے تمہیں رشوت دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ لفافہ میں نے ہی اسے دیا تا کہ حساب کتاب میں اگر کوئی فرق ہو تو اس رقم سے دور کر جائے۔ یہ رشوت ہرگز نہیں ہے۔"

ماریا کے گال غصے سے سرخ ہو گئے۔ وہ شخص کچھ زیادہ ہی ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سرکاری خزانے میں ادائیگی چالان کے ذریعے کی جاتی ہے لیکن اس وقت ماریا نے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "میرے آڈٹ کا تعلق قدیم چینی نوادرات سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ گوشوارے میں ان کی قیمت کم ظاہر کی گئی ہے۔ میں چاہوں گی کہ کسی دوسری جگہ سے ان کا تخمینہ لگوایا جائے۔"

سینئر وکیل نے اپنی بھویں سوالیہ انداز میں اوپر اٹھائیں جیسے کہہ رہا ہو کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔

ماریا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ تخمینہ کسی ایسے مستند تخمینہ کار سے لگوایا جائے گا جو انکم ٹیکس میں رجسٹرڈ ہو۔"

پھر اس نے ایک کاغذ پر چارلس ٹنکل کا نام اور پتا لکھ کر دیا اور بولی۔ "یہ مجسمے اس تک پہنچانے کا بندوبست کرد اور اس کی رپورٹ براہِ راست مجھے ملنی چاہیے تا کہ میں اصل قیمت معلوم ہونے کے بعد سود اور جرمانے کا تعین کر سکوں۔"

"مجھے تو یہ ایک غیر معمولی بات لگتی ہے لیکن اگر انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ اس کے تخمینوں کو قبول کر لیتا ہے تو ہماری فرم کو کوئی اعتراض نہیں۔ میں ایوریٹ ڈاؤن کی سوتیلی بیٹی ڈوٹی سے بات کر لوں کیونکہ وصیت پر عمل کرنے کی ذمّے داری اسی کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان مجسموں کی اس سے زیادہ قیمت ہو سکتی ہے۔"

☆☆☆

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" سینئر وکیل رچرڈ گریوز نے فون پر غصے سے کہا۔ "چار سال پہلے یہ مجسمے آرٹ ایڈوائزری پینل کو جانچ پڑتال کے لیے بھیجے گئے تھے، جب تم فلورا کے کیس کو دیکھ رہی تھیں۔ اب ان کے لیبارٹری ٹیسٹ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"وہ اصلی مجسمے نہیں بلکہ ان کی رنگین سلائڈز اور ٹرانسپیرنسی تھیں۔" ماریا نے تصحیح کی۔ "شاید ان سلائڈز میں وہ مخصوص دھبّا نظر نہ آیا ہو جو تخمینہ کار نے دیکھا ہے۔"

"تمہارے خیال میں یہ دھبا کس چیز کی نشاندہی کرتا ہے؟" رچرڈ گریوز بھناتے ہوئے بولا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ لیبارٹری کے تجزیے کے بعد یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ مجسمے چار ہزار سال پرانے ہیں اور ان کی قیمت لاکھوں ڈالرز ہے؟"

ماریا نے اپنا پاؤں زمین پر پٹخا اور بولی۔ "بالکل... شاید لیبارٹری تجزیے سے یہ بات ثابت ہو جائے۔"

"اگر تمہارے ماہرین نے ان مجسموں کے قدیم ہونے کی بنیاد پر بھاری تخمینہ لگایا تو ہم یہ کیس واشنگٹن بھیج دیں گے۔" گریوز نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" ماریا نے اطمینان سے کہا۔

☆☆☆

لیبارٹری تجزیے سے ماریا کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ پہلے اس نے اس موضوع پر ریاستی قوانین کا مطالعہ کیا پھر تخمینہ کار چارلس ٹنکل سے ایک میٹنگ کی۔ اس کے بعد اس نے ایک فون کیا جس کے بارے میں اس نے کسی کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

جولیا کو جب اصل صورتِ حال کا پتا چلا تو وہ پریشان ہو گئی اور بولی۔ "کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ یہ مجسمے غیر قانونی طور پر اسمگل کیے گئے جبکہ چینی حکومت نے ان کی برآمد پر پابندی لگا رکھی ہے؟"

"بالکل، اب تو واضح ہو گیا۔ ہم انکم ٹیکس گوشوارے میں تصحیح کر لیں گے لیکن..."

یہ میٹنگ چارلس ٹنکل کے دفتر میں ہو رہی تھی جو چینی اور قدیم نوادرات کا ماہر تھا اور اس کے لگائے ہوئے تخمینے سے اختلاف کی گنجائش نہیں تھی۔ گریوز نے اس معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنی جگہ جولیا کو میٹنگ میں شرکت کے لیے بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ ماریا سے اضافی ٹیکس کا چیک بھیجنے کا کوئی وعدہ نہ کرے۔

وہ سب ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، تبھی ماریا نے میٹنگ میں موجود چوتھے فرد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ڈوٹی! اب تم ہی اپنے سوتیلے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کی ذمّے دار ہو۔"

ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماریا کو اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق اس نے سان فرانسسکو کے ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا بھائی پیٹر گرین، ہوائی میں رہتا تھا۔ بظاہر ان دونوں کو

وفادار شوہر

ہفتے کی رات تھی۔

وہ کلب کے ہنگاموں میں رات تین بجے تک مگن رہا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے شوہر کو دیکھا تو پوچھا۔ "آج کلب میں کیا شغل رہا؟"

"آج کلب میں عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تمبولا شروع ہونے سے پہلے سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو شخص کھڑا ہو کر سب کے سامنے اس امر کا دعویٰ کرے کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی تو اس کی خدمت میں یہ نیا ہیٹ پیش کیا جائے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"ڈارلنگ تم سن کر حیران ہو گی کہ سارے مجمع میں سے کسی بھی شخص نے اس امر کا دعویٰ نہیں کیا۔"

"مگر تم نے کیوں دعویٰ نہیں کیا؟"

"میں نے؟ میں تو کھڑے ہو کر اعلان کرنے ہی والا تھا کہ یکایک مجھے خیال آیا کہ یہ ہیٹ میرے سائز کا نہیں!"

(پھالیہ سے امتیاز احمد کا انتخاب)

اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ ماربل ہیڈ میں رہنے کی خواہش نہیں تھی۔ جس مکان میں وہ پلے بڑھے تھے، اب وہ ایوریٹ کی نئی بیوی ایڈن کے نام منتقل ہو رہا تھا۔

ماریا نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولی۔ ”مسٹر ٹنکل! لیبارٹری رپورٹ کیا کہتی ہے؟“

”اس میں ایک بات قابلِ غور ہے۔“ ٹنکل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ان میں سے ایک مجسمے پر کسی رنگ کا ہلکا سا نشان ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسا نشان ہے۔ کہیں یہ مجسمہ جعلی تو نہیں۔ اسی لیے میں نے اسے لیبارٹری تجزیے کے لیے بھیج دیا اور انہوں نے مجھے بتایا...“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا۔ ”یہ کسی انسان کا خون تھا۔“

”کیا اس سے اثاثوں کی مالیت پر اثر پڑتا ہے؟“ جولیا بے اختیار بول اٹھی۔

”ممکن ہے۔“ ماریا نے کہا۔ ”لیکن ہم تمہیں بتانا چاہتے ہیں کہ اس صورت حال کے پیشِ نظر اعلیٰ حکام کو فون کر دیا گیا ہے۔“

”تمہارا مطلب انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ سے ہے؟“ جولیا بولی۔

”نہیں، میں ایف بی آئی کی بات کر رہی ہوں۔“

”ایف بی آئی؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”اس کا تعلق مسٹر ڈاؤن کے انکم ٹیکس گوشوارے سے منسلک جدول ایف سے ہے۔ تمہیں اس کی پہلی بیوی فلورا کا جدول ایف تو یاد ہوگا؟“ ماریا نے کہا۔

جولیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماریا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس میں قدیم چینی مجسموں کی تعداد بارہ بتائی گئی تھی۔“ پھر وہ ڈوٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہارے سوتیلے باپ نے کبھی کوئی مجسمہ خریدا تھا؟“

ڈوٹی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ وہی مجسمے ہیں جو تمہاری ماں کی ملکیت تھے۔“ ماریا بولی۔

”ہاں۔“ ڈوٹی نے جواب دیا۔ ”ہماری ماں نے یہ مجسمے اس وقت خریدے تھے جب وہ گریجویشن کر رہی تھی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب چینی حکومت نے ان کے مسروقہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔“

”بہر حال، اب صورتِ حال مختلف ہوگئی ہے اور اس تحقیقات کا رخ دوبارہ تمہاری ماں کے اثاثوں کی طرف چلا گیا ہے۔“ ماریا نے کہا۔

”لیکن فلورا کا کیس تو بند ہو چکا ہے۔“ جولیا بولی۔

”میں ہمیشہ انکم ٹیکس کے گوشوارے دیکھ کر حیران ہوتی ہوں۔“ ماریا بولی۔ ”لیکن اب جو غیر معمولی بات سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ فلورا کے گوشوارے میں جو تعداد ظاہر کی گئی تھی... اس میں ایک کا اضافہ ہو گیا ہے جبکہ تمہارے سوتیلے باپ کو ان مجسموں کی خریداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“

ڈوٹی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے کہ ایوریٹ کے گوشوارے میں ان مجسموں کی تعداد تیرہ ظاہر کی گئی ہے جبکہ فلورا کے گوشوارے میں صرف بارہ مجسمے دکھائے گئے تھے۔“

جولیا جلدی جلدی اپنے کاغذات پلٹنے لگی۔

”یہ بہت عجیب سا لگتا ہے کہ تم اس بات کی نشان دہی کر رہی ہو۔“ ڈوٹی بولی۔ ”جب ہماری ماں کی ذاتی اشیا تقسیم ہو رہی تھیں تو ایوریٹ نے وہ مجسمے لے لیے تھے اور ہمارے حصے میں دوسری چیزیں آئیں۔ اس وقت ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے قیمتی ہیں۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹنکل کے ایک معاون نے دروازہ کھولا۔ ایک طویل قامت شخص سیاہ سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ یہ ایف بی آئی ایجنٹ ڈنلی تھا۔ اس نے آتے ہی ڈوٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں تمہارے سوتیلے باپ کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ جب ہمیں فون پر بتایا گیا کہ چینی مجسمے پر خون کا دھبا نظر آیا ہے تو ہم نے مقامی حکام سے مسٹر ایوریٹ کی رہائش گاہ کے بارے میں معلوم کیا۔ یہ خون ان نمونوں سے مل رہا تھا جو پولیس نے تمہاری ماں کے مرنے پر حاصل کیے تھے۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور ڈی این اے ٹیسٹ کروایا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ تمہارے سوتیلے باپ نے فلورا کے سر پر ضرب لگانے کے لیے ایک مجسمے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ پولیس نے اس وقت بھی اس کے بیان پر پوری طرح یقین نہیں کیا تھا لیکن ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا جس کی بنا پر وہ ایوریٹ پر ہاتھ ڈال سکتی۔“

ڈوٹی یہ سن کر زار و قطار رونے لگی اور بولی۔ ”میرا بھی یہی خیال تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ ایوریٹ کو شراب پینے کی عادت تھی۔ وہ بہت جلد غصے میں آجاتا تھا اور ہماری ماں اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اسی لیے میں نے ایوریٹ کی بیان کردہ کہانی پر کبھی یقین نہیں کیا۔“

”اب تمہارا سوتیلا باپ بے نقاب ہو گیا ہے۔“ ڈنلی بولا۔

”اس نے یقیناً بیمہ پالیسی اور مکان اپنے نام کرنے کی بات کی ہوگی۔“ ڈوٹی بولی۔ ”جب اثاثوں کی تقسیم ہوئی تو مکان اور نقدی اس کے حصے میں آئی۔“

”اب ایڈن کیا کہے گی؟“ ڈوٹی نے اچانک ہی جولیا سے پوچھا۔

”ایڈن... یہ کون ہے؟“ ماریا نے پوچھا۔

”ایوریٹ کی نئی بیوی۔“ ڈوٹی نے جواب دیا۔ ”وصیت کے مطابق وہ ان تمام اثاثوں کی مالک بن گئی ہے جو ایوریٹ کو میری ماں سے ورثے میں ملے تھے۔ ان میں ماربل ہیڈ کا مکان، تمام اسٹاکس اور نقد رقم شامل ہے۔“

”اس لحاظ سے یہ انکوائری کافی سودمند رہی۔“ ماریا بولی۔ ”یہ محض تمہاری ماں کے جدول ایف کو درست کرنے کا معاملہ نہیں تھا۔“

”ایک منٹ۔“ جولیا اچانک بولی۔

سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کہنا چاہ رہی ہے۔ جولیا نے اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں اور بولی۔ ”ایڈن کو کچھ نہیں ملے گا۔ وہ وراثت سے محروم ہو گئی ہے۔“

ڈوٹی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اگر تمہارے سوتیلے باپ نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا۔“ جولیا نے کہا۔ ”تو ایوریٹ کی وراثت ضبط ہو گئی۔ آپ کسی کو قتل کر کے اس کے وارث نہیں بن سکتے۔“

ڈوٹی ابھی تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے جولیا کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگ رہا تھا۔

”اس لیے تمہارا سوتیلا باپ ایوریٹ نہیں بلکہ تم اور تمہارا بھائی پیٹر 2003ء سے ہی اپنی ماں کی جائداد کے وارث بن گئے ہو۔ اس لیے تمام اثاثے ایوریٹ کے بجائے تمہیں چار سال پہلے ہی منتقل ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایڈن کو کچھ نہیں ملے گا۔“

”ماربل ہیڈ کا مکان بھی؟“ ڈوٹی نے سرگوشی کی۔

”ہاں۔“ جولیا نے جواب دیا۔

”اسٹاکس، بانڈز اور ونے یارڈ کے مکان سے حاصل ہونے والی رقم؟“ ڈوٹی نے پوچھا۔

”وہ بھی تمہاری ہے۔“ جولیا نے کہا اور یہ کہہ کر اپنے بریف کیس سے کیلکولیٹر نکال لیا۔

”قدیم نوادرات، چاندی کے برتن اور نادر تصاویر۔ وہ سب ہماری ہیں؟“ ڈوٹی نے پوچھا۔

”ہاں... ہاں۔“ جولیا کاغذات میز پر پھیلاتے ہوئے بولی۔ ان میں انکم ٹیکس گوشوارے بھی تھے جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کیلکولیٹر پر چل رہی تھیں اور ماریا بڑے غور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

سارا حساب کتاب لگانے کے بعد جولیا نے کہا۔ ”تمہاری ماں کے اثاثوں کی مالیت پچاس لاکھ ڈالرز ہے کیونکہ 2003ء میں یہ اثاثے اس کے شوہر کو منتقل نہیں ہوئے اس لیے ان پر ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔“

”بہت خوب۔“ ڈوٹی خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”جو کچھ ہمیں مل رہا ہے، اس کے مقابلے میں ٹیکس کی رقم کچھ بھی نہیں۔ میں اور پیٹر تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔“

”ہمیں اس سلسلے میں کچھ قانونی کارروائی کرنا ہوگی۔“ جولیا نے کہا۔ ”سب سے پہلے عدالت سے اس لیبارٹری رپورٹ کی تصدیق کروانا ہوگی تاکہ یہ سرکاری دستاویز کی شکل اختیار کر سکے۔ صرف اسی صورت میں ایوریٹ ناحق قرار دیا جائے گا۔ اس کے بعد 2003ء سے اب تک تمام واجب الادا ٹیکس دینا ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈوٹی نے کہا۔ ”تم فوراً اپنا کام شروع کر دو۔“

جولیا دل ہی دل میں حساب لگانے لگی کہ اس تمام قانونی کارروائی کے عوض ان کی فرم کو کتنی فیس ملے گی۔ جب گریوز کو معلوم ہوگا کہ میں نے فرم کی آمدنی بڑھانے کے لیے کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے تو وہ کتنا خوش ہوگا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ جب جولیا نے اسے میٹنگ کی روداد سنائی تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تو ڈر رہا تھا کہ تم کہیں اس بار بھی کوئی حماقت نہ کر بیٹھو۔ یہ تو آج معلوم ہوا کہ احمق لوگ بھی کبھی کبھی عقل کی بات کر جاتے ہیں۔“

اس رات ماریا کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر وہ باریک بینی سے انکم ٹیکس گوشواروں اور خاص کر جدول ایف کا جائزہ نہ لیتی تو حق دار کو اس کا حق کبھی نہ ملتا۔ عام طور پر لوگ جدول ایف پر اس لیے توجہ نہیں دیتے کیونکہ اس میں ٹیکس دہندہ کے ذاتی استعمال کی اشیا ظاہر کی جاتی ہیں لیکن اب اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ جدول ایف سے کیا کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

* * *

سرورق کی پہلی کہانی

ہشت پا محبت

احمد اقبال

معاشرے کی بنیاد اور بُنت میں ہر فرد ایک اہم کردار ادا کرتا ہے... افراد کی زندگی ہمارے معاشرتی ماحول کا وہ آئینہ ہے جس میں ہر پہلو کو بڑے واضح انداز میں دیکھا جا سکتا ہے... ہماری اخلاقی قدریں تیزی سے روبہ زوال ہیں... مگر ہم اسے تبدیلی کا نام دے کر قبول کرتے جارہے ہیں... ہمارے خاندانی نظام کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا ہے کہ خودغرضی میں ہم نے صرف اپنی ذات کے لیے تمام مادی وسائل کے حصول کو کامیابی کا معیار بنالیا ہے... جائز و ناجائز کے فرق کو راستے کی رکاوٹ سمجھ کے ختم کر چکے ہیں... یہ تبدیلی نہیں تباہی ہے... ان ہی تبدیلیوں اور تباہیوں کی عکاس ایک پُراثر کہانی کے پیچ و خم... جو آپ کے ذہنوں کو الجھا کے سوچنے پر مجبور کر دیں گے...

سب کچھ بدلنے پر مجبور کر دینے والی محبت کے ہشت پا پہلوؤں کو اجاگر کرتی تحریر...

سائرہ نے کتاب سے نظر اٹھا کے دیکھا۔ "مائرہ... تمہارا پیپر ہے کل۔"

مائرہ نے اپنے موبائل فون پر گیم جاری رکھا۔ "پھر؟"

"پھر کیا... تم پڑھ کیوں نہیں رہی ہو؟"

"یار تم پڑھ رہی ہو نا... کافی ہے۔" اس کی انگلیاں کی پیڈ پر ناچتی رہیں۔ "ویسے بھی مجھے پیپر دینے نہیں جانا۔"

سائرہ چونکی۔ "پیپر دینے نہیں جانا؟"

"ہاں، مجھے کہیں اور جانا ہے اور میں یہ چانس مس نہیں کر سکتی... اوہ شٹ۔" اس نے غلط بٹن دبانے پر عادتاً کہا۔

"پیپر سے زیادہ اہم کون سی جگہ ہو گئی ہے؟" سائرہ خفگی سے بولی۔

مائرہ نے ٹچ اسکرین فون کو بند کر کے پیار سے گال پر رکھا۔ "سچ بتاؤں مائی ڈیئر باجی... تم میری سہیلی بھی ہو، رازدار بھی... اس لیے بتا رہی ہوں۔ آگے تمہاری مرضی اماں ابا کو بتانا چاہو تو... اس سے پھڈے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کروں گی میں اپنی مرضی۔"

"یا میرے خدا... کچھ بتاؤ بھی۔"

"مجھے جانا ہے ایک انٹرویو کے لیے۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی ہے... اس میں ریسپشنسٹ کم آپریٹر کی جاب ہے۔ تنخواہ ابھی ہو گی چوبیس ہزار... مراعات بہت ہیں ٹرانسپورٹ... میڈیکل... اس کے علاوہ ان کے ڈائریکٹ کونٹیکٹ ہیں کینیڈا میں اور یہاں ایمبیسی میں... تو میرے کینیڈا جا کے سیٹل ہونے کے چانسز بھی بہت برائٹ ہیں... دو چار سال میں۔"

سائرہ دم بخود یہ سب کچھ سنتی رہی۔ "مگر مائرہ... ابھی تمہاری عمر ہے اٹھارہ سال۔"

مائرہ ہنسی۔ "سویٹ آپی... تمہیں کچھ سرپرائز دوں... پہلے یہ دیکھو۔"

سائرہ نے شناختی کارڈ پکڑ لیا۔ "یہ تمہارا ہے؟"

"یار فوٹو کس کی ہے اوپر؟ میری ہے تو کارڈ ی میرا ہے۔"

سائرہ اسے دیکھتی رہی۔ "یہ کیسے بنا... اس ں تو تمہاری عمر بیس سال لکھی ہے، تاریخِ پیدائش ے حساب سے۔"

"ہو گئی تو ہو گئی۔ چیلنج کون کر رہا ہے ے... ابھی یہ دوسرا ایٹم بم... خاص ہارے لیے۔"

سائرہ نے کارڈ واپس کیا اور پائپ کی رح رول کیا ہوا کاغذ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں ٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "مائرہ... یہ..."

"ہاں یار... ڈگری ہے میری بی اے کی جو میں نے پرائیویٹ کیا گزشتہ سال... اور یہ میں نے کمپیوٹر سے پرنٹ نہیں نکالا ہے۔ ورسٹی سے جاری ہوئی ہے۔ رائٹر مارکس... یل... کنٹرولر آف ایگزامینیشن کے دستخط... ب جینوئن..."

"مگر ڈگری جعلی ہے۔"

مائرہ ہنس پڑی اور ڈرامائی لہجہ بنا کے ولی۔ "نادان لڑکی... ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے۔ اصلی ہو یا نقلی... کل اسی کی بنیاد پر میرا سلیکشن بھی ہوگا۔ میں بتا سکتی ہوں کہ سلیکشن کمیٹی کے ارکان مجھ سے کیا سوالات کریں گے۔ تمہیں تو یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ کل میں کیا پہن کر جاؤں گی۔ وہ جو بلیک شرٹ ہے نا میری... نہیں وہ نہیں جو اماں نے عید پر بنائی تھی۔ وہ سلیولیس... جس پر تم اعتراض کرتی ہو کہ بیک پر سے بہت اوپن ہے... اور اس کے ساتھ اورنج اسکرٹ... تم نے میرے سن گلاسس دیکھے... بالیاں تو دیکھی ہیں نا... جیسی پریانکا چوپڑا کی تھیں اس فلم میں..."

"مائرہ... یہ تم کیا کر رہی ہو؟ خدا کے لیے کچھ سوچو... ابا..."

"ابا کے لیے تم سوچو پیاری بہن۔ میں تو صرف اپنے لیے سوچتی ہوں۔ آفٹر آل دِس از مائی لائف... اور بقول شاعرِ مغرب... زندگی نہ ملے گی دوبارہ... میں سب کو فیس کرنے کے لیے تیار ہوں... تم ابھی کرانا چاہتی ہو تو ابھی سہی۔"

سائرہ بت بنی ٹیبل پر کھلی کتاب کو گھورتی رہی۔ متضاد اور مخالف سمت میں کھینچنے والی قوتوں کے آگے وہ بے بس ہوتی جا رہی تھی۔ غلط اور صحیح... جائز اور ناجائز... اچھا برا... وقت ایک ہی گرائنڈر مکسر میں سب کو گھوٹ رہا تھا اور یہ نئے دور کا انرجی ڈرنک تھا۔ اس سے دماغ صحیح ٹریک پر چلنے لگتا تھا۔ گزرے ہوئے دن پر لعنت... آنے والے دن کی ابھی سے کیوں فکر... سارے اخلاقی نظریات لاحاصل... آج کا مادی فائدہ ہی اپنی بقا کا ضامن ہوگا۔ گزرے وقتوں کی ساری قدروں کے تمام صحیفے اٹھا کے گٹر میں ڈال دو... آج کا وقت اپنی ترجیحات کا خود تعین کرے گا۔ ہر ذی روح کا الگ اور پرسنل کوڈ آف کنڈکٹ ہوگا جس کی زندگی کسی اور کی نہیں اس کی ذاتی ملکیت سمجھی جانی چاہیے۔

سائرہ سخت الجھن میں تھی۔ وہ سب خاندانی اور معاشرتی روایات سے بغاوت تھی جو مائرہ کر رہی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ غلط نہیں کر رہی ہے۔ ہر شخص مستقبل کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچتا تو ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس سے فائدہ ہوگا یا نقصان۔ فیصلے خواہ

کاروباری ہوں یا سیاسی... کون دیتا ہے آنکھیں بند کر کے کسی کو اختیار کہ کوئی فیصلہ کرے... جبکہ وہ خود فیصلہ کر سکتا ہو اور بہتر انداز میں کر سکتا ہو۔ زیادہ حقیقی اور منطقی بنیادوں پر۔ اپنے مزاج، حالات اور توقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے۔

”مائرہ... گھر سے تم پیپر دینے جاؤ گی۔ تو وہ لباس جو تم نے بتایا تھا...؟“ اس نے اچانک پوچھ لیا۔

مائرہ نے گیم پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ”یار پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے تم نے... اس کا بندوبست ہے۔ ایک فرینڈ کے گھر جا کے لباس بدلوں گی۔ اب تم سو جاؤ نا... مجھے ڈسٹرب مت کرو۔“

”یہ گیم بہت ضروری ہے تمہارے لیے... اور خوف کوئی نہیں تمہیں کہ ابا تمہارے ہاتھ میں یہ پچاس ہزار کا موبائل فون دیکھ لیں گے۔ انہوں نے تو تمہیں دو ہزار کا دلایا تھا جو میرے پاس بھی ہے۔“

”تم رکھو اسے ابا کی نشانی سمجھ کے... اور میری فکر مت کرو۔“ اس نے ایک انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ناک کے بغیر اندر کوئی نہیں آ سکتا... کسی کو آنا بھی نہیں چاہیے۔“

”مائرہ!“ اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ ”یہ تم امی سے کیا کہتی رہتی ہو کہ بندوبست ہو جائے گا پیسوں کا۔“

مائرہ ہنس پڑی۔ ”ڈیئر سسٹر! اماں ایک بات کرتی ہیں اکثر... گڑ نہ دو گڑ جیسی بات تو کرو... یہ اسی فارمولے کے مطابق کہتی ہوں میں۔ وہ بے چاری ویسے ہی ڈپریشن میں ہیں۔ ابا کے اصولوں کا بوجھ ڈھونا کوئی آسان کام ہے۔“

”کل تو تم کہہ رہی تھیں کہ کچھ ہو گیا۔“

”اُفوہ... مت ڈسٹرب کرو بہنا... سو جاؤ اور میٹھے میٹھے سپنے دیکھو پیا گھر کے... میرا گھر میری جنت والا خواب چلے گا... آس توڑنے سے جھوٹا آسرا دینا بہرحال بہتر ہے۔ اوہ شٹ... پھر خراب کرا دیا یہ گیم بھی تم نے۔“

”مجھے لگتا ہے مائرہ... تم گیم کسی کے انتظار میں کھیل رہی ہو۔ وقت گزار رہی ہو۔“

مائرہ نے فون بند کر کے رکھ دیا اور ایک انگڑائی لی۔ ”بالکل ٹھیک اور اسی لیے نیند بھی نہیں آ رہی ہے مجھے... کیا گھر ہے ہمارا بھی... چائے ملے گی صبح شام... اس وقت جی چاہتا ہے کافی مل جائے گرم گرم... کیپو چینو... مگر ابا کہتے ہیں نا... چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ پتا ہوتا تو ایک انرجی ڈرنک چھپا کے رکھ دیتی فریج میں پیچھے کہیں۔“

ایس ایم ایس کے سگنل پر اس نے جھپٹ کر فون اٹھا لیا۔

لکھا تھا۔ ”کیا کر رہی ہو سویٹی؟“

”کیا کر سکتی ہوں سویٹ ہارٹ... تمہیں یاد کے سوا۔“ مائرہ نے لکھا۔

”میں نے تمہارے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔“ آیا۔

”سائیں مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ مائرہ نے لکھا

”امیدیں ہم نے بھی بہت باندھ رکھی ہیں تم سے“ مائرہ نے لکھا۔ ”سب پوری ہو جائیں گی وقت پر... اور وقت زیادہ دور نہیں ہے' اب سب کچھ ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”چلو چھوڑو ڈارلنگ... ان لڑکوں کو امپو کو پوسیبل بنانا آتا ہے... یہ بتاؤ... کل جوائن کر رہی

”سائیں... اپنے وعدے ایسے نہیں ہوتے۔“ نے لکھا۔

”آئی ول بی ڈیئر ٹو ریسیو یو... اور میں تمہیں ڈریس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنسی پھر اس نے لکھا۔ ”مجھے یاد ہے بابا... تم تو ٹین ایجر کی طرح شوخ ہو رہے ہو۔“

”کیا طعنہ دے رہی ہو عمر کا... دل کو دیکھو کتنا ہے۔“

”یہ تو دیکھ لیا ہے اچھی طرح... ورنہ تم جیسے کسی شادی شدہ آدمی کو میں گھاس ڈالتی جس کے بچے میری عمر کے ہوں۔ ایک بیوی اوپر اور دوسری گھر میں بیٹھی ہو۔“

”ایک دن تم میرے گھر میں دلہن بنی بیٹھی ہو گی۔ سوچتا ہوں تو اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا۔ کب آئے گا دن؟“

مائرہ نے لکھا۔ ”آ جائے گا وہ دن بھی... کل تو میں بیٹھوں گی تمہارے آفس میں۔“

”کیسا سج جائے گا میرا کنسٹرکشن بزنس کا آفس... میں نے اسے خاص طور پر تمہارے لیے ڈیکوریٹ کرایا ہے۔ تم دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔“ جواب آیا۔

”تم کہاں ہو اس وقت؟ میرا مطلب ہے... تمہاری بیوی... کیا وہ شک نہیں کرتی؟“

جواب آیا۔ ”بابا یہ بیویاں اور کرتی کیا ہیں شک کے سوا... ابھی سو گئی ہے لیکن اس کو لیپ ٹاپ کی سمجھ کدھر ہے۔ وہ سمجھتی ہے آفس کا ارجنٹ کام ہے۔ اور مجھے کدھر پروا ہے وہ کیا سوچتی ہے۔“

”کل ایسا ہی تم میرے بارے میں کہو گے... کسی اور ے جو میری جگہ ریسیپشن پر آئے گی۔“

”کیسی بات کرتی ہو... کون آ سکتا ہے تمہاری جگہ ڈارلنگ... اچھا ابھی گڈ نائٹ... مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”گڈ نائٹ سویٹ ہارٹ...“ مائرہ نے لکھا۔

سارے میسیج ڈیلیٹ کر کے اور موبائل فون آف کر کے اس نے لائٹ آف کی۔ سائرہ کب کی سو چکی تھی یا ایسا ظاہر ضرور کر رہی تھی۔ کیا وہ سب جانتی ہے؟ پور گرل... کاش اس نے بھی کوئی بولڈ اسٹیپ لیا ہوتا... اور میں نے بھی اس کی مدد کی ہوتی... جو خود اپنے لیے کچھ نہ کرے، تقدیر بھی اس کے لیے کیا کر سکتی ہے جو تدبیر نہ کرے۔ کال بیل کی آواز پر اس نے منہ لپیٹ کر سو جانا ہی بہتر سمجھا۔

☆☆☆

اردو پڑھانے والے پروفیسر ابراہیم کو اپنے پرانے معمول کے مطابق خبرنامے کے بعد رات کا کھانا کھانے اور کا غلبہ ہونے تک پسند کی کتاب پڑھنے کی عادت تھی۔ اس میں عموماً رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بج جاتے تھے۔ بعض اوقات کتاب ان کے ہاتھ سے گر جاتی تھی تو بیوی کتاب اٹھا کے بیڈ سائڈ لیمپ آف کرتی تھی۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ٹیبل لیمپ کو آف کر کے اس نے سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ لاؤنج میں لگی کال بیل بجی۔ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ کال بیل کی آواز رات کی خاموشی میں کچھ زیادہ ہی اونچی سنائی دی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل فون نکال کے وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔ وہ کچھ دیر منتظر رہی کہ ان کے بیٹوں میں سے کوئی اٹھ کے مین گیٹ تک جائے گا اور نصف شب کے اس غیر متوقع ملاقاتی سے بات کرے گا۔ بیٹیوں میں سے تو کسی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ بھائی کو جگا سکتی تھیں۔ چھوٹی والی عموماً بارہ بجے کے بعد بھی نوٹس تیار کرتی رہتی تھی۔ گو بڑی کا بیان یہ تھا کہ وہ سب کے سونے کا انتظار کرتی ہے اور پہلے ایس ایم ایس کی خاموش زبان میں ہونے والی گفتگو سرگوشی کی زیرِ لب گفتگو بن جاتی ہے۔ چھوٹی اس کی واضح تردید کرتی تھی اور سند کے طور پر باجی کے ایک پکڑے جانے والے محبت نامے کا حوالہ دیتی تھی۔ باجی کے الزام کو انتقامی کارروائی قرار دینا آسان تھا۔

گھنٹی پھر بجی۔ پروفیسر کی بیوی کو بے چینی سی محسوس ہوئی۔ آخر اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بڑی خالہ کئی ماہ سے چل چلاؤ کی کیفیت میں تھیں۔ پھوپی کے بائی پاس میں کچھ پیچیدگی کی رپورٹ تھی۔ شہر کے حالات مدت سے خراب چل رہے تھے۔ ہر جگہ ہر وقت ٹارگٹ کلنگ کے نام پر اپنے اپنے حساب برابر کیے جا رہے تھے۔ اخبار میں صرف اعداد و شمار ہوتے تھے۔ پولیس بھی ذاتی رنجش سے کاروباری رقابت تک ہر قتل پر ٹارگٹ کلنگ کا لیبل لگا کے تفتیش سے بچ جاتی تھی۔ قتل نامعلوم افراد نے کیا تو پوچھ گچھ کس سے کریں۔ نشانہ عموماً نوجوان بن رہے تھے۔ جوانی کے خون کی گرمی کے ساتھ سب کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار جو آ گئے تھے۔

اس نے پروفیسر کو ہلایا۔ ”سنتے ہو... کوئی آیا ہے باہر... گھنٹی بجی ہے دوبار۔“

پروفیسر نے غنودگی میں کہا۔ ”اکمل دیکھ لے گا یا احسن۔“

”میں کہتی ہوں... ان کا جانا ٹھیک نہیں... نوجوان ہیں۔“

پروفیسر نے وہ بات فوراً سمجھ لی جو بیوی نے کہی نہیں تھی۔ تکیے کے نیچے سے چشمہ نکال کے اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور چپل پہن کے جماہی لیتا باہر چلا گیا۔ ”کون ہے؟“ انہوں نے احسن سے پوچھا۔

احسن اس وقت تک دروازہ کھول کے دیکھ چکا تھا۔ ناگواری کے آثار اس کی صورت پر عیاں تھے۔ ”کون ہو سکتا ہے۔ وہی آپ کے نالائق شاگرد... وہی آتے ہیں وقت بے وقت غالب کا کوئی شعر سمجھنے... اب رات کو بھی چین نہیں۔“

”تم نے کیا کہا؟“

”میرے کچھ کہنے سے فائدہ؟ میں نے بٹھا دیا ہے ڈرائنگ روم میں۔“ اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کے احسن نے احتجاجی انداز میں دروازہ دھڑ سے مارا۔ اس نے بڑے بھائی اکمل کی بات کو جواب کے قابل نہیں سمجھا جس نے برہمی سے سوال کیا تھا کہ دماغ خراب ہے کیا؟ آدھی رات کو گہری نیند سے اٹھ کر کسی غالب کے سخن فہم کا استقبال کرنے والے کا دماغ تو خراب ہوگا۔

پروفیسر کی بیوی بھی اس وقت آنے والے طالبانِ علم کے اشتیاق اور جذبے سے سخت ناخوش تھی۔ وہ واش روم سے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے نکلے تو اس نے کہا۔ ”ہماری زندگی بھی عذاب کر رکھی ہے تمہارے ان شاگردوں نے۔“

”بھئی ایسا روز تو نہیں ہوتا نا۔“ پروفیسر نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

وہ بڑبڑاتی رہی۔ ”اتنا سر چڑھالیا ہے انہیں کہ سوچتے بھی نہیں۔ بس آگئے نیند حرام کرنے۔ اگر کوئی شعر نہیں سمجھ میں آرہا ہے تو ایسی کون سی قیامت آرہی تھی کہ آگئے آدھی رات کو... صبح تک کیا آسمان گر جاتا... اب یہ مت کہنا کہ چائے بنادو۔“

”بیگم! اچھا تھا تم بھی ثواب میں شریک ہوجاتیں... ہمارے لیے تو یہ عبادت ہے۔“

بیوی نے جل کے کہا۔ ”فرض، عبادت تو کرلیتے پہلے۔“

ڈرائنگ روم میں ایک ہی صوفے پر تین ایک ہی وضع قطع کے ٹین ایجر بڑی بے پروائی سے تقریباً نیم دراز تھے۔ پروفیسر کو دیکھ کر وہ اٹھے اور پھر بیٹھ گئے۔ ان کی عمریں سترہ اٹھارہ کے لگ بھگ تھیں۔ وہ گورے چٹے صحت مند اور خوش حالی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ ان کی ٹی شرٹس پر الٹی سیدھی عبارات تحریر تھیں اور انہوں نے امپورٹڈ جینز پہن رکھی تھیں۔ پروفیسر نے انہیں غور سے دیکھا مگر پہچاننے میں ناکام رہا۔ وہ اس کے شاگرد نہیں تھے۔

پروفیسر نے دائیں جانب بیٹھ کے کہا۔ ”کون ہو تم لوگ؟ میں نے پہچانا نہیں تمہیں۔“

نیلی ٹی شرٹ والے نے دونوں ہاتھ سینے پر سمیٹ کے کہا۔ ”میرا نام راحت علی خاں ہے۔“

دوسرے نے اس کی نقل بڑی متانت سے کی۔ ”میں حامد علی خاں ہوں۔“

تیسرا مسکراہٹ ضبط کر کے بولا۔ ”اور میں اسد امانت... سوری... شفقت۔“

پروفیسر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ظاہر ہے یہ ان کے اصل نام نہیں تھے۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟“

نیلی شرٹ والے نے کھنکھار کے کہا۔ ”پروفیسر! ظاہر ہے اس وقت ہمارا آنا مذاق کی بات نہیں۔ ہم آپ کے شاگرد کبھی نہیں رہے۔“

دوسرا بولا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کسی کا بھی اصل نام کیا ہے۔ آپ پوچھیں کہ کام کیا ہے۔“

پروفیسر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں ہرگز نہیں پوچھوں گا اور کوئی بات سنوں گا بھی نہیں... تم لوگ جاسکتے ہو۔“

ان میں سے کوئی ہلا بھی نہیں۔ انہوں نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نیلی ٹی شرٹ والے نے جو ان کے لیڈر کی طرح بی ہیو کررہا تھا، انگریزی میں کہا۔ ”ڈونٹ یو گیٹ ہاٹ اولڈ مین۔ دیکھو ہم کتنے کول ہیں۔“

دوسرے نے سر ہلایا۔ ”اور ہم آئے ہیں اس وی مین بزنس۔“

پروفیسر نے برہمی سے کہا۔ ”تم جاتے ہو یا میں بیٹوں سے کہوں وہ پولیس کو فون کریں۔“

تیسرے نے نفی میں سر ہلانا شروع کیا۔ ”نہیں... ہم ایسا کیوں چاہیں گے اور مجھے یقین ہے تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا پروفیسر...“ اس نے بڑے خیز انداز میں اپنی ران پر اس جگہ تھپکی دی جہاں ایک ابھار نظر آرہا تھا۔

اسی وقت دوسرے نے ایسے ہی اپنی پتلون کے کو واضح کیا۔ ”پلیز سٹ ڈاؤن اولڈ مین... مزید ٹائم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

تیسرے نے جو لیڈر تھا، ابہام دور کردیا۔ اس جینز کی ٹائٹ پاکٹ سے ایک جدید ریوالور نکال کے جیب میں شفٹ کیا۔ ”لیٹ اس ٹاک بزنس... ہم ایک منافع بخش آفر لائے ہیں لیکن ظاہر ہے اس میں فائدہ ہی ہے... اور نقصان ہمارا ہوگا تو تمہارا بھی ہوگا۔“

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ ”زیادہ ہوگا... پریشانی الگ۔“

اب تیسرے کی باری تھی۔ ”ٹو بی آنسٹ... لاس کوئی لاس نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ کے ہم ہر سگریٹ پھونک دیتے ہیں اور گفٹ دے دیتے ہیں۔“

”ہیل۔“ نیلی شرٹ والے نے کہا۔ ”وائی کانٹ کیپ یور بلڈی ماؤتھ شٹ۔“

پروفیسر نے خطرے کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ اب چپ چاپ صوفے پر بیٹھا مستقبل کے ان معماروں کو دیکھ رہا جس کے چرچے اس نے بہت سنے تھے مگر ان سے راست رابطے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

دروازے کی اوٹ سے پروفیسر کی بیوی نے کہا۔ ”چائے لے لو۔“

وہ میکانکی انداز میں اندر کھلنے والے دروازے تک گیا۔ اسے خیال ضرور آیا تھا کہ وہ چائے لے کر پلٹنے کے بجائے بھاگ کر سیدھا اکمل اور احسن کے کمرے میں گھس جائے۔ چلا کے بیوی سے کہے کہ وہ لڑکیوں کے بیڈ روم میں جا کے دروازے کو اندر سے بند کرلے۔ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اندر جا کے پولیس کو فون کرتا تو موبائل کے آنے سے پہلے وہ تینوں گینگسٹر بھاگ جاتے لیکن وہ

آتے۔ زیادہ تیاری کے ساتھ اور پھر اتنی شرافت بھی نہ دکھاتے۔ پولیس ان کا خاک سراغ لگاتی جبکہ پروفیسر نہ ان کا نام پتا بتاتا اور نہ یہ کہ وہ کس کالج کے تھے اور کیا چاہتے تھے۔

چنانچہ بیوی نے پوچھا۔ ”کون ہیں؟“

اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”شاگرد ہیں میرے۔“ اور چائے کی ٹرے لے کر واپس ہوگیا۔ اب شک و شبے کی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ پروفیسر زیادہ پُرسکون رہ کے اس خطرناک صورتِ حال سے نمٹنا چاہتا تھا۔

”چائے پیو... اور آرام سے بتاؤ کہ لالچ اور دھمکی کے حربے آزما کے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”دیٹ از بیٹر۔“ سرغنہ نے چائے کا کپ اٹھالیا۔

دوسرے نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”میں چائے نہیں پیتا... کافی مل سکتی ہے؟“

تیسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ ”یا کوئی انرجی ڈرنک۔“

”ڈونٹ بی روڈ... پروفیسر بہت نائس اور... وہ ہے... مہمان نواز۔“ گینگ لیڈر اپنے ساتھیوں پر غرایا۔ انہوں نے کپ اٹھالیے۔

”ہمارا تعلق مختلف کالجوں سے ہے لیکن ہم فرینڈز ہیں... اسکول میں ساتھ تھے۔ وہ کلفٹن کا سب سے مہنگا اور مشہور اسکول ہے۔ ہم سب نے اولیول کیا۔ وہاں میٹرک کوئی نہیں کرتا۔ اس سے پہلے ہم مختلف انگلش میڈیم اسکولوں میں تھے۔ پری نرسری اور پلے گروپ سے اولیول تک اردو کسی نے بھی نہیں پڑھی۔ میرا مطلب ہے سیریس لی... اسکول میں بھی اردو بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ فائن ہوجاتا تھا۔ گھر میں پیرنٹس بھی انگلش میں بات کرنے پر انکریج کرتے تھے۔ پرابلم کوئی نہیں تھی۔ ہم نے تین چار اور پانچ اے گریڈ لیے اولیول میں لیکن اردو میں نہیں۔“ اس نے چائے حلق میں انڈیل کر کپ ٹرے میں رکھ دیا۔

”میں سمجھ گیا۔ تم لوگ اردو کی خصوصی ٹیوشن چاہتے ہو۔“ پروفیسر بولا۔

وہ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ نیلی شرٹ والے نے کہا۔ ”نہیں گرینڈ پا... تم نہیں سمجھے۔ کیا ضرورت ہے ہمیں اردو پڑھنے کی۔ اور سچ پوچھو کے ضرورت ہے مگر اس ملک میں جو لوگ حکومت میں بیٹھے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ انٹرنیشنل اور کمپیوٹر ایج میں اردو کی حیثیت ایک ڈیڈ لینگویج کی ہے۔ انگلش اینڈ آنلی انگلش میں ہے فیوچر... ہم پر زبردستی اردو کا عذاب ڈال رکھا ہے کہ پڑھو... کون کون ہیں وہ... غالب اور اقبال... اور پریم چند... سرسید... پتا نہیں کیا لکھتے تھے اور کیوں... مجال ہے جو غالب کی اردو کا ایک لفظ سمجھ میں آجائے... کون ایڈیٹ کہے گا اسے اردو... فارسی ہے سب... اگر تم بُرا نہ مانو تو میں... بڑی ٹینشن ہورہی ہے۔“ اس نے جیب سے سگریٹ کا ایک مسلا ہوا پیکٹ نکالا۔

پروفیسر کا پارا چڑھ گیا۔ ”سگریٹ پیو گے؟ میرے سامنے... میرے گھر میں...؟“

مگر اس وقت تک باقی دو بھی اس پیکٹ میں سے ایک ایک سگریٹ نکال چکے تھے۔ ”شور کرنے کا فائدہ؟“ دوسرے نے لائٹر سے سب کے سگریٹ جلائے۔

”اینڈ واٹ اے سلی نوشن... رسپیکٹ دل سے ہوتی ہے یا سگریٹ سے... پھر تو چائے کوک کچھ نہیں پینا چاہیے بزرگوں کے سامنے۔“

”سوری ڈیڈ۔“ ان کے سرغنہ نے دو لمبے لمبے کش لے کر دھواں اوپر پھیلایا۔ ”میں ان دونوں باسٹرڈ کی بات سے ایگری کرنے پر مجبور ہوں۔ ہم دل سے تمہاری بہت رسپیکٹ کرتے ہیں... فارگیٹ دس... اگر یہ بدتمیزی ہے تمہارے نزدیک۔“ اس نے سگریٹ اٹھا کے کہا۔ ”اگر تمہیں بلڈ پریشر ہے تو غصہ مت کرو۔“

پروفیسر نے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کے ایک گھونٹ پیا۔ ”دیکھو... یہ میرے آرام کا وقت ہے۔“

”اوکے... اوکے... آئی ایم سوری... میں مطلب کی بات کرتا ہوں۔ ہم سب نے بورڈ سے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہم اردو نہیں جانتے اور اردو لازمی ہے۔ دو سال ٹیوشن پڑھنے کے باوجود ہم اردو نہیں سیکھ سکے۔ جو فرسٹ ایئر میں ہوا تھا اس سال پھر ہوگا۔ دونوں پرچے دینے پڑے تھے مگر ہمیں معلوم ہے ہم کیا لکھ کر آئے تھے۔“

پروفیسر کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“

نیلی ٹی شرٹ والا کچھ دیر انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ”ہمارے اردو کے پرچے مارکنگ کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔“

پروفیسر کو جیسے الیکٹرک شاک لگا۔ ”تم... تم کیسے جانتے ہو... کس نے بتایا تمہیں؟“

”چھوڑو یہ سب... ہمیں معلوم ہے... ہم نے معلوم کرلیا ہے... اینڈ دی ڈیل از ویری اوپن۔“ اس نے ٹیبل

پر رکھے ہوئے چھوٹے سے چرمی بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں تین لاکھ روپے ہیں۔ ایک ایک لاکھ ہم سب کے۔“

پروفیسر کا سارا خون اس کے چہرے اور سر میں جمع ہو گیا۔ ”تم چاہتے ہو کہ میں یہ تین لاکھ لے کر تم تینوں کو اردو میں پاس کر دوں؟“ وہ چلّایا۔ اتنی اونچی آواز میں کہ اسے کھانسی آ گئی۔

ان تینوں کے سرغنہ نیلی شرٹ والے نے اسے گلاس میں پانی ڈال کے پیش کیا۔ ”اتنا اونچا مت شاؤٹ کرو ڈیڈ... اور ایسے سوال مت کرو جن کا جواب تم جانتے ہو... جیسا کہ میں نے کہا تھا دس ڈیل از ویری اوپن... تم انکار نہیں کر سکتے کیونکہ آج تک کسی اور نے ایک پیپر میں مارکس لینے کی یہ قیمت ادا نہیں کی... دس ہزار کافی ہوتے ہیں۔“

”لیکن سنا تھا کہ تم بے وقوفی کی حد تک اصول پسند ہو۔“ دوسرا بولا۔ ”اور انانیت پرست۔“

تیسرا ہنسا۔ ”بڑے مشکل لفظ بولے تُو نے... اردو کے پروفیسر کو پسند آئیں گے۔“

”میرا مطلب تھا... ضدی اور ہٹ دھرم... معاف کرنا میرا مقصد تمہیں بے عزت کرنا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن ایسے لوگ آج کل بے وقوف کہلاتے ہیں جو اصولوں کی خاطر سب قربان کر دیتے ہیں... مالی فائدہ... مستقبل کی خوش حالی اور...“

پروفیسر نے پانی کا گلاس کھینچ کر مارا۔ ”شٹ اپ... اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ۔ لے جاؤ یہ کاغذی نوٹ۔“

اس کے ٹارگٹ نے پُرسکون رہتے ہوئے تھوڑا سا سر کو دائیں جانب جھکایا۔ گلاس اڑتا ہوا سیدھا جا کے اس کے پیچھے کی دیوار سے ٹکرایا اور کرچی کرچی ہو کے نیچے بکھر گیا۔

”اولڈ پاپ... ہم ایسے جانے کے لیے نہیں آئے تھے... یہ سب ہمارے لیے متوقع تھا... لے جانے کو ہم کیا نہیں لے جا سکتے۔“

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا۔ ”مثلاً وہ سب امتحانی کاپیاں جو تمہارے گھر میں موجود ہیں لیکن ابھی تک تم نے ان پر مارکس نہیں دیے۔ وہ کل ہی تو بورڈ آفس سے موصول ہوئی تھیں۔“

”شٹ اپ اینڈ لیٹ می ٹاک۔“ سرغنہ نے اپنے ساتھی کو سرزنش کی لیکن یہ سب اسکرپٹ میں شامل تھا کیونکہ ناراضی ظاہر کرتے وقت اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی اور پروفیسر نے اسے آنکھ مارتا بھی دیکھ لیا تھا۔

”اس کے بعد آپ کیا کرو گے؟ پولیس کو فون کرو اور رپورٹ لکھواؤ گے... چوری یا ڈکیتی کی... لیکن کس خلاف... نامعلوم افراد کے خلاف؟“ اس نے قہقہہ لگا

”جیسے پولیس ہر ذاتی قتل پر ٹارگٹ کلنگ کا لیبل لگا کے کیس فائل کر دیتی ہے، یہ بھی ہو جائے گا لیکن فائدہ پھر ہمیں ہی گا۔ یا تو بورڈ خاموشی سے اردو کے نمبر لگا دے گا۔ ان کے باپ کے خزانے میں تو کمی نہیں آتی... وہ ایوریج نمبر دیکھ کے فیصلہ کر سکتے ہیں... میڈیا میں کوئی ایک سطر کی خبر نہ آئے... یہ بھی ہو سکتا ہے اور آ گئی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ کہ خصوصی امتحان کا اعلان ہو جائے گا ان سب کے لیے جن کی کاپیاں تمہاری غفلت اور نااہلی کے سبب چوری ہو گئیں یا کرائی گئیں... بس... اس معاملے کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے بعد تم نے یہ ڈراما کیا۔ ہر طالب علم سے جس کی کاپی مارک ہونے آئی تھی، تم نے سودا کر لیا۔ تم جانتے ہو کہ وہ سب ایک ہی اسکول کی مختلف برانچوں کے امیدوار تھے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”بوائے... ہو سکتا ہے اولڈ مین نہ جانتا ہو... یہ انتظام تو ہمارے پرنسپل نے اپنے کونٹیکٹس سے کیا تھا۔“

”یہ کتنا بڑا رسک ہے اور نقصان... ہم خصوصی پرچہ خصوصی انتظامات کے مطابق دیں گے۔ ہماری مرضی کی جگہ... ہماری مرضی کے نگراں... جوابات لکھنے لکھوانے کی ہر سہولت... سوال ہمیں پہلے سے معلوم ہوں گے۔“

تیسرا بولا۔ ”یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ ہمیں امتحانی کاپیاں گھر پر فراہم کر دی جائیں اور ہم جوابات لکھ کے لے جائیں۔ کچھ دیر امتحانی مرکز پر بیٹھ کے گپ شپ کریں اور کاپیاں دے کر واپس آ جائیں۔“

دوسرا بولا۔ ”کٹ اٹ شارٹ نیس... کاش ہم پہلے ہی سب کر لیتے۔“

پروفیسر کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن ابھی تک اسے ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا۔ چرمی بیگ جس میں تین لاکھ کے نوٹ تھے، اس کے سامنے تھا۔ قصور اس کی اپنی نظر کا تھا جو اسے حرام... ناجائز... ناپاک دیکھ رہی تھی۔ ایسا کسی نوٹ پر لکھا ہوا نہیں تھا اور نہ دنیا کے بازار میں کوئی انہیں جعلی نوٹوں کی طرح الگ کر سکتا تھا۔

اس مرحلے پر جب پروفیسر صاحب مستعفی ہونے سے مرجانے تک کے سارے آپشن دیکھ رہے تھے۔ اس ایک ایکٹ کے فل آف ہارر اینڈ سسپنس ڈرامے نے ایک ٹرن لیا جب ان کی بیگم نے اسٹیج پر قدم رکھا۔ سب کی حیران نظروں کے سامنے اس نے درمیانی میز پر رکھا ہوا چرمی بیگ اٹھایا اور پلٹ کے آواز دی۔ ”احسن۔“

احسن فوراً سے بھی پہلے اندر آ گیا۔ جیسے وہ تیار تھا کہ اب اسے انٹری دینی ہے۔ ”جی امی؟“

”یہ بیگ اندر لے جاؤ اور سائرہ کو دے دو۔ اپنی الماری میں لاک کر کے رکھے۔“

”جی امی۔“ احسن نے ایک فرماں بردار سعادت مند بچے کی طرح کہا۔

پروفیسر چلّایا۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو... احسن...“

بیگم ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”تم چپ کرو جی... مجھے بات کرنے دو... تم جاؤ احسن۔“

”میں اپنی نظروں کے سامنے ایسا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ پروفیسر پھر چلّایا۔

”تو پھر جاؤ اندر... مجھے بات کرنے دو۔“ بیوی نے کہا۔ ”ہاں بیٹا! کسی کاغذ کے پرزے پر اپنا نام اور رول نمبر لکھ کر مجھے دے دو... لکھنے کے لیے کچھ ہے۔“

”یس میم... لیکن... کیا آپ یہ کام کرا دیں گی؟“ تینوں کے لیڈر نے کہا۔ ”آپ کو یقین ہے؟“

”بے وقوفی کی باتیں کیوں کرتے ہو... یقین نہ ہوتا تو میں معاملات طے کرانے نہ آتی۔ میں سب سن رہی تھی۔ بالکل مطمئن رہو... تم سب پاس ہو جاؤ گے۔“

”گارنٹی؟“ دوسرا بے یقینی سے بولا۔

”گارنٹی کے بچے... اب کیا حلف اٹھوائے گا مجھ سے... تیری ماں سے بھی بڑی ہوں میں۔“ بیوی نے گارنٹی مانگنے والے کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی اسے گھورا۔ ”شیم آن یو مین۔“

پروفیسر کسی فالج زدہ شخص کی طرح اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتا رہا۔ یہ اس کے اپنے تھے جو دشمن سے مل گئے تھے۔ ففتھ کالم... میر جعفر اور صادق جیسے غدار جن کے بارے میں شاعرِ مشرق نے کیا خوب فرمایا تھا۔ ننگ دنیا ننگ دیں ننگ وطن... پھر کسی نے اس کو بدل کے گاندھی کے بارے میں لکھ دیا۔ ننگے پاؤں ننگے سر ننگے بدن... شاید ان کے دماغ پر اثر ہوا تھا کہ پروفیسر کے دماغ میں الٹے سیدھے خیالات آ رہے تھے۔ اس نے تینوں نوجوانوں کو اٹھ کر جانے سے پہلے بڑے مضحکہ خیز انداز میں سیلیوٹ کرتا دیکھا۔ وہ فتح مند واپس جا رہے تھے۔

یکلخت پروفیسر جیسے ہوش میں آ گیا۔ ”یہ کیا غضب کیا تم نے بیگم؟“ وہ چلّایا۔

”چلّاؤ مت... میں نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم ایک باپ کی طرح سوچتے تو مجھے کیوں آگے آنا پڑتا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ پروفیسر دہاڑا۔ ”میں اچھا باپ نہیں ہوں؟“

”نہیں... کیونکہ اپنے اصول تمہیں ہم سے زیادہ عزیز رہے... اپنی اولاد کو تم اپنے اصولوں پر قربان کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہو۔ ان کی زندگی کو داؤ پر لگا رکھا ہے تم نے... کوئی مرے یا جیے... کسی کی زندگی تباہ ہو جائے... تمہیں اپنے اصول ہم سب سے پیارے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے... بہتان ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے کہ تم نے اکمل کو نقل سے روکا، نقل کرانے والے تیار تھے۔ ایک پیسا نہیں مانگ رہے تھے تم سے... بدلے میں صرف یہ چاہتے تھے کہ تم ان کے کسی بچے کی مدد کر دو۔ مگر تم نے انکار کیا۔ کیا ملا تمہیں؟ اکمل کا مستقبل تو تباہ ہو گیا۔ نقل کرنے والوں کو نمبر مل گئے اور وہ پہنچ گئے میڈیکل کالج میں... اکمل کا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا نہیں ہوا۔ جانتے بھی ہو کہ داخلوں کا سارا نظام نمبروں پر چلتا ہے۔ کون دیکھتا ہے کہ نمبر کس نے کیسے لیے تھے۔ اب بی ایس سی کر کے وہ ایک اسکول ٹیچر ہے تو تمہاری وجہ سے۔“

پروفیسر نے صدمے سے سر جھکا لیا۔ ”میں اپنے ضمیر کے خلاف کیسے جاتا... میں مجبور تھا۔“

”اور آج بھی ہو۔“ بیوی نے تلخ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”سائرہ کے لیے کیا ہے تمہارے پاس؟ تین مہینے رہ گئے ہیں اس کی شادی میں اور تیاری کیا ہے؟ خاک... وہی جوڑے ہیں جو میں تنخواہ میں سے پیسا پیسا بچا کر بناتی رہی تھی لیکن پروفیسر ابراہیم کی بیٹی کیا لے کر جائے گی سسرال؟“

”عورت کا اصل زیور اس کی تعلیم اور تربیت ہے۔“

”تم بولے جاؤ وہی بہشتی زیور کے ڈائیلاگ... اپنی عزت کا جھنڈا اٹھائے کھڑے رہو... دنیا میں عزت کا پیمانہ یہ نہیں رہا... لڑکی کو سسرال میں عزت ملتی ہے اس کے جہیز سے... خالی ہاتھ جائے تو ساری عمر صرف طعنے ملتے ہیں... شادی کے مہمانوں کو کہاں بلاؤ گے؟ کیا گلی میں ٹینٹ لگاؤ گے اور آلو گوشت کے ساتھ تنور کی روٹیاں رکھو گے سامنے... اس

کے لیے بھی لاکھ چاہئیں... اور جہیز میں کیا ایک بیڈ سیٹ، ٹی وی، فریج بھی نہیں ہوں گے۔"

"تم سب جانتے ہو کہ میں نے اپنی تنخواہ میں سے ایک پیسا اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ چائے، سگریٹ، پان... دوست احباب... کسی پر نہیں اڑایا۔"

"مگر تنخواہ تھی ہی کتنی... اس کے علاوہ جو آیا تو تمہارے اصول آڑے آتے رہے۔ دیکھ نہیں رہے زمانے کے تیور؟ انکار کا نتیجہ ابھی سامنے آجاتا۔ وہ صرف پیپر ہی نہیں... اٹھا کے لے جاتے مائرہ کو بھی تو کیا کر لیتے تم... اپنے اصولوں کی توپ چلا کے سب کو مار گراتے۔ شکر کرو وہ تین لاکھ دے کر گئے... کچھ لے کر نہیں گئے ورنہ یہ عزت بھی دو کوڑی کی ہوجاتی۔ بیٹی کو واپس لانے کے لیے نمبر تو دینا پڑتے... اور بیٹی کیا جیسی گئی تھی ویسی واپس آجاتی؟"

پروفیسر چیخا۔ "بند کرو اپنی بکواس خدا کے لیے... تم جانتی ہو میں یہ سب نہیں کرسکتا۔"

"نہ کرو... مگر میں نے تین لاکھ رکھے ہیں سائرہ کو رخصت کرنے کے لیے... میں کفرانِ نعمت نہیں کرسکتی۔ گھر آئی لکشمی کو لوٹا نہیں سکتی۔" بیوی نے دیوار گیر گھڑی سے صبح کے تین گھنٹے بجنے کی آواز سنی اور کھڑی ہوگئی۔

"ایک بات اچھی طرح سمجھ لو بیگم... نمبر میں نہیں دوں گا۔ جو ہو سو ہو... بعد میں تم بھگتو یا تمہاری بیٹی۔"

بیوی عیاری سے مسکرائی۔ "تم سیر ہونا پروفیسر تو میں سوا سیر ہوگئی ہوں کیونکہ تم نے بچے صرف پیدا کیے ہیں... پالا میں نے ہے اور وہ میری ذمے داری ہیں... نمبر تو میں احسن سے لگوا دوں گی... وہ بھی سب سن رہا تھا۔ اب تک اس نے امتحانی کاپیاں اپنے قبضے میں کرلی ہیں... یہ تین رول نمبر ہیں۔ کل ان کی مارکنگ کردے گا۔ انکار تم کیسے کرو گے؟ اس کی اور تمہاری ہینڈ رائٹنگ ایک ہے۔ امتحانی کاپیوں پر تمہارے دستخط بھی کرلے گا۔" وہ فاتحانہ انداز میں ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

پروفیسر نے اٹھنا چاہا مگر اس کی ٹانگوں نے بھی بغاوت کردی۔ اس نے صوفے کے بازو پر اپنے بازو رکھ کے زور لگانے کی کوشش کی پھر اس نے چلانا چاہا... لیکن وہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

جون کا مہینا تھا اور کراچی کے ساحلی شہر کو سمندر کی طرف آنے والی مرطوب ہوائیں مل رہی تھی جو موسم کو معتدل رکھتی تھی۔ الٹی ہوا چلتی تھی تو ڈیڑھ کروڑ کی آبادی بلبلا اٹھتی تھی۔ سڑک پر تارکول نرم پڑ گیا تھا اور دھوپ میں سا سراب نظر آتا تھا۔ رکشا میں بھی پروفیسر ابراہیم کے دماغ ک کے تھپیڑے سرسامی کیفیت میں مبتلا کررہے تھے۔ مجبو ایک بار پھر اسے اے جی آفس لے آئی تھی جہاں اس ک پنشن کا کیس گزشتہ کئی ماہ سے التوا میں تھا۔

پچاس روپے میں چپراسی سے اجازت نامہ حاصل کر کے وہ اکاؤنٹس آفیسر کے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے ان کرسیوں کے پیچھے کھڑا ہوگیا جو اس کی بلیئرڈ ٹیبل جیسی میز کے گرد لگی ہوئی تھیں۔ ان پر چیئرمین لٹھے کے کلف لگے دھوپ سے اجلے سفید گھیردار شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹوں میں ارکانِ اسمبلی، ٹھیکے دار اور سیکریٹریٹ کے عہدے دار تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے چائے کے کپ تھے اور خالی پلیٹوں میں سموسوں کی باقیات... یہ ترقیاتی منصوبوں... سرکاری ٹھیکوں اور خصوصی فنڈز پر اٹھنے والے اخراجات کے بل پاس کرانے والے لوگ تھے۔

حسن عسکری اکاؤنٹس آفیسر نے ناگواری اور فرعونیت کے جذبات سے بھری نگاہ پروفیسر ابراہیم پر ڈالی۔ "تم پھر آگئے؟"

"کیا کروں جنابِ والا... اب چھ مہینے ہوگئے ہیں مجھے چکر لگاتے۔"

"اوہو بھئی وقت تو لگے گا نا تمہاری پوری سروس کا ریکارڈ ویری فائی کرنے میں۔"

ابراہیم نے لجاجت سے کہا۔ "تمام کاغذات تو محکمۂ تعلیم نے میری ریٹائرمنٹ سے چھ مہینے پہلے ہی بھیج دیے تھے۔"

"اچھا اچھا... یہ سب پہلے بھی سن چکا ہوں میں۔ اوپر جا کے جی فائیو سے معلوم کرو۔" عسکری صاحب نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ کہتے ہیں کہ بل آپ کی ٹیبل پر ہے... چیک کے ساتھ۔"

عسکری صاحب نے معذرت طلب نظروں سے معزز مہمانوں کو دیکھا اور ایک سرکاری افسر کی جبری خوش اخلاقی سے کام لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "اچھا... ابھی میں مصروف ہوں... دو گھنٹے بعد آنا۔"

احسن کی آنکھیں اس فرعون صفت افسر پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ وہ پروفیسر ابراہیم کو بڑی بد اخلاقی سے ٹال رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ "عسکری صاحب! یہاں کوئی ویٹنگ روم ہے؟"

"کیا مطلب؟ یہ سرکاری دفتر ہے۔"

"پھر آپ بتائیں کہ دو گھنٹے یہ بوڑھا آدمی کہاں گزارے... سڑکوں پر مارا مارا پھرے... آپ کو معلوم ہے اس وقت باہر کا درجۂ حرارت کیا ہے؟"

"بدتمیزی مت کرو۔"

احسن بھڑک اٹھا۔ "بدتمیزی میں کررہا ہوں یا آپ کررہے ہیں؟ آپ گریڈ سترہ کے افسر ہیں نا اور یہ جو آپ کے سامنے کھڑا پنشن کی بھیک مانگ رہا ہے، یہ گریڈ انیس میں ریٹائر ہوا تھا۔ یہ آپ کے بچوں کا روحانی باپ ہے۔ انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے جسے آپ نے کھڑا کر رکھا ہے۔ کس لیے ملی ہیں آپ کو یہ کرسیاں آخر؟ صرف ٹھیکے داروں اور اپنے مہمانوں کو بٹھانے کے لیے... اس پر ایک ریٹائرڈ استاد کیوں نہیں بیٹھ سکتا آخر... اسے آپ بھی کلاس میں کھڑے ہوکے ریسیو کرتے تھے۔"

"شٹ اپ۔" عسکری صاحب نے گھنٹی بجائی اور چپراسی سے کہا۔ "نکال دو ان دونوں کو باہر... سرکاری دفتر میں آکے بدمعاشی کرتے ہو... کون ہو تم آخر؟"

پروفیسر نے کانپتے ہوئے احسن کو کھینچا۔ "خدا کے لیے چپ ہوجاؤ۔"

"معلوم ہوجائے گا آپ کو کہ میں کون ہوں، پروفیسر ابراہیم کا بیٹا ہونے کے علاوہ..." احسن نے جاتے جاتے کہا۔

"احسن! اب مجھے اور کئی مہینے دھکے کھانے پڑیں گے۔ اس لیے آئے تھے تم میرے ساتھ؟" پروفیسر ابراہیم نے خفگی سے کہا۔

میز کے گرد بیٹھے ہوئے کسی ایم پی اے یا ٹھیکے دار نے کہا۔ "تیور بتاتے ہیں کہ میڈیا کا بندہ ہے۔"

"بڑا سر چڑھا لیا ہے انہیں بھی حکومت نے... سارے بلیک میلرز ہیں۔" عسکری صاحب نے کہا۔ "استاد کی عزت ہم بھی کرتے ہیں مگر کیا کریں، قواعد وضوابط سے مجبور ہیں۔"

باہر آکے احسن کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا نہیں باپ کا نقصان کیا تھا۔ پنشن کی رقم سے گھر میں مفلسی اور تنگ دستی ختم ہوجاتی۔ گریجویٹی اور پراویڈنٹ پروفیسر کی بتیس سالہ دورِ ملازمت کا جمع شدہ سرمایہ تھے اور یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس سے فیڈرل بی ایریا میں ایک سو بیس گز کا اپنا گھر بھی خریدا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد ہر ماہ کرائے کی مد میں جانے والی دس ہزار کی رقم بچتی اور زندگی بہت آسان ہوجاتی۔ اب نہ جانے اکاؤنٹ اور آڈٹ والے اس پر مزید کتنے اعتراضات دائر کریں گے... ان سے کتنے چکر لگوائیں گے۔

پروفیسر ابراہیم نے کمرے سے باہر آکے کہا۔ "اب آئندہ سے میں اکیلا ہی آجاؤں گا۔"

"حوصلہ مت ہاریں ابا... دو گھنٹے بعد دیکھتے ہیں۔ آپ آئیں ذرا اوپر والوں سے بھی بات کرلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دال ایسے نہیں گلے گی۔" احسن نے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں احسن... اوپر سب گدھ بیٹھے ہیں منہ کھولے... مردار خور۔"

"ان کو گوشت ڈالنا پڑے گا نا... اس کا بھی پتا چل جائے گا... آپ کچھ مت بولنا... میں بات کروں گا۔"

پروفیسر ابراہیم کو دہری مجبوری تھی۔ ایک امید کہ شاید احسن وہ راستہ نکال لے جس سے آسانی پیدا ہوتی ہے۔ ان کو تو رشوت دینا ہی نہیں آتی تھی۔ دوسری مجبوری ضرورت مندی کی تھی جس کے لیے وہ قرض بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔ وہ ہمت کر کے دو سیڑھیاں چڑھے اور ایک چپراسی کی بینچ پر اجازت لے کر بیٹھ گئے۔

سودے کی بات چپراسی نے خود ہی شروع کی۔ "کیا مسئلہ ہے جی... پریشان نظر آتے ہیں بزرگوار۔"

احسن نے دوٹوک کہا۔ "چھ مہینے ہوگئے پنشن کے لیے دھکے کھاتے پروفیسر صاحب کو... تم کچھ مدد کرسکتے ہو؟"

چپراسی کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ "مدد کرنے والا ویسے تو اللہ ہی ہے۔ یہاں کا دستور کچھ اور ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ تم ہماری مدد کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے... کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا ہوں۔ راستہ تم بتاؤ۔ مدد کون کرے گا ہماری... جس کی ہم مدد کریں... اور مدد کیا ہوگی؟"

"سب کچھ ہے اکاؤنٹنٹ صاحب کے ہاتھ میں... لیکن بات کرے گا ان کا ماتحت کلرک... آپ چل کے بیٹھو کینٹین میں... اسے بھیجتا ہوں۔ تم عقل مند آدمی ہو کہ وقت ضائع نہیں کیا۔ صاف بات اچھی ہوتی ہے۔ اپنا فائدہ دیکھو تو دوسرے کا بھی دیکھو۔"

ایک پُرشور، غلیظ میزوں اور شکستہ کناروں والے گھٹیا کپ کی دودھ پتی والے کینٹین میں بیٹھنا بھی صبر آزما کام تھا۔ ان کے سر پر پنکھا بھی بادل ناخواستہ گھوم رہا تھا جیسے منتظر ہو کہ اسے بھی کچھ ملے تو تیز چلے اور ہوا دے۔ کھچڑی بالوں والا کلرک بے تکلفی سے ان کے سامنے آبیٹھا اور وہ سوال

دہرانے لگا جو بنیادی تھے۔ پنشن کتنی ہے، کیس کہاں اٹکا ہوا ہے، آبجکشن کیا ہے، پراویڈنٹ فنڈ کتنا ہے... سارے جوابات سن کے اس نے چائے کے کپ کو حلق میں انڈیلا اور اپنا معاوضہ بتا دیا۔

پروفیسر ابراہیم نے خفگی سے کہا۔ ”صوفی صاحب! یہ میری حق حلال کی کمائی ہے۔ کسی ٹھیکے کا بل نہیں ہے۔“

”بل کوئی بھی ہو، ادائیگی پرسنٹیج پر ہوتی ہے۔ آج بل دو... اسی ہفتے ادائیگی کا ریٹ کچھ اور ہے، اسی مہینے کا کم ہے... ویسے آپ کی مرضی چکر لگاتے رہو۔“

احسن نے کہا۔ ”کچھ رعایت کرو صوفی صاحب۔“

”دیکھو بیٹا! مہنگائی سے سب پس رہے ہیں۔ ہم کون سے افسر ہیں۔ تمہارے ابا تو تھے گریڈ انیس میں... ہم گریڈ سات کے لوگ تنخواہ میں روٹی بھی نہیں کھا سکتے۔ حرام حلال کیا دیکھیں۔“

”اوکے... اوکے... ادائیگی پہلے ہو گی؟“

صوفی نے اسے یوں دیکھا جیسے اس احمقانہ سوال کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ”ظاہر ہے، بعد میں کون پکڑائی دیتا ہے۔ چیک ہاتھ میں آیا تو بندہ گیا۔“

”ہم کل پے منٹ کر دیں تو چیک کب مل جائے گا... جی فائیو سے کلیئر ہو گیا ہے۔“

”اچھا، تم معلوم کر چکے ہو پہلے ہی... ایسا ہے تو... دو دن... آج بدھ ہے جمعے کو ملنا۔ رجسٹر میرے ساتھ ہو گا۔ دستخط کرواور چیک لے جاؤ۔“

پروفیسر ابراہیم نیچے اترے تو جیسے خود اپنی نظر سے گر چکے تھے۔ عمر کے اس آخری دور میں انہیں وہ سب کرنا پڑ رہا تھا جو غلط، ناجائز، غیر قانونی، غیر اخلاقی اور حرام سب کچھ تھا مگر دنیا ایسے ہی چل رہی تھی۔ مولانا حالی فرما چکے تھے کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ انگریز بہت پہلے فارمولا بتا گئے تھے کہ روم میں ویسا ہی کرو جیسا رومن کرتے ہیں۔ احسن کے ساتھ رکشے میں واپسی کا سفر ایک اور کڑوا گھونٹ تھا۔ زندگی زہر ہلاہل ہے تو پینا ہے مجھے... اردو کے پروفیسر کو ایسے ہی برمحل اشعار یاد آ کے مزید پریشان کرتے تھے۔

رکشا چلتے چلتے رکا اور ڈرائیور نے اپنی سیٹ پلٹ کے انجن کا پلگ صاف کرنا شروع کیا۔ وہ شاہراہ فیصل کی بلند و بالا عمارات کو دیکھتے رہے جن میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ جہاں لوگ ایک خواب ناک ماحول میں ملازمت کرتے تھے۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے، خوب صورت فرنیچر اور اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں جو آس پاس رنگ و نور بکھیرتی اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ ان کے خوش رنگ جلوہ تما... اور اندازِ محبوبی... چائے، کافی ہر وقت دستیاب... کو... ڈرنکس حاضر... کام ایسے ماحول میں تفریح... دل دفتر میں کیوں نہ لگے۔

رکشا اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور دھوپ میں پسینا پسینا ہو جانے والا ڈرائیور حوصلہ ہار رہا تھا۔ پھر اس نے اعترافِ شکست کر لیا۔ ”آپ کوئی دوسرا رکشا لے لیں جی۔“ وہ ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رکشا والے کو کچھ کہنے سننے کا فائدہ نہیں تھا۔ مشین کوئی بھی ہو، نوٹس دیے بغیر خراب ہوتی ہے اور نقصان تو اسی کا تھا کیونکہ جتنا فاصلہ طے کیا تھا، اس کا کچھ نہیں ملا۔ احسن نے دوسرا رکشا روک کے پروفیسر ابراہیم کو بٹھا دیا۔ ”آپ چلیں، میں آتا ہوں۔“

”تمہیں کیا کام پڑ گیا اچانک؟“ پروفیسر نے کہا۔

”بتاؤں گا آ کے۔“ احسن نے دائیں طرف دیکھا اور سڑک پار کر کے درمیانی جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی نظر نے جو دیکھا تھا، وہ پروفیسر نے نہیں دیکھا تھا ورنہ قیامت ہو جاتی۔ خود احسن کو بڑی مشکل سے یقین آیا تھا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا نہیں ہے۔ سڑک پار کر کے وہ کاروں اور موٹر سائیکلوں سے بھرے ہوئے احاطے میں داخل ہوا اور پھر ایک بلند و بالا دروازے سے گزرا۔ اندر سیاہ ٹائلوں کا فرش ان فانوسوں کی روشنی کو منعکس کر رہا تھا جو دن میں بھی روشن تھے۔ دروازے کے اندر باہر ایک قدم کا فاصلہ جیسے جنت اور جہنم کی حد تھی۔ ایک طرف لو سے جھلستا دھوپ میں تپتا شاہراہ فیصل پر آگ کا دریا تھا جس میں خس و خاشاک کی طرح بہنے والی ہزاروں گاڑیوں کے ایگزاسٹ کی گرمی شامل ہوتی جا رہی تھی... تو دروازے کے دوسری طرف پُرسکون خوشبودار ٹھنڈک والا جاں فزا ماحول تھا۔

اس نے اوپر سے نیچے تک پھیلے ہوئے بورڈ کو دیکھا جس پر ان تمام دفاتر، کمپنیوں اور کارپوریشنز کے نام اور فلور نمبر درج تھے جو اس عمارت میں ہر قسم کا کاروبار کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس سے پوچھے اور کہاں جائے؟ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ ہر فلور پر ہر آفس میں جھانکتا پھرے۔ ایک قوت تھی جو اسے پسپائی پر مجبور کرتی تھی اور اس کے پیچھے جذباتی دلائل تھے۔ دوسری زیادہ طاقتور قوت عملی سوچ کی تھی جو حالات کے مطابق سمجھوتے کرنے پر اکساتی تھی۔ ایک ایسا ہی سمجھوتا وہ ابھی کچھ دیر پہلے پنشن کے معاملے میں کر کے آیا تھا۔

وہ کاؤنٹر پر جا کے بھی تماشا بنتا۔ صرف نام سے کیا ہوتا ہے؟ کمپنی کا نام ہو یا مالک کا نام۔ فون نمبر... ای میل... جس عمارت میں ہزاروں افراد بھرے ہوئے ہوں اور ان میں نصف نہ سہی ایک چوتھائی لڑکیاں ہوں گی اور سیکڑوں نام ہوں تو ہر نام کی چار چھ ملیں گی۔ بالآخر اس نے صبر اور حوصلے کا مشکل راستہ نکال لیا۔ وہ درمیان میں لگی ہوئی آرام دہ سیٹس پر بیٹھ گیا اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ ایک وردی والے ویٹر نے جس کی ٹی شرٹ پر ریسٹورنٹ کا نام چھپا ہوا تھا، اسے برگر اور کولڈ ڈرنک لا دیے اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ انتظار کا وقفہ رات تک بھی لمبا ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ نائن ٹو فائیو کے شیڈول پر چلتی ہو۔ وہ لیٹ آورز تک بیٹھ سکتی ہے۔

صرف ایک گھنٹے میں وہ بیزار ہو گیا اور مشکوک بھی۔ یہاں لوگ مختصر وقت گزارتے تھے، کسی سے ملنے یا کسی کام کے لیے۔ یہ پبلک کے لیے ریسٹ کی جگہ نہیں تھی۔ اس نے ہمت سے کام لیا اور کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کے پاس چلا گیا۔ ”دیکھیے... میری ایک پرابلم ہے۔ میں سکھر سے آیا ہوں... یہاں اس عمارت میں میری بہن کام کرتی ہے لیکن مجھے نہ اس کی کمپنی کا نام معلوم ہے نہ مالک کا...“

احسن کا حربہ کامیاب رہا۔ لڑکی نے ہمدردی سے پوچھا۔ ”نام بتائیے ان کا... میں کوشش کرتی ہوں۔“

”مائرہ... مائرہ ابراہیم... میرا نام ہے احسن۔“

”یو آر شیور کہ وہ یہاں ہوں گی؟“

”میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ اسے میں نے کچھ دیر پہلے اندر جاتا دیکھا تھا۔ میں سڑک پار کر رہا تھا۔“

احسن کو غیر متوقع کامیابی ہوئی۔ لڑکی نے اِدھر اُدھر چند کالز کر کے نہ جانے کس کس سے پوچھا اور پھر مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ ”مسٹر احسن! مائرہ نام کی تین ہیں۔ آپ تینوں کو دیکھ لیں۔“ اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر روم اور فلور نمبر لکھے۔ ”لفٹ ادھر سامنے ہے۔ دو نمبر کی لفٹ ہر فلور پر جاتی ہے۔“

پہلی ایک دوا ساز کمپنی میں فارماسسٹ تھی۔ وہ معذرت کر کے اوپر چلا گیا۔ دوسرے آفس میں قدم رکھتے ہی اس کو جیسے الیکٹرک شاک لگا۔ دائیں جانب شیشے کے کیبن کی شفاف دیواروں کے پیچھے وہ اپنی بہن مائرہ کو دیکھ سکتا تھا جو سر پر ہیڈ فون چڑھائے کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مائرہ نے ہیڈ فون اتار کے رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر وہ ساکت و صامت ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر مائرہ نے کہا۔ ”تم کو کس نے بتایا بھائی... کہ میں یہاں ہوں؟“

”کسی نے بھی نہیں... اتفاق سے خود میں نے تمہیں دیکھ لیا کار سے اترتے ہوئے... میں سڑک کے دوسری جانب تھا' ابا کے ساتھ رکشا میں۔“

مائرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ”ابا... کیا وہ بھی آئے ہیں؟“

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انہیں میں نے گھر بھیج دیا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو۔“

مائرہ نے لجاجت سے کہا۔ ”دیکھو بھائی! کوئی ہنگامہ کھڑا مت کرنا جس سے میری اور تمہاری پوزیشن خراب ہو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”مجھے اندازہ ہے کہ اس وقت میں تمہاری مملکت کی حدود میں ہوں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”اور یہ وہ کالج نہیں ہے جہاں تم بی اے کے آخری سال کی تعلیم پوری کرنے آتی ہو... ہر روز۔“

مائرہ نے اندر کھلنے والے ایک دروازے کو کھول کے دیکھا اور بولی۔ ”اندر آ جاؤ۔ باس نہیں ہے۔“

احسن جس کمرے میں گیا، وہ اپنی شاہانہ آرائش سے کسی وزیر کا آفس لگتا تھا۔ وہ ایک طرف لگے ہوئے سیاہ لیدر کے نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ... اور کون ہے تمہارا باس؟“

مائرہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”سائرہ کو سب معلوم تھا۔“

”اس نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا اور وہ اپنے سسرال سے فون کرتی ہے تو صرف امی کو... کیا معلوم تھا اسے؟“

”تم اس سے لڑو گے تو نہیں... کوئی فائدہ نہیں بھائی۔“

”مجھے معلوم ہے، لڑنے والا ہوتا تو اب تک تمہیں مار مار کے بالوں سے گھسیٹتا ہوا لے جاتا۔ تم سمجھ لو میں پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بزدل اور بے غیرت ہونے کو روشن خیالی کا نام دیتا ہوں... کمپرومائز پر چلنے والے۔“

”شاید ہم سب ایسے ہی ہیں بھائی۔“ مائرہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر وہ سب بتا دیا جو ناقابلِ تردید سچ تھا اور برداشت نہ کرنے سے بدلنے والا نہیں تھا۔ اس کے بعد خاموشی کا طویل وقفہ آیا جس میں مائرہ اپنے سینڈلوں کو دیکھتی رہی اور خراب ہو جانے والی نیل پالش کو دانتوں سے کھرچتی

رہی پھر اس نے کہا۔ ”چائے کافی کچھ پی لو بھائی۔“

”میں نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔“ احسن بولا۔

مائرہ نے سکون کا گہرا سانس لیا اور اٹھ کر دروازے تک گئی۔ اس نے کسی کو بلا کے کچھ کہا اور پھر اپنی جگہ آ کے بیٹھ گئی۔

”تمہارا یہ باس... کنسٹرکشن کمپنی کے علاوہ اس کے اور کیا بزنس ہیں؟“

”رسول بخش بہت بڑا لینڈ لارڈ ہے۔ اس کی دو شوگر ملز ہیں اندرونِ سندھ... اس کا بڑا بھائی اسمبلی کا ممبر تھا۔ پچھلے سال... تین مہینے پہلے مر گیا۔ اب ضمنی انتخاب میں رسول بخش اس کی سیٹ پر منتخب ہو جائے گا۔“

”کتنی عمر ہے اس باس کی... ابا سے زیادہ؟“

”نہیں بھائی... خود چالیس بتاتا ہے... پہلی بیوی مر گئی تھی۔ دوسری گوٹھ میں ہے۔ بڑی لڑکی شادی شدہ ہے... بڑا لڑکا اکیس سال کا ہے اور چھوٹا اٹھارہ کا۔“ مائرہ نے سارا ایچ اگل کے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

”ابھی تم اس کی پرسنل سیکریٹری ہو... تنخواہ کے نام پر کیا دیتا ہے اور مراعات کے نام پر کیا؟“ وہ طنز سے بولا۔

مائرہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا۔ ”چھوڑو... تم کیا کرو گے جان کے... لیکن بھائی... سائرہ کو کیا ملا بی اے کر کے... اکمل بھائی بھی اسکول ٹیچر ہیں اور تم ابھی تک ملازمت کی تلاش میں ہو... ابا کی پنشن ملی؟“

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آج رشوت سے معاملہ طے ہوا ہے۔ شاید دو چار دن اور لگ جائیں گے۔“

ایک چپراسی چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ہوئی ٹرے درمیان میں رکھ گیا۔ ”ذرا سوچو... ابا نے ایم اے کیا پھر پی ایچ ڈی... ان جیسی عزت اور شہرت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ مگر اپنا گھر تک تو ہے نہیں ان کے پاس... گاڑی کہاں سے آئے گی۔ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ دنیا کس کے آگے سر جھکا رہی ہے... کسے سلام کر رہی ہے۔“

وہ برہمی سے بولا۔ ”یہ سب مجھے بتانے کا مقصد... اور ایسے کب تک چلے گا؟“

مائرہ نے اسے چائے بنا کے دی۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے بھائی... دو مہینے سے میں چلا رہی ہوں۔“

وہ تلخی سے ہنسا۔ ”میرے جیسے کنگلے سے کیا توقع رکھتی ہو تم... بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے... آج سیکریٹری ہو کل کو مالکن ہو جاؤ گی۔ مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ تم جیسی لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔“

”میری جگہ تم ہوتے یا اکمل بھائی ہوتے... تو موقع سے فائدہ نہ اٹھاتے؟ بولو... ایمانداری سے بتاؤ... تم نے کیوں ایم اے کر کے ابا کے نقشِ قدم پر چلنا منظور نہیں کیا؟ اکمل بھائی ٹیچر بن گئے مجبوراً مگر وہ اولیول کی ٹیوشن سے کتنا کما رہے ہیں... کوچنگ سینٹر بھی کھول لیا ہے انہوں نے۔“

”اور الگ بھی ہو گئے ہیں۔ اب تو ملنا جلنا بھی رسمی رہ گیا ہے۔ ہفتہ دس دن میں بھائی چکر لگا جاتے ہیں۔ گزشتہ بار آئے تو ایک ہزار دے گئے تھے اماں کو اور ایک ہزار ابا کو... مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ ”کسی کا مطلب“ میں یا تم نہیں... ان کی بیگم تھیں جس نے انہیں غلام بنا رکھا ہے۔“

”سچ پوچھو تو بھائی، اماں نے ان کے لیے بڑے گھر کی لڑکی تو دیکھی مگر اپنا گھر نہیں دیکھا کہ کتنا بڑا ہے۔ اسے تو جانا ہی تھا۔ وہ یہاں روایتی بہو بن کے ساس سسر کی سیوا کرنے نہیں آئی تھی۔ اسٹار پلس کے ڈراموں سے ساس نندوں کی ایسی تیسی کر کے اپنا گھر سنسار سب الگ بسانے کی پوری ٹریننگ تھی اس کے پاس۔“

”اور تم... انہی ڈراموں سے تم نے بھی یہ سب سیکھا... جو تم کر رہی ہو... خاندان کی عزت، غیرت اور شرافت کی ایسی تیسی کر کے تم بہت اونچا اڑ رہی ہو۔“

مائرہ نے برہمی سے کہا۔ ”پھر کیا کرتی میں... سائرہ کی طرح آنکھیں بند کر کے کسی کلرک بادشاہ کے ساتھ چلی جاتی، اس کے گھر کی ملازمہ بن کے۔ اس کے دس بارہ بچوں کی ماں بننے کے لیے... پیسے پیسے کو ترسنے کے لیے... کس کام آتی میرے وہ لاج شرم... خاندان کی پرمپرا... جھوٹی شرافت اور عزت۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے تمہارے جیجا جی... سائرہ کے مجازی خدا... وہ آئے تھے میرے پاس۔“

احسن چونکا۔ ”وہ کس لیے آئے تھے؟“

مائرہ مسکرائی۔ ”خود سوچو انہیں مجھ سے کیا کام ہو گا؟ باجی کو ساتھ لائے تھے سفارش کے طور پر... اپنی درخواست دے گئے۔ ویسے تو درخواست جاتی ایچ آر والوں کے پاس تو جواب بھی نہ دیا جاتا لیکن میں نے وعدہ کر لیا ہے ان سے اور باس سے بھی بات کر لی ہے۔ جتنی تنخواہ وہ آج لے رہے ہیں ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں... اس سے چار گنا پر ان کا تقرر ہو جائے گا... مگر یہاں نہیں۔“

”یہ بڈھا... میرا مطلب ہے رسول بخش اتنی مانتا ہے

تمہاری؟“

”کیوں نہیں مانے گا... نکیل ڈال رکھی ہے میں نے ایسی کہ اشارے پر چلتا ہے۔“ مائرہ نے فخر سے بتایا۔

احسن منہ کھولے بیٹھا رہا۔ ”یہ سب تو ہوتا ہے اگر کوئی لڑکی تم جیسی ہو اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دے... لیکن یہ کھیل کتنے دن کا ہے؟ اس کے بعد...؟“

”میں اب اناڑی نہیں، کھلاڑی ہوں بھائی... تم دیکھتے جاؤ کہ کون کس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔“

”کیا تم نے... شادی کر لی ہے اس سے؟“

وہ ہنسی۔ ”ابھی نہیں... ابھی تو ابتدائے عشق ہے... اس کے شوق کو ہوا دے رہی ہوں۔ اس کے جذبات سے کھیل رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بالآخر شادی کرنی پڑے گی لیکن تب تک میں اپنی پوزیشن بہت سیف کر لوں گی۔ میں کوئی اسٹریٹ گرل نہیں ہوں... جب اس سے شادی کروں گی تو بہت کچھ ہو گا میرے پاس... میرا اپنا... اتنا کہ دکھ اسے ہو گا اگر اس نے مجھے گنوایا... وہ اپنی جذباتی بے وقوفی کی اتنی بڑی قیمت دے چکا ہو گا کہ نقصان میرا نہیں... اس کا ہو گا۔“

”تم نے کہاں سے حاصل کیا یہ تجربہ بہنا؟“ احسن کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔

”اب جانے دو بھائی... کیا فائدہ ان باتوں کو دہرانے کا... ابا ایک شعر پڑھتے تھے نا... دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں... جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں... ہر شخص کے اپنے تجربات ہیں... میں نے بھی بہت کچھ داؤ پر لگایا ہے مگر اپنی جیت کو یقینی بنا کے... یہ تو سارا کھیل ہی عقل کا ہے اور میرے مقابل ہے ایک جذباتی کم عقل عمر رسیدہ شخص۔“

”تم کیا سمجھتی ہو، وہ ساری زندگی تمہارا غلام رہے گا؟ تم سے شادی کے بعد تمہاری جگہ دوسری سیکریٹری آ جائے گی۔“

”آتی ہے تو آ جائے... اگر اس وقت تک وہ خود نہ مرا تو ایک شادی اور کر لے گا... کر لے... وہ میرا کیا لے جائے گی... لیکن اس وقت تک میری زندگی بدل جائے گی... شاید ہم سب کی... ابھی ہمارے دولہا بھائی ایڈجسٹ ہو جائیں... اس کے بعد میں تمہارے لیے جگہ نکالتی ہوں... اگر تم چاہو... اس کے ساتھ نہیں... وہ اپنے سیاسی اثر رسوخ سے سالے صاحب کو اس سیٹ اپ میں اچھی جگہ دلوائے گا۔“

احسن متاثر ہو گیا۔ ”اتنی چلتی ہے اس کی... تو ابا کی پنشن کا معاملہ طے کیوں نہیں کراتیں؟“

”ابا کا ڈر نہ ہوتا تو ضرور کرا دیتی۔ ابا کو ایک بار بھی کہیں جانا نہ پڑتا۔“ اس نے فون اٹھا لیا۔ ”میرا خیال ہے کہ باس وہیں گئے ہیں۔ سندھ سیکریٹریٹ میں ہوں گے... سمجھو یہ کام ہو گیا۔“

احسن دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کی سیدھی سادی نظر آنے والی معصوم اور بے وقوف سی بہن کا اعتماد حیران کن تھا۔ وہ اسے بالکل مختلف انداز میں رسول بخش سے بات کرتے دیکھتا رہا۔ ”آپ کہاں ہیں جی؟ ابھی وہیں ہیں؟ مجھ سے تو دو گھنٹے کا کہہ کر گئے تھے... اچھا ایک کام کریں میرا... ارجنٹ اور پرسنل... اے جی آفس میں کوئی ہے؟ ہاں ہاں، میں جانتی ہوں کہ آپ کے تعلقات کہاں تک ہیں... ابھی فون کریں وہاں اور پوچھیں کہ پروفیسر ابراہیم کے پنشن کیس کا کیا ہوا... جی سر... آپ نے ٹھیک سمجھا۔ وہ میرے ابا ہی ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں اس کام کی اہمیت کا... ہاں وہ گئے تھے مگر اے جی آفس والے انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ ہاں... رشوت مانگ رہے ہیں... نام نہیں معلوم مجھے... آپ تو بس کام کرائیں۔ مجھے بتائیں کیا کیا آپ نے۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتی ہوئی فاتحانہ نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ ”سمجھو کام ہو گیا۔“

احسن سوچ میں پڑ گیا۔ ”ابا کو یہ سب اچھا نہیں لگے گا۔“

”کیا ضرورت ہے انہیں کچھ بتانے کی۔ وہ جا کے اپنا چیک لے لیں۔ پرابلم ہو تو تم مجھے بتانا۔ ابھی میں ابا سے بات نہیں کر سکتی۔“

”آخر کب تک ایسے دھوکا دیتی رہو گی؟ ابا تو ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہر صبح تم کالج جاتی ہو اور شام کو کوچنگ کے لیے چلی جاتی ہو وہیں سے... کسی سہیلی کے ساتھ۔“

”ابا شاک میں تھے۔ پہلے باجی کی شادی پر جو ہوا پھر انہیں ریٹائرمنٹ دے دی گئی، حالانکہ وہ ایکسٹینشن کی توقع کر رہے تھے۔ ایسے میں انہیں میرے معاملات کا پتا چلتا تو پتا نہیں کیا ہوتا؟“

”کیا ہوتا... ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ وہ خودکشی کر لیتے۔ کیا تمہیں پروا ہے؟“ احسن برہمی سے بولا۔

”یہ مت کہو احسن... سب کی پروا ہے مجھے... میں سب کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور کر رہی ہوں... یہ مت کہنا کہ میں احسان جتا رہی ہوں۔ ابھی دولہا بھائی کو سیٹ کیا

ہے۔ انشاء اللہ ابا کی پنشن بھی مل جائے گی... آج نہ سہی کل... اس کے بعد..."

"اب زیادہ شیخی بگھارنے کی ضرورت نہیں تمھیں... میں چلتا ہوں۔"

"میں بھی آجاؤں گی اپنے وقت پر... ساڑھے نو دس تک۔"

"ہاں... کوچنگ سینٹر نو بجے تک چلتے ہیں نا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا اور باہر نکل گیا۔

وہ اس ائرکنڈیشنڈ آفس اور اس شاندار عمارت کے ماحول سے نکلا تو اسے واپس اپنی دنیا کے جہنم میں آنا زیادہ عذاب ناک لگا۔ ڈرون حملے جیسے انکشاف کے بعد اس نے خود کو تماشا بننے سے بچالیا تھا ورنہ وہ کسی غیرت مند بھائی والا فلمی سین چلاتا اور چیختا دھاڑتا یا مائرہ کو بے عزت کرتا تو بعد میں مائرہ کسی نہ کسی طرح صورتِ حال کو سنبھال لیتی لیکن جائے واردات سے سیکیورٹی والے اسے دھکے دے کر نکالتے اور سڑک پر پھینک دیتے۔ اور کہتے پاگل کے بچے... شکر کرو ہم نے تمھیں پولیس کے حوالے نہیں کیا۔

اس وقت احسن نے خود کو بے عزت ہونے سے بچالیا لیکن اب وہ خود کو سخت بے عزت محسوس کررہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے ہر نظر اس پر حقارت سے خندہ زن ہے۔ بس کی کھڑکی سے جھانکتے... موٹر سائیکل پر قریب سے گزرتے... رکشا میں جاتے اور پیدل چلتے لوگ اس کی طرف دیکھتے ہیں تو ایک ہی گالی دیتے ہیں۔ بے غیرت... تیری بیس سال کی بہن نے خود کو دگنی سے زیادہ عمر کے وڈیرے کو بیچ دیا اور تو اس کی کمائی میں سے چائے پی کے اور سموسے کھا کے مونچھوں پر تاؤ دیتا جارہا ہے۔ تیری بہن کا شوہر بھی بے غیرت ہے جو اس داشتہ بن جانے والی سالی کے قدموں میں بیٹھ گیا نوکری مانگنے کے لیے۔ اب تیرے باپ کو پنشن اسی کے طفیل ملے گی اور پھر تجھے نوکری... تیری بہن کے جسم کا خریدار کتنی دولت لٹارہا ہے تنخواہ کی اور مراعات کی صورت میں... وہ شاندار گاڑی دیکھی تھی تو نے جس سے وہ اتری تھی۔

مگر گھر پہنچتے پہنچتے ردِعمل کا سیلابی ریلا بھی گزر گیا۔ اس کے دماغ کی رو مخالف سمت میں چل پڑی۔ ان لوگوں کی طرح جو زلزلے یا سیلاب کے بعد زخم چاٹتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنا باقی ماندہ اثاثہ سمیٹ کر دوبارہ ملبے سے ایک نیا گھر بنانے کی سوچنے لگتے ہیں۔ احسن نے بھی یہی بہتر جانا کہ خرابی پر سینہ کوبی کرنے اور آنسو بہانے سے مزید خرابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمدرد بھی تسلی دیں گ طعنہ ہوگا۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس خرابی میں جو بہتری ک امکانات ہیں ان کو کیسے ایکسپلائٹ کیا جائے۔ بہن اگر مجر ہے تو اسے سنگسار کرنے سے اس کا ہاتھ تھام کے سہارا د بہتر ہوگا۔ اس نے مدد مانگی ہے تو وہ کیسے انکار کرے۔

ابھی شام ہونے میں دیر تھی کہ کال بیل بجی۔ ماں نے کہا۔ "احسن! دیکھ مالکِ مکان ہوگا۔ ابا کا پوچھے تو کہہ د کہ بہت بیمار ہیں۔ شاید اسپتال میں داخل کرانا پڑے۔"

"اماں! وہ کچھ نہیں سنے گا۔ چار مہینے کا کرایہ مانگے گا۔"

"ارے تو کہہ دینا کہ کل پرسوں تک پنشن مل جائے گی، دے دیں گے۔"

"یہ میں کہہ دوں گا۔ پھر جو وہ کہے گا سنوں گا۔" گرمی کھاتا دروازہ کھولنے گیا۔

باہر مالکِ مکان کے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوا پھر اسے یاد آگیا۔ وہ اجنبی نہیں تھا۔ اس سے آج دوپہر ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اے جی آفس کا اکاؤنٹس آفیسر عسکری تھا۔ اس کے ساتھ وہی داڑھی والا کلرک تھا جس کے ساتھ رشوت کا معاملہ طے ہوا تھا۔ ان کے چہروں پر بڑی خوشامدانہ عاجزی تھی۔

احسن کی سوالیہ نظروں کے جواب میں عسکری نے کہا۔ "پروفیسر ابراہیم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

احسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"وہ دراصل... ہم حاضر ہوئے تھے ان کی پنشن کا چیک... اور پراویڈنٹ فنڈ کا چیک لے کر۔"

احسن کا جی چاہا کہ وہ ایک قہقہہ لگائے اور پھر ایک گالی دے کر کہے... بس یہی تھی تیری افسری؟ ایک ٹیلی فون میں ساری اکڑفوں نکل گئی؟ نوکری کی فکر لاحق ہوئی تو کتے کی طرح دروازے پر دم ہلانے آگیا۔

لیکن دوپہر کی طرح ایک بار پھر احسن نے اپنے ری ایکشن کو کنٹرول کیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔ پھر وہ باپ کے سامنے ایک سیاسی اعلان کرنے گیا۔ "ابا! وہ آئے ہیں اے جی آفس والے چیک لے کر... آپ نے دیکھی رشوت کی طاقت... ہڈی ڈالو تو غرانے والا کتا بھی دم ہلانے لگتا ہے۔"

پروفیسر ابراہیم کو بڑی مشکل سے یقین آیا کہ ان کا نالائق نکما بیٹا مذاق نہیں کررہا تھا۔

☆☆☆

مائرہ اپنے باس کی گھومنے والی نرم لیدر سیٹ کی کرسی پر دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک پُرتفاخر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اب وہ کسی آئینے کی گواہی کی محتاج نہیں تھی۔ اسے کسی آرڈیننس ڈپو کے کمانڈنگ آفیسر کی طرح بالکل صحیح اندازہ تھا کہ اس کے پاس تباہ کن اسلحہ کتنا ہے اور کیسا ہے... خود اعتمادی کی یہ رپورٹ اس نے خود ہی بنائی تھی اور آئینہ بھی اسے بتا تا رہا تھا کہ اس کی صورت کے قاتل نقش... اس کا گلاب اور موتیا جیسا رنگ رخسار... اس کی غزالی آنکھوں کے شرابی ڈورے... اس کی مونا لیزا کو شرمسار کرنے والی مسکراہٹ... اور اس کے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے شفاف بدن کے قوس وخم اور اس کی ادائے حسن کی تابکاری کس درجہ تباہ کن ہے۔

بے شک یہ احسان ہے اس مالک کا جس کے دستِ جمال آفریں نے اسے یہ پیکر عطا کیا۔ اور وہ جسے چاہے یہ دولت بے حد وحساب دیتا ہے لیکن ہاتھ میں اچھی سے اچھی بندوق ہو اور نشانہ لینا نہ آتا ہو تو سب بیکار... اپنے حسن و شباب کے بارود خانے کا سارا اسلحہ مائرہ نے بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا تھا۔

کالج میں پہنچتے ہی گویا اسے نوجوانی کی سند مل گئی۔ وہاں شہر بھر کے اسکولوں سے آنے والی ساری ہی ملکۂ حسن کی وزارت کا قلمدان سنبھالنے آئی تھیں۔ نئے دور کی نئی تیاری کے ساتھ... آزادی اور خود اعتمادی کے نئے نشے میں چور... خیال تو دل میں یہ بھی تھا کہ اب ایف اے بی اے کرنا ہے، ڈاکٹر بننا ہے مگر ذہن میں وہ سب رنگین کہانیاں بھی تھیں جو ان سے پہلے کالج آنے والیوں سے منسوب ہوئیں اور مشہور ہوئیں۔ دماغ سے الگ دل کی دنیا تھی جو اپنی طرف کھینچتی تھی اور کھینچنے والے ہر جگہ ہول سیل میں دستیاب تھے... پارٹ ٹائم بھی اور ہول ٹائم بھی۔ وہ گھر سے کالج کے دروازے تک موٹر سائیکلوں اور اسپورٹس کاروں تک پر چھوڑنے آتے تھے اور پھر چھٹی کے وقت یا درمیان میں بھی ریسیو کرنے کے لیے ہمہ وقت گیٹ پر منڈلاتے نظر آتے تھے۔

مائرہ کے پاس بہت چوائس تھی۔ پھکو ہیرو اور بزعم خود سلمان خان سے لے کر باپ کی کمائی سے نئے ماڈل کی ہنڈا سٹی دوڑانے والے چمار صورت شاہ زادوں تک۔ مائرہ نے تجزیہ کیا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ گھر سے تو اکثریت علم کی دولت سمیٹنے کے لیے آتی یا بھیجی جاتی تھی مگر اس معاملے میں سیریس شاید آدھی بھی نہ تھیں۔ باقی آدھی میں کچھ ابتدائی تجربات کے بعد تعلیم اور تفریح کو یکساں وقت اور اہمیت دیتی تھیں لیکن ایک چوتھائی جوانی کے ایڈونچرز میں کتابیں ضرور اٹھائے پھرتی تھیں مگر ان کو کھول کر دیکھنے کے لیے وقت نکالنے سے قاصر تھیں۔

ہر نووارد کی طرح مائرہ نے آواری یا شیرٹن میں بوفے لنچ بھی کھائے اور دھوکے بھی... مگر وہ ذہین تھی اور اسے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ تھا چنانچہ گھاٹے کے سودے کو بھی اس نے تجربہ شمار کیا اور ہجوم عاشقاں پر دفعہ ایک سو چوالیس لگادی... اب پانچ اکٹھے نہیں ہوسکتے تھے۔ چار میں سے دو فائنل تک پہنچے۔ ظاہر ہے مقابلہ سخت رہا لیکن ٹرافی بالآخر خدا بخش کے بیٹے نے جیت لی۔ وہ عام نوجوانوں کے مقابلے میں کچھ شرمیلا اور کم شو مارنے والا تھا۔ گاڑی اس کی بھی کسی سے کم نہ تھی لیکن وہ خاندانی رئیس زادہ تھا۔ کپڑے بھی ڈھنگ سے پہنتا تھا اور ادب آداب میں بھی شائستگی کا قائل تھا۔

مائرہ سے اس کی ملاقات بھی کسی کبوتر کے ذریعے نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک سو فیصد فلمی اتفاق سے ملے تھے۔ وہ گھر سے رکشا پر آئی تھی اور کالج گیٹ کے باہر اتری تھی۔ اسی وقت وہ اپنی بہن کو چھوڑنے آیا تھا۔ کچھ قصور رکشا والے کا تھا جس نے ایک دم بریک لگائے تو ہنڈا سٹی کے سامنے آگیا۔ کچھ مائرہ کی شوخی تھی کہ وہ غلط سائڈ پر ایک دم اتر گئی۔ نتیجہ یہ کہ دوبارہ اسٹارٹ لینے والی ہنڈا سٹی نے اسے محض چھوا مگر یہ چھونا بھی مائرہ کے قدم اکھاڑنے کے لیے کافی تھا۔ وہ منہ کے بل گری تو اس کا سر پکی سڑک پر لگا اور وہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش آیا تو وہ کار کی پچھلی سیٹ پر تھی۔

وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ "یہ تم کہاں لے جارہے ہو مجھے؟" وہ چلائی۔

ڈرائیور نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور گاڑی روک لی۔

"کہیں نہیں مس... یہ سامنے اسپتال ہے۔"

"مجھے نہیں جانا کسی اسپتال... اندھوں کی طرح گاڑی چلاتے ہو۔"

"میں معافی مانگتا ہوں اپنی غلطی کی لیکن مس... آپ کے ماتھے پر خراش ہے۔ زخم گہرا نہیں مگر صاف ہونا چاہیے اور آپ کو اے ٹی ایس کا انجکشن بھی لگ جائے تو اچھا ہے۔"

اس نے گاڑی پھر آگے بڑھادی۔

"تم نے اپنی گاڑی میں کیوں ڈالا مجھے؟" وہ کچھ نرم پڑی۔

"اس لیے کہ وہاں مجمع لگ جاتا... تماشا بنتا... آپ

پریشان نہ ہوں... چیک اپ کے بعد میں آپ کو واپس کالج پہنچا دوں گا یا آپ کے گھر... اگر آپ چاہیں۔‘‘ وہ پُرسکون انداز میں بات کرتا تھا اور انگریزی زیادہ بولتا تھا۔

’’او گاڈ... میرا بیگ۔‘‘ وہ ہسٹریائی انداز میں ادھر اُدھر دیکھ کے چلائی۔

’’بیگ؟‘‘ لڑکا کنفیوز ہو گیا۔

’’ہاں بیگ... کالے رنگ کا... اس میں تو سب کچھ تھا۔‘‘ مائرہ گھبراہٹ کی بہترین اداکاری کا نمونہ پیش کرتی رہی۔

’’میں... میں نے دیکھا نہیں... شاید وہیں پڑا رہ گیا... کیا تھا اس میں؟‘‘ وہ مجرمانہ شرمندگی سے بولا۔

’’کہا نا سب کچھ... نیا بیگ تھا... ہزار تو ابا نے صبح دیے تھے۔ ڈھائی سو پہلے تھے تقریباً... کچھ کاغذات تھے ضروری اور موبائل...‘‘

’’آئی ایم سوری... یہ سب میری بے وقوفی سے ہوا۔ لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔‘‘

’’گھر پر کیا بتاؤں گی میں؟‘‘ وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

’’اوہ پلیز... پلیز... اتنا پریشان نہ ہوں۔ پہلے اسپتال سے ڈریسنگ کرا لیں پھر کچھ کرتے ہیں۔‘‘ اس نے لجاجت سے کہا۔

گاڑی اس وقت اسپتال کے گیٹ میں داخل ہو کے پارکنگ ایریا کی طرف مڑ چکی تھی۔ اس نے پیچھے کا دروازہ کھول کے کہا۔ ’’آیئے... آپ چل سکتی ہیں نا؟‘‘ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

مائرہ نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور نقاہت سے بولی۔ ’’کچھ چکر آ رہے ہیں... مگر... میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔‘‘

اس کا ہاتھ تھامتے ہی وہ جیسے پگھل کے موم ہو چکا تھا۔ ’’پلیز شرمندہ مت کرو مجھے... کیا نام بتاؤں تمہارا یہاں؟‘‘

وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ ’’مائرہ... مائرہ خان... کسی نے مجھ سے پوچھا تمہارا تو؟‘‘

’’حیدر... حیدر بخش... اینڈ وی آر کزن... رائٹ... ذرا پُراعتماد نظر آؤ۔‘‘

ایک خراش کی معمولی ڈریسنگ کے لیے نام تو مائرہ سے پوچھا گیا مگر حیدر کے بارے میں کوئی سوال کیوں کرتا؟ اس نے زبردستی کی رجسٹریشن وغیرہ کے ملا کر سات سو دیے اور اسے باہر لے آیا۔ اندر ہی کہیں سے اس نے جوس کے دو پیکٹ پکڑ لیے تھے۔ ’’یہ پی لو... تم بہتر محسوس کرو گی۔‘‘

’’یو آر اے رئیل جینٹل مین حیدر۔‘‘ مائرہ نے کہا جو اب اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

’’اب اگر تم برا نہ مانو تو میں ایک بات کہوں... بیگ کہاں سے لیا تھا تم نے؟‘‘

’’طارق روڈ پر میٹرو سے...‘‘ مائرہ نے سوچا ہوا جواب داغ دیا۔ ’’ابھی دو ہفتے پہلے۔‘‘

’’طارق روڈ... ہوں۔‘‘ اس نے گھڑی دیکھی۔ ’’اس کے لیے کچھ ویٹ کرنا پڑے گا۔ وہ بارہ ساڑھے بارہ بجے سے پہلے کہاں کھولتے ہیں اور ابھی تو دس بجے ہیں۔‘‘

’’آج میرے پہلے دو پیریڈ خالی تھے۔ اس لیے دیر سے آئی تھی۔ یہ ہونا ہی تھا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب؟‘‘

’’تم نے کہا تھا نا کہ گھر والوں سے کیا کہوں گی... تو ہم طارق روڈ سے بالکل ویسا ہی دوسرا بیگ لیں گے... آئی ہوپ کہ وہ مل جائے گا... دو ہفتے میں اسٹاک بدلتا نہیں... کیا تب تک ہم کہیں انتظار کر سکتے ہیں؟‘‘

’’انتظار... کہاں؟‘‘

وہ سوچ کے بولا۔ ’’پی سی اچھی جگہ ہے۔ ہم ایک کپ کافی کا پئیں گے اور بارہ بجے طارق روڈ...‘‘

’’مگر میں تم سے بیگ کیوں لوں؟‘‘

’’اس لیے کہ میری غلطی سے تمہارا نقصان ہوا۔ تمہاری پوزیشن تو خراب نہ ہو گھر میں... پلیز، یہ میری خواہش ہے۔ اگر تم اس کے سوا بھی سزا دینا چاہو تو مجھے منظور ہے۔‘‘

’’حیدر! اب میں شرمندہ ہو رہی ہوں... مجھے بتانا ہی نہیں چاہیے تھا۔‘‘

پی سی میں کوئی نہیں تھا۔ ان کے ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے والے فارغ ہو کے جا چکے تھے اور لاؤنج بھی خالی پڑا تھا۔ وہ ایک کنارے پر شیشے کے ساتھ والی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ صاف نظر آتا تھا کہ حیدر نشانے پر آ گیا تھا اور اب کسی زخمی پرندے کی طرح بے بس تھا۔ اس کی نظر طواف رخ یار سے ہٹتی ہی نہ تھی۔

’’ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟‘‘ مائرہ نے شرما کے کہا۔

’’کیا دیکھے گا کوئی بھی جو تمہیں دیکھے گا... لیٹ می سے... یو آر سو پریٹی... لیکن یہ تو معلوم ہی ہو گا تمہیں... میرا کوئی اور مقصد نہیں مگر مجھے اعتراف تو کرنا ہی چاہیے۔‘‘

’’مجھے اپنے بارے میں بتاؤ؟‘‘ وہ نظر چرا کے بولی۔

’’کیا کرتے ہو تم؟‘‘

’’پڑھتا ہوں... اے لیول کے بعد ایم بی اے کر رہا ہوں... آئی بی اے سے... میرے فادر رسول بخش ہیں اور ہم سندھ کی مشہور فیملی ہیں۔ ابھی میرے تایا اسمبلی میں ہیں مگر وہ بہت بیمار رہتے ہیں۔ اگلے الیکشن کے لیے وہ اپنی جگہ میرے فادر کو دیں گے۔‘‘ وہ اچانک رک گیا کیونکہ مائرہ پلک جھپکائے بغیر ایک مقتدر فیملی کا شجرۂ نسب سن رہی تھی۔ ’’آئی ایم سوری... میں کچھ زیادہ بول گیا۔ وڈیرے اتنے اچھے نہیں سمجھے جاتے... خصوصاً ہمارے ڈراموں میں ان کا جو امیج پینٹ کیا جاتا ہے۔‘‘

’’میں ڈرامے نہیں دیکھتی... اور ڈرامے حقیقی زندگی کی صحیح تصویر تو نہیں ہوتے۔‘‘

اس نے مسکرا کے دیکھا۔ ’’تھینک یو... کچھ اپنے بارے میں کہو۔‘‘

’’کیا کہوں؟ میرے فادر تو بس ایک لیکچرار ہیں... پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم... میں اب بی اے کے فائنل ایئر میں ہوں، اس کے بعد ایم اے کروں گی۔‘‘

’’اور اس کے بعد... پی ایچ ڈی...‘‘

وہ ہنسی۔ ’’اتنی دور کا ابھی سوچا نہیں... ایم بی اے کر کے تم کیا کرو گے؟‘‘

’’پتا نہیں... جو بڑے کہیں گے۔ شاید مجھے اپنی دو شوگر ملز کو دیکھنا ہو گا۔ ایک خیال ہے کہ سیمنٹ فیکٹری لگائی جائے... مجھے یہ پسند تو نہیں۔‘‘

’’تمہیں کیا پسند ہے؟‘‘

’’میں لندن جانا چاہتا تھا بلکہ ایبرڈین سے ایم بی اے کرنے کی خواہش تھی مگر اجازت نہیں ملی۔ کہا گیا کہ تمہارا کسی سے بھی مقابلہ نہیں ہے۔ بس کوالیفائی کر لو تاکہ بزنس چلا سکو... لندن، امریکا پھرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔‘‘

’’تمہارے یہاں تو شادیاں بھی فیملی سے باہر نہیں کرتے۔‘‘

اس نے افسردگی سے اقرار میں سر ہلایا۔ ’’میری بہن ابھی اٹھارہ سال کی ہے۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہے۔ تایا کے بیٹے سے۔ چاہتی وہ بھی بہت کچھ تھی... بہت ایمبیشیس تھی تمہاری طرح۔‘‘

مائرہ نے سرسری لہجے میں کہا۔ ’’یہ تو تمہارے لیے بھی طے کر دیا گیا ہو گا... اگر تایا کی بیٹی ہے۔‘‘

وہ باہر دیکھتا رہا۔ ’’ہم ٹریڈیشنز کے بارے میں بہت آرتھوڈوکس ہیں... جتنے دیکھنے میں ماڈرن ہیں اندر سے نہیں ہوتے۔‘‘

’’مطلب یہ کہ انکار نہیں کر سکتے تم... اپنی مرضی سے لائف پارٹنر نہیں چن سکتے؟‘‘

وہ زبردستی مسکرایا۔ ’’ایک ساتھ یس اینڈ نو... جو میں نے دیکھا بھی ہے... خاندانی شادی تو ہو جاتی ہے روٹین میں... پھر اپنی مرضی کا لائف پارٹنر بنانا ہو کسی کو تو بنا لیتے ہیں... ہمارا آدھا وقت شہر میں گزرتا ہے... آدھا گوٹھ میں۔‘‘... پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ’’کیا خیال ہے چلیں... بارہ تو بج گئے؟‘‘

طارق روڈ کی بیشتر دکانیں کھل گئی تھیں مگر کچھ ابھی کھل رہی تھیں... میٹرو کے شو اسٹور میں صرف خواتین کو داخل ہونے کی اجازت تھی۔ وہ گاڑی میں اے سی چلا کے بیٹھا رہا۔ ’’یہ لو... میرا کریڈٹ کارڈ ہے... تمہیں نقد کچھ نہیں دینا۔‘‘

اس نے جھجکتے ہوئے کارڈ لے لیا۔ اپنی کامیابی کے باوجود وہ کچھ شرمسار تھی۔ اس کا بیگ سال بھر پہلے عید کے موقع پر طارق روڈ کی فٹ پاتھ سے ڈیڑھ سو روپے میں لیا گیا تھا لیکن اب اس کے پاس اس سے دس گنا قیمت کا بیگ لینے کا لائسنس تھا۔ اس نے بلیک کلر کا انیس سو والا بیگ لیا اور خوش خوش واپس آئی۔ ’’تھینک گاڈ! وہی ڈیزائن مل گیا۔‘‘ اس نے کار میں بیٹھ کے کریڈٹ کارڈ حیدر کو دیا اور اس نے کوئی سوال کیے بغیر رکھ لیا۔

’’تھینکس حیدر! تم نے میری پوزیشن اکورڈ ہونے سے بچا لی۔ ابا تو اتنے شکی نہیں ہیں مگر اماں سوال کر کر کے جان مشکل میں ڈال دیتیں۔‘‘

’’دیکھو... کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ بیگ کے اندر کیا تھا؟ کاغذات کے علاوہ... پیسے بھی تو ہوں گے؟‘‘

مائرہ نے بڑی عیاری اور بے پروائی سے کہا۔ ’’فار گیٹ دیٹ... شاید انیس سو تھے... مگر ہاں... موبائل فون کا افسوس ہے... ابھی مہینا بھر پہلے ابا سے ضد کر کے لیا تھا۔ یہاں کراچی میں کون لے کے پھر سکتا ہے... کالج کے اندر جا کے نکالتی تھی۔‘‘

اس نے نیا بیگ مائرہ کے ہاتھ سے لے لیا۔ ’’ذرا دکھاؤ تو مجھے۔‘‘ اس نے شاپنگ بیگ میں سے بیگ نکال کے تعریفی نظر سے دیکھا۔ ’’اچھی چوائس ہے تمہاری۔‘‘ پھر اپنا پرس نکال کے اس میں سے ہزار ہزار کے دو نوٹ اندر ڈال دیے۔

’’یہ کیا کر رہے ہو تم؟‘‘ مائرہ نے احتجاج کیا۔

’’تمہارا نقصان پورا کر رہا ہوں اور کیا... سو روپے واپس کر دینا۔‘‘ وہ مسکرایا۔

’’دس از ٹو مچ حیدر۔‘‘ مائرہ نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

اس نے اپنا پانچ انچ ٹچ اسکرین کا بہت قیمتی برانڈ کا

موبائل فون کھولا اور سم نکال کے موبائل بھی بیگ میں ڈال دیا۔

مائرہ نے شور مچایا۔ ”میں یہ نہیں لے سکتی۔“

حیدر نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ ”پلیز... میری خاطر... ورنہ میں خود کو بہت گلٹی محسوس کرتا رہوں گا۔ دوستی میں یہ کچھ بھی نہیں... کیا ہم دوست ہیں؟“

مائرہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”میں انکار کیسے کر سکتی ہوں؟“

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آج کا دن میرے لیے کتنا مبارک ہے حالانکہ ابتدا تو ایک ناخوشگوار حادثے سے ہوئی تھی۔ مگر آل از ویل دیٹ اینڈز ویل... اب تم نہ کالج جا سکتی ہو اور واپس گھر جا کے بھی کیا کرو گی... سو...“

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ اس نے ترچھی نظروں سے حیدر کو گھورا۔

”تمہارے لیے نہیں سوچا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے اور لنچ کے معاملے میں بہت پرٹیکولر ہوں میں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں ڈراپ کر کے پیٹ پوجا کرنے چلا جاؤں... میرا ساتھ دو پلیز۔“

وہ دونوں فنکار تھے۔ مائرہ کو فرسٹ ایئر سے تھرڈ ایئر پاس کرنے تک تجربات نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اناڑی پن کا کھیل وہ کسی کھلاڑی سے بہتر انداز میں کھیلتی تھی اور اس کی ادائے حسن کی معصومیت کے جال میں گرفتار ہونے والا پھڑ پھڑا تا رہ جاتا تھا مگر رہائی اس کے بس کی بات نہیں رہتی تھی۔ وہ رہائی چاہتا ہی کب تھا۔ حیدر بھی رئیس زادہ تھا اور ایسے شکار ان کا خاندانی شوق تھے۔ مائرہ اس کا سب سے قابلِ فخر شکار تھی لیکن خلافِ توقع زیادہ مشکل ثابت ہوئی تھی۔

مائرہ ایسے تمام شکاریوں کی نفسیات پر ذاتی مشاہدے اور تجربے سے بہت ریسرچ کر چکی تھی۔ پہلے سال کے تجربات تلخ تھے جو ناتجربہ کاری سے ہوئے۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھی اور ہر ناکامی اسے نیا سبق دیتی تھی جسے وہ اگلے تجربے میں بہتر نتائج کے لیے استعمال کرتی تھی۔ تجربہ حاصل ہونے کے بعد مائرہ بھی محتاط ہو گئی اور ایک وقت میں ایک پرستار کے اصول پر چلتی رہی۔

حیدر بخش کا سیریس کیس تھا۔ مائرہ نے اسے ترسا ترسا کے دیوانہ کر دیا تھا۔ خرچ کی اسے پروا نہیں تھی۔ یہ اس کے لیے واقعی ہاتھ کا میل تھا اور اس کے باپ کے لیے ھذا من فضل ربی... وہ مائرہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا گیا اور اس پر بھی تیار تھا کہ وہ خاندانی روایات سے بغاوت کر کے پہلے مائرہ سے شادی کرے گا پھر اپنی کزن سے اور اسے دوسرے درجے کی بہو نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کا باپ مجبور ہے کیونکہ دوسری اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ وہ اکلوتے وارث کو عاق بھی نہیں کر سکتا۔ قتل تو دور کی بات ہے۔

اس معاملے میں مائرہ بھی مستقبل کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کر رہی تھی۔ حیدر کی خاندانی روایات اپنی جگہ... اگر وہ پہلی بیوی کا اسٹیٹس حاصل کر لیتی ہے تو خاندانی بیوی پھر بھی نہیں ہو گی۔ حویلی کی قید میں راج کرنے کا تصور ہی اسے ڈراتا تھا۔ خاندانی بیوی راج کا شوق پورا کرے۔ حیدر اسے شہر میں کوٹھی لے کر رکھتا ہے۔ کوٹھی کار اس کے نام کرتا ہے تو بس ٹھیک ہے۔ ایک محفوظ مستقبل اور پرتعیش زندگی ہی اس کا مقصد ہے۔ حیدر آج دیوانہ ہے۔ وہ خاندانی دیہاتی جاہل بیوی اسے کیا قابو کرے گی۔ حیدر بھی تمام عمر اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی بن کے نہیں رہے گا۔ اس کی نظر بدلے گی، رویّہ بدلے گا... وہ پہلے مرد ہے اور وہ بھی فیوڈل نظام کا پروردہ... پھر روایتی شوہر بن جائے گا تو جب تک چلتی ہے چلے... پھر تو نہیں اور سہی۔

اسے اپنی فیملی سے ملوانے کے لیے حیدر نے ایک راستہ نکال لیا۔ اس نے اپنے گھر میں سالگرہ کا انتظام کیا جو اس کی اکیسویں تھی یعنی بالغ ہونے کی سرکاری تقریب۔ اس نے چند کلاس فیلوز کو بلایا مگر لڑکی صرف مائرہ تھی۔ اس اجتماع میں وہ سب کی نظروں کا مرکز بنی رہی۔ کچھ اپنے حسنِ بے مثال کے باعث، باقی اپنی جلوہ نمائی سے... حیدر کے بہت سے قریب اور دور کے کزن اسے کوہِ قاف سے اترنے والی پری کی طرح ٹریٹ کرتے رہے۔ اس کی ماں نے اور دیگر خواتین نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مہمان کے ساتھ بداخلاقی تو ممکن نہ تھی، بے اعتنائی ممکن تھی... مائرہ نے پسندیدگی کی سند حاصل کی تو حیدر کے باپ سے۔ وہ اس پر بہت مہربان رہا اور اس کی خصوصی توجہ حیدر کا حوصلہ بڑھاتی رہی تو حیدر کی ماں اور بہن کے مخالفانہ جذبات کو بھڑکاتی رہی۔

مائرہ اکیلی نہ ہوتی تب بھی حیدر کے سارے راز افشا کر دیتی... اس پر حیدر کی نظر تھی تو سب خواتین کی بھی حیدر پر نظر تھی۔ حیدر کے باپ رسول بخش نے اسے اپنے صوفے پر ساتھ بٹھا کے بہت شفقت اور محبت سے بات کی تو حیدر کو جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ تشویش خاندانی کیمپ میں پھیلی... رسمی طور پر کیک کاٹا گیا تو وہ حیدر کے ساتھ کھڑی تھی۔ دوسری طرف اس کا باپ تھا پھر ماں تھی۔ حیدر کی بہن کو بھائی کے بالکل ساتھ پھنسی مائرہ کے بعد جگہ ملی تھی اور یہ آفیشل فوٹو گراف ایک اشتہار بن گیا جو از خود بتاتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

تقریب کے آخر میں ایک اور دھماکا ہو گیا۔ رسول بخش نے بیٹے سے کہا۔ ”بھئی اپنی فرینڈ کو شادی میں بلاؤ نا... اگلے مہینے اس کی بہن کی شادی ہو گی... تم آؤ دو چار دن مہمان رہو... ہماری شادی بھی دیکھ لو۔“

”دو چار دن کے لیے تو مشکل ہے سر... گھر سے اجازت نہیں ملے گی۔“ مائرہ نے کہا۔

”بھئی ہم اجازت دلوا دیں گے پروفیسر صاحب سے۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے مائرہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کیا۔ حیدر کا پُرامید چہرہ دمک اٹھا۔ مائرہ نے ماں کا نہ سہی اس کے باپ کا دل جیت لیا تھا۔

لیکن اسے کوئی اندازہ نہ تھا کہ یہ جیت درحقیقت اس کی ہار کا پیش خیمہ ہے۔ یہ فرق مائرہ نے محسوس کیا۔ ایک عورت کی چھٹی حس کی مدد سے۔ رسول بخش کی توجہ اور گرم جوشی میں بزرگانہ شفقت نہیں تھی۔ ایک مرد کی چاہت تھی۔ یہاں تو عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مائرہ اگر بیس سے کم تھی اور وہ چالیس سے زیادہ تو کوئی بات نہیں۔ ونی کے ہر کیس میں نو دس سال کی بچی اس سے کہیں زیادہ عمر کے مرد کے نکاح میں دے دی جاتی تھی اور ساٹھ ستر سال کے مرد کو چودہ پندرہ سال کی لڑکی پسند آ جائے جو اس کی پوتی کے برابر ہو تو یہ بھی نہ غیر شرعی تھا، نہ غیر اخلاقی... مائرہ کھٹک گئی تھی لیکن یہ بات حیدر سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

اس کے بعد دو حادثات ہوئے۔ ایک واقعہ تھا دوسرا حادثہ... مائرہ نے حیدر یا اس کے باپ کو تو بیچ میں نہیں ڈالا کیونکہ پھر سوال اٹھتا کہ اس کی اتنی شناسائی اور قربت کیسے کہ وہ خاندانی تقریب میں بلائی گئی؟ مائرہ نے ایک اور سہیلی کو شریکِ راز کیا جس کی شادی بھی انہی دنوں میں پڑ گئی تھی۔ یہ محرم کا مہینا شروع ہونے سے پہلے چند دن کا وہ مختصر وقفہ ہوتا ہے جس میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابھی شادی نہ کی تو پھر چہلم تک کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اس سہیلی نے بڑے اصرار سے مائرہ کے لیے اجازت نامہ حاصل کیا کہ مہندی، مایوں سے رخصتی تک مائرہ انہی کے گھر میں رہے گی۔ مائرہ نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس پیک کیا اور حیدر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”میری بہن تو جا رہی ہے۔ ماں کو کسی طرح مٹھی میں کرو... وہ مخالفت کرے گی لیکن تم نے نیکی، سعادت مندی اور شرافت کا نمونہ بنا کے پیش کیا خود کو تو پھر میرا کام آسان ہو جائے گا۔“

”میں سونے کی بن کر آ جاؤں، تب بھی وہ مجھے پتھر کی طرح ٹھکرائیں گی۔ ان جیسی ساس کے لیے میری جیسی بہو کو قبول کرنے کا خیال ہی ہولناک ہو گا۔“

”ان کی کمزوری سے میں واقف ہوں۔ یہ کام شرافت سے تو ہو گا نہیں۔ اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے مجھے ان کو بلیک میل کرنا پڑے گا۔ جذباتی بلیک میلنگ کا مقابلہ کون ماں کر سکتی ہے۔“

مائرہ ہنسی۔ ”کیا کرو گے تم... بھوک ہڑتال؟“

”بس... ممکن ہوا تو کسی کمزور سی رسی کے ساتھ خودکشی کا ڈراما... جو ٹوٹے تو فوراً کوئی دیکھ لے اور میں بے ہوش رہوں اسپتال جانے تک۔“ حیدر نے ہنستے ہنستے بتایا۔

”تمہارے خاندان اور قبیلے میں چلتی ہے مردوں کی... رسم و رواج یا روایات عورت نہیں بدل سکتی۔“

”لیکن بابا سائیں کا ووٹ میرے لیے ہو گا۔“

”اس کا اتنا یقین ہے تمہیں؟“

”وہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کر لیا ہے میں نے۔“

مائرہ اسے کیسے بتاتی کہ اندازے کی بنیاد ہی غلط ہے۔ ابھی وہ خود سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کا شک درست ہو گا۔ اگلے تین دن اس کے لیے بھی اہم تھے۔ اس نے خود کو ایک بہت بڑے بحرانی چیلنج کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اگر باپ خود اپنے بیٹے کے سامنے رقیب بن کے کھڑا ہو گیا تو کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کمزور حریف وہ بیٹا ہے جو ابھی صرف پرنس آف ویلز ہے۔ جانشین ہے... بادشاہ نہیں... تاج ابھی باپ کے سر پر ہی ہے۔

شادی کے تین دنوں میں مائرہ کا شک اتنی تیزی سے یقین میں بدلا کہ خود مائرہ حیران رہ گئی۔ یہ ناممکن تھا کہ دوسروں کی خصوصاً بیوی کی نظر سے یہ بات چھپی رہتی کہ رسول بخش کی شفقت کے پیچھے کیا ہے۔ اس کا بہانے بہانے سے مائرہ کے قریب آنا... اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اپنے قریب کرنا... اس پر والہانہ مسکراہٹ نچھاور کرنا... اسے مہمان سے زیادہ اہمیت دینا... مہمان نوازی میں اسے دوسرے مہمانوں سے زیادہ ذاتی توجہ دینا... یہ سب ایک مرد کا ایک عورت کو واضح پیغام تھا جسے دوسروں نے بھی سمجھ لیا۔ نہیں سمجھا تو وہ کاٹھ کا الو جس کی نظر دن کے اجالے میں ہونے والے پُرہوس ڈرامے کو نہ دیکھ سکی۔

پہلی رات ہی مائرہ کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر کے سوئی۔ رسول بخش سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اخلاقاً

اس سے پوچھنے آجاتا کہ کوئی تکلیف تو نہیں اور اپنی تکلیف بیان کردے... اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ عورت خریدتا بھی تھا اور چھینتا بھی تھا اور یہ اس کی مردانہ حاکمیت اور وڈیرا شاہی کی علامت تھی۔ مائرہ سخت مشکل میں پڑ گئی۔ اگر اس نے کسی لحاظ کے بغیر کہہ دیا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ کیسے بتائے گی کہ مجھے تو آپ کے ہونہار سپوت نے پسند کیا ہے۔ حیدر باپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اور خود مائرہ بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ رسول بخش اسے بہ زورِ بازو بھی حاصل کرسکتا تھا اگر وہ اپنی زندگی کے مقاصد کو دیکھتی تو فیصلہ باپ کے حق میں کرتی لیکن برائے فروخت ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اسے کوئی بھی چوڑا اچمار، اندھا کانا بوڑھا خرید لے اور وہ اس کی ہوجائے۔ وہ تو جوان اور خوب صورت تھی۔ اسے زندگی کا ساتھی اپنے جیسا ہی درکار تھا اور چوائس اس کے پاس تھی۔

جس کا ڈر تھا، وہ دھماکا بالآخر دوسرے روز ہوگیا۔ دلہن کی رخصتی ہوچکی تھی اور اگلی صبح سے مہمانوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ حیدر بخش بہت خوش تھا کہ مائرہ نے جھوٹ بول کے اس کے گھر میں دو دن گزارے۔ وہ رات کو مائرہ سے چھپ کر ملنے آتا تھا۔ اپنے گھر میں اسے خطرہ زیادہ محسوس ہوتا تھا کہ بنی بنائی بات بگڑ نہ جائے۔ حالانکہ بات بگڑ چکی تھی۔ وہ تو ساری رات مائرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہتا مگر دن بھر شادی کی مصروفیات کے بعد مائرہ کا تھکن اور نیند سے بُرا حال ہوتا تھا۔ وہ ایک دو گھنٹے بعد اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کے چلا جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھا۔ اس نے زبردستی نہ پہلے کی تھی اور نہ اب اس گھر میں جہاں اسے تمام مواقع میسر تھے۔

دروازے پر دستک سن کے مائرہ نے اس یقین کے ساتھ دروازہ کھولا تھا کہ باہر حیدر بخش ہوگا۔ جب اس کا باپ دّرانہ وار اندر آیا تو مائرہ کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی یوں بجانی شروع کی جیسے آگ بجھانے کے لیے جانے والی فائر بریگیڈ کی گاڑی بجاتی گزرتی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیوں آیا ہے۔ وہ نشے میں تھا اور اس کی سرخ آنکھوں میں ہوس کا ننگا جذبہ اپنی ساری بدنمائی کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مائرہ پنجرے میں پھنسی چڑیا تھی جسے شاہین نے دبوچ لیا تھا۔ یہ تاج محل اس کا تھا۔ طاقت اور اختیار کا مالک وہ تھا۔ مائرہ چیخ پکار کرتی تو سنتا کون۔ شاید باہر بھی اسی کے پہرے دار متعین ہوں گے۔

وہ صبح تک مائرہ کے ساتھ رہا اور اس کے آنسو پونچھتا رہا۔ ”دیکھو... تمہاری آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ تم تو اب رانی بنوگی۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا اور ہم آج کل کے لڑکوں کی طرح نہیں کہ مطلب نکالا اور چلتے بنے۔ ہم قول پر جان دیتے ہیں۔ اب تم سے وعدہ کیا ہے شادی کا تو شادی ہوگی۔ ساری دنیا دیکھے گی کس کی مجال ہے جو روکے۔“

صبح حیدر بخش کے ساتھ واپس جاتے ہوئے مائرہ وہ نہیں تھی جو آتے ہوئے تھی۔ حیدر نے کئی بار پوچھا کہ تم چپ کیوں ہو تو اس نے ٹال دیا کہ رات نیند نہیں آئی۔ جو سچ تھا اور تھکن کو اس کی وجہ بتایا۔ یہ بھی سچ تھا کہ مائرہ کے لیے آزمائش کا اصل مرحلہ آگے تھا۔ رسول بخش اگر اس کا باپ نہ ہوتا تو مائرہ اس حادثے پر خاموشی کا پردہ ڈال کے بھول جاتی لیکن اب اچانک حیدر بخش اس کے لیے شجرِ ممنوعہ ہوگیا تھا۔ وہ رسول بخش کو انکار کرسکتی تھی لیکن حیدر بخش کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی تھی۔ نہ یہاں، نہ کہیں اور جاکے۔ یکلخت وہ جیتی ہوئی بازی ہار گئی تھی۔ یہ ایک حادثہ تھا جس کی نہ پیش بندی ممکن تھی اور نہ اس سے بچا جاسکتا تھا۔ بس اچانک ایک موڑ آیا اور سب ختم۔ چنانچہ اب سوال یہ نہیں تھا کہ حیدر بخش کا کیا ہوگا؟ سوال یہ تھا کہ اس کا اپنا کیا بنے گا؟ وہ کہاں جائے گی؟ بات ختم ہونے والی نہیں تھی۔ رسول بخش کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ وہ شادی پر اصرار کرے گا۔ وہ مائرہ کے گھر بھی پہنچ سکتا تھا۔ حیدر بخش مقابلے سے ناک آؤٹ ہوچکا تھا۔

تین دن طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے وہ سوچتی رہی کہ اب حیدر بخش کو کیا بتائے اور کیسے... اس نے اپنا موبائل فون بھی بند کر رکھا تھا۔ وہ حیدر بخش کو حقیقت بتادیتی تو نتیجہ نہ جانے کیا نکلتا۔ بیٹا اسی وقت ریوالور لے کے جاتا اور باپ کو شوٹ کردیتا۔ مسئلہ اور الجھ جاتا۔ شاید اس کا نام تصویر کے ساتھ خبروں کی زینت بنتا جس میں دائیں بائیں قاتل اور مقتول کی تصاویر ہوتیں۔ عنوان سب کے اپنے اپنے ہوتے۔ میڈیا والے تو آج کل سنسنی خیزی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کسی ٹی وی چینل پر دلچسپ کمنٹری کے ساتھ کوئی گانا بیک گراؤنڈ میں چلتا۔ حیدر بخش تو بعد میں ضمانت بھی حاصل کرلیتا اور بیوروکریسی کی پشت پناہی سے کیس بالآخر سردخانے میں چلا جاتا۔ خود مائرہ کے خاندان پر کیا گزرتی؟ پروفیسر ابراہیم صاحب تو شارٹ کٹ اختیار کرتے۔ بدنامی اور بے عزتی کون فیس کرے۔ چلتے ہیں عدم آباد... عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن... دو عزت سے گزر گئے تو دو بے عزتی کے ساتھ گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔

تین دن اس نے حیدر بخش کی کوئی کال موصول نہیں کی تھی اور اسے ڈر تھا کہ وہ ہجراں نصیب مجنوں کہیں کوئے لیلیٰ میں نہ آنکلے۔ رسول بخش تو مجنوں کا بھی باپ تھا اور اسے کسی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ سیدھا پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوجائے اور حکم دے کہ اسے اپنی فرزندی میں قبول کرلیں۔ وہ درخواست کرنے والا آدمی نہیں تھا اور نہ انکار سننے والا۔

بہت سوچنے کے بعد مائرہ نے طے کیا کہ اسے وقت لینا چاہیے۔ وقت ہر زخم کا درماں ہے۔ کیا پتا کچھ کوشش کر کے وہ باپ بیٹے دونوں سے نجات پالے۔ تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مائرہ نے بہتر سمجھا کہ وہ رسول بخش سے فون پر بات کرلے۔

مائرہ کی آواز سن کر اس کی آواز سے ہوس ٹپکنے لگی۔ ”ارے جانِ من... یقین نہیں آتا کہ یہ تم مخاطب ہو... ہم تو ترس گئے تھے تمہاری آواز کو بھی۔“

”سائیں! ایک گزارش تھی۔“

”آپ حکم کرو جی... جان لینے کا بولو تو جان حاضر... ہم کو آپ کی ایک نظر کا اشارہ چاہیے... آپ نے ہماری گزارش پر کیا سوچا؟“

”سائیں! اب سوچنے کو کیا ہے... آپ نے جو کیا...“

”کیوں نہیں جی... ہم تو بے قرار بیٹھے ہیں۔“ اس نے بات کاٹ دی۔

”سائیں! آپ نے اپنی مرضی کی... اب مجھے اپنی مرضی بتانے کے لیے تھوڑا ٹائم چاہیے... آپ کے لیے یہ جتنا آسان تھا میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے... آپ حاکم اور مالک ہیں... میں اس خاندان کی ایک مجبور اور کمزور لڑکی ہوں... جو اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی... آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات کو؟“

”سب سن رہے ہیں ہم... آپ بولو۔“

”میرے خود راضی ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے اپنے ماں باپ کو بھی راضی کرنا ہے اور خاندان والوں کو بھی۔“

”ان کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے جی... یہ تو ان کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔“

”میرے خاندان والے آپ کی طرح نہیں سوچ سکتے۔ ہماری اخلاقی قدریں مختلف ہیں... آپ کو معلوم ہے، پہلی بات میرے ماں باپ کے بارے میں کیا کہی جائے گی؟ یہی کہ انہوں نے لڑکی بیچ دی۔“

”بابا یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ ہم شرع کے مطابق نکاح کریں گے... سارے حقوق دیں گے۔“

”مگر یہ بات اپنی جگہ رہے گی کہ آخر ایسی کون سی مجبوری تھی کہ لڑکی کو دگنی سے زیادہ عمر کے مرد سے بیاہ دیا گیا اور وہ بھی غیر... دوسری زبان بولنے والے... جن کا رہن سہن بھی مختلف ہے... آپ کی دولت اور آپ کا اثر رسوخ ایک طعنہ بن جائے گا ہم سب کے لیے... اسی لیے کہتی ہوں کہ مجھے تھوڑا وقت دیں۔“

”اچھا تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ بس ایک بات بتا دو... یہ کوئی ٹالنے والی بات تو نہیں ہے نا... ہمیں چکر دے کر تم نکل جاؤ کسی اور کے ساتھ باہر؟“

”نہیں سائیں! اب اس کی گنجائش نہیں چھوڑی آپ نے... میں آپ کی ہوچکی ہوں... آپ کے گھر میں بھی آجاؤں گی ایک دن۔“

مائرہ کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ اس نے پھر کالج جانا شروع کیا۔ اگلا مرحلہ حیدر کو بدظن کرنے کا تھا۔ اس کی کوئی ترکیب ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ تو دیوانہ ہے... کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑے گا... کوئی بہانہ قبول نہیں کرے گا۔ اسے شک بھی ہوگا کہ مائرہ نے کسی اور کو پسند کرلیا ہے یا اس کی شادی خاندان میں کسی سے طے کردی گئی ہے۔ دونوں باتیں غلط ثابت ہوجائیں گی۔ وہ معلوم کرلے گا کہ مائرہ کی بے اعتنائی کا کوئی سبب نہیں۔ کسی وجہ کے بغیر وہ اچانک اسے برطرف تو نہیں کرسکتی کہ جاؤ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی جیسے وہ عاشقِ زار کی عارضی اسامی پر یا کنٹریکٹ پر محبت کررہا تھا۔

حالات نے ایک اور پلٹا کھایا... مائرہ کو اس کی قسمت ایک طے شدہ سمت میں دھکیل رہی تھی... شادی کے موقع پر رسول بخش کی حویلی میں پیش آنے والا حادثہ پہلا سیلابی ریلا تھا جو اس کی مستقبل کی تمام منصوبہ بندی کو بہالے گیا۔ اس نے کامیاب خوش حال اور مطمئن زندگی کے خوابوں کا جو نقشہ بڑی غیر جذباتی سوچ اور کاروباری ذہانت کے ساتھ مرتب کیا تھا، یوں غارت ہوگیا جیسے ایک طوفانی لہر کے سامنے بڑے مضبوط بنیادوں پر استوار محل بھی ریت کا گھروندا ثابت ہو۔

جب اس کے ردِعمل کی جذباتی شدت کم ہوگئی تو اس کے سامنے دو راستے آگئے۔ حیدر بخش کسی بھی راستے پر اس کا ہمسفر نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ انتقام کے چکر میں نہ پڑے اور رسول بخش سے جرمانے کے طور پر اپنا معاوضہ وصول کرے کہ بعد میں جب یہ جذبات کی دیوانگی کا دورہ ختم

ہوتو وہ سر پر ہاتھ رکھ کے روئے کہ اس نے کیا بے وقوفی کی۔ ایک عورت کی اتنی بڑی قیمت ادا کردی۔ وہ مس یونیورس ہی کیوں نہ سہی۔ اسے گلے کا ڈھول بنالینا اور مجبور ہو کے بجاتے رہنا... یہ مزہ نہیں سزا ہے۔ رسول بخش پر آج جو نشہ غالب تھا، وہ زیادہ دن رہنے والا نہیں تھا۔ کوئی بھی نشہ ہو، ایک وقت کے بعد اتر جاتا ہے۔ مائرہ ابھی فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ نشہ اترنے کے بعد نہیں... پھر تو وہ کہے گا کہ بی بی! صبر کرو اور بھول جاؤ اس حادثے کو... زندگی حادثات سے عبارت ہے۔

لیکن مائرہ نے چانس کا گیم نہیں کھیلا۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار کے فارمولے پر عمل کیا۔ حیدر بخش کے اخراج کے بعد اس کا باپ زیادہ منافع بخش اسامی تھا جو ابھی اس کے قبضے میں تھا۔ اس فیصلے پر عمل کرنے میں پھر قسمت نے اسے ایک دھکا اور دیا۔ حیدر بخش اچانک غائب ہوگیا۔ اس کے فون آنے بند ہوگئے۔ مائرہ کو فون کرنے پر اس کا نمبر بند ملا۔ اس کے کسی ایس ایم ایس کا جواب نہیں آیا۔ دس دن بعد وہ آئی بی اے گئی جہاں وہ ایم بی اے کے تیسرے سمسٹر میں تھا۔ کسی دشواری کے بغیر اسے معلوم ہوگیا کہ وہ یہاں بھی نہیں ہے اور کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کے دیگر زنانہ و مردانہ دوست بھی اسے تلاش کررہے تھے لیکن سب کی کوشش کا حاصل ناکامی تھی۔ اگر وہ حویلی میں تھا، تب بھی جواب تو دے سکتا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ سے بغیر اطلاع اور چھٹی کے غائب ہونا تو ڈراپ آؤٹ ہونے والی بات تھی۔ جب حاضری پوری نہیں ہوگی تو سمسٹر گیا... اور سمسٹر کسی بڑے حادثے کے بغیر کون بے وقوف چھوڑتا ہے۔ پاکستان کے اس سب سے معتبر ادارے میں داخلہ تو سب کا خواب ہوتا ہے مگر داخلہ صرف میرٹ پر خوش نصیبی سے ہی ملتا تھا۔

ایک فون نمبر مائرہ کے پاس تھا جو کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس نے رسول بخش کو فون کیا۔ ”سائیں! کیسے ہو آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے... آپ کی آواز سنی تو دل کو تھوڑی خوشی ملی ورنہ...“

”ورنہ کیا؟ سب خیر تو ہے نا سائیں؟ آپ کچھ پریشان ہو... حیدر سے بھی بات نہیں ہوسکی حالانکہ یہاں تھا تو کبھی فون کرلیتا تھا یا ملنے آجاتا تھا۔“

رسول بخش نے ”کبھی“ کے جھوٹ کو نظر انداز کیا۔ ”اس کی تو شادی کردی ہم نے۔“

مائرہ کو لگا جیسے اس نے جو پلاسٹک کا کھلونا اٹھالیا تھا، وہ بم تھا جو ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ”شادی؟“ اس نے چند سیکنڈ میں صدمے کے ردِعمل پر قابو پالیا۔ ”کمال ہے سائیں! نہ اس نے یاد کیا نہ آپ نے...؟“

”یاد کیا کرتے جی... اچانک ہی سب ہوا... آپ شاید پتا ہو کہ ہمارے بڑے بھائی اسمبلی کے ممبر ہیں... تھے... اللہ ان کی مغفرت کرے۔“

”کیا... ان کا انتقال ہوگیا؟“

”ہاں مائرہ جی! بیمار تھے وہ کافی دن سے... ان کی لڑکی ہمارے حیدر سے بیاہی جانی تھی۔ یہ تو بچپن سے طے تھا۔ اب انہوں نے آخری وقت میں کہا کہ میرے سامنے رخصتی ہو... حیدر ایم بی اے کرلیتا... اور وہ لڑکی اولیول...“

مائرہ چونکی۔ ”وہ اولیول کررہی تھی؟“

”ہاں جی... اپنے کراچی گرامر سے دو چار مہینے میں کرلیتی... مگر بڑے بھائی کی خواہش کے آگے امتحان کی کوئی حیثیت کیسے ہوسکتی ہے اور پھر یہ آخری خواہش تھی۔ گھر ہی گھر میں سب کرلیا۔ تیسرے دن ان کا انتقال ہوگیا۔ پرسوں ان کا سوئم تھا۔ آپ شاید اخبار نہیں دیکھتی ہو؟“

مائرہ نے اعتراف کیا۔ ”جی... کم ہی موقع ملتا ہے۔ بڑا افسوس ہوا سائیں۔“

”حیدر کی شادی پر؟“ اس نے کمال معصومیت سے کہا۔

مائرہ نے بڑی خوب صورتی سے اس باؤنسر کو کھیل لیا۔ ”اس کا بھی... مجبوری نہ ہوتی تو کتنی دھوم دھام سے کرتے آپ یہ شادی... خیر، بہت اچھا کیا آپ نے... حیدر نے بھی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ میں آپ کے بڑے بھائی صاحب کے انتقال پر افسوس کا اظہار کررہی تھی۔ ابھی چہلم تک تو آپ بھی ادھر ہی رہو گے... انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“

مائرہ کے لہجے میں جو امید دلانے والا انداز تھا، اس نے رسول بخش کے دل میں دبی چنگاری کو ہوا دینے کا کام کیا۔ ”بات یہ ہے مائرہ! زندگی اور موت سب قدرت کے فیصلے ہیں... ہم ان معاملات میں زیادہ جذباتی ہیں... میں نے سعودی عرب میں دیکھا تھا۔ وہ روتے پیٹتے نہیں، صاف کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی۔ اس پر شور شرابا کیسا... تیسرے دن سب بھول کے اپنے معمولات میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ہم ان جیسے تو نہیں بن سکتے مگر یہ ٹھیک ہے کہ دنیا کے کام نہیں رکتے۔ جیسے گھڑی کی سوئی نہیں رکتی۔ ہم بھی کل پرسوں آجائیں گے... کاروبار کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ مالک کی نظر نہ ہو تو ماتحت گدھ بن جاتے ہیں... حرام کھانے والے سب کھا جاتے ہیں۔“

”اللہ آپ کو صبر اور حوصلہ دے۔ آپ کے بھائی کی سیٹ پر اب ان کے مخالف آجائیں گے۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو آپ... ہم کیا مر گئے ہیں مائرہ! ہمارے ہوتے یہ سیٹ کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ ضمنی انتخاب میں ہم خود کھڑے ہوں گے۔ شاید نوّے دن میں کرانا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک مصروفیت ہوگی۔ اگر آپ پرسوں آجاؤ آفس تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”مہربانی کیسی سائیں! مجھے تعزیت کے لیے آنا تو تھا۔ حویلی میں ہی آجاتی۔“

”چلو آپ بعد میں ایک ہی دفعہ آجانا۔“ وہ بولا۔ ”آپ کے آنے سے دل کو بڑی تسلی ملے گی۔“

”میں پرسوں آؤں گی سائیں۔“

”چھٹی کے وقت گاڑی کالج کے دروازے پر موجود ہوگی۔ آپ تو پہچانتی ہو حیدر کی گاڑی؟“ اس نے آخری تیر چلایا اور فون بند کردیا۔ بھائی کی موت نے ایک غم اور تین خوشیاں دی تھیں۔ حیدر کی شادی... اسمبلی کی رکنیت اور مائرہ... اللہ سائیں بڑا مہربان ہے۔

تیسرے دن مائرہ نے آفس میں قدم رکھا تو اس کی شان و شوکت نے اسے دم بخود کردیا۔ رسول بخش نے دیکھا کہ مڈل کلاس کی اس ملکۂ حسن کو دولت مندی کی چکاچوند نے مسحور کردیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے مائرہ کو مزید مرعوب کیا۔ جب وہ مائرہ کو اپنی شاندار پراڈو میں لنچ کرانے لے گیا تو اسٹاف میں کسی کی ہمت نہ پڑی کہ لبوں پر طنزیہ معنی خیز مسکراہٹ بھی لائے۔ وہ سب دیکھتے تھے اور سب جانتے تھے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے باتوں کے سوا... اس کی انہیں اجازت تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ رسول بخش کے کانوں تک کوئی بات نہ پہنچے۔

مائرہ نے فیصلہ کن پیش قدمی کی تھی اور رسول بخش کی نظر نے اس کے انداز و اطوار میں فیصلہ پڑھ لیا تھا چنانچہ اس نے پہلے عشق کے مراحل میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ کوئی ٹین ایجر نہیں تھا۔ اپنے بیٹے کی طرح... اس نے پہلے مائرہ کو تفصیل سے اپنی زمین... کاروبار اور آمدنی کی تفصیلات سے مرعوب کیا۔ مائرہ سنبھل گئی... اسے بڈھے کی یہ خوش فہمی دور کردینی چاہیے کہ جس کا نشانہ لیا تھا، وہ شکار زخمی ہو کے اس کے قدموں میں آگرا ہے اور منتظر ہے کہ وہ تکبیر پڑھ کے اس کو حلال کرے... یہی وقت تھا جب بارگیننگ کی جاسکتی تھی لیکن ایسے کہ بارگین نہ لگے۔

کھانا ختم ہوا تو رسول بخش نے سوال داغ دیا۔ ”مائرہ! پھر کیا سوچا تم نے؟“

”کس بارے میں؟“ وہ معصوم انداز میں چونکی۔

”ایک ہی سوال ہے ہمارا تو... آپ کب آرہی ہو ہمارے دل سے نکل کے حویلی میں؟“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں ابھی اٹھ کے آپ کے ساتھ چل پڑوں اور آپ کی حویلی کے ملازم مولوی کے سامنے بیٹھ جاؤں... حویلی کا تجربہ میرے لیے اچھا نہیں تھا۔ میں دوبارہ وہاں جانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے آج بھی آپ کی بیگم اور دوسری خواتین کی نظریں اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہوتی ہیں سائیں... میں صرف اپنی نظر میں ذلیل نہیں ہوئی تھی۔ اس حویلی کی خادمہ تک مجھ پر ہنستی محسوس ہوتی تھی۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔

”مائرہ! پلیز... آپ بہت جذباتی ہورہی ہو۔ یہ سب آپ کا خیال ہے ورنہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ خیر، یہ مجھے بھی پتا تھا کہ حویلی میں آپ کا گزارہ نہیں ہوگا۔ میری پہلی بیوی بھی اس کی اجازت نہیں دے گی۔ آپ کے لیے شہر میں کوٹھی ہے... ادھر سب کچھ ہوگا... نوکر چاکر گاڑی۔“

”وہاں سے آپ کتنے عرصے بعد نکالیں گے مجھے... کسی اور کو لانے کے لیے؟“ مائرہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

وہ شاک سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہم آپ سے شادی کررہے ہیں... یہ آپ کو گھر میں ڈالنے کی بات نہیں ہے... کوٹھی آپ کے نام پر ہوگی۔ آپ نکال سکتی ہو ادھر سے ہم کو...“ وہ مسکرانے لگا۔

مائرہ نے اندر ہی اندر سکون کا پہلا سانس لیا۔ یہ مرحلہ نمبر ایک تھا جو سب سے بڑا تھا۔ اب چھوٹی باتوں سے کیا فائدہ کہ گاڑی بھی میری پسند کی اور میرے نام پر ہونی ضروری ہے۔ اسے میں خود فرنش کراؤں گی... دوسرا اہم مسئلہ تھا آمدنی کا... فوری طور پر یہ سوال کرنا مناسب نہ تھا کہ میرے نام پر بینک میں کتنی رقم ہوگی؟ حق مہر یا ماہانہ خرچ کیا ہوگا؟

”اب کیا سوچ رہی ہو؟“ رسول بخش نے بے چینی سے پوچھا۔

”ابھی تو صرف باتیں ہیں سائیں... دیکھوں گی آپ کتنے سیریس ہیں... آفٹر آل یہ میری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔“

”بہت جلد دیکھ لو گی... ایک مہینے کے اندر... یہ ایک قانونی ضرورت ہے ورنہ کوٹھی کل آپ کی ہوتی۔ میں وکیل کو بولتا ہوں کاغذات بنوائے اور اخبار میں نوٹس وغیرہ شائع کرائے۔“

مائرہ مسکرائی۔ ”اب ایسی جلدی بھی نہیں سائیں!

میرے فائنل کے پیپرز تو ہو جائیں... میں بی اے کر لوں۔“

رسول بخش نے الٹا ہاتھ مائرہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”بی اے کر کے کیا کرو گی مائرہ؟ ڈگری چاہیے تمہیں تو بولو... مل جائے گی۔“

”کیسے مل جائے گی جب میں امتحان ہی نہیں دوں گی؟“

وہ زور سے ہنسا۔ ”میری بھولی بلبل... اس کو چھوڑو... بندہ آم کھاتا ہے پیڑ نہیں گنتا۔ اور تم نے کیا دیکھا نہیں کالج میں اور سنا نہیں... بغیر امتحان دیے بھی ڈگری مل جاتی ہے۔ تمہیں بھی مل جائے گی۔ یہ مت سوچو کہ کیسے... کوئی امتحان دے گا تمہاری جگہ یا تمہاری کاپیاں آ جائیں گی گھر پر... تم بتاؤ نمبر کتنے چاہئیں؟ فرسٹ کلاس چاہیے تو کوئی مسئلہ نہیں... سب اپنے زر خرید ہیں مائرہ... نمبر لگانے والے... ڈگری بنانے والے...“

”آپ جعلی ڈگری دلوائیں گے مجھے؟“

”جعلی؟ جو اسے جعلی بولے مجھے بتانا... میں اسے تصدیق کرا کے دکھا دوں گا یونیورسٹی سے... یہ فکر تم چھوڑ دو... سمجھو تم گریجویٹ ہو گئیں۔“

مائرہ کے دل کو بڑا اطمینان ملا۔ ”پھر بھی... مجھے اپنے گھر والوں کو راضی کرنا ہو گا اور جب تک امتحان نہیں ہوتے کالج بھی جانا پڑے گا... امتحان کا ڈراما بھی کرنا ہو گا۔“

وہ ہنسا۔ ”ڈراما... یہ ٹھیک بولا تم نے... ڈراما ضرور کرو لیکن جانے کے لیے کالج ضروری ہے؟“

”پھر کہاں جاؤں... سڑکوں پر ماری ماری پھروں؟“

”تم ہمارے پاس آؤ... ہمارے آفس کی شان بڑھاؤ... ہمارے دل کو خوشی دو۔“

”میں آفس آؤں... کس حیثیت سے؟“

”حیثیت ہم پکی کر دیتے ہیں... تم ہماری سیکریٹری... تمہاری تنخواہ اور مراعات سب تمہاری مرضی کے مطابق... یہ بھی پکا ڈراما ہو گا۔ ایچ آر والے تمہیں اپائنٹمنٹ لیٹر دیں گے۔ اس میں سب لکھا ہو گا۔ تمہاری تنخواہ تمہارے اکاؤنٹ میں جائے گی... گاڑی کون سی چاہیے بولو... کلر بھی بتاؤ... تمہارے نام پر خریدی جائے گی۔“

مائرہ نے انکار کر دیا۔ ”ابھی نہیں سائیں... میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے گھر والوں کو راضی کر لوں۔“

”چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی... تب تک میری گاڑی تمہاری۔“

یہ سب پلاننگ سے ممکن نہیں تھا۔ خوش قسمتی مائرہ کو بڑھا رہی تھی۔ مسلسل آگے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اس کے لیے حالات کو سازگار بنا رہی تھی۔ اس کے راستے کی رکاوٹیں دور کر رہی تھی۔ بس اس کے ایک اقرار نے سارے ہفت خواں فوری طے کر لیے تھے۔ آج تقدیر اس کی مٹھی میں تھی۔ کل کی سوچنا بے وقوفی تھی۔ یہ امید تو خود اسے بھی نہیں تھی کہ اسے کچھ مانگنا نہیں پڑے گا۔ کوئی چال نہیں چلنی پڑے گی۔ کوئی عیاری نہیں دکھانی پڑے گی۔ رسول بخش خود اس کے قدموں میں سب ڈال دے گا۔

مائرہ نے جب اپنے آفس میں قدم رکھا تو وہ بہت کچھ سوچ چکی تھی اور طے کر چکی تھی۔ گو اس نے خود کو رسول بخش کے حوالے کر کے بڑی عقل مندی کا فیصلہ کیا تھا اور بہت بروقت لیکن بہت کچھ ابھی طے ہونا باقی تھا جو اس کے محفوظ مستقبل کا ضامن ہو... یوں تو ایک وہی شعر سب سے بڑی حقیقت ہے کہ... سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں... مگر کیا دنیا نے آنے والے دنوں کی فکر کرنا چھوڑ دیا ہے؟ اس کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا لیکن وہ ایسی عجلت دکھانا نہیں چاہتی تھی کہ اس میں لالچ نظر آئے۔

اب مائرہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں اس کو ہر قدم بہت محتاط ہو کے چلنا تھا۔ اس نے اپنی ایک قیمت طے کر لی تھی۔ اس قیمت کے وصول ہونے تک اسے خریدار کو امید کے سوا کچھ دینا نہیں تھا۔ صرف اس کے آتشِ شوق کو ہوا دینی تھی ورنہ مقابلے پر رسول بخش جیسا کاروباری تھا۔ کیش ہونے تک اس کے وعدے وہ چیک تھے جو باؤنس بھی ہو سکتے تھے۔

مگر آج احسن کو اچانک آفس میں اپنے مقابل پا کے مائرہ نے محسوس کیا کہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے جب اسے پروفیسر ابراہیم کو بتانا پڑے گا کہ حقائق کی دنیا اس دنیا سے کتنی مختلف ہے جس میں وہ رہتا ہے۔

رسول بخش کے آنے سے مائرہ کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ وہ ابھی تک باس کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ اٹھنے لگی تو رسول بخش نے ہنستے ہوئے روک دیا۔ ”ارے بیٹھو بیٹھو... یہ بھی تمہاری کرسی ہے۔“

”نہیں سائیں! ہم تو تنخواہ دار ہیں... مالک آپ ہو۔“

رسول بخش نے اسے زبردستی بٹھا دیا اور خود سامنے بیٹھ گیا۔ ”تم کیوں دل توڑنے والی بات کرتی ہو۔ ارے بابا تم ہمارے جان و دل کی مالک ہو تو سب کی مالک ہو۔“

”سب زبانی جمع خرچ ہے سائیں... اس سے حقیقت نہیں بدلتی... میں سیکریٹری ہوں آپ کی اور کچھ

نہیں۔“

”خیر سے آج مزاج کچھ بگڑا ہوا ہے؟“

”بس سائیں! سوچنا تو پڑتا ہے اپنے مستقبل کے بارے میں۔“

”فکر کی اب کیا بات ہے... تم نے دیکھا کہ مکان ہم نے تمہارے نام کر دیا۔ کوٹھی دیکھ لی تم نے... ابھی کرائے دار ہیں اس میں... ان کو بھی نوٹس دے دیا ہے... شادی کے بعد ہم ادھر رہیں گے... گاڑی بھی بک ہو چکی ہے۔“

”ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں رسول بخش! یہ جو تمہاری محبت ہے آج... یہ شادی کے بعد کیا اتنی ہی رہے گی؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”ارے ہم تو ڈر گئے تھے۔ محبت کی کیا بات کرتی ہو۔ جب سے دیکھا ہے تمہیں ہر روز ہماری محبت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تو سمجھو ہم مجنوں ہو گئے ہیں... لیلیٰ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔“

”سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں شادی سے پہلے... پھر محبوبہ ہو جاتی ہے بیوی... جو سر پر چڑھ کے رہتی تھی وہ بن جاتی ہے پاؤں کی جوتی... ایک گھر اور ایک گاڑی کیا ضمانت بن سکتی ہے ساری زندگی کے لیے...؟“

”ایسی کوئی بات نہیں جان... ہم بدلنے والے نہیں ہیں۔“

”سب سے پہلے تو یہ ہو گا جی کہ مجھے یہ سیٹ چھوڑنا پڑے گی۔ آپ جیسا عزت دار کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی شریکِ حیات دفتر میں سیکریٹری ہو... یہ جگہ کسی اور کو ملے گی... جیسے پہلے ملتی رہی ہے... اس کے علاوہ آپ ہو جائیں گے اسمبلی کے ممبر بھی... تو میڈیا کی نظر میں ہوں گے اور ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ یہ بات پبلک میں ڈسکس ہو... آپ کی روایات سے بغاوت کروں گی تو میری چھٹی... پھر میرا کیا مستقبل...؟“

”اچھا ابھی بتاؤ اور کیا ضمانت چاہیے تمہیں اپنے مستقبل کے لیے؟“

”آپ خود سوچ سکتے ہیں سائیں... میرا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا... مجھے گھر والے بھی قبول نہیں کریں گے اور اس جعلی ڈگری کے ساتھ مجھے اور کہیں چھوٹی موٹی نوکری مل جائے تو کیا وہ بھی آپ کی بدنامی کا سبب نہیں بنے گی؟“

”صاف بولو یہ خوف تمہارے دل سے کیسے دور ہو گا؟“

”ہاں، میرے لیے تو ابھی وقت ہے۔ بعد میں نہ آپ پوچھیں گے نہ میرے کہنے سے کچھ ہو گا۔ مجھے مستقل آمدنی کی ضمانت چاہیے۔ یہ نوکری تو اسی دن ختم ہو جائے گی جس دن آپ مجھے اپنے گھر لے جائیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں... ایسی کیا ضمانت ہو گی؟“

”بہت سادہ اور آسان بات ہے سائیں... آپ نے لائف پارٹنر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ بزنس پارٹنر بھی بنا لیں تو میرے خدشات دور ہو جائیں گے... مالک اور حاکم پھر بھی آپ ہی ہوں گے۔“

رسول بخش اسے دیکھتا رہا۔ یہ لڑکی اس کی توقع سے زیادہ ہوشیار تھی۔ اس کو اپنی قیمت یکمشت وصول کرنا منظور نہ تھا۔ شہری لڑکیاں مہنگی ضرور ہوتی ہیں مگر اتنا کاروباری ذہن رکھنے والی یہ لڑکی قابو نہیں آ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی فتح مکمل ہو گئی لیکن اب اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ لڑکی ایک دفاعی حصار کے اندر بند ہو گئی ہے اور اس کی پیش قدمی رک گئی ہے۔ محرومی اور احساسِ شکست سے اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ اور نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی آتشِ شوق بھڑکتی جا رہی تھی۔ عورت تو اس کے لیے ایک کموڈیٹی تھی... استعمال کی ایک چیز... جب جہاں پسند آئی، لے لی۔ اتنا مجبور اور بے بس تو وہ اپنی جوانی میں نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ اب پیچھے ہٹنا اس کے اختیار کی بات ہی نہیں رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار ہونے والی محبت کی اسے کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ حسن اگر دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے تو خرابی اس کی نظر نے پیدا کی۔ اسے مائرہ کے مقابلے پر دنیا کی کسی عورت کے حسن و شباب میں ایسی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بعد کا اسے اندازہ نہیں تھا مگر ابھی اس محبت نے واقعی اسے پاگل کر دیا تھا۔

رسول بخش یہ بھی جانتا تھا کہ پہلے یہی حالت اس کے بیٹے کی تھی۔ وہ بھی رئیس زادہ تھا مگر اس متوسط بلکہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی سے محبت اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ ایک تیر سے رسول بخش نے دو شکار کیے۔ حیدر کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور اس کی محبت کے غبارے سے ہوا خود نکل گئی۔ اس کی بیوی بھی کم نہ تھی۔ ناز نخرے اور فیشن میں وہ مائرہ سے بہت آگے تھی کیونکہ اسے ہر شوق پورا کرنے کے لیے کوئی بوائے فرینڈ تلاش نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ سب کچھ افورڈ کر سکتی تھی جو مائرہ اپنے مجنوں سے لیتی تھی۔ دوسرا فیصلہ کن قدم رسول بخش نے حویلی میں ایک رات گزارنے والی مائرہ سے اظہارِ محبت کر کے اٹھایا تھا۔ اس نے کالج کے چھوکروں کی طرح ایس ایم ایس نہیں کیے تھے۔ محبت

بھرے ڈائیلاگ نہیں بولے تھے۔ آہیں بھرنا، تارے گننا سب فضول... اس نے ڈائریکٹ ایکشن لیا تھا۔ پراپرٹی کا تو ایسا ہی معاملہ ہے سائیں... قبضہ سچا دعویٰ جھوٹا... جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ اس نے بھی محبت کا عملی ثبوت پہلے دیا۔ اظہار بعد میں کیا۔ پیمان بعد میں باندھے۔ جو بات محبت کا انجام ہوتی ہے، وہ آغاز بنی... پھر اس نے شادی کی پیشکش کر دی۔ یہ کوئی کوک کی بوتل نہیں تھی کہ پی، پیاس بجھائی اور پھینک دی۔ یہ وہ شراب تھی جس کا نشہ ٹوٹتا تھا تو طلب بے بس کرتی تھی۔

مائرہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کی صورت سے اس کے خیالوں کے سارے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ گھڑی فیصلہ کن تھی جس کو آنا تھا۔ مائرہ نے اس کے لیے گیم پلان بڑی ذہانت سے تیار کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے سارے کارڈ شو کر دیے تھے لیکن ابھی ٹرمپ کارڈ نہیں کھیلا تھا۔ “پریشان ہو گئے نا سائیں! محبت نے آزمائش میں ڈال دیا۔”

رسول بخش چونکا۔ “جو تم سوچ رہی ہو... ناممکن ہے... تم برابر کی پارٹنر کیسے بن سکتی ہو؟”

“میں نے برابر کی کب کہا سائیں... مرد، عورت برابر کیسے ہو سکتے ہیں... بیوی کے مقابلے میں شوہر کا مرتبہ اونچا ہے۔”

“پھر؟ مستقل آمدنی کتنی چاہیے تمہیں... جو کچھ میرا ہے صرف میرا تو نہیں... میرے بیوی بچے وارث ہیں۔”

“ایک بیوی وارث ہے تو دوسری کیا لاوارث رہے گی؟ شرع کے مطابق آٹھواں حصہ ایک کا ہو گا تو دوسری کا بھی اتنا تو ہونا چاہیے۔”

“وہ میرے مرنے کی صورت میں ہو گا۔” رسول بخش بگڑ گیا۔

“ابھی آپ کے مرنے کی عمر نہیں۔ آپ کے ہوتے مجھے کس بات کی فکر... لیکن سائیں! زندگی کا کیا بھروسا... میں نہ رہی تو آپ کو کیا فرق پڑے گا مگر مجھے پوچھنے والا کون ہو گا؟ مجھے معلوم ہے حویلی کے اندر میری کیا وقعت ہے۔ سب کی نظر دیکھی ہے میں نے۔”

“آٹھواں حصہ... یعنی ساڑھے بارہ فیصد کی پارٹنر بننا چاہتی ہو تم... اگر میں انکار کر دوں... پھر؟”

“آپ مالک ہو سائیں... آج بھی ہو اور کل بھی رہو گے... میں زور زبردستی نہیں کر سکتی۔ میں خاموشی سے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی اور اس دفتر سے بھی۔ شاید یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں۔ کیسے مقابلہ کروں گی میں لوگوں کی نظر کا... ان کی باتوں کا... جب نتیجہ سامنے آئے گا۔”

وہ چونکا۔ “نتیجہ... کیسا نتیجہ؟”

“جو آپ کے اور میرے تعلق کا ہے... اس محبت کا جو آپ نے مجھ سے کی۔” مائرہ نے اپنا ٹرمپ کارڈ چلا دیا۔

رسول بخش دم بخود بیٹھا رہا۔ “یہ... تم نے پہلے نہیں بتایا کبھی۔”

“سائیں! مجھے بھی پہلے کہاں پتا تھا۔” وہ نظر جھکا کے دکھی لہجے میں بولی۔

“تم بلیک میل کرنا چاہتی ہو مجھے؟” وہ گرم ہو گیا۔

وہ رو پڑی۔ “اتنی ہمت کہاں ایک غریب لڑکی میں۔ آپ بااثر ہیں، طاقتور ہیں۔ شکل دیکھنا تو دور کی بات ہے، آپ میرا نام بھی نہیں سنیں گے دوبارہ۔”

رسول بخش کو یوں لگتا تھا جیسے وہ جیتی ہوئی بازی ہار جائے گا۔ مائرہ نے جو ٹرمپ کارڈ پھینک دیا تھا، وہ اپنا کام کر گیا تھا۔ مائرہ یہ بھی جانتی تھی کہ رسول بخش جیسے انا پرست مرد کو طاقت سے مطیع نہیں بنایا جا سکتا۔ ہٹلر جیسے مرد کو نکیل ڈالنے والی عورت ایوا براؤن کوئی حسینۂ عالم نہیں تھی۔ شہزادہ چارلس کا دل ڈیانا جیسی عورت نہ جیت سکی جس نے اپنے حسن بے مثال کی جلوہ نمائی سے ایک عالم کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ مگر ایک معمولی شکل و صورت والی بیوہ مسز پارکر نے برطانوی تاج و تخت کے وارث کو اسیر کیے رکھا اور بالآخر اپنا لیا۔ فارسی کا مقولہ ایک صداقت ہے کہ جو عورت مرد کی غلام بن کر رہتی ہے، وہی اس پر حکومت کرتی ہے۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر...

مائرہ کے آنسوؤں نے رسول بخش کے دل کو موم کی طرح پگھلا دیا۔ اس نے دوسری طرف جا کے مائرہ کے آنسو پونچھے۔ “پلیز مائرہ! یہ مت کرو۔ میں سوچے سمجھے بغیر بول گیا۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔ یہ وقت ایسا ہے کہ کسی قسم کا اسکینڈل میرا سیاسی مستقبل تباہ کر سکتا ہے... میں نے کاغذاتِ نامزدگی جمع کرا دیے ہیں۔ ضمنی انتخابات کا شیڈول بھی آ چکا ہے اور میرا حریف بہت... ہے۔”

رسول بخش عادت کے مطابق گالی دے گیا تھا مگر اسے احساس نہیں تھا۔ مائرہ نے اس کا ہاتھ بڑی محبت سے تھام لیا۔ “مجھے یقین ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے۔ ہر رات میں نوافل پڑھ کے آپ کے لیے دعا کرتی ہوں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے اور آپ کی کامیابی میری کامیابی... ابھی ساری توجہ الیکشن پر رکھیں۔”

رسول بخش نے سکون کا سانس لیا۔ “میں چاہتا ہوں کہ تم سیاسی کیریئر میں اسی طرح میرا ساتھ دو جیسے نصرت نے بھٹو صاحب کا دیا تھا۔ تم میں ہے وہ صلاحیت... اللہ سائیں کی مہربانی ہو گی تو ایک دن تم چیف منسٹر کی حلف برداری کے وقت میرے ساتھ ہو گی۔”

خواب مائرہ کی آنکھوں میں بھی جاگ اٹھے۔ “انشاء اللہ... میری محبت نہیں زندگی بھی آپ کی ہے سائیں۔”

“ابھی میں کسی کو بھی بکواس کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا ورنہ شادی کا کیا ہے کل ہو سکتی تھی...”

“مجھے کوئی جلدی نہیں سائیں۔” مائرہ نے کافی بنا کے اس کے سامنے رکھی۔

“یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کائیاں اخبار والا تمہارے میرے پیچھے لگا ہوا ہو اور اس کے ہاتھ کوئی خبر یا فوٹو لگ جائے۔ موبائل فون کے کیمروں نے بڑی مصیبت ڈال دی ہے۔ اس دفتر میں کوئی نمک حرام بھی یہ کام کر سکتا ہے، اس لیے کچھ محتاط رہنا پڑے گا۔”

“میں سب سمجھتی ہوں سائیں... آپ فکر مند نہ ہوں۔”

“اس لیے آج کل میں کچھ دور دور رہوں۔ دفتر میں بھی کم بیٹھتا ہوں۔ اس وقت تو خیر سب جا چکے ہیں۔ ابھی جو بات تم نے کی...” وہ کافی ختم کرنے کے لیے رکا۔ “میں تمہاری تشویش کو غلط نہیں کہتا... لیکن جو تم نے کہا... وہ ہو نہیں سکتا۔”

مائرہ کا دل بیٹھ گیا۔ “یعنی... آپ مجھے پارٹنر نہیں بنا سکتے؟”

“نہیں جان... اس میں خاندانی روایات کا مسئلہ ہے۔ اپنے باپ کا وارث میں تھا۔ میرا وارث حیدر ہے۔ میرا جو کچھ ہو گا، میرے بعد اس کا کہلائے گا۔ حیدر کے بعد اس کی اولاد کا۔ اس میں باہر کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمہاری بات میں نے سمجھ لی ہے اور اس کا ایک حل بھی تلاش کر لیا ہے... تمہارے لیے مستقل ماہانہ آمدنی کا بندوبست کرنا میری ذمے داری ہے کیونکہ میں نہ رہا تو تمہاری خاندان میں کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔”

مائرہ کا چہرہ پھر امید سے روشن ہو گیا۔ “مجھے پورا بھروسا ہے آپ کی محبت پر۔”

رسول بخش اپنی رو میں بولتا گیا۔ “میں تمہارے نام سے پچاس لاکھ کہیں انویسٹ کر دوں گا۔ این آئی ٹی میں یا اسپیشل سیونگز سرٹیفکیٹ میں... اس سے تمہاری پچاس ہزار سے زیادہ ماہانہ آمدنی پکی ہو جائے گی۔ رقم اپنی جگہ محفوظ رہے گی... ٹھیک؟”

مائرہ نے بڑے والہانہ انداز میں اپنی بانہیں رسول بخش کے گلے میں ڈال دیں۔ “مجھے پتا تھا آپ میرا خیال کریں گے۔”

رسول بخش نے اسے محبت سے چوما۔ “جانِ من... یہ لیلیٰ مجنوں والی محبت جو آج کل کے چھوکرے کرتے ہیں، فلمی ڈائیلاگ بول کے... اپنی وہ محبت نہیں ہے... یہ بدنامی نہیں تحفظ دینے والی محبت ہے۔ پیسا ہاتھ کا میل ہے۔ محبت دلوں کا میل ہے۔ زیر زبر کا فرق ہے بس۔ تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟”

“ابھی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں سائیں... بے وجہ شور شرابا ہو گا اور آپ کے لیے بھی پریشانی... جب شادی ہو جائے گی تو انہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا... پھر وہ جو چاہیں کہیں اور کریں۔”

“ہم تو جان تمہارے لیے جو کر سکتے ہیں کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔”

“اچھا، اب میں جاؤں... آپ بیٹھیں گے ابھی؟”

“نہیں... چلتا ہوں میں بھی... تمہیں راستے میں اتار دوں گا... اور گاڑی میں کاغذات رکھے ہیں، تم وہ بھی دیکھ لو۔”

“کیسے کاغذات رسول بخش؟”

“وکیل دے گیا تھا۔ محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی والی کوٹھی اب تمہاری ہے۔ گاڑی کا میں نے بتا ہی دیا تھا۔ ابھی شوروم میں کھڑی ہے، تم جب چاہو لے سکتی ہو۔ جو کام تم نے آج بولا ہے، وہ بھی دو چار دن میں ہو جائے گا۔”

“مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں اتنی خوش قسمت ہوں۔” مائرہ سچ مچ جذباتی ہو گئی۔ جو کھیل اس نے اپنی جوانی اور خوب صورتی کو داؤ پر لگا کے شروع کیا تھا، اس میں اتنی بڑی کامیابی کا مائرہ نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اس میں کمال کس کا ہے۔ اس کی ہوشیاری کا یا رسول بخش کی دیوانگی کا۔ دیوانہ وہ ضرور تھا مگر بے وقوف نہیں تھا۔ جسے وہ بے وقوفی سمجھتی تھی، اس کا نام محبت تھا۔ یہ محبت کا الگ روپ تھا۔ اس میں چڑھے سمندروں کا تلاطم نہ سہی، گہرے سمندروں کی گمبھیرتا ضرور تھی اور محبت کی یہ گہرائی اب مائرہ کو کھینچ رہی تھی۔ زندگی بہت سے خواب اس کی راہ میں پھولوں کی طرح بچھا رہی تھی اور ان خوابوں کی تعبیر حقیقی تھی۔ سکھ، چین آرام... عزت اور خوشی جو یہ سب کچھ دے اسی کا نام محبت ہے۔ یا دیوار میں زندہ چنوائے جانے اور خود اپنے تیشے سے جان گنوانے کا... محبت قربانی دینے کا نام ہے

یا قربانی مانگنے کا... محبت صرف اپنی خواہشات کی تکمیل سے حاصل ہونے والی خود غرضانہ خوشی کا نام ہے یا اپنی خوشی قربان کر کے ان سب کو خوشی دینے کا ہے جو آپ سے محبت کا رشتہ رکھتے ہوں... وہ سوچتی رہی۔

☆☆☆

ایک بار پھر اسے جھوٹ بول کے گھر سے غیر حاضر رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ گزشتہ کئی ماہ سے اس کا ایک ہی معمول تھا۔ وہ کالج یونیفارم میں گھر سے نکلتی تھی۔ گلی کے موڑ پر کار اس کو منتظر ملتی تھی۔ اس کا انجن چلتا رہتا تھا تاکہ اے سی بند نہ ہو۔ وردی والا شوفر اسے دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول کے مؤدب کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار ایک سرسراہٹ کے ساتھ جیسے ہوا پر تیرتی آگے بڑھ جاتی تھی۔

کچھ لوگ یہ منظر ہر روز دیکھتے تھے۔ ایک دودھ کی دکان والا... ایک بیکری کا مالک جو سیلز مین بھی تھا۔ ایک جنرل اسٹور کے کاؤنٹر پر اونگھتا ہوا بڈھا۔ اس کے علاوہ محلے ہی کے کچھ لوگ جو صبح دم ضرورت کی خریداری کرنے آتے تھے۔ پہلے وہ سب بڑے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ کے مسکراتے تھے پھر انہوں نے آپس میں تبادلہ خیالات کر کے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔

"دیکھ رہے ہو بھائی... کیسی بے حیائی ہے اور کیسی ڈھٹائی۔"

"اور شریفوں کے محلے میں۔"

کوئی افسوس سے سر کو زور زور سے ہلاتا۔ "کیسا زمانہ آ گیا ہے... باپ کو دیکھو تو شرافت اور وضع داری کا نمونہ... اور بیٹی... توبہ توبہ..."

"باپ کو خبر ہی نہیں کہ اس کی کالج جانے والی بیٹی کیا گُل کھلا رہی ہے۔ اس کا تو ہارٹ فیل ہو جائے۔"

"اجی چھوڑو... آپ بھی کیا بات کرتے ہو... سب پتا ہے اسے لیکن انجان بنا ہوا ہے۔"

"ہاں جی... اکیلا وہ ہی تو نہیں ہے گھر میں... ماں بھی ہے اور سب سے بڑھ کر وہ بے غیرت بھائی جو کہ دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے... سارے زمانے کی خبر رکھتا ہے وہ تو کیا بہن کے کرتوت سے بے خبر ہوگا... مگر بھائی پیسے نے منہ بند کر رکھا ہے سب کا..."

"آخر جاتی کہاں ہے یہ... اگر کالج نہیں جاتی... یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"اللہ ہی جانے جی... کس کو فرصت ہے کہ جاسوسی کرتا پھرے۔"

"کوئی جا کے بتائے گھر والوں کو۔"

"پھر وہی بات... ٹائم کس کے پاس ہے اور زمانہ ایسا ہے کہ جو سچ بولے وہی سب سے بڑا جھوٹا... الزام اسی پر آ جائے گا کہ گندی زبان اور گندی ذہنیت ہے کہ شریف گھروں کی لڑکیوں کو بدنام کرتا پھرتا ہے... اپنے گھر کی خبر تو لے پہلے۔"

ان باتوں کا سلسلہ بھی کب تک چلتا۔ خود مائرہ کے تیور ایسے ہوتے تھے جیسے وہ کسی کی مشکوک اور سوال کرتی نظر کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتی اور نہ اسے پروا ہے کہ زبان خلق کیا بکواس کرتی ہے۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر پورے طمطراق سے کار کی پچھلی سیٹ پر براجمان ہوتی اور سب کو تلملاتا چھوڑ کے نکل جاتی۔ یہ باتیں اب بھی ہوتی تھیں مگر کم... کچھ بے وقوفوں نے ہمت کی تھی اس کے گھر پہنچنے کی لیکن وہاں احسن نے انہیں اسی طرح آڑے ہاتھوں لیا جیسے ان کو توقع تھی۔ خود مائرہ کی ماں نے اپنا دفاع کرنے کے بجائے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر صاحب تو گھر میں قید ہو کے رہ گئے تھے۔ وہ کچھ بیمار بھی تھے۔

مائرہ کو بہت صبح نکلنا ضروری تھا۔ کالج آٹھ بجے لگتا تھا۔ وہ یونیفارم میں، کتابوں کا بیگ لے کر جاتی تھی۔ اس کا آفس نو بجے شروع ہوتا تھا۔ کار میں اس کا برقع موجود رہتا تھا۔ جب وہ آفس کی عمارت کے مین گیٹ پر اترتی تھی تو چوکیدار اونگھتا نظر آتا تھا۔ ہر فلور پر صفائی کرنے والے فرش اور دیواروں کو چمکانے اور ڈیکوریشن کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہوتے تھے۔ کسی کالج گرل کی آمد ایک عجوبہ ہوتی اور وہ بھی آفس ٹائم سے پہلے۔ برقع میں مائرہ لفٹ تک جاتی تھی۔ یہ رسول بخش کے آفس کی پرائیویٹ لفٹ تھی جو اس کے کمرے کے عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ اندر پہنچ کے وہ سکون کا سانس لیتی... اپنا سیکریٹری کا جدید ترین وضع کا فیشن ایبل اور بیش قیمت لباس زیب تن کرتی اور پھر اپنے لیے کافی بناتی۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھتی جو دیوار پر نصب تھا۔ پھر اسٹاف کے آنے کا وقت ہو جاتا تو وہ اپنے کیبن میں آ بیٹھتی۔ اس کی واپسی بھی اسٹاف کے رخصت ہو جانے کے کافی دیر بعد ایسے ہی ہوتی تھی۔ پروفیسر ابراہیم کو یقین تھا کہ ان کی بیٹی کے ہر روز دو تین پیریڈ خالی گزرتے ہیں جس میں وہ لائبریری میں رہتی ہے۔ اس کی چھٹی ڈھائی بجے ہوتی ہے اور کوچنگ کلاسز ساڑھے پانچ بجے شروع ہوتی ہیں۔ چنانچہ بس سے آنے جانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے وہ ایک عزیز سہیلی کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے رات کو جب کوچنگ سینٹر سے فراغت ہوتی ہے تو وہ ساڑھے نو بجے گھر پہنچ جاتی ہے۔

آج کل رسول بخش کی کنسٹرکشن کمپنی کا یہ آفس اس کا الیکشن آفس بنا ہوا تھا جس کی انچارج مائرہ تھی، پہلے خود اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ کسی الیکشن کے لیے پبلسٹی کی مہم ایسے مؤثر انداز میں چلا سکتی ہے۔ آفس میں ایک دو پبلک ریلیشن میں ایکسپرٹ سمجھے جانے کے دعوے دار بھی تھے اور مائرہ کی دخل اندازی سے پہلے کسی نے ان کی اس حیثیت پر سوال بھی نہیں اٹھایا تھا۔ جب مائرہ نے ایک دو اشتہارات کے مضمون دیکھے تو وہ اسے کمزور لگے۔ اس نے رسول بخش کے سامنے اپنا اعتراض رکھا۔

وہ مذاق میں مسکرایا۔ "ارے بابا، تم بناؤ اس سے اچھا مضمون اور اس... کے سامنے رکھو۔" وہ کبھی مذاق میں اور کبھی عادتا خاصی معیوب گالی بھی دے جاتا تھا۔

مائرہ نے قلم اور کاغذ اٹھا لیا۔ "آپ آدھا گھنٹا دیں مجھے سائیں! میں مضمون بنا کے لاتی ہوں۔"

"تم گھنٹا لو... ہم بیٹھے ہیں ادھر۔"

مائرہ اپنے کیبن میں آ گئی اور سر جھکا کر اس نئے کام میں منہمک ہو گئی جو اب ایک چیلنج بن گیا تھا۔ کام ختم ہونے پر اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو اتفاق سے پورا آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنا مضمون بھی رسول بخش کے سامنے رکھ دیا۔ "لو سائیں، اب آپ فیصلہ کرو... جو اچھا لگے اخبار کے لیے ریلیز کر دو۔"

رسول بخش نے مائرہ کے بنائے اشتہار کا مضمون پڑھا اور حیران سے زیادہ خوش ہوا۔ "تم نے تو کمال کر دیا مائرہ جان! یہ تو ہمیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم ایسی زبردست اسکرپٹ رائٹر ہو۔"

مائرہ ہنس دی۔ "آپ کو کیا سائیں... خود مجھے کہاں اندازہ تھا۔"

رسول بخش نے اس پی آر او کو بلایا جو ایک طرح سے الیکشن کی پوری پبلسٹی کمپین کی ذمے داری سنبھال چکا تھا۔ جو کچھ رسول بخش نے اس سے کہا، وہ بڑا توہین آمیز تھا مگر حکم حاکم۔

"ابھی تم جو پبلسٹی میٹر بھی بناؤ... پوسٹر... ہینڈ بل یا اشتہار... مس مائرہ کو دکھاؤ۔"

"یس سر۔" اس نے کڑوا گھونٹ پی کے کہا۔ یہ کڑواہٹ اس نے باہر آ کے اگلی۔ "ایسے چریا جائیں گے ہمارے نمائندے بن کے اسمبلی میں تو پھر وہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ میرٹ ہے صرف چٹک مٹک... نخرہ اور جوانی کا جادو..."

پی آر او کے ایکسپرٹ نمبر دو نے جو قدرے جونیئر تھا، اس کی رپورٹ رسول بخش کو دے کر اپنی پوزیشن بہتر بنا لی۔ نمبر ون کو فارغ کر کے سیمنٹ انڈسٹری کے آفس میں دادو روانہ کر دیا گیا۔ نمبر دو بڑی فرماں برداری سے مائرہ کے حکم کا غلام بن گیا۔

اب مائرہ ہر اسکرپٹ کو منظور کرتی تھی پھر اس نے ایک پوسٹر دیکھا تو اس نے اپنے ماتحت کو طلب کر لیا۔ "یہ عبارت تو خیر میری تھی... مگر یہ کیا لے آؤٹ ہے... کیا بکواس کلر اسکیم ہے... اور پرنٹر کون ہے... کوئی جوتے گانٹھنے والا؟"

دوپہر کو اس نے یہی بیان رسول بخش کے سامنے دیا۔ اس نے کہا۔ "جان من... سارے اختیارات تمہارے پاس ہیں تو مجھ سے کیوں کہتی ہو... بلا لو اس... ڈیزائنر اور پرنٹر کو۔"

ڈیزائنر پہلے حاضر ہوا۔ وہ پوسٹر چھاپنے والے پریس میں مشین مین تھا اور کسی زمانے میں ایک سنیما کے پوسٹر پینٹ کیا کرتا تھا۔ مائرہ نے اسے کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا۔ وہ خود کمپیوٹر کا استعمال واجبی حد تک جانتی تھی مگر اسے معلوم تھا کہ کمپیوٹر گرافکس اور فوٹوشاپ وغیرہ سے آرٹ کے کیسے نمونے تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اس کے سر پر سوار رہی۔ "ہاں، یہ ٹھیک ہے مگر کلر بدلو... اس کو نیچے لاؤ... ذرا بڑا کرو... ایسے... اب اس کو فریم کرو... عبارت ادھر سے شروع کرو... رسول بخش کے نام کا فونٹ بڑا ہوگا... کلر بھی کنٹراسٹ میں ہوگا۔"

تین گھنٹے کی دماغ سوزی کا نتیجہ ایک کلر پرنٹ کی صورت میں سامنے آیا تو رسول بخش کو ایک دم اپیل کر گیا۔ "واہ واہ مائرہ جی... تم تو فنکار ہو... یہ تو بہت اچھا بنا ہے... بس اس کو چھپوا لو۔"

محبت کا یہ نیا اور انوکھا تجربہ مائرہ کو بہت کچھ سکھا رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بہت سی نامور شخصیات مثلاً چارلی چپلن کے ساتھ آدھی عمر کی لڑکیوں نے کیسے محبت کی تھی اور کیسے نبھائی تھی۔ محبت نام ہے جس کا وہ محض جسمانی کشش یا جوانی کی ترنگ ہی نہیں... اس کے آگے بھی بہت کچھ ہے جہاں من تو شدم تو من شدی کی منزل آ جاتی ہے۔

الیکشن سے پہلے مائرہ نے اس علاقے کا جائزہ لیا۔ وہ رسول بخش کی ہدایات کے مطابق سیکیورٹی گارڈز اپنے ساتھ لے کر گئی۔ اس نے اپنی نگرانی میں پوسٹرز اور بینرز لگوائے۔ اس کے ماتحت وہ تھا جو اب پی آر او بن گیا تھا۔ وہ کارکنوں کی ٹیم کو کنٹرول کرتا تھا۔ کارکن ان پڑھ اور کم عقل تھے جن کی زیادہ دلچسپی کھانے اور معاوضے میں ہوتی تھی۔ پوسٹرز اور

بینرز صحیح اور نمایاں جگہ پر لگا دیے گئے تو مائرہ نے ایک گشتی فورس کو نگرانی پر مامور کیا کہ مخالفین رات کے وقت بھی انہیں خراب نہ کریں... پھر اس نے رسول بخش کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی جاگیردارانہ انا کو فی الحال بھول جائے اور ووٹروں سے ملے... رسول بخش نمازِ جمعہ کے بعد مسجدوں میں گیا۔ اس نے کچھ مرنے والوں کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ چند گھروں کی شادی میں بن بلائے پہنچا اور دولہا دلہن کو سلامی دے آیا۔ کچھ نومولود بچوں کی مبارک باد دینے گیا تو مٹھائی ساتھ لے گیا اور تھوڑی بہت رقم دے آیا۔ ایسا پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ وڈیرے تو اسمبلی کی رکنیت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے اور ہاریوں کا فرض کہ وہ انہیں ووٹ دیں۔

مائرہ نے کچھ لوگوں کو ڈھول پیٹنے پر مامور کیا جو ہر جگہ کہتے پھرتے تھے کہ سائیں رسول بخش کتنا غریب پرور ہے۔ ہر ایک کے گھر جا کے اپنی فیاضی کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس نے مسجد میں ملاؤں سے دعا کرائی کہ اللہ اس کی نیکیوں کے بدلے اسے کامیابی عطا کرے تا کہ وہ سب کی فلاح و بہبود کے کام کر سکے۔ اگر وہ دس گھروں میں گیا تھا تو پبلسٹی میں پچاس کہا گیا۔ رسول بخش کی اچھائی یہ تھی کہ اس نے مائرہ کے کسی مشورے کو اپنی مردانہ انا پرستی سے مسترد نہیں کیا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ مائرہ کی جدوجہد کے نتائج کتنے مثبت انداز میں سامنے آ رہے ہیں۔ رسول بخش کی کامیابی یقینی ہو چکی تھی۔

انتخاب کے دن تک مائرہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھک کے چور ہو گئی تھی۔ وہ آفس میں ریسٹ کرتی رہی۔ وہ اپنی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن اور اسے نتائج کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی کہ وہ کسی پولنگ اسٹیشن سے ووٹنگ کی رپورٹ لیتی۔ وہ دفتر میں اکیلی تھی۔ ایک بجے اس نے فون پر اپنے لیے برگر منگوایا۔ اس کے سامنے ٹی وی چل رہا تھا لیکن اس پر وہ اپنے مستقبل کی متحرک فلمیں دیکھ رہی تھی۔ ایک فلم وہ تھی جس میں رسول بخش چیف منسٹر کی حیثیت سے حلف اٹھا رہا تھا اور وہ فرنٹ رو میں بیٹھی تھی۔ کیمرے بار بار اسے فوکس کر رہے تھے۔

ایک بج کے دس منٹ پر آفس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بے خیالی میں ریسیور اٹھا کے کہا۔ ”ہیلو!“

دوسری طرف سے پی آر او ہسٹریائی انداز میں چلا کے بولا۔ ”میڈم مائرہ! غضب ہو گیا... بہت بری خبر ہے آپ کے لیے... سائیں رسول بخش کو کسی نے گولی مار دی ہے... وہ اپنا ووٹ ڈال کے واپس آ رہے تھے۔“

مائرہ کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ ٹی وی کا منظ گیا۔ اب اس پر ایک لہو آلودہ لاش پڑی تھی۔ ٹی وی چی بریکنگ نیوز چلا چلا کے دہرا رہے تھے۔ مخالفین مبارک وصول کر رہے تھے۔ سائیں اب ضمنی انتخاب پھر ہو گا۔

مائرہ سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ خوا تھا جو بھی ہم نے دیکھا۔ جو بھی سنا، افسانہ تھا۔ اس نے آن بہاتے ہوئے اپنا اسباب سمیٹنا شروع کیا۔ اب اس کا یہا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ وہ جا تھی کہ بہت جلد مالک بدل جائیں گے۔ نیا مالک حیدر ہو نہ وہ مائرہ کی صورت دیکھنا برداشت کر سکتا تھا اور نہ مائرہ کو منظور ہوتا... اس ذلت کی گھڑی کے آنے سے پہلے ہی اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اچانک کال بیل بجی تو ا خیال آیا کہ اس نے برگر کا آرڈر دیا تھا۔

اسے دروازے تک جانا پڑا... لیکن آنے والا بر لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ حیدر تھا جس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ مائرہ نے جیسے غلطی سے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا۔ اس نے اختیار کہا۔ ”تم...؟“

وہ مسکرایا۔ ”تم کس کی آس لگائے بیٹھی تھیں؟“

اسی وقت برگر والا نمودار ہوا... حیدر کی بیوی نے سے کہا۔ ”مائرہ کو اس کا انتظار تھا۔“

کسی تکلف کے بغیر حیدر اپنے باپ کی کرسی پر بیٹھا۔ ”تم نے تو یہاں کا بھی نقشہ بدل دیا ہے۔“

”بھئی برگر اور لا کے دو... ہم بہت بھوکے ہیں۔“ حیدر کی بیوی نے آرڈر بوائے سے کہا۔

مائرہ صمٌ بکمٌ کھڑی رہی۔ ”تم لوگ... کہاں سے آ رہے ہو؟“

”کیا بتائیں تمہیں... ابھی تک ہمارا ہنی مون چل رہا تھا۔“ وہ عجیب طرح سے مسکراتا رہا۔

”حیدر! کیا تمہیں معلوم نہیں... تمہارے والد کو قتل کر دیا گیا ہے؟“ مائرہ نے کہا۔

اس نے جیسے چونک کے کہا۔ ”اچھا... کب؟ اور تمہیں کس نے بتایا؟“

اس کی بیوی سامنے بیٹھ گئی۔ ”اسی لیے رو رہی ہو تم... ملازمت بھی گئی اور بادشاہت بھی۔“

یکلخت تمام حقیقت مائرہ پر اظہر من الشمس ہو گئی۔ حیدر کی مصنوعی حیرانی جس میں صدمے کا کوئی پہلو نہ تھا، سارے راز فاش کرنے والی تھی۔ اس نے حیدر پر نظر جما کے پوچھا۔ ”ایسا کیوں کیا تم نے حیدر؟“

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ کرسی پر جھولتا رہا۔

”تم نے اپنے باپ کو قتل کیوں کرایا؟“ مائرہ نے پاٹ لہجے میں کہا۔

”اس لیے... کہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔“ اس نے یر سنجیدگی سے کہا۔

”محبت... اس کا نام محبت ہے؟“ مائرہ چلائی۔ ”یا نفرت... ہوس... لالچ... انتقام... اب تمہارا ہے یہ سارا کاروبار... اب ضمنی انتخاب ہو گا تو امیدوار تم بنو گے... کیونکہ یہ تمہاری خاندانی سیٹ ہے اور ہمدردی کے سارے ووٹ سمیٹو گے؟“

حیدر نے ایک دم ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ گولی نے سامنے دیوار پر لگی تصویر کے فریم کو پاش پاش کر دیا۔ فریم بکھر کے نیچے گرا۔ یہ کوئی تجریدی آرٹ کا نمونہ تھا جس کو دیکھ کے یوں لگتا تھا جیسے کسی JIG SAW پزل کے ٹکڑے ہیں... جو بے ترتیب رہتے ہیں مگر مختلف زاویوں سے ان کو ٹ کیا جائے تو ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے... کوئی پھول یا وئی چہرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

مائرہ نے اپنا ریوالور نکالنے میں دیر نہیں کی۔ ”ہاتھ اوپر مت اٹھانا حیدر... ریوالور نیچے گرا دو اور پاؤں کی ٹھوکر سے آگے کر دو۔“ حیدر نے تعمیل کی۔

حیدر کی بیوی چلائی۔ ”خدا کے لیے مائرہ... اس کو معاف کر دو۔“

مائرہ نے جھک کے حیدر کا ریوالور اٹھا لیا۔ ”میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی بی بی... اور پھر اسے کیوں قتل کروں گی میں... جو اتنی محبت کرتا ہے مجھ سے... سب کچھ تمہارا ہو چکا ہے حیدر... جائداد... کاروبار... اسمبلی کی سیٹ... ایک خاندانی بیوی تمہارے ساتھ ہے... مجھے بھی تم رکھ سکتے ہو... داشتہ بنا کے... یا دوسری بیوی بنا کے... اتنی محبت ہے نا تمہیں مجھ سے...“ وہ دیوانگی کی ہذیانی ہنسی ہنسنے کے بعد آگے بڑھی۔ ”لیکن محبت کس کا نام ہے... یہ میں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور یہ ہے تمہاری محبت کا جواب۔“ اس نے حیدر کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر وہ اپنا اسباب اٹھا کے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اس یوم حساب کو ایک دن آنا تھا اور مائرہ اس کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے اپنی فردِ جرم خود ہی بنائی تھی اور عدالت کے سامنے رکھ دی تھی۔

یہ مائرہ کی کوٹھی کا خوب صورتی سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا جس میں اس کا سارا خاندان خود مائرہ کے مدعو کرنے پر آیا تھا۔ اس کے سامنے پروفیسر ابراہیم کچھ حیران سے بیٹھے تھے۔ باقی سب محرمِ راز تھے اور ایک دوسرے سے نظر چرا رہے تھے۔

”جی پاپا... یہ کوٹھی میری ہی ہے۔ جو مرنے سے پہلے ہی میرے مرحوم شوہر نے میرے نام کر دی تھی۔ اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ دیکھیے ان چہروں کو... یہ میری ماں ہیں... یہ میرے بھائی اور یہ بہن بہنوئی... ان کی خاموش گواہی میرے حق میں ہے... یہ سب جانتے ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سچ ہے۔ ابھی آپ کے چہرے پر بے یقینی ہے اور بے اعتباری... لیکن مجھے شرمندگی ہے تو صرف یہ کہ میں نے صرف آپ کو بے خبر رکھا... باقی سب باخبر ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میں نے کب اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیا تھا جس پر آپ خود بھی چلے اور آپ نے چاہا کہ ہم سب چلیں... اور ایک میں باغی نہ ہوتی تو ایسا ہوتا۔“

”مائرہ! تم مجھے کنفیوز کر رہی ہو۔“

”نہیں پاپا... میں آپ کے دماغ سے کنفیوزن دور کر رہی ہوں۔ آج کل میرے سالانہ امتحانات چل رہے ہیں۔ آپ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ میں بی اے فائنل کا امتحان دے رہی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بی اے میں نے گزشتہ سال ہی کر لیا تھا۔ آپ میری ڈگری دیکھیں گے؟“ اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا اور پروفیسر کے سامنے رکھ دیا۔

پروفیسر نے اسے غور سے دیکھنے کے لیے چشمہ لگایا اور اس کی عبارت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا حالانکہ اس مضمون میں فلسفے کا کوئی رقیق نکتہ نہیں تھا۔ نہ وہ خود کوئی فارنسک ایکسپرٹ تھا جو سائنس کے جدید طریقوں سے نتیجہ اخذ کر کے بتا دیتے ہیں کہ ڈگری اصلی ہے یا جعلی۔ ”یہ سب کیسے ہوا مائرہ؟“ پروفیسر کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

”پتا نہیں یہ کیسے ہوا اور کیوں... لیکن اچانک قسمت نے مجھے رسول بخش سے ملوا دیا۔ وہ مجھ سے دگنی عمر کا شادی شدہ وڈیرا تھا جس کے بچے بھی عمر میں مجھ سے زیادہ تھے۔ وہ بہت دولت مند تھا۔ بہت طاقت، اثر و رسوخ اور عزت رکھتا تھا۔ اسے مجھ سے محبت ہو گئی پھر مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”وہی جو حقیقت ہے پاپا... جب اس نے محبت کی تو پھر جو کیا میری خوشی کے لیے کیا اور اس نے ہی یہ واضح کیا مجھ پر کہ محبت اپنی خوشی کا نام نہیں ہے۔ محبت ان کو خوشی دینے کا

نام ہے جن سے محبت کی جائے۔ اس نے کہا کہ بی اے کر رہی ہو ڈگری کے لیے... یہ لو ڈگری... فرسٹ کلاس میں بی اے پاس کیا ہے تم نے... اور یہ جینوئن ہے جس سے چاہو تصدیق کرا لو۔ میں دکھانے کے لیے کالج جاتی تھی ورنہ میں تو اس کی سیکریٹری تھی۔ یہ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ مجھے خوشی دینے کے لیے اس نے میری ہر خواہش پوری کی، ہر شرط مانی۔ میں نے کہا کہ میری بہن کے حالات اچھے نہیں... اس کے شوہر کو اچھی ملازمت نہیں مل رہی ہے حالانکہ وہ کوالیفائڈ ہے اور جب میرے کہنے سے دولہا بھائی کو ایک اچھی جاب ملی تو مجھے ان کو خوش دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پھر جب آپ کو پنشن کے لیے خوار کرنے والے خود آپ کے پاس حاضر ہوئے چیک لے کر... تو آپ کو کتنی خوشی ملی تھی اور میں خوش تھی کہ میں آپ کو خوشی دے سکی۔ اور رسول بخش خوش تھا کہ میں خوش ہوں۔ اس کے بعد احسن کو اپائنٹمنٹ لیٹر ملا۔ وہ کتنا خوش ہوا تھا۔ اس نے آفس میں مجھے آ کے بتایا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا چھوٹے بھائی! اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں تمہاری خوشی کی کیوں پروا کرتی؟‘‘

پروفیسر نے اپنے داماد اور پھر اپنے بیٹوں کو دکھ بھری شکایتی نظروں سے دیکھا مگر وہ خوش تھے، شرمندہ نہیں۔

مائرہ نے پھر کہا۔ ’’آپ پنشن میں ایک گھر بنانا چاہتے تھے۔ کتنا بڑا گھر بنا لیتے آپ... میں نے تو بات کی تھی ایک ٹھیکے دار سے اور اس نے کہا کہ سائیں رسول بخش ہمارا اَن داتا ہے... اس کے لیے ایک کیا دس گھر قربان ہیں... آپ پسند کرو اور پھر حکم کرو... لیز کے کاغذ لے کر ہم حاضر ہو جائیں گے۔ آپ دو سو گز کے گھر کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آپ کو چار سو گز کا گھر مل جائے تو آپ کتنے خوش ہوتے۔ اسے اپنی خوش نصیبی کی لاٹری کہتے... یہ سمجھتے کہ بیچنے والا بے وقوف تھا لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب یہ آپ کا گھر ہے۔‘‘

پروفیسر کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا۔ ’’یہ... یہ کوٹھی...‘‘

’’یہ ہزار گز کی کوٹھی میری ہے تو کیا آپ کی نہیں ہے؟ اور جو کار کھڑی ہے باہر، وہ میری ہے تو کیا امی کی نہیں ہے... آپ سب کی نہیں ہے؟ ہم اتنے باعزت ہو گئے ہیں اچانک تو کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے؟ اور کس نے دی ہے مجھے یہ خوشی؟ اس شخص نے جواب اس دنیا میں نہیں ہے... جو خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا کیونکہ بیٹا اس کی وراثت کے لیے مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی خوشی عزیز تھی، پہلے درکار تھی۔ ماں باپ کی محبت سے زیادہ وہ اپنی خوشی چاہتا تھا۔‘‘

پروفیسر چلّایا۔ ’’کیوں بتا رہی ہو تم یہ سب مجھے‘‘

’’میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی ہوں پاپا... آپ بھی کرتے تھے ہم سب سے پاپا... لیکن آپ کی تھی کہ ہم وہ کریں جس میں آپ خوش ہیں۔ آپ ہم مستقبل قربان کر سکتے تھے مگر اپنے اصول نہیں۔ ہماری سے زیادہ آپ کو اپنے اصول عزیز تھے۔ شاید ہم سب ہی سوچتے ہیں۔ اپنی اپنی خوشی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ نے سعادت مندی سے سر جھکا کے آپ کا فیصلہ قبول کر لیا ایک کلرک سے شادی کر لی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ اس خوشی نہیں دیکھی آپ نے... رسول بخش نے مجھے محبت کا فرق سمجھایا ہے... جس سے محبت کرو، اس کی خوشی دیکھو اس کی خوشی پر سب قربان کر دو... پھر میں نے جو کیا اس خوشی کے لیے کیا اور اس نے میری خوشی کو سب پر مقدم جانا۔‘‘

پروفیسر اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہاری بکواس سے قائل ہو جاؤں گا؟ تمہاری آوارہ مزاجی اور بے روی... جسے تم محبت کا نام دے رہی ہو... جائز ہو جائے گی؟‘‘

’’آپ اپنی خوشی کے لیے مجھے چھوڑ جائیں گے پا اور ان سب کو بھی؟‘‘

’’ان میں سے کون ہے جو تمہارا ساتھ دے گا؟‘‘

’’یہ اتنے خودغرض نہیں ہو سکتے... میں نے ان کی خوشی کے لیے سب کیا... میں ان سے محبت کرتی تھی۔ محبت نہ کرتی تو ان کی پروا کیوں کرتی۔ یہ جانتے ہیں میری قربانی کو... بدنامی اور بدکرداری کے سارے الزام تو میں لیے... مگر ان سب کی محبت کو فراموش نہیں کیا... اور آپ پاپا... مجھے معلوم ہے آپ ہم سب کو نہیں چھوڑ سکتے۔‘‘

پروفیسر بیٹھ گیا۔ ’’شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم سب اپنی اپنی زندگی میں الگ الگ انداز سے محبت کرتے ہیں اور اس میں مخلص بھی ہوتے ہیں مگر محبت نام ہے جس کا... شاید سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ بندے کی خدا سے... خدا کی بندے سے... ماں کی اولاد سے... انسان کی دولت سے یا زندگی سے... مصور کی رنگوں سے... مغنی کی سُر سے... اور میری تم سب سے۔‘‘

مائرہ ایک دم اٹھی اور باپ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

’’مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ آپ کو محبت مجبور کر دے گی۔‘‘

پروفیسر نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں میں آنے والے آنسو روک لیے۔ وہ واقعی مجبور تھے۔

◆

خوف کے تاجر

کاشف زبیر

نیک اور اچھے مقصد کے لیے جان تو دی جا سکتی ہے... لیکن اس کے حصول کے لیے کسی بے گناہ ذی روح کی زندگی سے کھیلنا انسانیت کے منافی ہے... عرصہ دراز سے مشرق و مغرب کے درمیان مذہب... انسانیت... اور نسلی تعصب جیسے مختلف مسائل کی دیواریں کھڑی کی جا چکی ہیں... جو وقت کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی ہیں... عقل پرست مغرب اور جذباتیت سے لبریز مشرق کب ایک دوسرے کے ہمنوا بن سکیں گے... اس منظر اور پس منظر میں کیا کچھ ہو رہا ہے... کی عملی تصویر کی ایک فکر انگیز جھلک...

نیکی اور بدی کے راستوں پر گامزن کرداروں کی باہمی کشمکش کا احوال

لندن ٹیوب میں عمر حسن کھڑکی کے شیشے سے لگا ہوا الوں میں گم تھا۔ اسے رہ رہ کر افغانستان کا وہ نوجوان کرم ان یاد آ رہا تھا جس نے اس کے سامنے دم توڑا تھا۔ وہ رت میں اس سے مشابہ تھا۔ دونوں میں مشترک چیز مذہب تھا اور بس یہی مشترک تھا ورنہ وہ دونوں بالکل مختلف تھے۔ عمر حسن لندن یونیورسٹی سے پڑھا ہوا تھا جبکہ کرم خان نے کسی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بلامعاوضہ صرف اپنے ملک کے لیے لڑ رہا تھا اور عمر حسن برطانوی فوج کا پیشہ ور سپاہی تھا۔ وہ

لازمی فوجی بھرتی کے پروگرام کے تحت فوج میں لیا گیا تھا۔ کرم خان پیدائشی لڑاکا تھا۔ اس نے ایک جنگ زدہ ملک میں آنکھ کھولی تھی اور صرف بیس سال کی عمر میں ماہر جنگجو بن گیا تھا۔ اس کے پاس ایک بوسیدہ ستر سال پرانی کھٹکے والی رائفل تھی۔ ہر فائر کے بعد اس کا کھٹکا گھما کر اور آگے پیچھے کر کے اسے لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ یہ رائفل اس کے دادا کی وراثت تھی۔ جتنی دیر میں اس سے ایک فائر ہوتا تھا، اتنی دیر میں عمر حسن کی خودکار رائفل پورا میگزین خالی کر دیتی تھی۔

عمر حسن نے دو سال افغانستان میں بے شمار لوگوں کو مرتے دیکھا تھا لیکن وہ کرم خان کو کبھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔ افغان جنگجوؤں کے اس گروہ نے برطانوی فوج کے اڈے پر حملہ کیا تھا اور بہت تباہی پھیلائی تھی۔ حملہ آوروں کا بھی بہت نقصان ہوا تھا لیکن وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر آئے تھے۔ موت ان کے لیے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ جب جنگجو پسپا ہوئے تو پیچھے رہ جانے والوں میں کرم خان بھی شامل تھا۔ وہ شدید زخمی تھا لیکن بچ گیا تھا۔ اس کا علاج کیا جا رہا تھا اور اسی دوران میں اس نے دم توڑ دیا۔

سوچتے ہوئے اچانک عمر حسن کی نظر ایک گوشے میں بیٹھی ایک نوجوان عورت کی طرف گئی۔ اس کے نقوش ایشیائی تھے اور اس نے مکمل لباس کے ساتھ سر پر اسکارف بھی لے رکھا تھا۔ وہ مسلم تھی۔ یہاں ایسے مناظر عام تھے۔ جب عورت نے کسمسا کر پہلو بدلا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ اپنی سرخ و سفید رنگت اور کھڑے نقوش کی وجہ سے عمر حسن ایشیائی سے زیادہ یورپی لگتا تھا۔ شاید عورت نے بھی اسے ایسا ہی سمجھا ہو۔

اپنے اسٹیشن پر اتر کر وہ پیدل ہی روانہ ہو گیا۔ اس کا فلیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دس منٹ بعد وہ فلیٹ میں تھا۔ داخلی دروازے کے نیچے ڈاک کا انبار تھا۔ یہ دو سال کی ڈاک تھی مگر ابھی ڈاک دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک پورا دن تو گھر کی صفائی اور چیزیں ٹھیک کرنے میں گزرا تھا۔ یہ فلیٹ اس کے باپ نے خریدا تھا۔ حسن شاہ پاکستان سے آ کر یہاں آباد ہوا اور اس نے ٹیلرنگ شاپ کھولی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ دوبارہ کبھی پاکستان نہیں گیا۔ اس نے یہیں ایک انگریز عورت سے شادی کی۔ عمر حسن اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد اس نے عمر کو ساتھ رکھا تھا، اس نے اسی شرط پر بیوی کو طلاق دی تھی۔ عمر رنگ و روپ میں باپ سے زیادہ ماں پر گیا تھا۔ حسن نے اسے پاکستان کے بارے میں بتایا۔ وہ اسے سمجھاتا تھا کہ وہ برٹش ہیں لیکن اس سے پہلے وہ مسلمان ہیں۔

وہ اسے باہر جانے اور مقامی بچوں سے گھلنے ملنے سے روکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں عمر حسن پر مقامی رنگ نہ چڑھ جائے۔ جب وہ چار سال کا تھا تو حسن شاہ نے اس کے لیے ایک عالم کا بندوبست کیا جو اسے قرآن پڑھانے کے ساتھ دین کے بارے میں بتاتا تھا۔ خود حسن شاہ کے پاس اتنا وقت اور معلومات نہیں تھیں کہ وہ عمر کو بتاتا۔ وہ اس سے محبت بہت کرتا تھا لیکن اس کے قریب نہیں تھا۔ پھر ایک رات وہ اپنی شاپ بند کر کے واپس آ رہا تھا کہ سنسان گلیوں سے گزرتے ہوئے نامعلوم غنڈوں نے اس پر حملہ کیا۔ وہ جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگتا رہا لیکن بچ نہ سکا۔ اگلی صبح اس کی لاش ایک چھوٹی گلی سے برآمد ہوئی۔ پولیس نے قتل کے شبے میں دو گورے نوجوانوں کو گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلا مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بری ہو گئے۔

اس وقت عمر حسن انیس برس کا تھا۔ اس نے باپ کی ٹیلرنگ شاپ فروخت کر دی۔ اسے خاصی رقم ملی تھی۔ اس کی مدد سے اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور جب وہ یونیورسٹی سے نکلا تو اسے فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ یہ لازمی فوجی خدمت تھی اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ اسے فوج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بزنس مین بننا چاہتا تھا۔ تربیت کے بعد اسے افغانستان بھیج دیا گیا اور وہ پورے دو سال بعد وہاں سے واپس آیا تھا۔ اب اسے نارمل زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ اگلی صبح وہ اس وقت بیدار ہوا جب باہر سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا اور جاگنگ کرتے ہوئے ویسٹ پارک تک گیا۔ یہ سارا علاقہ ایشیائی اور رنگ دار لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ خاص طور سے سیاہ فام زیادہ تھے۔ اس کا اظہار دیواروں پر بنی اسپرے پینٹ کی تصاویر، خاکوں اور تحریروں سے بھی ہو رہا تھا۔ یہاں مسلمان آباد تھے اور ان میں ساری دنیا سے تعلق رکھنے والے مسلمان شامل تھے۔ ان میں کچھ عمر حسن کے بچپن کے دوست بھی تھے۔

یہاں رہائش کے ساتھ ساتھ تجارتی گودام بھی تھے۔ ایسے ہی ایک گودام کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹے ٹرک سے پلاسٹک میں لپٹے [illegible] اتارے جا رہے ہیں۔ جاگنگ اور ناشتے کے بعد وہ تیار ہوا اور باہر نکل آیا۔ اس کا ارادہ ملازمت تلاش کرنے کا تھا۔ اسے امید تھی کہ سابق برٹش آرمی ممبر کی حیثیت سے اسے بہ آسانی ملازمت مل جائے گی لیکن شام کو جب وہ واپس آیا تو اسے اندازہ ہوا کہ برطانیہ میں ملازمتوں کا کال پڑ گیا ہے اور واحد شعبہ جہاں آسانی سے ملازمت مل سکتی تھی، وہ ایمپلائی ٹ کا شعبہ تھا۔ یورپ اور دنیا کی خراب اقتصادی صورتِ حال کا اثر برطانیہ پر بھی پڑا تھا اور دنیا کی پانچویں بڑی معیشت زبوں حالی کا شکار تھی۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک گلی میں داخل ہوا تو اس نے فہد البنانی کو دیکھا۔ فہد سیاہ فام تھا۔ اس کا تعلق شمالی افریقا سے تھا۔ وہ اپنے نوعمر بھائی سعد کو کچھ سمجھا رہا تھا اور وہ سرکش انداز میں جواب دے رہا تھا۔ پھر اس نے بھائی کا ہاتھ جھٹکا اور اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ وہ آوارہ گرد سیاہ فاموں والے مخصوص حلیے میں تھا۔ ڈھیلا لباس اور اوپر ڈھیلا سا اپر۔ عمر حسن حیران ہوا۔ دو سال پہلے وہ ذرا شرارتی مگر تمیز والا لڑکا تھا۔ خاص طور سے فہد کا بہت احترام کرتا تھا۔ فہد اس کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے اسکول کی تعلیم ایک ساتھ مکمل کی تھی لیکن اس وقت فہد بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔ اس نے شیو بڑھالی تھی اور اس کے سر پر گول جالی دار ٹوپی تھی۔ عمر حسن نے اسے آواز دی تو اس نے چونک کر دیکھا اور پھر گرم جوشی سے اس کے گلے لگ گیا۔ ”عمر میرے دوست... تم کب واپس آئے؟“

”کل ہی آیا ہوں۔ تم کیسے ہو؟ باقی سب کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بولا۔ اس نے باقی سب کے بارے میں بتانے سے گریز کیا۔

”حالات کیسے ہیں؟“

فہد نے گہری سانس لی۔ ”حالات بہت بدل گئے ہیں۔“

”سعد کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟“

فہد نے سر ہلایا۔ ”وہ آج کل بلیک فالکن کے لڑکوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ رہا ہے۔“

بلیک فالکن ایک جرائم پیشہ گروہ تھا۔ اس میں زیادہ تر افریقا سے تعلق رکھنے والے سیاہ فام شامل تھے۔ عمر حسن نے سر ہلایا۔ ”یہ تشویش کی بات ہے... تم اسے سمجھا رہے تھے؟“

فہد نے گہری سانس لی۔ ”ہاں لیکن میں کامیاب نہیں ہوا۔ مجھے زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ لندن زیرِ زمین سرگرمیوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

”آج کل ساری دنیا میں ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“ عمر حسن نے کہا۔ وہ کچھ دیر فہد سے گپ شپ کرتا رہا پھر واپس فلیٹ پر آ گیا۔ شام کو وہ دوبارہ نکلا۔ اس بار اس کا رخ ساؤتھ کی طرف تھا۔ یہ سفید فاموں کا علاقہ تھا اور یہاں بے شمار پب اور نائٹ کلب تھے۔ انگلش شونامی نائٹ کلب میں ڈینی اس کا منتظر تھا۔ ڈینی اس کا بچپن کا ایک اور دوست تھا۔ اس نے عمر کو کال کر کے بلایا تھا۔ اندر شور اور ہجوم تھا۔ مختلف اسٹیجز پر نیم عریاں لڑکیاں ڈانس کر رہی تھیں اور دیکھنے والوں کو محظوظ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈینی اس سے گرم جوشی سے ملا اور اسے ایک کونے والی میز پر لے آیا۔

”دوست! کیا حال ہیں؟ میں تمہیں پورے دو برس بعد دیکھ رہا ہوں۔“

”میں دو برس بعد کل ہی آیا ہوں۔“

ڈینی اس کے اور اپنے لیے بیئر لے آیا۔ اس نے گلاس عمر کے سامنے رکھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

عمر نے شانے اچکائے۔ ”ظاہر ہے، جاب کروں گا۔“

”کیسی جاب؟“ ڈینی آگے جھک کر بولا۔

عمر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کوئی بھی جاب۔ تم جانتے ہو میں نے بزنس میں ڈگری لی ہوئی ہے۔“

”آج کل نوکریوں کا کال ہے۔“ ڈینی بولا۔ ”تمہیں آسانی سے جاب نہیں ملے گی۔“

عمر کو ایک ہی دن میں اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ”فی الحال کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے فوج سے اچھی خاصی رقم ملی ہے۔ اگر ایک آدھ سال بیٹھ کر کھاؤں، تب بھی گزارہ چل جائے گا۔“

ڈینی سوچنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے پاس ایک جاب ہے۔“

”کیسی جاب؟“

ڈینی نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ”تم انٹیلی جنس میں تھے نا؟“

عمر نے سر ہلایا۔ ”فیلڈ انٹیلی جنس...“

”اسی سے متعلق جاب ہے۔“

عمر سوچ میں پڑ گیا۔ ”سرکاری معاملہ ہے؟“

”ہاں لیکن اسے ظاہر نہیں کیا جائے گا۔“ ڈینی بولا۔ ”اگر تم راضی ہو تو میں تمہیں متعلقہ شخص سے ملواتا ہوں۔“

عمر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ہاں یا نہ کا فیصلہ میں جاب کا سن کر ہی کروں گا۔“

ڈینی خوش ہو گیا۔ ”کل اسی وقت اسی جگہ... یقین کرو تم نہ صرف اپنے ملک بلکہ اپنے لوگوں کی بھی مدد کرو گے۔“

گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے عمر ڈینی کے اس جملے پر غور کر رہا تھا۔ اپنے لوگوں سے کیا مراد تھی؟ کیا وہ

مسلمانوں کا ذکر کر رہا تھا؟ وہ ٹیوب اسٹیشن سے نکل کر اوپر آرہا تھا کہ سیڑھیوں سے نکلتے ہی اس کی ٹکر دو لڑکوں سے ہو گئی جو ایک لمبی سی چیز اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ چیز گر گئی اور ان کے ساتھ تیسرے کمسن لڑکے نے گالی دے کر کہا۔ ۔ ۔ ۔ "نظر نہیں آتا۔"

عمر نے اسے دیکھا اور چونک گیا۔ وہ فہد کا بھائی سعد تھا۔ دونوں لڑکے عمر میں اس سے بڑے تھے۔ پھر اس نے گرنے والی چیز دیکھی۔ یہ ویسا ہی پلاسٹک میں لپٹا ہوا قالین تھا جیسے اس نے صبح دیکھے تھے۔ اس نے سعد سے کہا۔ "تم یہ چرا کر لے جا رہے ہو؟"

"بکواس مت کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" سعد نے کہتے ہوئے اپر میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال کر اس کی طرف سیدھا کیا۔ عمر خود کار انداز میں حرکت میں آیا۔ اس نے ہاتھ مار کر پستول کا رخ نیچے کیا اور دوسرے ہاتھ سے پستول چھینتے ہوئے سعد کو پیچھے دھکا دیا۔ یہ سب ایک لمحے سے بھی پہلے ہو گیا۔ دونوں لڑکوں کے ہاتھ اپنی جیب کی طرف گئے تھے کہ عمر نے ڈپٹ کر کہا۔

"بس اب حرکت مت کرنا۔"

لڑکوں کے ہاتھ رک گئے اور پھر وہ تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سعد اٹھ گیا اور خوں خوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا اس نے دھمکی دی۔ "تم پچھتاؤ گے۔"

عمر کو اس کے انداز پر غصہ آگیا۔ "اس سے پہلے کہ میرا موڈ بدل جائے، تم بھی چلتے نظر آؤ۔"

سعد کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر تیزی سے ٹیوب کی سیڑھیاں اتر گیا۔ عمر نے پستول دیکھا اور اسے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بارہ تیرہ سالہ لڑکے کے پاس یہ مہلک ہتھیار کہاں سے آیا؟ کیا بلیک فالکن اسے استعمال کر رہے تھے؟ اس کا دھیان پلاسٹک میں لپٹے قالین کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی دونوں لڑکے تاریکی سے نمودار ہوئے اور قالین اٹھا کر چلتے بنے۔

☆☆☆

اگلی صبح عمر جاگنگ کے لیے نکلا۔ گودام والے روڈ پر برج کے نیچے سے گلی کی طرف مڑا تھا کہ رک گیا۔ اس کے سامنے جیبز کھڑا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ بلیک فالکن کا سربراہ اصل میں وہی ہے لیکن وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی سفیدی اس کے سیاہ رنگ پر بہت زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ موٹے ہونٹ اور متناسب نقشہ تھا۔ وہ متوسط قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا لیکن عمر کے چونکنے کی وجہ اس کی ڈاڑھی تھی۔ آخری بار جب عمر نے اسے دیکھا تھا تو وہ کلین شیو تھا۔ وہ مسکرایا لیکن اس کی آنکھیں سرد رہیں۔

"عمر! تمہیں دو سال بعد دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"تم بدل گئے ہو۔" عمر چلنے لگا۔ جیبز اس کے ساتھ آگیا۔

"ہاں، میں بدل گیا ہوں۔ میں اب مسلمان ہو گیا ہوں۔"

عمر رک گیا۔ "واقعی۔ ۔ ۔ کب؟"

"ایک سال پہلے۔" اس نے جواب دیا۔ عمر پھر چلنے لگا۔ "میں نے جان لیا کہ سچائی کا راستہ یہی ہے۔"

"تب تم نے اپنا طرزِ حیات یقیناً بدل لیا ہوگا؟" عمر نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ جیبز کی غیر قانونی سرگرمیوں کی طرف تھا۔

"ہمارے ساتھ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ میرا مطلب ہے صرف مسلم دنیا میں نہیں جو مغرب کی جارحیت کا شکار ہے بلکہ یہاں مغرب میں بھی۔ یہ ہمیں دیوار سے لگا رہے ہیں۔"

عمر پھر رک گیا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"یہی کہ اب ہم اپنا ردِ عمل ظاہر کریں گے۔" جیبز کا چہرہ چمکنے لگا۔ "یہ جلد دیکھیں گے۔"

عمر کے بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ جیبز کے لہجے میں دھمکی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم فوج میں رہے ہو اور افغانستان گئے تھے۔ وہاں تم نے اپنے ہم مذہبوں کا خون بہایا تا کہ مغربی استعمار مضبوط ہو۔ اب تمہیں اس کی تلافی کرنی ہے۔"

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔"

"مغرب کا ساتھ دینے والا ہر فرد ہمارا بھی دشمن ہے۔ تمہیں یاد ہے، نائن الیون کے بعد کیا کہا گیا تھا جو ہمارے ساتھ نہیں ہے، وہ ہمارا دشمن ہے۔ آج ہم بھی کہہ رہے ہیں جو ہمارے ساتھ نہیں ہے، وہ ہمارا دشمن ہے۔"

جیبز اس سے بات کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ عمر اپنے فلیٹ کی طرف جانے کے لیے گلی میں مڑا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اس چھوٹے سے میدان میں سعد یوں کھڑا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال والی مشین گن تھی اور وہ عمر کو گھور رہا تھا۔ جیبز نے اس کے کان میں کہا۔ "تمہیں جلد فیصلہ کرنا ہے کہ تم کس کے ساتھ ہو؟"

وہ اس کے پاس سے ہوتا ہوا آگے چلا گیا۔ سعد نے مشین گن اپنے ساتھ کھڑے بارنی کو تھمائی۔ لمبا تڑنگا اور جسیم بارنی جائز کا دستِ راست تھا پھر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

نائٹ کلب انگلش شو میں ڈینی کے ساتھ اس سے ملتی جلتی صورت والا ایک ادھیڑ عمر شخص عمر کا منتظر تھا۔ ڈینی نے تعارف کرایا۔ "رائز ولسن۔"

ڈینی بیئر لینے چلا گیا۔ عمر نے رائز کی طرف دیکھا۔ "تم سرکاری ملازم ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ بولا۔

"ڈینی ولسن تمہارا بھائی ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "باپ کی طرف سے۔ ہماری مائیں الگ ہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ڈینی میرا بھائی ہے۔ یہ خالصتاً پیشہ ورانہ معاملہ ہے۔"

"ظاہر ہے میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔" عمر نے سر ہلایا۔ "ڈینی میرا بچپن کا دوست ہے لیکن اس نے آج تک اپنے کسی سوتیلے بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ویسے کام کیا ہے؟"

اس سے پہلے رائز کوئی جواب دیتا، ڈینی بیئر لے آیا۔ رائز نے بے تابی سے اپنا گلاس سرکایا اور گھونٹ لے کر بولا۔ "اگر تم راضی ہو تو میں تمہاری ملاقات کرا سکتا ہوں۔"

"یعنی اصل آدمی کوئی اور ہے؟"

"نہیں، وہ میرا باس ہے۔" رائز نے کہا۔ "اگر تم راضی ہو گئے تو تم میرے ماتحت کام کرو گے۔"

"میرا انتخاب کیا گیا ہے؟"

"ظاہر ہے۔" رائز نے جواب دیا۔ "ہم نے تمہارا پس منظر مکمل چھانا ہے پھر تمہاری سروس کا جائزہ بھی لیا ہے۔"

"اس کام میں یہ ضروری ہے۔" ڈینی نے اسے تسلی دی۔ "درحقیقت یہاں بھی تم اپنے ملک کی خدمت کرو گے۔"

"تمہیں فوری فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں۔"

عمر کو جائز کی بات یاد آئی کہ تمہیں جلد فیصلہ کرنا ہے، تم کس کے ساتھ ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "میں تیار ہوں لیکن میں اب بھی واضح کر رہا ہوں، میں ایک بار انکار کا حق رکھتا ہوں۔"

رائز نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر تم باس تک پہنچ گئے تو انکار کا حق کھو دو گے اس لیے ابھی فیصلہ کرو۔"

ڈینی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "عمر! ہم پر اعتماد کرو، پلیز۔"

وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے یہ پیشکش قبول نہیں کرنی چاہیے لیکن ساتھ ہی وہ اسے قبول بھی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اسے تجسس تھا کہ اس کا انتخاب کیوں ہوا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے صرف اس کی سروس نہیں تھی۔ برطانیہ میں خفیہ ایجنسیوں اور اداروں کے پاس افراد کی کمی نہیں تھی۔ اس کا انتخاب کسی خاص وجہ سے کیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اور ڈینی اسے پُرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے سر ہلایا تو ڈینی خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "گڈ۔ ۔ ۔ اس خوشی میں بیئر سے آگے کچھ نہ ہو جائے؟"

"تم جانتے ہو میں بیئر سے آگے نہیں جاتا۔" عمر نے جواب دیا اور رائز کی طرف دیکھا۔ "تمہارے باس سے کب اور کہاں ملنا ہے؟"

"کل میں تمہیں کال کروں گا۔ اپنا نمبر مجھے دے دو۔"

☆☆☆

عمر اپنی کار ٹھیک کر رہا تھا۔ دو سال سے گیراج میں کھڑے کھڑے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور انجن جام تھا۔ فہد اس کی مدد کر رہا تھا، وہ اچھا مکینک تھا۔ عمر نے ایک بولٹ کستے ہوئے پوچھا۔ "تم جانتے ہو سعد کس حد تک بلیک فالکن میں ملوث ہے؟"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے لیکن میں اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ صرف چند مہینے میں بہت بدل گیا۔ وہ بدتمیز اور بگڑ گیا ہے۔ ذرا سی بات اسے مشتعل کر دیتی ہے۔"

اس کا گواہ عمر بھی تھا۔ اگر وہ بروقت ہاتھ نہ مارتا تو ممکن تھا، سعد اس پر گولی چلا دیتا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ جیبز مسلم ہو گیا ہے۔"

فہد نے بونٹ سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "یہ پرانی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان ہو کر اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ وہی کر رہا ہے جو پہلے کرتا تھا۔"

"وہ مجھے ملا تھا اور اس کے ساتھ سعد بھی تھا۔"

فہد چونک گیا۔ "کب۔ ۔ ۔؟ کہاں۔ ۔ ۔؟"

عمر نے اسے مختصراً بتایا کہ جیبز اسے کیسے ملا تھا اور سعد کا رویہ کیا تھا۔ "سعد کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں جا چکا ہے۔"

فہد تشویش زدہ ہو گیا۔ "جیبز کی سرگرمیاں مشکوک ہیں اور مجھے یقین ہے وہ پولیس اور ایجنسیوں کی نظر میں ہوگا۔"

"منشیات اور مجرمانہ سرگرمیوں کے حوالے سے؟"

"کئی حوالوں سے۔ سب جانتے ہیں جیبز اور اس

کے ساتھی انتہا پسندانہ خیالات رکھتے ہیں۔ وہ مغرب کو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں۔“

عمر کو جیمز کی بات یاد آئی۔ اس نے فہد کی طرف دیکھا۔ ”جب میں یہاں سے گیا تو یہ سب اتنا عام نہیں تھا۔“

”ہاں، سب کچھ بہت تیزی سے پھیلا ہے۔“

”کیا جیمز کسی چکر میں ہے، میرا مطلب ہے کسی بڑے چکر میں؟“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس قسم کا آدمی ہے جس سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔“

☆☆☆

ساؤتھ لندن میں یہ چھوٹا سا ریستوران بہت صاف ستھرا اور اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہاں ڈینی کے ساتھ ایک خوش پوش اور خوش شکل آدمی اس کا منتظر تھا۔ سادہ سوٹ میں وہ کہیں سے کسی خفیہ ادارے کا افسر نہیں لگ رہا تھا بلکہ کسی فرم کا ایگزیکٹو دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک کونے کی میز پر تھے اور صبح گیارہ بجے یہاں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ ڈینی نے تعارف نہیں کرایا تھا۔ اس نے عمر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”ایلن میکارتھی۔“

”میرے بارے میں تم سب جانتے ہو گے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”تم نے یقیناً سوچا ہو گا کہ ہم نے تمہارا ہی انتخاب کیوں کیا ہے؟“

”ظاہر ہے۔“

”درحقیقت ہم بہت مشکل میں ہیں۔“ اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا۔

”مشکل کی نوعیت؟“

”بہ ظاہر تو بہت ساری وجوہات ہیں لیکن اصل وجہ مغرب میں مسلم بیس کی وسعت ہے۔“

”کیا مطلب؟“

ایلن نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”پہلے مسلم ایشیائی ہوتے تھے یا عرب... لیکن اب ان میں افریقن بھی شامل ہیں اور سفید فام بھی۔ حد یہ کہ ان میں اسپینش بھی شامل ہیں۔ تقریبا تین ملین افراد میں سے اپنے مطلوبہ آدمیوں کی تلاش بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے انتہا پسند یا دہشت گرد؟“

”بالکل۔“ ایلن نے زور دے کر کہا۔ ”میں نے کہا نا ان کی بنیاد بہت وسعت اختیار کر گئی ہے اور اب روایتی طریقوں سے ان کی نگرانی اور ان کے عزائم تک پہنچنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“

”اس لیے تم لوگوں نے میرا انتخاب کیا ہے۔ میں مسلم ہوں اس لیے میرے ہم مذہب مجھ پر اعتماد کریں گے؟“ عمر کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”لازمی بات ہے۔ سیون سیون کے بعد برطانیہ واضح طور پر مشکل میں ہے۔ جنگ ہماری سرزمین تک پہنچ چکی ہے۔“

”جنگ بڑی تیز رفتار چیز ہے۔“ عمر نے سر ہلایا۔ ”عراق اور افغانستان یہاں سے بہت دور ہیں۔“

”ہمیں خبردار کیا گیا ہے کہ آنے والے چند مہینوں میں پھر کسی بڑے حملے کا خطرہ ہے۔“

”مجھے کیا کرنا ہے؟“

ایلن کے تاثرات جو پہلے جملے پر ذرا خراب ہوئے تھے، معمول پر آ گئے۔ اس نے اپنے کوٹ سے ایک تصویر نکال کر عمر کے سامنے کی۔ تصویر ایک ایشیائی نقوش رکھنے والے جوان آدمی کی تھی۔ بال ہلکے گھنگرالے اور چہرہ عام سا تھا۔ ”یہ طاہر شاہ ہے۔ اس کا تعلق ازبکستان سے ہے لیکن اب برطانوی شہری ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس کے دہشت گردوں سے روابط ہیں۔ تمہیں اس کی نگرانی کرنی ہے۔ یہ کن لوگوں سے ملتا ہے، ان کو بھی چیک کرنا ہے۔“

عمر نے تصویر دیکھ کر واپس کر دی۔ ”کوئی خاص اطلاع؟“

ایلن نے تصویر واپس رکھ لی۔ ”اطلاع ہے کہ لندن کے پاس کسی ساحل پر اسلحہ اور بم سازی کا سامان لایا جائے گا۔ ہمیں بہرصورت اس اسلحے کو استعمال میں لانے سے پہلے پکڑنا ہے اور ان لوگوں کو بھی گرفتار کرنا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا۔“

”لیکن یاد رکھنا، اس میں رازداری شرط ہے۔“ ایلن نے اسے خبردار کیا۔ ”تم کسی کو اس بارے میں نہیں بتاؤ گے۔“

”میں جاسوسی کے کھیل کے اصول جانتا ہوں۔“ عمر نے جواب دیا۔ ”اگر مجھے تم سے رابطہ کرنا ہو یا کوئی خاص اطلاع دینی ہو تو؟“

”تم ڈینی کے توسط سے مجھ سے رابطہ کرو گے۔“

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بعض اوقات ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ مجھے براہِ راست نمبر چاہیے۔ دوسرے اگر پولیس سے سامنا ہو جائے تو ان کو بتانے کے لیے بھی میرے پاس کچھ ہونا چاہیے۔“

ایلن نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، دونوں چیزیں تمہیں مہیا کر دی جائیں گی۔“

اگلے روز ڈینی نے اسے ایک لفافہ دیا۔ اس میں ایک کارڈ تھا۔ اس کارڈ پر اس کی تصویر اور نام کے ساتھ صرف ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایلن میکارتھی کا سیل نمبر بھی تھا۔ ایلن نے ڈینی کو اس کی معاونت کے لیے مقرر کیا تھا۔ البتہ وہ رائز کو جواب دہ تھا۔ ایلن سے صرف ہنگامی حالات میں رابطہ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عمر اپنی کار میں تھا۔ سروس اور ٹیوننگ کے بعد اس کی کارکردگی بہترین ہو گئی تھی۔ یہ چار سال پرانی ہنڈا کار تھی اور اس کا پک اپ شاندار تھا۔ عمر سڑک کے پاس ایک عمارت کی طرف نگراں تھا۔ سڑک کے ساتھ قطار میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور مشکل سے کوئی جگہ خالی تھی۔ اسے امید تھی کہ کوئی خاص طور سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہو گا۔ اس کے زانو پر ایک واکی ٹاکی سیٹ رکھا ہوا تھا اور وہ اس کی مدد سے ڈینی سے رابطے میں تھا جو ایک بلاک دور اپنی کار میں موجود تھا۔ مذکورہ عمارت میں طاہر کا اپارٹمنٹ تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور وہ آٹھ بجے سے یہاں موجود تھے۔ دس بج کر دس منٹ پر عمارت کے دروازے سے طاہر شاہ اور ایک سیاہ فام برآمد ہوئے۔ ان دونوں نے آس پاس دیکھا اور پھر سڑک پر آ گئے۔ عمر نے واکی ٹاکی اٹھائے بغیر کہا۔ ”وہ باہر نکل آئے ہیں۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ ڈینی نے جواب دیا۔

طاہر اور اس کا سیاہ فام ساتھی سڑک پار کر کے ایک سیاہ مرسڈیز کار کی طرف بڑھے۔ عمر نے ساتھ والی نشست سے ٹیلی لینس کیمرا اٹھا کر ان کی تصاویر لیں۔ اس نے کار کی نمبر پلیٹ کی تصویر بھی لی۔ جیسے ہی سیاہ مرسڈیز حرکت میں آئی، اس نے کیمرا رکھا اور کار اسٹارٹ کی۔ سیاہ مرسڈیز گھوم کر اس کے پاس سے گزری اور ذرا آگے نکلی تو اس نے بھی کار گھمائی اور ڈینی کو اطلاع دی۔ ”وہ میرے پاس سے گزرے ہیں۔ میں ان کے پیچھے جا رہا ہوں۔“

”میں پیچھے ہوں۔“

سیاہ مرسڈیز مختلف شاہراؤں سے گزر کر لندن برج کی طرف جا رہی تھی۔ عمر کی کار اس سے کچھ دور تھی اور ڈینی کی گاڑی اس کے پیچھے تھی۔ لندن برج کراس کرتے ہی وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ شہر کا مرکزی تجارتی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد سیاہ مرسڈیز ایک ریستوران کے سامنے رکی۔ طاہر اور سیاہ فام اتر کر ریستوران میں چلے گئے۔ عمر نے کار ذرا دور پارک کی اور اترنے سے پہلے ڈینی کو اطلاع دی۔ ”میں ریستوران میں دیکھنے جا رہا ہوں۔“

”احتیاط سے۔“ ڈینی بولا۔ ”مجھے سیاہ فام شخص مشکوک لگ رہا ہے۔ اسے پہلی بار دیکھا ہے۔“

عمر سرسری سے انداز میں ریستوران کی طرف بڑھا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ کارنر پر ہونے کی وجہ سے دو طرف شیشے لگے تھے اور ان سے اندر کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ شیشے پر ایک جگہ ریستوران کی ڈشوں کے نام اور قیمت لکھی تھی۔ عمر بہ ظاہر رک کر انہیں دیکھنے لگا لیکن اس کی توجہ اصل میں طاہر اور سیاہ فام کے ساتھ بیٹھی ایک عورت اور ایک تومند گنجے سر والے سفید فام مرد کی طرف تھی۔ عورت ایشیائی خدوخال رکھتی تھی اور خوب صورت تھی۔ سرخی مائل سانولی رنگت، بڑی آنکھیں اور ان پر ابرو کی کمان کھنچی ہوئی تھی۔ ستواں ناک تلے کسی قدر گداز لب تھے۔ اس نے کریم کلر کا اسکرٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ نیچے سفید شرٹ تھی۔ وہ چاروں آپس میں کسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اس کا اظہار ان کے تاثرات سے واضح تھا۔ گنجا مرد کسی بات پر نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

عمر کی توجہ کا مرکز عورت اور سفید فام مرد تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس کار میں آیا اور اس نے ٹیلی لینس کیمرے سے ان چاروں کی تصاویر لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان کی گفتگو کے بارے میں کس طرح جان سکتا ہے لیکن ان کے پاس جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسے مسلسل ان کی نگرانی کرنی تھی۔ اگر وہ ایک بار اس کی طرف سے مشکوک ہو جاتے تو یہ کام ناممکن ہو جاتا۔ اسے ان کی نظروں سے دور رہ کر اپنا کام کرنا تھا۔ اس نے ڈینی سے کہا۔ ”مجھے سفید فام مرد زیادہ اہم لگ رہا ہے۔ میں اس کا پیچھا کروں گا۔ تم کیا کرو گے؟“

”میں طاہر اور سیاہ فام آدمی کے پیچھے رہوں گا۔“ ڈینی بولا۔

”کیا عورت کو نظرانداز کرنا مناسب ہو گا؟“

”ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کس کے ساتھ جاتی ہے لیکن سیاہ فام آدمی زیادہ اہم لگ رہا ہے۔“

انہیں مشکل نہیں ہوئی کیونکہ عورت، طاہر شاہ اور سیاہ فام کے ساتھ ان کی مرسڈیز میں روانہ ہوئی تھی جبکہ سفید فام مرد ایک الگ گاڑی میں روانہ ہوا۔ عمر نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس کا رخ پرانے لندن کی طرف تھا جو بندرگاہ کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ سفید فام نے اپنی گاڑی بندرگاہ کی پارکنگ میں چھوڑی اور خود ہاربر کے چھوٹے حصے کا رخ کیا۔ یہاں چھوٹی کشتیاں موجود تھیں۔ وہ ریڈ مرمیڈ نامی کشتی میں سوار ہوا۔ یہ چالیس فٹ لمبی عام سی کشتی تھی اور اس

کی ساخت سے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کس کام میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک بڑے کیبن کے اوپر پائلٹ روم تھا۔ سفید فام کے سوار ہونے کے بعد کشتی حرکت میں آئی اور اس نے ڈاک چھوڑ دیا۔ عمر نے سیل فون پر رائز ولسن سے رابطہ کیا اور اسے اب تک کی رپورٹ دی۔

”تم اچھے جا رہے ہو۔“ اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”تصویریں اور رپورٹ ڈینی کے حوالے کر دو۔ جب تک ہم ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرتے ہیں، تم آرام کرو۔“

ڈینی طاہر، سیاہ فام اور عورت کا تعاقب کرتا ہوا واپس طاہر کی رہائش پر پہنچ گیا۔ عمر نے تصویریں اور رپورٹ اس کے حوالے کر دی۔ گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بہ ظاہر کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ انٹیلی جنس میں کام کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ کام اسی طرح ہوتا ہے۔ فیلڈ ایجنٹس معلومات جمع کر کے اوپر والوں تک پہنچاتے تھے اور وہ اس کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچتے تھے یا ٹکڑے جوڑ کر ایک واضح تصویر بناتے تھے۔ راستے میں اس نے کئی جگہوں پر سیاہ فام اور ایشیائی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کو گروہوں کی صورت میں کھیلتے یا گپ شپ کرتے دیکھا۔ ان میں سے بیشتر مسلم تھے۔ اسے خیال آیا کہ کیا واقعی خطرہ زیادہ ہو گیا تھا؟ یا برطانوی سیکیورٹی ادارے مسلمانوں کے بارے میں تعصب برت رہے تھے۔ شاید معاملہ دونوں کے درمیان تھا۔ اسے جائز کا خیال بھی آیا، وہ بھی کسی چکر میں تھا۔

اس رات عمر کو بہت مشکل سے نیند آئی۔ اسے بار بار عورت اور سفید فام مرد کا خیال آ رہا تھا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تو کچھ دیر بعد بجنے والے الارم نے اسے بیدار کر دیا۔ اس کا موڈ نہیں تھا لیکن وہ تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ حسبِ معمول جاگنگ کر کے وہ واپس فلیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے پارکنگ کے باہر اپنی گاڑی اس حالت میں کھڑی دیکھی کہ اس کی باڈی کا ایک حصہ بھی صحیح سلامت نہیں تھا۔ اس کے سارے شیشے توڑ دیے گئے تھے اور باڈی ضربوں سے پچکا دی گئی تھی۔ دروازے اکھڑے ہوئے تھے اور اندر سیٹوں اور ڈیش بورڈ کا حال بھی بُرا تھا۔ عمر کے اندر غصہ ابھرنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ ایک وارننگ تھی کہ وہ ان کی بات مان لے ورنہ اگلی بار اس کا بھی یہ حشر ہو سکتا ہے۔ وہ ابھی کار کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا کہ عقب میں ایک گاڑی رکی اور اس کی فرنٹ سیٹ پر موجود جیمز نے افسوس بھری آواز کے ساتھ کہا۔

”چچ چچ... بہت بُرا کیا... ویسے اس کی مرمت ہو سکتی ہے بس خرچہ آئے گا اور یہ اپنی اصل حالت میں آ جائے گی۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ ”آدمی کی مرمت پر بھی بہت خرچ آتا ہے لیکن وہ دوبارہ اپنی اصل حالت میں نہیں آتا۔“

عمر اس کی طرف گھوما تھا کہ اس نے انگلیوں سے اسے سیلیوٹ کیا۔ بارنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ عمر کا اشتعال کم ہو گیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کیا جیمز جان گیا ہے کہ وہ کن کے لیے کام کر رہا ہے؟ لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ اس نے بہت احتیاط کی تھی۔ اس نے سوائے ڈینی کے اور کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ حد یہ کہ اس نے فہد کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا حالانکہ وہ اس کا دوست تھا اور وہ اس پر پورا اعتماد کرتا تھا۔ وہ اپنی آمد و رفت میں تعاقب کا پورا خیال رکھتا تھا۔ اسے کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا تھا۔ خاصا سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جیمز اس کے بارے میں ناواقف ہے۔ وہ اسے اس لیے دھمکا رہا ہے کہ وہ اس کے گروہ میں شامل ہو جائے۔

☆☆☆

عمر ایک سرکاری عمارت میں بھاری جبڑوں اور چھوٹی آنکھوں والے اس شخص کے سامنے تھا جس نے اپنا تعارف ڈیوڈ جیکمین کے نام سے کرایا تھا۔ وہ ایلن میکارتھی کا باس تھا۔ جب ڈینی نے اسے ساؤتھ لندن کے مخصوص ریستوران میں آنے کو کہا تو اس کا خیال تھا کہ کوئی نیا کام سونپا جائے گا لیکن وہاں ایلن اس کا منتظر تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ ڈیوڈ جیکمین نے کہا۔ ”مسٹر عمر! تمہاری اطلاع نہایت اہم ہے۔ ہم نے گنجے سفید فام کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ایوان گریگی اصل میں روسی نژاد شخص ہے۔ وہ دس سال سے برطانیہ میں مقیم ہے اور اس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ مشرقی یورپ سے اسلحہ اسمگل کر کے جرائم پیشہ افراد کو فروخت کرتا ہے۔“

”اسے کبھی گرفتار کیا گیا؟“ عمر نے سوال کیا۔

”نہیں، اس کے خلاف ثبوت نہیں ملا۔“

”سیاہ فام شخص اور عورت کون ہے؟“

”سیاہ فام مائیکل میڈارکی کا تعلق نائیجیریا سے ہے۔ نام سے قطع نظر یہ مسلم ہے۔“ ڈیوڈ نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”البتہ عورت ماریا عبداللہ ہماری ایجنٹ ہے۔“

عمر چونکا۔ ”یہ بھی مسلم ہے؟“

ڈیوڈ نے سر ہلایا۔ ”اس کا باپ لبنانی تھا اور ماں

اسپینش۔“

”اس نے کوئی کام کی بات بتائی ہے؟“

”اسی نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ برطانیہ میں پھر کسی بڑی کارروائی کا خدشہ ہے۔ وہ چھ مہینے سے انڈر کور مشن پر تھی۔ اس نے دو مہینے پہلے ہم سے رابطہ کیا اور یہ اطلاع دی۔“

صورتِ حال رفتہ رفتہ واضح ہو رہی تھی۔ برٹش وزارتِ داخلہ اور سلامتی کے ذمے دار دوسرے اداروں کو فکر تھی کہ سیون سیون جیسا واقعہ دوبارہ نہ ہونے پائے۔ لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور سے برطانیہ جیسے ملک میں جہاں قانون سے تجاوز کر کے کوئی کام مشکل تھا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تم ایوان گریگی پر کام کرو گے۔ اس کے رابطوں کو نظر میں رکھو گے۔ ہمارا اصل مقصد یہ جاننا ہے کہ وہ اسلحہ کس طرح اسمگل کرتا ہے؟“

”زیادہ ضروری ہے کہ ہم اسے اسلحے کی کھیپ سمیت رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں۔“ ایلن نے وضاحت کی۔ ”یہ لندن سے کچھ دور ایک چھوٹے قصبے میں رہتا ہے۔ ذرائع آمدنی نامعلوم ہیں اور بیشتر وقت گھر میں ہوتا ہے۔“

عمر خاموشی سے سن رہا تھا۔ جب ایلن خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔ ”میں بہ وقتِ ضرورت ماریا سے کیسے رابطہ کر سکتا ہوں؟“

ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس میں بہت رسک ہے۔“

”فیلڈ ایجنٹس کا آپس میں رابطہ ضروری ہے۔“ عمر نے اصرار کیا۔ ”بعض اوقات معلومات کا ایک حصہ ایک ایجنٹ کے پاس ہوتا ہے اور دوسرا حصہ دوسرے ایجنٹ کے پاس... اور جب تک ان کو جوڑا نہ جائے کوئی واضح تصویر نہیں بنتی۔“

”رابطے کا نمبر نہیں ہے کیونکہ وہ مستقل ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ وہ ایسی لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہے جو مغربی معاشرے سے متنفر ہے اور اس کے خلاف ان لوگوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ البتہ دورانِ نگرانی تم محفوظ طریقے سے اس سے رابطہ کر سکتے ہو۔“

”لیکن میں بتا دوں... ذرا سی بے احتیاطی سے سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“ ایلن نے کہا۔

”میں اس کھیل میں رازداری کی اہمیت جانتا ہوں۔“ عمر نے کہا۔ ”مجھے اب تک کوئی معاوضہ نہیں ادا کیا گیا ہے۔“

ڈیوڈ نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ عمر نے لفافہ اٹھا کر دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے جیکٹ میں رکھ لیا۔ ”میری گاڑی بدمعاشوں نے خراب کر دی ہے۔ مجھے ایک گاڑی کی ضرورت ہے۔“

”گاڑی مل جائے گی۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”لیکن تم کام تیز کر دو۔ اب ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔“

عمر کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا اس لیے اس نے فوری طور پر ایوان گریگی کی نگرانی کرنے کا سوچا۔ ایلن میکارتھی نے اسے ایک سرکاری گاڑی مہیا کی۔ یہ دو سال پرانی فیاٹ تھی اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ وہ نواحی قصبے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایوان گریگی رہتا تھا۔ یہ چھوٹا لیکن گنجان آباد تھا۔ یہاں زیادہ تر امرا رہتے تھے، اسی لحاظ سے گھر تھے۔ البتہ ایوان کا مکان ذرا پرانے طرز کا اور دیکھنے میں زیادہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے مکینوں کو اس کی دیکھ بھال سے دلچسپی نہیں تھی۔ دیواروں سے پلستر اکھڑ رہا تھا اور اندر مکان کا رنگ و روغن... جا بہ جا خراب ہو گیا تھا۔ عمر شام تک نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران میں ڈینی بھی وہاں آ گیا۔ عمر نے اپنی کار ذرا دور پارک کر دی اور وہ ڈینی کی کار میں آ گیا۔ وہ عقبی نشست پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ ایوان کے مکان کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اب تک بس اتنی سرگرمی دیکھنے میں آئی تھی کہ ایوان ایک بار باہر آیا اور ڈسٹ بن میں کچرے کا بڑا سا شاپر ڈال کر چلا گیا۔ رات ہو گئی تھی۔ ڈینی جا کر اس کے اور اپنے لیے برگر لے آیا۔

آٹھ بجے ایک وین آ کر مکان کے سامنے رکی اور اس میں سے دو افراد نے اتر کر پھرتی سے دو عدد بڑے بیگ مکان میں منتقل کیے۔ وین کے آتے ہی ایوان خود باہر آ گیا۔ اس دوران میں وہ آس پاس نظر رکھے ہوئے تھا۔ وین مشکل سے پانچ منٹ رکی رہی۔ دونوں افراد نے اپنا کام کیا اور رخصت ہو گئے۔ ڈینی نے دوربین کی مدد سے وین کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اس وقت کیمرا نہیں تھا ورنہ وہ تصویریں لے سکتے تھے۔ عمر نے اپنے موبائل پر ان کی مختصر سی مووی بنائی تھی لیکن اتنی دور سے یہ غیر واضح تھی۔ عمر سوچ رہا تھا کہ اس طرح نگرانی کرتے رہنے سے انہیں صرف نام اور گاڑیوں کے نمبر معلوم ہوں گے۔ اس سے آگے بڑھنا تھا تو ضروری تھا مجرموں کے ٹھکانوں میں گھسا جائے۔ اس نے ڈینی سے کہا۔ ”میں مکان کا دورہ کرنے کا سوچ رہا ہوں۔“

ڈینی ہچکچایا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

عمر نے شانے اچکائے۔ ”نو رسک، نو گیم۔“

ایک گھنٹے بعد وہ خاموشی سے کار سے اترا اور دبے

قدموں مکان کی طرف بڑھا۔ اس نے بغلی گلی میں جا کر آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے دیوار پر چڑھ گیا۔ بے آواز طریقے سے اندر اتر کر اس نے پہلے کسی آہٹ پر کان مرکوز کیے۔ اندر سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی۔ وہ گھوم کر بیک یارڈ کی طرف آیا۔ یہاں کچن کا دروازہ تھا اور اندر سے لاک تھا۔ اس نے سخت ایکسرے فلم کا ٹکڑا نکال کر اسے دروازے کی اوپری درز میں داخل کیا اور اسے نیچے لاتے ہوئے لاک کھول لیا۔ پھر اس نے اپنے جوتوں پر ریشمی کپڑے کے بنے ربر سے کس جانے والے غلاف چڑھائے اور اندر داخل ہو گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور ٹی وی کی آواز مکان کے اگلے حصے سے آرہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس ایک کمرا بند تھا، اس نے یہاں بھی ایکسرے فلم استعمال کی۔

لاک کھول کر وہ اندر آیا اور ساکت رہ گیا۔ وہاں الیکٹرانک سرکٹ، تاریں، بیٹریاں اور دھماکا خیز مواد کی اسٹکس پڑی تھیں۔ پلاسٹک کی بالٹیوں میں مختلف کیمیائی مادے مکس کر کے دھماکا خیز مواد کی تیاری کا کام جاری تھا۔ اس نے تیزی سے اپنا سیل فون نکالا اور ان تمام چیزوں کی مووی تیار کرنے لگا۔ اس نے ایک منٹ کی مووی بنائی ہوگی کہ اندر سے آہٹ ہوئی اور کوئی اس طرف آنے لگا۔ عمر نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور دبے قدموں باہر آیا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ ادھر وہ باہر نکلا ادھر ایوان کچن میں داخل ہوا تھا۔ باہر نکل کر عمر دیوار کی طرف جانے کے بجائے ڈسٹ بن کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ایوان شاپر اٹھائے باہر آیا اور اس نے ڈسٹ بن کا ڈھکن اٹھا کر شاپر اس میں ڈال دیا۔ کچھ دیر وہ آس پاس کا جائزہ لیتا رہا پھر اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عمر پھرتی سے اٹھا اور دیوار کود کر باہر نکل گیا۔ اس نے کام کی بات معلوم کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ویڈیو ایوان کو زیرِحراست لینے کے لیے کافی ہوگی۔ اس سے مزید لوگوں کے نام معلوم کیے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ ڈینی کے ہمراہ ایلن کے سامنے ریستوران میں موجود تھا۔ اس نے سیل فون پر بنائی ہوئی مووی اسے دکھائی۔ اس کا خیال تھا کہ ایلن اچھل پڑے گا لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور مووی دیکھ کر سیل فون اسے واپس کر دیا۔ ”بس یہی یا اور بھی کچھ ہے؟“

”ایک وین کا نمبر ہے۔ اس سے دو افراد ایوان کے گھر میں کچھ سامان اتار کر گئے تھے۔“ ڈینی نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ مووی کافی ہے اسے گرفت میں لینے کے لیے۔“

ایلن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارا مقصد اسے گرفت میں لینا نہیں، اسلحے کی ترسیل کا روٹ جاننا ہے۔ اس کام کے لیے تو ہمارے ایجنٹ بھی کافی ہیں۔“

”اس صورت میں مجھے ماریا تک رسائی دی جائے۔“ عمر نے مطالبہ کیا۔ ”وہ اندر رہ کر کام کر رہی ہے اس لیے ہم سے کہیں زیادہ جانتی ہوگی۔“

ایلن سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”اوکے... اسے تمہارا نمبر مہیا کر دیا جائے گا۔ وہ خود دیکھ کر کال کر لے گی۔ لیکن تم آئندہ بھی اس سے خود رابطہ نہیں کرو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ وہ راضی ہو گیا۔ ”ایوان کے لیے کیا حکم ہے؟“

”اس کی نگرانی جاری رکھو۔ لیکن اب تم یہ کام اکیلے کرو گے۔ ڈینی، مائیکل کی نگرانی کرے گا۔“

ڈینی اس فیصلے سے رضامند نہیں تھا لیکن اس نے اعتراض بھی نہیں کیا۔ عمر کے خیال میں بھی اکیلے نگرانی کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن اس نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایوان کی ہی نگرانی کرے گا اور اگر اس سے کوئی سرا ملا تو اسے صرف رپورٹ کرے گا۔ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ ایوان اس کھیل کا مرکزی کردار ہے اور اسے توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اسے یہ بات عجیب ضرور لگی تھی کہ برطانوی، اسلحے کی اسمگلنگ کا روٹ جاننا چاہتے تھے۔ انہیں اس سے بھی غرض نہیں تھی کہ ایوان کے گھر میں بم سازی کا کام جاری تھا۔ وہ اسے چھوٹ دے رہے تھے۔ بہرحال ایجنسیوں کے کام کرنے کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہ ایجنٹس کو استعمال کرتی ہیں، ان کو اپنی حکمتِ عملی یا پلاننگ نہیں بتاتیں۔

آنے والے دو دن تک وہ ایوان کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ قصبے سے کچھ دور واقع ایک متروک بندرگاہ کی طرف گیا جہاں اب پرانی کشتیوں اور گاڑیوں کا ملبا پڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ صرف خالی جیٹی تک ہو کر آگیا تھا۔ اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی اور نہ ہی کچھ اور کیا۔ تیسرے دن وہ ایوان کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا کہ اچانک ایک وین آکر اس کی گاڑی کے پاس رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، ایک آدمی نے اتر کر اسے کوٹ کی آڑ سے جھانکتے پستول کی زد میں لے لیا۔ اس نے بہت ٹھنڈے لہجے میں عمر سے کہا۔ ”حرکت مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔“

عمر کو بھی یقین تھا کہ وہ گولی چلانے میں دیر نہیں کرے

گا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے۔ وین کے پچھلے حصے سے ایوان اترا اور اس نے اسے کھینچ کر کار سے اتارا اور وین کی پچھلی نشست پر دھکیل دیا۔ پھر اس کے ہاتھ دروازے کے اوپر لگے ہینڈل سے پلاسٹک کی خودکار لاک ہو جانے والی ہتھکڑیوں کی مدد سے باندھ دیے۔ یہ کام اس نے پیشہ ورانہ مہارت سے کیا تھا۔ اس نے عمر کی تلاشی لی۔ انہیں صرف کسی ہتھیار کی تلاش تھی مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار یا شناختی چیز نہیں تھی۔ اس کا سیل فون تھا لیکن اس پر سیکیورٹی کوڈ لگا ہوا تھا اس لیے ایوان نے فی الحال اسے جیب میں رکھ لیا۔ اسے باندھتے ہی ڈرائیور اپنی سیٹ پر آگیا اور ایوان اس کے برابر میں بیٹھا رہا۔ وین جھٹکے سے آگے بڑھی۔ عمر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح کیوں لے جارہے ہو؟“

جواب میں ایوان نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور وہ بندھے ہاتھوں کے درمیان سر کر کے رونے کے انداز میں کراہنے لگا۔ اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ان لوگوں کے سامنے خود کو ایسا فرد بنا کر پیش کر رہا تھا جو ذرا سی چوٹ پر رونے لگتا ہے۔ وہ اسے کہیں لے جارہے تھے۔ وہ چاہتے تو اسے اسی جگہ مار سکتے تھے۔ کہیں لے جانے کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے، دوسرے وہ اس کی لاش ایوان کے گھر کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد وین نے ایک ندی کا پل عبور کیا اور دوسری طرف واقع ویران انڈسٹریل ایریا میں داخل ہوئی۔ یہاں بند ہو جانے والے کارخانے اور گودام تھے۔ وین ایسے ہی ایک ویران گودام میں داخل ہوئی۔ گودام خالی تھا اور اس میں کچھ جگہوں پر گھاس تک اگ آئی تھی۔

وین رکتے ہی ایوان نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا اور ایک منٹ میں اس نے بے رحمی سے عمر کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس کے مکوں میں بہت طاقت تھی۔ ناک کے ساتھ اس کے منہ سے بھی خون بہہ نکلا تھا اور بائیں آنکھ سوج گئی تھی۔ اپنی طاقت اور مہارت سے ایوان پیشہ ور باکسر لگ رہا تھا۔ عمر بچنے کی کوشش کرتا رہا اور رونے کے انداز میں کراہتا رہا۔ بالآخر ایوان نے ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے ایک چاقو نکالا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”تم کس کے لیے میرے گھر کی نگرانی کر رہے تھے؟“

”تمہیں غلط فہمی...“ عمر کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس بار ڈرائیور نے پلٹ کر اس کے منہ پر ہاتھ مارا۔ وہ جھول گیا اور اس کا سارا زور ہاتھوں پر آگیا۔ ایوان جھک کر سفاکی سے بولا۔

”تمہارے پاس وقت کم ہے اس لیے ہمارے سوالوں کے درست جواب دو۔“

”میں... کچھ... نہیں... جانتا۔“ عمر نے گہرے سانس لیتے ہوئے رک رک کر کہا۔ ”تم لوگ غلط آدمی کو اٹھا لائے ہو۔“

”یہ اس طرح نہیں مانے گا۔“ ڈرائیور نے مشورہ دیا۔ ”اسے ذرا سبق سکھاؤ۔“

ایوان نے اس بار اس کے گردوں کو نشانہ بنایا۔ وہ اچھا باکسر تھا۔ اس کے گھونسے قیامت بن کر عمر کی کمر اور پسلیوں پر برس رہے تھے۔ اس سے بچتے ہوئے وہ ہینڈل سے جھول رہا تھا اور جسم کی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ اس کی کوشش رنگ لائی اور اچانک ہینڈل چھت سے اکھڑ گیا۔ وہ اس سے آزاد ہو گیا۔ ایوان کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے عمر نے اس کے منہ پر کہنی ماری اور ڈرائیور کو دونوں ہاتھوں سے گھونسا رسید کیا۔ وہ اسی کی طرف آرہا تھا۔ گھونسا کھا کر وہ پلٹ کر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ ایوان نے چاقو گھمایا۔ یہاں بچنے کی جگہ کم تھی۔ عمر اپنی جگہ سے اچھلا مگر چاقو اس کے بائیں پہلو کو کاٹتا ہوا گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ ایوان سنبھلتا، عمر نے اس کا چاقو والا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ پہلے سر کی بھرپور ٹکر اس کی ناک پر رسید کی اور پھر چاقو والا ہاتھ گھما کر اسی کی ران میں چاقو اتار دیا۔ ایوان کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

ڈرائیور دوبارہ پلٹ کر آرہا تھا۔ عمر نے بائیں پاؤں کے بل پر خود کو اٹھاتے ہوئے دائیں پاؤں کی ایڑی ڈرائیور کے منہ پر ماری۔ وہ ایک بار پھر پلٹ کر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور اس بار ساکت ہو گیا۔ ایوان ہوش میں تھا لیکن عمر نے جب دوسری بار اس کے منہ پر ٹکر ماری تو وہ بھی ساکت ہو گیا۔ اس کی ران میں پیوست چاقو کا کچھ حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ عمر نے اسی سے اپنی بندشیں کاٹیں اور آزاد ہو کر نیچے اتر آیا۔ ان دونوں کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ وہ کئی گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔ اس کے پہلو سے کھال اور کچھ گوشت کٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ اس نے واپس وین میں گھس کر ایوان کی جیب سے موبائل نکالا اور ڈینی سے رابطہ کیا۔

”مجھے ایوان اور اس کا ایک ساتھی اغوا کر کے یہاں لائے تھے۔ تم فوراً آجاؤ۔“ اس نے ڈینی کو پتا بتایا اور فون

بند کر دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر وین کی طرف دیکھا، وہ دونوں بدستور بے ہوش تھے۔

ڈینی آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران میں عمر نے دونوں بے ہوش افراد کی تلاشی لی۔ ایوان کے پاس سے ایک سیل فون نکلا تھا۔ اس نے اس کی فون بک اپنے موبائل میں منتقل کر لی اور سیل فون واپس ایوان کی جیب میں رکھ دیا۔ ڈرائیور کے پاس کچھ نہیں تھا۔ دونوں کے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ ڈرائیور کے پاس پستول تھا لیکن وہ اسے استعمال نہیں کر سکا تھا۔ ڈینی نے اس کا زخم دیکھا تو تشویش زدہ ہو گیا۔ “... خون نکل رہا ہے، تمہیں اسپتال جانا ہوگا۔”

“نہیں، مجھے گھر لے چلو، خود دیکھ لیں گے۔” اس نے انکار کیا تو ڈینی اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی تک لایا۔

“ان کا کیا کرنا ہے؟” ڈینی کا اشارہ ایوان اور اس کے ساتھی کی طرف تھا۔

“کچھ نہیں، میرا خیال ہے یہ میرے بارے میں نہیں جانتے۔ بس آس پاس دیکھ کر مشکوک ہو گئے تھے۔” عمر نے کہا۔ “بس اب چلو، اس سے پہلے کہ وہ ہوش میں آ کر تمہیں بھی دیکھ لیں۔”

راستے میں اسے خیال آیا تو اس نے ایلن کو کال کر کے واقعے کے بارے میں بتایا اور اسے ایوان کے گھر کے پاس سے کار اٹھوانے کو کہا۔ ایلن بولا۔ “تم فکر مت کرو لیکن یہ اچھا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے تم اتنے محتاط نہیں تھے جتنا تمہیں ہونا چاہیے تھا۔”

“اس کھیل میں یہ سب ہوتا ہے۔”

“ٹھیک ہے، اب ڈینی اس کی نگرانی کرے گا۔ تم واپس مائیکل کی طرف آؤ اور ماریا سے رابطہ رکھنا لیکن پہلے تم اپنے زخموں کی دیکھ بھال کر لو۔ ویسے یہ کام تم نے اچھا کیا کہ ان کو اٹھایا نہیں۔ اب ان کو کوئی شک ہوگا تو وہ اتنا زیادہ نہیں رہے گا۔”

ڈینی اسے اس کے فلیٹ تک لایا۔ اس کا زخم صاف کیا اور پھر اس پر موٹی پٹی رکھ کر اوپر سے ٹیپ لپیٹ دیا۔ عمر نے چھوٹے تولیے کو گیلا کر کے جہاں جہاں خون لگا تھا صاف کیا۔ آخر میں ڈینی نے اسے جراثیم کش اور پین کلر کے انجکشن دیے۔ گرم دودھ پی کر وہ لیٹا تو پھر اسے خبر نہیں ہوئی کہ کب ڈینی چلا گیا۔ وہ اس کے لیے نوٹ لکھ گیا تھا۔ “مجھے رائز نے بلایا ہے، ضروری کام ہے اس لیے جانا پڑ رہا ہے۔”

عمر کی آنکھ کھلی تو اگلی صبح بھی طلوع ہو چکی تھی۔ اس کے زخم کی حالت خاصی بہتر تھی۔ اس کا بخار اتر گیا تھا اور تکلیف بھی کم رہ گئی۔ ناشتا کر کے اس نے خود پٹی اتاری۔ زخم خشک تھا اور اس نے اس پر جراثیم کش پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے جالی دار پٹی کر لی۔ ڈینی نے اس کے چہرے کے زخموں کو بھی صاف کیا تھا۔ دو دن کے آرام سے اسے خاصا فرق پڑا... زخم تقریباً بھر گیا تھا اور چہرے کے نیل اور زخموں کے نشانات بھی معدوم ہو رہے تھے۔ تیسرے دن وہ نکلنے کا سوچ رہا تھا کہ فلیٹ کی کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ماریا کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ وہ اسے تقریباً دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی۔ عمر دنگ رہ گیا۔ کہاں تو وہ اس سے فون پر بھی رابطہ نہیں کر سکتی تھی اور کہاں وہ اس کے فلیٹ تک چلی آئی تھی۔ پاس سے دیکھنے پر وہ کم عمر اور زیادہ خوب صورت لگی تھی۔ اس نے عمر کے فلیٹ کا جائزہ لیا اور بولی۔

“تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟”

عمر نے سر ہلایا۔ “لیکن اس طرح نہیں... تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔”

“کیسا رسک؟”

“میری حالت دیکھ رہی ہو، یہ بے احتیاطی کا نتیجہ ہے۔ یہاں ہر طرف مسلمان رہتے ہیں اور ان میں انتہا پسند بھی شامل ہیں۔”

“کیا تم ان کی نظروں میں مشکوک ہو؟”

“نہیں لیکن ان کی نظر میں ضرور ہوں۔” عمر نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے کافی کا پانی چڑھایا۔ ماریا بھی وہیں آ گئی۔

“تم چھوڑو، تم ابھی ٹھیک نہیں ہو۔” اس نے کافی کا سامان اس سے لے لیا۔

“زخم... تقریباً بھر گیا ہے۔ ابھی میں نکلنے کی سوچ رہا تھا۔ تمہیں میرے زخمی ہونے کا کس نے بتایا؟”

“ایلن نے بتایا تھا۔” ماریا اس کے اور اپنے لیے کافی نکال کر لے آئی۔ “ابھی تم باہر نکلنے کا مت سوچو کیونکہ تم ان کی نظروں میں آ چکے ہو۔”

“نہیں، میرا خیال ہے مجھے ایوان نے دیکھا ہے اور اسے بھی یقینی پتا نہیں ہے، وہ اسی لیے ویرانے میں لے جا کر مجھ پر تشدد کر رہے تھے۔ اگر ان کو یقین ہوتا تو وہ مجھے مار کر کہیں پھینک دیتے۔” عمر نے کہا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر سر ہلایا۔ “ٹھیک ہے۔”

“تم کیسے آئیں؟”

“میں تم سے ملنے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔” ماریا نے کافی کا گھونٹ لیا۔ “میں ان کے درمیان میں ہوں، اس سے مجھے معلومات مل جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی میری آزادی محدود ہو رہی ہے جس سے میں بہت سی معلومات تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہی ہوں۔ میں نے پہلے بھی ڈیوڈ سے مطالبہ کیا تھا کہ مجھے فیلڈ ایجنٹس کے کونٹیکٹس دیے جائیں مگر وہ مجھے ٹال رہا تھا۔”

“اتفاق سے میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔ مختلف ایجنٹس کے پاس معلومات کے الگ الگ حصے ہوتے ہیں۔ ان کو ملا کر ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔”

“بالکل، میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا لیکن وہ روایتی لگے بندھے انداز میں کام کرنے کا قائل ہے۔”

“کام ہمیں کرنا ہوتا ہے۔” عمر نے کہا۔ “ویسے تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ کون ہیں؟”

“انتہا پسندوں کی بات کر رہے ہو؟”

“نہیں، ایلن اور اس کے باس ڈیوڈ کی۔”

ماریا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ “تم نہیں جانتے...؟ یہ وزارتِ داخلہ کا ایک ادارہ ہے جو خاص طور سے اندرونی مسائل سے نمٹنے کے لیے بنایا گیا ہے۔”

“میں ایک باہر کا آدمی ہوں اس لیے مجھے کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔ تم باقاعدہ ملازم ہو؟”

ماریا نے سر ہلایا۔ “میں دو سال سے ان کے لیے کام کر رہی ہوں۔”

“اس کیس پر؟”

“نہیں، اس کیس پر چھ مہینے پہلے آئی تھی۔”

“طاہر شاہ اور مائیکل کا کیا لنک ہے؟”

“طاہر شاہ رقوم کی فراہمی کا ذمے دار ہے اور مائیکل کا رابطہ لندن کے سیاہ فام جرائم پیشہ گروہوں سے ہے۔” ماریا نے کہا۔ “لیکن میں ایوان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔”

“وہ اسلحے کا بیوپاری ہے۔ نہ صرف اسلحہ اسمگل کرتا ہے بلکہ اپنے گھر میں بم سازی بھی کر رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایلن اور ڈیوڈ کو بم سازی سے زیادہ دلچسپی اسلحے کی اسمگلنگ کے روٹ میں ہے۔”

ماریا چونکی۔ “بم سازی سے کیا مراد ہے؟”

جواب میں عمر نے اسے ایوان کے مکان کے اندر بم سازی کی ویڈیو دکھائی۔ وہ حیران ہوئی۔ “یہ بہت خطرناک معاملہ ہے۔ اتنا ساز و سامان... اس سے تو بہت بڑا بم بن سکتا ہے۔”

گھر۔ اُداس۔ ویران

جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اُداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے اِن شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کِھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوا لیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزما لیں اور خدارا اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنا لیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0301-6690383
0300-6526061

فون اوقات
صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

”یقیناً وہ بم کی تیاری کر رہا تھا۔“ عمر نے سر ہلایا۔ ”لیکن ایلن اور ڈیوڈ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”اسلحے کا روٹ جاننا بیکار ہے۔ ایک بار آپ نے اسے ٹریس کر لیا تو وہ لوگ دوبارہ اسے استعمال ہی نہیں کریں گے۔“ ماریا نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ”یہاں روٹس کی کمی نہیں ہے۔“

”اصل مسئلہ بم سازی کا ہے اور اس کی ڈیوڈ یا ایلن کو فکر نہیں ہے۔“

”ممکن ہے وہ کسی اور سے بھی اس کی نگرانی کرا رہے ہوں۔“ ماریا بولی۔ ”پھر بھی یہ بہت خطرناک ہے۔ بم ایک دفعہ بن جائے تو اسے کسی بھی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔“

ماریا دو گھنٹے اس کے ساتھ رہی۔ اس نے اپنے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔ اس کا باپ اصل میں فلسطینی تھا اور دوسری عرب اسرائیل جنگ کے بعد وہ لبنان میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی والا آدمی نہیں تھا اس لیے جب لبنان کے حالات بھی خراب ہونے لگے تو وہاں سے انگلینڈ چلا آیا اور یہاں اس نے ایک اسپینش نژاد عورت سے شادی کر لی۔ ماریا اپنے بارے میں بتاتے ہوئے ہنسی۔ ”اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں ماں باپ دونوں کی طرف سے عرب ہوں۔ موجودہ اسپینیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی رگوں میں عرب خون بھی شامل ہے۔ میرے نقوش بھی عرب ہی ہیں۔“

”بات خون کی نہیں نظریے اور مذہب کی ہوتی ہے۔“ عمر نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ میرے آباؤ اجداد اصل میں کون تھے۔ وہ کہاں سے پاکستان کی سرزمین تک آئے اور میرا باپ یہاں انگلینڈ آ گیا۔ لیکن میں یقینی طور پر اپنے مذہب کے بارے میں جانتا ہوں۔“

ماریا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”تم مذہبی آدمی ہو؟“

”ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں آج کل مغرب میں اسلام کو لیا جا رہا ہے۔“

”پھر بھی تم ان کا ساتھ دے رہے ہو جن کے بارے میں مسلمانوں کا یہ تاثر عام ہے کہ وہ اصل میں اسلام سے عداوت رکھتے ہیں۔ ان کے مہذب چہروں کے پیچھے آج بھی قرونِ اولیٰ کا صلیبی چھپا ہوا ہے۔“

”ساتھ تو تم بھی دے رہی ہو؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”میں مذہبی نہیں ہوں۔ میں پریکٹیکل مسلم نہیں ہوں۔ شراب پیتی ہوں، مغربی لباس پہنتی ہوں۔“

”ایسا یہاں کے بہت سارے لوگ کرتے ہیں۔“ عمر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہ بھی جو مغرب کو صلیب زدہ سمجھتے ہیں اور اس پر حملے کے مواقع تلاش کرتے ہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں نے کوشش ہی نہیں کی۔“

”یہ غلط ہے۔ ہر انسان سوچتا ہے اور پھر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہاں، وہ عقل و شعور سے بیگانہ ہو تو الگ بات ہے۔“

”بعض اوقات انسان عقل و شعور رکھتے ہوئے بھی اسے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔“ عمر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ جب ماریا جانے لگی تو اس نے اسے باہر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔

”نہیں، میرا تمہارے ساتھ نظر آنا ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”ان لوگوں سے تم نے کیا کہا ہے؟“

”یہی کہ میں ایک دن کے لیے پیرس جا رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”ان میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟“

”وہی جو بہت سارے بھیڑیوں میں گھری ہرنی کی ہو سکتی ہے۔“

عمر مضطرب ہو گیا۔ جب وہ چلی گئی تو اسے خود پر حیرت ہوئی۔ وہ اس کے لیے فکرمند ہو رہا تھا۔ دوسرے دن وہ تیار ہو کر نکل رہا تھا کہ اسے رائز کی کال آئی۔ اس نے عمر کو لندن کے ایک متروک ریل گودام کے علاقے میں بلایا تھا۔ کسی زمانے میں یہاں باہر سے آنے اور جانے والا سامان ریل گاڑیوں پر لاد کر اندرونِ ملک بھیجا جاتا تھا۔ پھر کنٹینرز کا دور آیا تو بندرگاہ سے سامان براہِ راست جانے لگا اور یہ اسٹیشن متروک ہو گیا۔ رائز ولسن ٹوٹے پھوٹے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس نے رسمی طور پر عمر کی طبیعت پوچھی اور پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔

”فرانس سے ایک اطلاع آئی ہے؟“

”کیسی اطلاع؟“

”فرانس اور اسپین کی سرحد پر علیحدگی پسندوں کا ایک گروپ اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث ہے اور یہ اسلحہ فرانس سے ہوتے ہوئے انگلش چینل کے ذریعے برطانیہ پہنچ رہا ہے۔“

”کیا ایوان کا اس سے لنک ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے۔“ رائز نے کہا۔ ”ڈینی اسمارٹ نہیں ہے اور نہ ہی وہ تمہاری طرح لڑنا جانتا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ایوان کی نگرانی تم ہی کرو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم نے ہی یہ کام ڈینی کے سپرد کیا ہے۔“

”تم فکر مت کرو، وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔“

”لیکن میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔“

”ڈینی تمہارے ساتھ ہوگا۔“ رائز نے اسے تسلی دی۔

”تب ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں مائیکل اور طاہر شاہ کو کون دیکھے گا؟“

”طاہر شاہ اور مائیکل کو میں دیکھوں گا۔ ماریا نے تم سے ملاقات کی؟“ رائز نے یہ سوال اچانک ہی کیا تھا۔ عمر نے بڑی مشکل سے خود کو نارمل رکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”مجھ سے ملاقات کا کیا سوال جبکہ وہ سیل پر بھی رابطہ نہیں کر سکتی۔“

”فی الحال اس سے دور رہنا۔“ رائز نے تنبیہہ کی۔ ”اگر وہ اس کے بارے میں مشکوک ہو گئے تو ہم ایک بہت قیمتی ایجنٹ سے محروم ہو جائیں گے۔“

عمر نے اسے یقین دلایا۔ ”میں اس سے از خود رابطہ نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، اب تم ڈینی سے رابطہ کرنا۔“

رائز کے جانے کے بعد وہ اسی جگہ ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا رائز نے اسے یہی بات کہنے کے لیے بلایا تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ اسے علم نہیں تھا کہ ماریا اس سے ملی تھی اور پورے دو گھنٹے تک اس کے فلیٹ میں رہی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے کیوں علم نہیں تھا؟ بلکہ ان لوگوں کو کیوں علم نہیں تھا؟ جبکہ ماریا ان کی باقاعدہ ایجنٹ تھی۔ رائز کے حکم کا مقصد اسے ماریا سے دور کرنا تھا۔ وہ دیر سے واپس گیا۔ سرکاری کار واپس چلی گئی تھی اس لیے وہ ٹیوب سے اور پیدل سفر کر رہا تھا۔ وہ اپنے اسٹیشن سے باہر نکلا تو اس کی نظر سیڑھیوں پر بیٹھے فہد پر گئی۔ اس کا چہرہ خون آلود تھا اور وہ جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ عمر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”فہد! یہ کیا ہوا؟“

لیکن فہد فی الحال جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ عمر اسے سہارا دے کر اپنے فلیٹ تک لایا۔ فہد کے چہرے کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا تھا اور اس کی ایک آنکھ سوج کر بند ہو گئی تھی۔ اس کے نیچے گال پھٹ گیا تھا اور اوپر بھوں بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی پسلیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے سیدھا بیٹھا یا بولا نہیں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

جا رہا تھا۔ اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ دوا ملے گرم پانی سے زخموں کی صفائی اور پھر برف کی ٹکور کے بعد گرم کافی سے اسے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ بولنے کے قابل ہو گیا۔ عمر نے پوچھا۔ ”یہ کس کا کام ہے؟“

”جیمز کا۔“

عمر کا خون کھولنے لگا۔ ”کون کون شامل تھا؟“

”بارنی اور...“

”اور کون؟“ عمر نے پوچھا پھر اسے خیال آیا۔ ”سعد بھی شامل تھا؟“

فہد کے لیے یہ تشدد سے زیادہ اذیت ناک بات تھی کہ اسے مارنے والوں میں اس کا چھوٹا بھائی بھی شامل تھا اور وہ مار پیٹ میں پیش پیش تھا۔ عمر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”وجہ کیا تھی؟“

”ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں سعد کو ان لوگوں میں شامل ہونے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری وجہ...“

”میں ہوں۔“ عمر کا لہجہ سخت تھا۔ ”جیمز مجھے اپنے ساتھ ملانے کے لیے بے تاب ہے۔“

فہد نے سر ہلایا۔ ”تم تربیت یافتہ لڑاکا ہو اور اسے ایسے آدمیوں کی تلاش رہتی ہے۔“

”میں اس سے ملوں گا۔“

”نہیں۔“ فہد خوفزدہ ہو گیا۔ ”اس کے ساتھ بہت بدمعاش ہوتے ہیں اور وہ سب مسلح ہوتے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو۔“ عمر کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ”میں صرف اس سے بات کروں گا۔“

فہد نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے فہد کو پین کلر اور خواب آور دوا دے کر سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب وہ سو گیا تو عمر خاموشی سے فلیٹ سے نکل گیا۔ وہ پیدل چلتا رہا اور کچھ دیر بعد وہ جیمز کے اڈے پر تھا۔ یہ ایک دس منزلہ عمارت کا پچھلا حصہ تھا اور اس کے دو فلور جیمز کے پاس تھے۔ وہ داخلی دروازے کے سامنے آیا تھا کہ وہاں موجود سعد اسے دیکھتے ہی بھاگا۔ عمر اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا اندر آیا تو ایک گیلری میں ایک نوجوان سفید فام نے اسے روک لیا۔ اس کے ساتھ زنجیر سے بندھا بل ڈاگ تھا جو اس پر بھونک رہا تھا۔ نوجوان نے غراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”میں جیمز سے ملنے آیا ہوں۔“

نوجوان نے پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے بارنی کی طرف دیکھا تو وہ سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد وہ باہر آیا اور اس نے اشارے سے عمر کو آگے آنے کو کہا۔ وہ نوجوان اور کتے کے پاس سے گزرا۔ کتا اب خاموش تھا۔ اندر لے جانے سے پہلے بارنی نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کمرے میں جیمز کے ساتھ دو افراد اور تھے لیکن اسے سعد نظر نہیں آیا۔ جیمز اسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھیوں کا انداز ایسا تھا جیسے اشارہ ملتے ہی اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ جیمز نے کہا۔ ”بالآخر تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔“

”نہیں، میں صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے بات کرو۔ غیر متعلقہ لوگوں اور چیزوں کو کیوں چھیڑ رہے ہو؟“

”تم سے بات ہو چکی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں نے تمہیں پیشکش کی تھی۔“

”پیشکش؟“ عمر نے تلخ لہجے میں کہا اور جیمز کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”تم جو کر رہے ہو وہ اس سے قطعی مختلف نہیں ہے جس کا الزام تم مغرب پر لگا رہے ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”تم کہتے ہو نا مغرب مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا ہے۔ مغرب طاقت کی سیاست کر رہا ہے۔ ذرا غور کرو، جواب میں تم کیا کر رہے ہو؟ یہ وہی کام ہے جو مغرب سیاست کے نام پر کر رہا ہے اور تم مذہب کے نام پر کر رہے ہو۔ اور جس مذہب کے لیے کر رہے ہو، اس کا تمہاری ذاتی زندگی میں کوئی اثر نظر نہیں آتا...“ عمر نے کہتے ہوئے دیواروں پر لگی ماڈلز کی عریاں تصاویر اور ایک طرف ریکس میں بجی شراب کی بوتلوں پر نظر ڈالی۔

”میری ذاتی زندگی سے میری جدوجہد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

”پڑتا ہے لیکن تم سمجھ نہیں رہے ہو۔“ عمر نے زور دے کر کہا۔ ”تم سعد جیسے کچے ذہن کے بچوں کو بہکا سکتے ہو۔ تم نئے مسلم ہونے والے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر سکتے ہو کیونکہ وہ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لیکن کیا کبھی تم نے کسی سنجیدہ اور پختہ عمر جوان مسلمان کو بھی قائل کیا ہے؟“

”باس، یہ زیادہ ہی بکواس کر رہا ہے۔“ جیمز کے ایک ساتھی نے بگڑ کر کہا۔ ”اس سے کہو اپنی زبان بند کرے یا...“

”یا تم طاقت کے زور پر بند کر دو گے۔“ عمر مسکرایا۔

جیمز تلملا کر بولا۔ ”ہم جو کر رہے ہیں، وہ درست ہے۔ جلد ان لوگوں کے دماغ ٹھکانے آجائیں گے۔“

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم لوگ کچھ ہاتھوں میں کھیل رہے ہو۔ ان ہاتھوں پر دستانے چڑھے ہیں اور جب ایک دن یہ دستانے اتریں گے تو تم تعجب کرو گے مگر اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ بے گناہوں کے خون سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور نہ طاقت کے بل پر کسی کو اپنا ہم نوا بنایا جا سکتا ہے۔“ عمر نے کہا اور پلٹ کر باہر نکل آیا۔ اس نے جیمز کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ عمر کے جاتے ہی ایک طرف سے سعد نکل آیا۔ اس نے جیمز سے مطالبہ کیا۔ ”اسے قتل کر دو ورنہ یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔“

”یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ جیمز نے کہا۔ ”اب تم یہاں سے باہر نہیں جاؤ گے۔“

☆☆☆

عمر مائیکل اور ماریا کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے کسی قدر پرانے ماڈل کی لیکن طاقتور انجن والی ٹو سیٹر جیگوار کار لی تھی۔ وہ لندن سے باہر جانے والی ہائی وے پر نکلے اور کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ایک گیس اسٹیشن پر رکی۔ مائیکل ایندھن کے لیے لائن میں لگ گیا اور ماریا اتر کر ساتھ واقع اسٹور میں چلی گئی۔ عمر نے محسوس کیا کہ ماریا سے بات کرنے کا یہ موقع اچھا ہے۔ وہ گاڑی پارک کر کے اندر آیا تو ماریا ایک طرف کولڈ ڈرنک ٹن کا کارٹن اور کچھ دوسری چیزیں لیے ادائیگی کی قطار میں کھڑی تھی۔ عمر نے سگریٹ کا ایک پیکٹ لیا اور قطار میں ماریا کے عقب میں آ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”پیرس... دو دن کے لیے۔“ ماریا نے زیرِ لب جواب دیا۔

”کیوں؟“

”اسلحے کی ایک کھیپ کا سودا ہونا ہے۔ مائیکل اس کی ادائیگی کرے گا۔“

”کھیپ کہاں آئے گی؟“

”یہ میں معلوم کر کے بتا سکتی ہوں۔“

”ہاتھ پیچھے کرو، میں اپنا سیل نمبر دے رہا ہوں۔ اس پر رابطہ کرنا۔“

ماریا نے ہاتھ پیچھے کیا تو عمر نے اسے پرچی تھما دی۔ اسی لمحے مائیکل بھی عقب میں آ گیا۔ وہ گیس کی ادائیگی کرنے آیا تھا۔ چند منٹ کے بعد ماریا اور مائیکل روانہ ہو گئے۔ اس سے کچھ آگے انگلش چینل کے نیچے سے گزرنے والی ٹنل کی طرف جانے والا حصہ آجاتا تھا۔ یہاں صرف وہی جاتے تھے جنہوں نے فرانس جانا ہوتا تھا۔ عمر یہیں سے واپس ہو گیا۔ اب اسے طاہر شاہ کی نگرانی کرنا تھی اور ماریا کی طرف سے کال کا انتظار کرنا تھا۔ لیکن جب وہ واپس آیا تو ڈینی نے اسے کال کی۔ ”فی الحال طاہر شاہ کی نگرانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم آرام کر سکتے ہو۔“

”وجہ؟“

”وجہ... ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ ہم تو اوپر سے آئے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔“ ڈینی نے رک کر کہا۔

”ٹھیک ہے، میں کچھ دن آرام کروں گا۔“

فہد اس کے فلیٹ پر تھا۔ فی الحال عمر نے اسے گھر جانے سے روک دیا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں اس کی جیمز سے کھری گفتگو کا نتیجہ فہد کے حق میں بُرا نہ نکلے۔ وہ ایک آسان نشانہ تھا۔ اس کی حالت بہتر ہو گئی تھی اور آنکھ کی سوجن اتر گئی تھی لیکن چٹخ جانے والی پسلی میں تکلیف باقی تھی۔ فہد نے اس سے پوچھا۔ ”تم آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”ملازمت کی تلاش۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”نہیں، دوست... تم غلط کہہ رہے ہو اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو الگ بات ہے ورنہ تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صاف منع بھی کر سکتے ہو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ عمر ہچکچایا۔ اسے خود بھی فہد جیسے پرانے دوست سے جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا پھر اسے محسوس ہوا کہ فہد اس معاملے پر اس سے اتفاق کرے گا اس لیے اس نے فہد کو ساری بات بتا دی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ لوگ تمہیں استعمال نہیں کر رہے ہیں؟“

عمر نے شانے اچکائے۔ ”ڈینی کی حد تک مجھے یقین ہے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”میں ڈینی کی نہیں، ایلن اور ڈیوڈ کی بات کر رہا ہوں۔ میں برسوں سے انگلینڈ میں ہوں اور کسی حد تک یہاں کے لوگوں کو سمجھنے لگا ہوں۔ یہاں سرکاری کام اس طرح سے نہیں کیے جاتے۔ یہاں پرائیویٹ کنٹریکٹر کا کوئی تصور نہیں ہے۔“

فہد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ عمر نے سوچ کر کہا۔ ”یہ الگ معاملہ ہے۔ یوں سمجھ لو کہ سنگل اسائنمنٹ جاب ہے۔ مجھے کسی بڑی کارروائی کو ہونے سے پہلے روکنا ہے۔“

”یہ ہمارے مفاد میں بھی ہے۔“ فہد نے سر ہلایا۔ ”ہمارا دین اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ہے کہ ہم بے گناہوں کو قتل کریں۔ اگر ہم ایسا کوئی واقعہ روکنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو مسلمانوں کے لیے بھی بہتر ہوگا۔“

”بدقسمتی سے جیمز جیسے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔“

فہد نے سر ہلایا۔ ”یہ مغرب کا کھیل ہے اور وہ اس کے غالب کھلاڑی ہیں اس لیے سب ان کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ کم سے کم وہ سمجھتے ایسا ہی ہیں۔“

فہد نے موضوع بدل دیا۔ ”یہ لڑکی ماریا... اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے وہ کسی مسئلے کا شکار ہے۔ وہ ایلن اور ڈیوڈ سے چھپ کر مجھ سے ملی تھی۔ یہ بات میں نے بھی کسی کو نہیں بتائی ہے۔“

”کیا وہ کچھ چھپا رہی ہے؟ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جن کی وہ جاسوسی کر رہی ہے۔“

”ہوسکتا ہے۔ ابھی وہ پیرس گئی ہے جہاں مائیکل کو اسلحے کی کسی کھیپ کی ادائیگی کرنی ہے۔“

فہد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”صورتِ حال واقعی بہت خراب ہے۔ آنے والے دنوں میں ایسے واقعات ہو سکتے ہیں جس سے مسلم کمیونٹی مشکل میں پڑ جائے۔“

”ہم لوگوں کو بھی ایسے واقعات کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔“ عمر نے کہا۔ ”ہمیں خود کو بہ حیثیت کمیونٹی حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”ہم کوشش کر رہے ہیں۔“ فہد نے کہا۔ ”میرا تعلق ایک ایسی ہی آرگنائزیشن سے ہے۔ مسلم فار پیس نامی یہ تنظیم مسلمانوں میں انتہا پسندی کے خلاف شعور پیدا کرنے کے لیے کام کر رہی ہے۔“

”تم نے پہلے نہیں بتایا؟“

فہد مسکرایا۔ ”تم نے بھی پہلے نہیں بتایا تھا۔ بہرحال ہمارا کام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اس کے ممبر بن رہے ہیں۔ ہم مسلم نوجوانوں پر نظر رکھتے ہیں اور اگر وہ غلط راستوں پر جانے لگیں تو ان کے ماں باپ اور کمیونٹی کو خبردار کرتے ہیں۔“ فہد نے کہتے ہوئے گہری سانس لی۔ ”لیکن میں جو دوسرے نوجوانوں پر نظر رکھتا ہوں، اپنے ہی بھائی پر نظر نہ رکھ سکا۔ وہ غلط راہوں پر چل نکلا۔“

عمر نے فہد کی طرف دیکھا تو چونک گیا۔ وہ آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

”سعد میرا ایک ہی بھائی ہے، اس دنیا میں وہی میرا سب کچھ ہے۔“

”تم فکر مت کرو، سعد کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ ان کے چنگل سے نکل آئے گا۔“ عمر نے اسے تسلی دی۔

”لیکن کیسے؟... جیمز اور اس کے آدمی مافیا ہیں۔ اگر انہیں محسوس ہوا کہ سعد پیچھے ہٹ رہا ہے تو وہ اسے مار بھی سکتے ہیں۔“

عمر حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”فہد! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ سعد کو ان کے چنگل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“

فہد پُر امید ہوگیا۔ ”اگر ایسا ہوگیا تو میں اس بار سعد پر کڑی نظر رکھوں گا۔ اسے پھر غلط ہاتھوں میں جانے نہیں دوں گا۔“

عمر نے وعدہ کرلیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے ایفا کیسے کرے گا۔ اگلے دن اسے ایک اجنبی نمبر سے ایک ایس ایم ایس ملا۔ اس میں اسی ویران بندرگاہ کا نام، ایک بوٹ کا نام اور وقت صبح سات بجے کا تھا۔ جس نمبر سے ایس ایم ایس آیا تھا، وہ فرانس کا تھا۔ شک کے باوجود عمر نے اس نمبر پر کال کرنے سے گریز کیا۔ اس سے ماریا کسی مشکل میں پڑسکتی تھی۔ ایس ایم ایس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کتنی مشکل میں ہے اور شاید اس کی نگرانی کی جارہی تھی ورنہ وہ اسے کال بھی کرسکتی تھی۔ عمر کا دل دھڑک اٹھا۔ نگرانی کا مطلب تھا کہ ماریا مشکوک ہوگئی تھی اور ایسے کام کرنے والے فوری فیصلہ کرتے ہیں۔ اگلی صبح فہد فجر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس نے عمر سے کہا تھا کہ وہ آج کچھ کام نمٹائے گا اس لیے دیر سے آئے گا۔

ناشتا کرکے عمر بھی جلدی نکل گیا تھا۔ اس نے جیگوار کار بندرگاہ کے ساتھ ہی ایک متروک آئل ٹرمنل کے اندر چھپا دی۔ یہاں آمدورفت نہیں تھی اس لیے اس کی کار نظروں میں آسکتی تھی۔ وہ پیدل کاٹھ کباڑ کی آڑ میں جیٹی کی طرف بڑھا۔ فوراً ہی سی روز نامی کشتی نظر میں آگئی۔ یہ درمیانے درجے کی کشتی تھی اور شاید باربرداری کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کشتی جس جیٹی کے ساتھ رکی تھی، اس پر ایک طویل بیرک نما کمرا بنا ہوا تھا جس کی کھڑکیوں کے شیشے اور دروازے غائب تھے۔ عمر دیکھ رہا تھا کہ اندر سے ایوان برآمد ہوا۔ وہ کشتی پر کودا اور اس نے ایک بڑا سا سیاہ بیگ اٹھایا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ بیگ خاصا وزنی ہے۔ وہ بہ مشکل اسے جیٹی پر لایا اور ایک طرف رکھ کر پھر کشتی میں گیا اور ایسا ہی دوسرا بیگ اٹھا لایا پھر وہ بیرک نما کیبن میں چلا گیا۔ دکھائی دے رہا تھا کہ عمر سے لڑائی میں ایوان کو جو زخم لگے تھے، وہ بھر گئے تھے اور وہ پوری طرح میدان میں آگیا تھا۔ اس کے جاتے ہی عمر آڑ سے نکلا۔ اس نے تیزی سے جیٹی تک جانے والے مختصر سے پل کو کراس کیا۔

لیکن جب وہ پل کراس کرکے دوسری طرف پہنچا تو اسے ایوان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دونوں سیاہ بیگ وہیں پڑے تھے۔ وہ کیبن کے دوسری طرف آیا۔ اس طرف بھی دروازے اور کھڑکیاں تھیں۔ تختے ٹوٹ رہے تھے اور کیبن کے اندر گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یقیناً آوارہ گرد اسے اپنی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن فی الوقت یہ جگہ خالی تھی۔ وہ بہت محتاط انداز میں کمروں میں جھانکتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ خاموش رہے لیکن پیروں تلے چرچراتے تختوں کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس نے کیبنوں کے گرد پورا چکر لگا لیا لیکن اسے ایوان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ جب وہ چکر لگا کر دوبارہ کشتی والی طرف آیا تو اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا۔ لیکن اسی لمحے عقب سے باریک ڈوری اس کے گلے کے گرد لپٹ گئی۔ اگر وہ بروقت اپنا بایاں ہاتھ گلے اور ڈوری کے درمیان نہ لاتا تو اس کا فوری کام تمام ہوجاتا۔

مگر اب بھی صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ ایوان پوری قوت صرف کر رہا تھا اور ڈوری اس کے ہاتھ اور دائیں طرف گلے میں دھنسی جارہی تھی۔ اس کا سانس رک رہا تھا۔ ایوان اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ عمر نے ہمت کرکے خود کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ایوان کو لے جاکر دیوار پر مارا لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سانس رکنے سے عمر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے کہنی پوری قوت سے ایوان کے پیٹ میں ماری۔ اس کا اثر ہوا اور اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی۔ دوسرا وار زیادہ قوت سے تھا۔ مگر ایوان نے اس کا اثر قبول نہیں کیا کیونکہ عمر کی کہنی کسی سخت چیز سے لگی تھی۔ آکسیجن کی کمی سے اس کا دماغ جیسے ڈوب رہا تھا۔ اس نے بہ مشکل ہاتھ پیچھے کیا اور ایوان کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر ہاتھ اوپر کرتے ہوئے لگاتار تین فائر کیے۔ ایوان جھٹکے سے پیچھے گیا اور ڈوری کا دباؤ ختم ہوگیا۔ عمر کی حالت بُری ہورہی تھی۔ اس کا نرخرہ پِس کر رہ گیا تھا اور دباؤ ختم ہونے کے باوجود وہ مشکل سے سانس لے پا رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے میں اسے کئی منٹ لگے۔ اس دوران میں وہ ایوان کی طرف سے بالکل غافل رہا تھا۔

سنبھل کر اس نے ایوان کو دیکھا۔ وہ جیٹی پر چت پڑا تھا اور اس کی کھلی آنکھوں میں پتلیاں پھیل گئی تھیں، وہ مرچکا تھا۔ عمر نے سب سے پہلے اس کی تلاشی لی اور اس کا سیل فون نکال لیا۔ اس کے پرس میں سوائے اس کے کاغذات اور رقم کے کچھ نہیں تھا۔ عمر نے وہاں سے ایک لوہے کی بھاری چیز تلاش کی اور اسے ایوان کی لاش سے باندھ کر اسے جیٹی سے نیچے دھکیل دیا۔ فرش پر پھیل جانے والے خون پر سمندر کا پانی بہایا تو وہ صاف ہوگیا۔ آخر میں وہ سیاہ بیگز کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے باری باری دونوں بیگز کھولے۔ ان میں جدید ساخت کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ان میں خودکار رائفلیں اور پستول شامل تھے۔ اکثر اسلحہ سابق چیکوسلواکیہ میڈ تھا اور کچھ سابق یوگوسلاویہ میڈ تھا۔ عمر ان بھاری بیگوں کو بڑی مشکل سے اپنی گاڑی تک لایا اور اس کی ڈکی میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ واپس آنے کے بعد اس نے ڈینی کو کال کی۔

”تم کہاں ہو؟“

”میں ایوان کی نگرانی کر رہا ہوں۔“ ڈینی نے حسبِ توقع جواب دیا۔ عمر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اسے ایوان کو اکیلے پاکر پہلے ہی شک ہوگیا تھا کہ اس کی نگرانی والی بات جھوٹ ہے اور ڈینی کے جواب نے اسے ثابت بھی کردیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”دوست... میں فارغ ہوں، مجھے کام بتاؤ۔“

”ایلن کی طرف سے ابھی کوئی ہدایت نہیں آئی ہے۔“

عمر نے فون بند کیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس سارا دن وہ سوچتا رہا۔ فہد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ جب وہ شام تک واپس نہیں آیا تو اس نے فہد کو کال کی تو اس نے کال ریسیو کی اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”میں اب نہیں بچوں گا۔“

عمر چونک گیا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”اپنے گھر میں لیکن شاید میرا آخری وقت آگیا ہے۔“

”فہد! میری بات سنو۔ اپنا فلیٹ اندر سے بند کرلو اور جب تک میں آواز نہ دوں دروازہ مت کھولنا۔ میں آرہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے دوست... لیکن شاید تمہارے آنے تک میں زندہ نہ رہوں۔“ فہد نے مایوسی سے کہا۔

عمر نے جھپٹ کر کار کی چابیاں اٹھائیں اور باہر کی طرف لپکا۔ فہد کا فلیٹ دو بلاک آگے اور چوتھے فلور پر تھا۔ وہاں جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں لفٹ میسر نہیں تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ فلیٹ کے دروازے پر دستک دی پھر کال بیل بجائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے بلند آواز سے فہد کو پکارا۔ اس بار بھی خاموشی رہی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جانے کا سوچ رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ ”وہ نہیں ہے۔“

عمر چونک کر مڑا۔ وہاں سعد کھڑا تھا۔ ”کیا مطلب؟“

”وہ زندہ نہیں ہے۔“ سعد نے اس بار واضح الفاظ میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کانپ رہا تھا۔ عمر اس کی طرف بڑھا تو اس نے پستول نکال لیا۔

”میرے پاس مت آنا۔“ سعد کے لہجے میں واضح وارننگ تھی۔ وہ رک گیا۔

”اسے تم نے شوٹ کیا ہے... اپنے بھائی کو؟“

سعد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے نہیں معلوم اسے کس نے مارا ہے۔ میں اسے سمجھانے آیا تھا۔“

”سمجھانے کی ضرورت اسے نہیں، تمہیں ہے۔“ عمر نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن تم شاید سمجھنے کی حد سے گزر چکے ہو۔“

”یہاں سے چلے جاؤ، اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔“ سعد نے کہا اور پیچھے ہٹا پھر مڑ کر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ عمر نے آخری بار فہد کے فلیٹ کو دیکھا اور جھکے ہوئے قدموں سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے فلیٹ پہنچا تو ٹھٹک گیا۔ وہ دروازہ لاک کر کے گیا تھا لیکن اب کھلا ہوا تھا۔ اس نے پستول نکال لیا اور آہستہ سے ہینڈل گھمایا۔ اندر تاریکی تھی مگر فوراً ہی ماریا کی آواز آئی۔ ”اندر آ جاؤ۔ روشنی مت کرنا۔“

عمر کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ اندر آیا اور دروازہ لاک کر دیا۔ ”تم اندر کیسے آ گئیں؟“

”ہم جیسے لوگ بند دروازے کیسے کھولتے ہیں؟“ ماریا بولی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم کب واپس آ گئیں؟“

”میں واپس نہیں آئی ہوں، وہاں سے فرار ہوئی ہوں۔“

”ان لوگوں کو شک ہو گیا تھا؟“

”نہیں، انہیں میرے بارے میں یقین ہو گیا تھا اور وہ مجھے قتل کرنے لے جا رہے تھے کہ میں موقع دیکھ کر راستے سے فرار ہو گئی۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ یہاں بھی معاملات ٹھیک نہیں ہیں۔“ عمر نے کہا۔ ”تم نے ناشتا کیا ہے؟“

”نہیں، میں نے لفٹ لے کر انگلینڈ تک سفر کیا ہے۔ میری ساری رقم بھی ان لوگوں نے چھین لی تھی۔ پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات میرے لباس کے اندر تھے اس لیے بچ گئے۔ میرا اسیل فون بھی چھین لیا تھا۔“

”پہلے ناشتا کر لو۔“

وہ عمر کے پیچھے کچن میں آئی تو وہ چونک گیا۔ کوٹ کے اندر اس کی سفید شرٹ پر خون لگا ہوا تھا۔ ”تم زخمی ہو؟“

”ہاں فرار کی کوشش میں چوٹ لگی تھی۔“

عمر نے اسے وہیں کرسی پر بٹھایا اور نرمی سے کہا۔ ”اگر تم اعتراض نہ کرو تو میں زخم دیکھ لوں؟“

ماریا کا سرخی مائل رنگ کچھ اور سرخ ہوا لیکن اس نے سر ہلایا۔ عمر نے اس کی شرٹ کے نچلے بٹن کھولے۔ زخم پیٹ اور پسلیوں کے ملاپ والی جگہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی نکیلی چیز کھال چیر گئی تھی۔ ماریا نے تصدیق کی کہ یہ زخم خاردار باڑھ سے لگا تھا۔ وہ سامان لایا اور زخم صاف کیا۔ ماریا کے ہاتھ پیروں پر بھی کچھ خراشیں تھیں۔ بال روکھے اور خراب ہو رہے تھے۔ عمر نے تجویز دی۔ ”ایسا کرو تم نہا لو پھر اس زخم کی پٹی کر دوں گا۔“

آدھ گھنٹے بعد ماریا غسل اور پٹی سے فارغ ہو کر عمر کے سلیپنگ سوٹ میں ناشتا کر رہی تھی۔ وہ کسی قدر مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ وہ جب اسے دیکھتا، وہ کھسیانے انداز میں مسکرا دیتی تھی۔ اس نے ناشتا کیا تو وہ کافی لے کر لاؤنج میں آ گئے۔ ماریا سنجیدہ ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے میرے بارے میں یہاں سے بتایا گیا ہے؟“

”کیا مطلب کہاں سے؟“

”ان لوگوں نے جن کے لیے میں کام کر رہی تھی۔“ ماریا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”جب وہ مجھے مارنے لے جا رہے تھے تو انہوں نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا تھا کہ میں مسلمان ہو کر ان لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ پھر ایک آدمی نے کہا کہ میرے بارے میں انہی لوگوں نے بتایا ہے جن کے لیے میں کام کرتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے اس شخص نے ٹھیک کہا ہے۔ یہاں بھی بہت گڑبڑ ہے۔“ عمر نے کہا اور پھر ایوان سے ہونے والی مڈبھیڑ اور ڈینی کے جھوٹ کے بارے میں بتایا۔ ”اب میرا شبہ پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ گڑبڑ اصل میں ایلن اور ڈیوڈ میں ہے اور ہم اس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ سرکاری آدمی نہیں ہیں؟“

”اس کا بھی امکان ہو سکتا ہے یا اگر وہ سرکاری آدمی ہیں تو ان کا اصل مقصد انتہا پسندوں کو نشانہ بنانا نہیں ہے۔“

”تب ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“ ماریا فکر مند ہو گئی۔ ”میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ دو سالوں میں مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میں سرکاری ایجنسی کے لیے کام نہیں کر رہی ہوں۔“

”اس کا پتا چلانا پڑے گا۔“ عمر نے کہا پھر اسے مشورہ دیا۔ ”تم سو جاؤ، تھکی ہوئی ہو اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”مجھے ان حالات میں نیند نہیں آئے گی۔ کوئی نیند کی دوا ہے؟“

عمر نے اسے نیند آور دوا کی شیشی لا دی۔ جنگ کے دوران میں اسے بھی سونے کے لیے ان گولیوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ماریا نے اس کی ہتھیلی سے شیشی اٹھانا چاہی تو اس نے ہتھیلی بند کر دی اور آہستہ سے بولا۔ ”ایک کھانا، سب مت کھا لینا۔“

”فکر مت کرو، سب کھانے کی نوبت آئی تو میں اکیلے نہیں مروں گی۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا اور شیشی اٹھا لی۔ عمر نے اپنے لیے دوسرا لباس نکالا۔ اس نے سعد سے حاصل کیا پستول گٹر میں ڈال دیا تھا۔ ایوان کا پستول جس سے وہ خود مارا گیا تھا اسے بھی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ اب اسے ہتھیار کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک سیاہ بیگ سے پستول اور اس کے اضافی میگزین نکالے۔ پستول پیک تھا۔ اس نے پہلے اسے پرزے پرزے کر کے اس کی صفائی کی۔ پرزوں کو تیل دیا۔ پھر انہیں جوڑ کر کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا اور جیکٹ میں رکھ کر روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے بیڈ روم میں جھانکا تو ماریا بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے اس پر چادر درست کی اور باہر نکل آیا۔

اس نے اپنی جیگوار کے بجائے ذرا دور کھڑی ایک سیاہ شیشوں والی کار کا انتخاب کیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر چابی نہیں تھی۔ یہ مسئلہ اس نے تار کاٹ کر ان میں سے اگنیشن والے تار جوڑ کر حل کر لیا۔ کار کا ٹینک تقریباً بھرا ہوا تھا اور نیا انجن بے مثال تھا۔ وہ طاہر شاہ کے گھر کے پاس پہنچا لیکن اس کی گلی کے بجائے دوسری گلی میں ایک جگہ کار روکی۔ عقبی آئینے میں طاہر شاہ کے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اب اسے انتظار کرنا تھا۔ ممکن ہے اس انتظار کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا لیکن وہ ایک امید کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے اور لندن میں حسب معمول گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک بجے کے قریب عمارت کا دروازہ کھلا اور اس سے طاہر شاہ مائیکل کے ساتھ باہر آیا۔ ان کے حلیوں اور زیرِ استعمال گاڑیوں سے لگتا تھا کہ ان کے پاس دولت ہے۔ طاہر شاہ جس عمارت میں رہتا تھا اس میں موجود ہر اپارٹمنٹ کی مالیت دو ملین پاؤنڈز سے کم نہیں تھی۔ وہ نہایت قیمتی سوٹ پہنتا تھا۔ اسی طرح مائیکل بھی بہترین سوٹ میں ہوتا تھا۔ اس کی کلائی پر ہیروں سے سجی گھڑی تھی۔

اس بار وہ طاہر شاہ کی مرسیڈیز کے بجائے میرون رنگ کی ٹویوٹا وین میں روانہ ہوئے۔ یہ بھی لگژری گاڑی تھی۔ دونوں فرنٹ سیٹ پر آئے تھے، یعنی بس وہی دونوں تھے۔ وین گھومی اور مخالف سمت میں روانہ ہوئی۔ عمر کو بھی عجلت میں ان کے پیچھے جانا پڑا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ انہیں کھو نہ دے لیکن سڑک تک آتے آتے وہ درمیان میں مناسب فاصلہ قائم کر چکا تھا۔ اس نے آگے پیچھے کا بھی خیال رکھا تھا اور کچھ دیر میں اس نے جان لیا کہ کوئی اور گاڑی وین کے تعاقب میں نہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کی نگرانی کے حوالے سے اس سے مسلسل جھوٹ بولا گیا تھا۔ وین مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے سینٹرل لندن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس طرف زیادہ تر سرکاری دفاتر تھے یا تجارتی عمارتیں تھیں۔ اگر کہیں رہائش تھی تو وہ بہت ہی مہنگی تھی۔ لندن کا شمار زمین اور جائداد کے لحاظ سے دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں ہوتا ہے۔

آدھ گھنٹے بعد وہ زو کے ساتھ پارک کی طرف مڑی۔ یہاں پارکنگ بھی تھی۔ وین ایک الگ تھلگ حصے میں چلی گئی جہاں اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ عمر نے اپنی کار ہجوم والی جگہ روک لی تاکہ نمایاں نہ ہو۔ اس نے ایک چھوٹی سی دوربین نکالی اور وین کا جائزہ لینے لگا۔ طاہر شاہ اور مائیکل اندر موجود تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی موضوع پر بحث کر رہے ہوں۔ ان کے تاثرات سے کشیدگی نمایاں تھی لیکن جیسے ہی ایک گرے رنگ کی کار آ کر وین کے برابر میں رکی، وہ دونوں مسکرانے لگے۔ پھر وہ وین سے اتر آئے۔ گرے کار سے جو شخص اترا اسے دیکھ کر عمر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ایلن کا باس ڈیوڈ تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ان مبینہ انتہا پسندوں سے ہاتھ ملائے جن کے خلاف اس نے عمر، ماریا اور ان جیسے نہ جانے کتنے ایجنٹوں کو لگا رکھا تھا۔ وہ تینوں تقریباً دس منٹ تک آپس میں بات کرتے رہے۔ پھر ڈیوڈ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوا اور اس کے جانے کے بعد طاہر شاہ اور مائیکل نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی بات کامیاب رہی تھی۔

جیسے ہی ڈیوڈ کی کار باہر نکلی، عمر اس کے پیچھے لگ گیا۔ اس نے اب تک صرف ایک عمارت دیکھی تھی جس میں ڈیوڈ کا دفتر تھا۔ اس دن وہ شام تک ڈیوڈ کے پیچھے رہا اور جب وہ واپس فلیٹ کی طرف روانہ ہوا تو اس نے ڈیوڈ کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ راستے میں اس نے ماریا کے لیے کچھ شاپنگ کی تھی۔ چوری کی کار اس جگہ سے ایک بلاک دور کھڑی کر کے اس نے اس پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور روانہ ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ مالک کو زیادہ زحمت نہیں کرنا پڑے گی اور اسے کار مل جائے گی۔ ماریا جاگ گئی

تھی اور کچن میں مصروف تھی۔ اس نے فریج سے سامان نکال لیا تھا اور ڈنر تیار کرنے میں مصروف تھی۔

’’طبیعت کیسی ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہوں، تم کہاں گئے تھے؟‘‘

’’کچھ کام تھا اور یہ تمہارے لیے کپڑے لایا ہوں۔‘‘

ماریا خوش ہو گئی۔ ’’یہ تم نے اچھا کیا کیونکہ ابھی مجھے جانا ہے اور میں سوچ رہی تھی کہ پرانے کپڑے ہی پہن کر چلی جاؤں۔‘‘

’’کہاں جانا ہے؟‘‘

’’اپنی رہائش پر۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ عمر مضطرب ہو گیا۔ ’’ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ مجھے یقین ہے دونوں پارٹیاں تمہاری تاک میں ہوں گی۔‘‘

ماریا نے سر ہلایا۔ ’’یہ خطرہ تو ہے لیکن مجھے وہاں سے کچھ چیزیں لینی ہیں لازمی۔‘‘

’’اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن آج نہیں کل۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ خلافِ توقع مان گئی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے اس کے نائٹ سوٹ میں وہ بالکل گھریلو عورت لگ رہی تھی۔ اس نے گوشت اور بعض سبزیوں کی مدد سے بہت مزے کا ڈنر تیار کیا۔ عمر نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔

’’یہ لبنانی ڈش ہے جو میرے ڈیڈی نے مجھے بنانا سکھائی تھی۔‘‘ وہ اپنے ماں باپ کے بارے میں بتانے لگی۔ پھر وہ اداس ہو گئی۔ ’’ماما کے بعد میرا کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’اتفاق سے میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ پاکستان میں کچھ رشتے دار ہیں لیکن نہ میں ان کے بارے میں جانتا ہوں اور نہ وہ میرے بارے میں جانتے ہیں۔‘‘

’’بہت سے لوگ اس دنیا میں بہت اکیلے ہوتے ہیں۔‘‘ ماریا نے ہاتھ روک لیا۔

’’کھاؤ۔۔۔ رک کیوں گئیں؟‘‘

’’بس میرا موڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی رات کو میں ہلکا پھلکا کھاتی ہوں۔‘‘ وہ اپنے برتن سمیٹنے لگی۔ کھانے کے بعد وہ کافی لے کر لاؤنج میں آ گئے۔ اس مختصر سے فلیٹ میں بس دو ہی کمرے تھے۔ عمر نے اسے آج کے دن کی روداد سنائی تو ماریا پہلے حیران ہوئی پھر اس کی آنکھوں میں غصہ دہک اٹھا۔ اس نے کہا۔ ’’یہ ہمیں جانوروں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔‘‘

’’دونوں طرف سے۔‘‘ عمر نے تصحیح کی۔

’’لیکن ماسٹر مائنڈ تو یہی لوگ ہیں۔‘‘ ماریا نے اصرار کیا۔

’’اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ دونوں پارٹیوں کا آپس میں گٹھ جوڑ ہے۔‘‘

’’بالکل۔۔۔ انتہا پسند گروپوں کے پیچھے طاہر شاہ اور مائیکل جیسے لوگ ہیں اور ان کے پیچھے ایلن اور ڈیوڈ ہیں۔‘‘ ماریا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن ان کا مقصد کیا ہے؟ وہ ان لوگوں سے رابطے میں ہیں جو برطانیہ میں دہشت گردی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔‘‘

’’مقصد ایک ہی ہے، مسلمانوں اور اسلام کو بدنام کرنا۔ اس لیے پہلے ایسے لوگوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا لیکن اب ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کی جاتی ہے۔‘‘ عمر نے کہا اور پھر ماریا کو فہد کے بارے میں بتایا۔ ’’وہ ان چند سمجھ دار مسلمانوں میں سے تھا جو مغرب کی اس چال کو سمجھ گئے تھے اور مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن افسوس اس کو نادان دوستوں نے مار دیا۔‘‘

ماریا نے فہد کے لیے افسوس کیا۔ ’’اب ہمیں عملی طور پر کچھ کرنا چاہیے۔‘‘

’’اگر ہم نے عملی طور پر کچھ کیا تو اسے دہشت گردی قرار دیا جائے گا۔‘‘ عمر نے تلخی سے کہا۔ ’’میں نے کہا نا ہم بے بس ہیں۔‘‘

’’پھر کیا کریں؟‘‘

’’میرا تو خیال ہے ہمیں اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔‘‘

’’میں اسپین جا سکتی ہوں، لبنان بھی جا سکتی ہوں لیکن ہم وہاں بھی ان سے محفوظ نہیں ہوں گے۔‘‘

’’اسی طرح میں پاکستان میں بھی ان سے محفوظ نہیں ہوں گا اور پھر میں افغانستان میں لڑ چکا ہوں اس لیے وہاں مجھے معاف نہیں کیا جائے گا۔ نہیں ماریا۔۔۔ ہمارے پاس کہیں جائے پناہ نہیں ہے۔‘‘ عمر نے گہری سانس لی۔ ’’ہمیں یہیں رہنا ہے اور حالات کا سامنا کرنا ہے۔‘‘

’’ہم پولیس سے مدد بھی نہیں لے سکتے کہ وہ انہی کی ماتحت ہے۔‘‘

’’فی الحال ہمیں روپوش ہو جانا چاہیے۔‘‘ عمر نے تجویز پیش کی۔

’’فرار بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔‘‘ ماریا نے کہا۔ وہ دیر تک اسی موضوع پر بات کرتے رہے لیکن کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ماریا سے کہا۔ ’’ایسا کرو سو جاؤ۔ اب صبح بات کریں گے پھر تمہاری طرف بھی جانا ہے۔‘‘

ماریا اس کے اصرار پر بیڈ روم میں سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹ گیا۔ صبح ماریا نے اسے بیدار کیا۔ وہ الارم لگانا بھول گیا تھا اور ویسے بھی وہ زخمی ہونے کے بعد سے جاگنگ پر نہیں جا رہا تھا اس لیے الارم بھی نہیں لگاتا تھا۔ ماریا نے اس کا لایا ہوا لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ پتلون اور گرم ہائی نیک جرسی تھی۔ اس کے اوپر وہ اپنا اسکرٹ والا کوٹ بھی پہن سکتی تھی، پتلون اسی رنگ کی تھی۔ اس نے خود کو دکھایا۔ ’’کیسی لگ رہی ہوں؟‘‘

’’بہت خوب صورت۔‘‘ عمر نے بے ساختہ کہا۔ ماریا کو عام معنوں میں حسین نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن ہر عورت کی طرح اس میں ایک الگ ہی دلکشی تھی۔ آج وہ میک اپ کے بغیر تھی اور زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ اپنی تعریف پر وہ شرمائی پھر جلدی سے بولی۔

’’اٹھ جاؤ ناشتا تیار ہے۔ پھر ہمیں جانا ہے۔‘‘

لیکن ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ ڈینی کی کال آ گئی۔ ’’عمر۔۔۔ تمہارے لیے کام آ گیا ہے۔‘‘

’’کام کیا ہے؟‘‘

’’ایک پتا نوٹ کر لو۔‘‘ اس نے کہا تو عمر نے رف پیڈ اور پنسل اپنی طرف کی۔ ڈینی کا بتایا ہوا پتا نوٹ کیا جو لندن کی بندرگاہ کی طرف کا تھا۔

’’ٹھیک ہے، مجھے کیا کرنا ہے؟‘‘

’’دوپہر تین بجے اس عمارت میں گھس کر دیکھنا ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شبہ ہے کہ وہاں اسلحہ لایا جاتا ہے۔‘‘

’’میرے ساتھ کون ہو گا؟‘‘

’’کوئی نہیں۔۔۔ تمہیں اکیلے یہ کام کرنا ہے۔‘‘ ڈینی بولا۔ ’’تم جانتے ہو، میں ایوان کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔‘‘

عمر مسکرایا اور اس نے کال کاٹ دی۔ تب اسے پتا چلا کہ ماریا اس کے شانے اور کان سے کان لگائے ہوئے کال سن رہی تھی۔ عمر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ کر اس سے الگ ہو گئی پھر جلدی سے بولی۔ ’’یہ کوئی جال ہے۔ تم اس طرف نہیں جانا۔‘‘

’’نہیں، مجھے جانا ہو گا۔‘‘ عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔

’’پلیز عمر۔۔۔ تم جان گئے ہو کہ یہ دھوکا دے رہے ہیں اور ہمیں استعمال کر رہے ہیں بلکہ اب تو یہ ہمیں ختم کرنے پر اتر آئے ہیں۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب مجھے لگتا ہے کہ مجھے صرف ایوان کا اسمگلنگ کا روٹ جاننے کے لیے ہائر کیا گیا تھا۔‘‘

’’اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟‘‘

’’شاید اس طرح ڈیوڈ اور ایلن آنے والے اسلحے کو اپنی نظر میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کو یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کس قسم کی کارروائیاں ہو سکتی ہیں۔‘‘

’’پھر تم کیوں جا رہے ہو؟‘‘

’’میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے کیا جال بچھایا گیا ہے لیکن تم فکر مت کرو، میں پوری تیاری سے جاؤں گا۔‘‘

’’پوری تیاری سے کیا مراد ہے؟‘‘

عمر نے ماریا کو دونوں سیاہ بیگوں میں موجود اسلحہ دکھایا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ’’میرے خدا۔۔۔ یہ تو بہت جدید اور مہلک اسلحہ ہے۔‘‘

’’یہ میں نے ایوان سے حاصل کیا ہے۔‘‘

’’تم نے بتایا تھا۔‘‘ ماریا بولی۔ ’’لیکن وہاں زیادہ افراد ہوئے تو۔۔۔؟‘‘

’’میں دیکھ بھال کر جاؤں گا۔‘‘

ماریا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ’’میں بھی ساتھ چلوں گی۔‘‘

’’نہیں، تم یہیں رکو۔ میں وہاں سے ہو کر آتا ہوں پھر تمہارے گھر جائیں گے اور اگر۔۔۔‘‘ عمر کہتے کہتے رکا۔ ’’میں نہ آ سکا تو تم فوری طور پر یہاں سے چلی جانا۔‘‘

’’پلیز، ایسی باتیں مت کرو۔‘‘ کہتے ہوئے ماریا کا لہجہ نم ہو گیا تھا۔ اس نے رخ پھیر لیا۔

’’صرف یہاں سے نہیں، تم انگلینڈ سے بھی چلی جانا۔ تمہارے پاس رقم ہے؟‘‘

ماریا نے سر ہلایا۔ ’’میرے پاس کچھ رقم ہے۔‘‘

’’تب ٹھیک ہے۔‘‘

’’لیکن میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔‘‘

’’اگر کوئی میری نگرانی کر رہا ہوا تو تمہیں ساتھ دیکھ کر مشکوک ہو جائے گا۔‘‘

’’اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے بارے میں مشکوک ہو چکے ہیں۔ ایوان کی۔۔۔ گمشدگی نے انہیں پریشان کیا ہو گا اور اگر اس کی لاش مل گئی ہے تو شک تم پر جائے گا۔ وہاں تمہارے لیے جال بچھایا گیا ہے کہ تم جاؤ اور اس میں پھنس جاؤ۔ عمر! مجھے شک ہے کہ وہاں قاتل تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔‘‘

’’تم کیا کر سکو گی؟‘‘

’’میں ہتھیار استعمال کرنا جانتی ہوں۔‘‘

’’اوکے۔۔۔ تم کیا لو گی؟‘‘

’’مجھے چھوٹا ہتھیار پسند ہے۔‘‘

عمر نے رائفل صاف کی اور اسے جوڑا۔ پھر اس نے ایک پستول نکالا اور اسے صاف کر کے ماریا کے حوالے کیا۔ ماریا نے پستول چیک کیا اور بولی۔ ’’میرا خیال ہے کہ ہمیں لنچ

کر کے جانا چاہیے۔‘‘

’’میں پیٹ خالی رکھنا چاہتا ہوں۔‘‘ عمر نے انکار کیا۔

وہ ایک بجے نکلے۔ دو بجے مطلوبہ پتے پر پہنچ گئے۔ یہ ایک ویران سی عمارت تھی جس کی اوپری منزلیں شاید خالی تھیں کیونکہ ان کی کھڑکیوں کے شیشے غائب تھے۔ لندن میں کسی مکان کی کھڑکیوں کے شیشے غائب ہوں تو اس کا مطلب ہے وہ ویران ہے۔ راستے میں ماریا نے اسے ایک بار پھر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس جال میں نہ پھنسے لیکن جب وہ اپنے ارادے پر قائم رہا تو ماریا چپ ہو گئی۔ وہ آدھ گھنٹے تک بیٹھے عمارت کو دیکھتے رہے پھر عمر نے رائفل اپنی جیکٹ میں کی اور بولا۔ ’’میں جا رہا ہوں۔‘‘

’’پلیز... خیال رکھنا۔‘‘ ماریا نے بے تابی سے کہا۔ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور نیچے اتر گیا۔ اگرچہ ابھی تین نہیں بجے تھے مگر اس نے سوچا کہ اگر کوئی جال ہوا تو وہ تین بجے کے حوالے سے ہوگا۔ وہ اس سے پہلے جا کر اس جال کو توڑ سکتا تھا۔ وہ دروازے تک آیا۔ وہ لاک تھا۔ اس نے آس پاس دیکھ کر ایکسرے شیٹ نکالی اور اسے درز میں گھسا کر لاک کھولنے جا رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور کسی نے اسے کالر سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ جب تک وہ سنبھلتا، دو افراد اس سے رائفل چھین کر اسے قابو کر چکے تھے۔ انہوں نے نقاب پہنے ہوئے تھے لیکن آنکھوں کے پاس جھلکتی رنگت سے وہ سفید فام لگ رہے تھے۔ عمر کو اوندھے منہ گرا کر انہوں نے اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کی ہتھکڑیاں کس دیں اور پھر اسے اٹھا کر کھینچ کر اندر لے جانے لگے۔ عمر بندھے ہونے کے باوجود مزاحمت کر رہا تھا لیکن اس کی مزاحمت بیکار تھی۔ وہ دو تھے اور بہت طاقتور افراد تھے۔ وہ اسے سلاخوں والے ایک سیل میں لائے اور کرسی پر بٹھا کر اس کے گرد ٹیپ باندھ دیا پھر اس کے پاؤں بھی کرسی کے پایوں سے باندھ دیے۔

’’تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟‘‘

عمر کے اس سوال کے جواب میں ایک نقاب پوش نے سامنے اسٹینڈ پر لگا چھوٹا سا ڈیجیٹل مووی کیمرا آن کیا اور اس کے سامنے ایک کاغذ کیا۔ ’’اسے پڑھو۔‘‘

دوسرے نے عقب سے اس کی گردن پر بڑے سائز کا چھرا رکھ دیا۔ ’’پڑھو ورنہ ابھی تمہاری گردن الگ کر دوں گا۔‘‘

عمر نے دیکھا۔ کاغذ پر لکھا تھا۔ ’’میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے افغانستان میں برطانوی فوجی کی حیثیت سے مسلمانوں کو قتل کیا ہے اور میں سزا کا مستحق ہوں۔‘‘

’’یہ بکواس ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔‘‘ عقب والے نے اس کے بال پکڑ کر سر پیچھے کھینچا اور غرایا۔ ’’تمہارے پاس صرف تین سیکنڈ کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میں اپنا کام کروں گا۔ ایک... دو... تین۔‘‘

وہ صرف دھمکی نہیں دے رہا تھا، اس پر عمل بھی کرنے والا تھا۔ دوسرا اس منظر کو کیمرے کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ چھرے والا چھرا چلاتا، فائر ہوا اور اس کے پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ وہ پیچھے گرا۔ کیمرے والے نے چونک کر سلاخوں کے پیچھے دیکھا۔ وہاں ماریا کھڑی تھی۔ کیمرے والے کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تھا کہ ماریا نے اس کے سینے میں بھی دو گولیاں اتار دیں۔ وہ تیورا کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ماریا لپک کر عمر کے پاس آئی۔ اس نے پہلے ہاتھ سے اس کی بندشیں کھولنے کی کوشش لیکن ناکام رہی۔ عمر نے کہا۔ ’’میری پنڈلی کے ساتھ چاقو بندھا ہوا ہے، اس سے کاٹ دو۔‘‘

ماریا نے ایسا ہی کیا، اس نے چاقو نکال کر ٹیپ اور پھر عمر کی ہتھکڑی کاٹ دی۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے یہ کام کیا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے عمر نے چاقو لے کر اپنے پیروں کو آزاد کیا۔ پھر اس نے اٹھ کر پہلے دونوں نقاب پوشوں کے چہروں سے نقاب اتارا۔ ایک کو دیکھ کر ماریا چونکی۔ عمر نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’تم اسے جانتی ہو؟‘‘

اس نے سر ہلایا۔ ’’یہ نومسلم ہے۔ میں نے اسے ایک بار مائیکل کے ساتھ دیکھا تھا۔‘‘

عمر نے اسٹینڈ سے کیمرا اٹھایا اور وہاں اپنی انگلیوں کے ممکنہ نشانات صاف کیے اور ماریا کے ساتھ باہر نکل آیا۔ روانگی سے پہلے اس نے کیمرا کار کے ٹائر کے سامنے رکھ دیا اور جب کار چلی تو وہ تباہ ہو گیا۔ عمر کو لگ رہا تھا کہ خطرہ آس پاس منڈلا رہا ہے۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ماریا کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خراب ہو رہی تھی۔ یہ کسی انسان کو قتل کرنے کا فطری ردِعمل تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ پھر اس نے پُرشور انداز میں کہا۔ ’’مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی ہے... میرا دم گھٹ رہا ہے۔‘‘

عمر نے اس سے کہا۔ ’’ماریا! خود کو سنبھالو۔‘‘

’’مجھ سے سانس نہیں لیا جا رہا ہے۔‘‘

وہ ایک ہاتھ سے اس کی پشت سہلانے لگا۔ ’’اپنی توجہ سانس لینے پر فوکس کرو۔ اور سنو تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ وہ لوگ اسی قابل تھے۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔‘‘

ماریا نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تو اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ ’’سچ... تم ایسا سمجھتے ہو؟ میں نے دو آدمی مارے ہیں۔‘‘

’’وہ جنونی تھے اور مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔‘‘ عمر نے زور دے کر کہا۔ ’’تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اگر تم ایک لمحے کی دیر کرتیں تو وہ میری گردن کاٹ چکا ہوتا۔‘‘

کچھ دیر بعد وہ ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ عمر جانتا تھا کہ اس سے کچھ کھایا نہیں جا سکے گا اس لیے اس نے ملک شیک منگوایا۔ اپنے لیے اس نے کافی منگوائی۔ ملک شیک پی کر ماریا کی حالت بہتر ہو گئی۔ وہاں لگے ٹی وی پر فہد کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ پولیس کو نامعلوم شخص نے اطلاع دی تھی۔ فہد کی لاش اس کے فلیٹ کے باتھ روم سے ملی تھی۔ اسے گلا کاٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ماریا نے آہستہ سے کہا۔ ’’یہ کن لوگوں کا کام ہے؟‘‘

عمر کا چہرہ سخت ہو گیا۔ ’’میں انہیں جانتا ہوں اور ان سے فہد کی موت کا حساب لوں گا۔‘‘

’’نہیں پلیز... وہ بہت خطرناک اور جنونی لوگ ہیں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ وہ کس طرح انسان کی جان لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔‘‘

’’انہیں روکنا بہت ضروری ہے اور کسی کو تو یہ کام کرنا ہوگا۔‘‘

’’پلیز، میری خاطر۔‘‘ ماریا نے التجا کی۔

عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔ ’’ٹھیک ہے، اب تم کیا کرو گی؟‘‘

’’میں سوچ رہی ہوں کہ اکیلے ہی جاؤں۔ دو افراد کے نظر میں آنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔‘‘

’’وہ تمہارے فلیٹ کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔‘‘ عمر فکرمند ہو گیا۔ ’’کیا یہ مناسب ہوگا؟‘‘

’’میں عقبی سیڑھیوں سے جاؤں گی۔ اس طرف سے بھی راستہ ہے۔ مجھے امید ہے وہ صرف سامنے سے نگرانی کر رہے ہوں گے۔ پھر کوئی بیک اپ میں بھی ہونا چاہیے۔ جیسے میں باہر رہی اور جب میں نے محسوس کیا کہ تم پھنس گئے ہو تو میں تمہاری مدد کے لیے اندر آ گئی۔‘‘

عمر متفق نہیں تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ یہ کتنے چالاک اور پیشہ ور لوگ تھے۔ ’’ٹھیک ہے لیکن وعدہ کرو اگر تم محسوس کرو گی کہ نگرانی سخت ہے تو اندر جانے کے بجائے واپس آ جاؤ گی۔‘‘

’’میں ایسا ہی کروں گی۔‘‘ ماریا نے اس سے وعدہ کیا۔

’’یہ سیل فون رکھ لو۔‘‘ عمر نے اسے ایک اضافی سیل فون دیا۔ ’’یہ بھی تمہارے لیے لیا تھا۔ کوئی بھی مشکل ہو تو تم مجھے کال کرنا۔ اس میں میرا نمبر محفوظ ہے۔‘‘

ماریا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر سرگوشی میں بولی۔ ’’میں واپس آؤں گی۔‘‘

وہ اٹھ کر روانہ ہوئی۔ ریستوران کے ساتھ ہی ٹیوب کی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ وہ گھوم کر اس طرف آئی اور سیڑھیاں اترنے سے پہلے شیشے کے پار سے عمر کی طرف دیکھا اور مسکرا کر انگلیوں سے الوداعی اشارہ کیا اور نیچے اتر گئی۔ یہ ماریا کی آخری جھلک تھی جو عمر نے دیکھی پھر وہ اسے نہیں دیکھ سکا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے سیل فون نکالا اور ڈینی کو کال کی۔ اس کی آواز سن کر وہ ایک لمحے کو چپ ہوا پھر اس نے پوچھا۔ ’’تم عمارت میں گئے نہیں؟‘‘

’’میں وہاں سے ہو کر آ گیا ہوں اور فوری طور پر تم سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تم کہاں ہو؟‘‘ اس نے پوچھا تو عمر نے اسے ریستوران کا پتا بتایا۔ ڈینی بولا۔ ’’میں بیس منٹ میں آ رہا ہوں۔‘‘

بیس منٹ بعد ڈینی اس کے سامنے تھا۔ وہ مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ ’’وہاں کیا ہوا تھا؟‘‘

عمر نے اسے کم و بیش وہی بتایا جو وہاں ہوا تھا۔ ان دونوں کے مارے جانے کا سن کر وہ ساکت ہو گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ’’کاش کہ وہ زندہ ہاتھ آتے۔‘‘

’’تم یہی چاہتے تھے نا کہ وہ زندہ رہتے اور میں مارا جاتا۔‘‘ کہتے ہوئے عمر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ’’لیکن ہوا اس کے برعکس وہ مارے گئے اور میں یہاں تمہارے سامنے زندہ بیٹھا ہوں۔‘‘

ڈینی کا چہرہ ستّ گیا۔ ’’ایسا نہیں ہے۔‘‘

’’میرے سابق دوست... تم نے مجھے قتل کرانے کی کوشش کی، بے شک ایسا تم نے کسی اور کے اشارے پر کیا ہو گا لیکن حقیقت یہی ہے۔‘‘

’’نہیں...‘‘

عمر نے ہاتھ اوپر کیا۔ ’’بس، اس سے پہلے کہ میرا رویہ دشمن والا ہو جائے، یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘

ڈینی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر ریستوران سے نکل گیا... عمر نے سر تھام لیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے یوں استعمال کیا جائے گا۔ وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا لیکن بہت ساری باتیں وضاحت طلب تھیں۔ اگر وہ ماریا سے کچھ نہ کرنے کا وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ کچھ دیر بعد اس کے سیل فون نے بیل دی۔ اس نے سیل فون نکال کر دیکھا۔ ایلن کی کال تھی، اس نے کال کاٹ دی۔ ایلن نے دوبارہ کال کی تو اس نے کال ریسیو کی اور

بولا۔ ”اب مجھے کال مت کرنا۔ میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق اس طرح ختم نہیں ہو سکتا۔“ ایلن نے سرد لہجے میں کہا۔

”لیکن اس طرح بھی ختم نہیں ہو گا جس طرح تم لوگ چاہتے ہو۔ تمہیں ان دو افراد کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا جو اس عمارت میں میرے منتظر تھے۔“

ایلن خاموش ہوا پھر بولا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”عمر! تم واپس آجاؤ۔ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے سلجھایا نہ جا سکے۔“

”میں تمہیں دوسرا چانس دوں؟“ عمر کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔“ اس نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی جگہ بیٹھا ہے جس کے بارے میں اس کے دشمن یقیناً جان گئے تھے اور اب اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے بل کی رقم میز پر رکھی اور باہر نکل آیا۔ یہ ریستوران جس سڑک پر تھا، وہ زیادہ مصروف نہیں تھی اور شام کے وقت بھی وہاں اِکّا دُکّا افراد دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی مشکوک فرد دکھائی نہیں دیا۔ مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خطرہ آس پاس ہی ہے۔ وہ اپنی کار کی طرف آیا اور جیسے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولنا چاہا، ایک اسٹیشن ویگن آکر عقب میں رکی۔ اس کا عقبی سلائڈنگ ڈور کھلا اور دو افراد نے اتر کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر اچھال دیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

فوراً ہی وہ خود بھی اندر آ گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ عمر کے چہرے پر پلاسٹک آ گیا۔ ایک شخص اس کے ہاتھ قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا پلاسٹک سے اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔ اندر اندھیرا تھا اور منہ پر پلاسٹک آنے سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنا دایاں ہاتھ آزاد کرایا اور جیکٹ میں ڈال کر پستول نکال لیا۔ پہلے اس نے اسے نشانہ بنایا جو اس کے چہرے پر پلاسٹک کسے ہوئے تھا۔ اس کے گرتے ہی دوسرے آدمی نے عجلت میں عمر کو چھوڑ دیا۔ شاید وہ کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان لوگوں کو توقع نہیں تھی کہ وہ مسلح ہو گا یا اس طرح مزاحمت کرے گا۔ اسے مہلت دینا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ عمر نے پستول کا رخ اندازے سے دوسرے آدمی کی طرف کر کے لگاتار فائر کیے۔ آدمی کی چیخ نے بتایا کہ وہ کامیاب رہا تھا۔ آخری فائر اس نے ڈرائیور پر کیا جو ویگن کو بریک لگاتے ہوئے ہتھیار بدست اس کی طرف گھوم رہا تھا۔ گولی کھا کر وہ اسٹیئرنگ پر اوندھے منہ جا گرا۔ ویگن رک گئی تھی۔

عمر نے سلائڈنگ ڈور سرکایا اور نیچے اتر آیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مرنے والوں میں ایک رائز ولسن تھا، ڈینی ولسن کا بھائی۔ دوسرا ایلن تھا۔ ویگن کے اندر تاریکی سے اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کن لوگوں سے لڑ رہا ہے۔ رائز کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ ایک خدشے کے ساتھ پلٹ کر ڈرائیونگ ڈور کی طرف آیا۔ اس نے ڈرائیور کو سیدھا کیا۔ اس کا خدشہ درست نکلا۔ وہ ڈینی تھا اور وہ بھی مر چکا تھا۔ اس نے ڈینی کو چھوڑا تو وہ دوبارہ اسٹیئرنگ پر اوندھے منہ گر گیا۔ وہ شاک کی کیفیت میں کھڑا ہوا تھا کہ پولیس سائرن نے اسے چونکایا اور وہ تیزی سے ایک نزدیکی گلی میں گھس گیا۔ کار کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس دوران میں پولیس آجاتی اور عین ممکن تھا ریستوران والے اس کی نشان دہی کر دیتے اس لیے وہ اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

وہ ایک طویل چکر لگا کر دوبارہ اسی سڑک پر آیا تو ویگن کے پاس پولیس کاریں موجود تھیں اور لوگ بھی جمع ہو رہے تھے لیکن اس کی جیگوار کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے کار میں بیٹھا اور وہاں سے نکل آیا۔ صورتِ حال اچانک ہی اس کے لیے سنگین ہو گئی تھی۔ ایلن، ڈینی اور رائز سرکاری لوگ تھے۔ ان کا قتل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ کچھ دیر میں سارے لندن کی پولیس اور خفیہ اداروں کے اہلکار حرکت میں آجاتے اور اس کی تلاش شروع کر دی جاتی۔ اب وہ واپس اپنے فلیٹ کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ماریا کا خیال آیا۔ وہ اسے لے کر انگلینڈ سے باہر جانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ دنیا بہت بڑی تھی اور اس میں کہیں تو ان کے لیے پناہ گاہ ہو سکتی تھی۔ اس نے سیل فون نکالا اور ماریا کو کال کرنے لگا۔ مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ عمر وقفے وقفے سے اس کا نمبر ملاتا رہا اور ہر بار اسے یہی اطلاع ملتی کہ اس کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔

آدھ گھنٹے بعد عمر طاہر شاہ کے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کے سامنے تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی اور کچھ دیر میں یہ تاریکی میں بدل جاتی۔ عمارت کے باہر طاہر شاہ کی مرسیڈیز یا کوئی دوسری جانی پہچانی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی جیگوار نظروں میں آچکی تھی اس لیے عمر نے اسے ایک عقبی گلی میں پارک کیا اور خود عمارت کے سامنے آ گیا۔ وہ ایک چھوٹے آرائشی درخت کی آڑ سے عمارت کی نگرانی کر رہا تھا۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد وہ ماریا کو کال کرتا تھا اور ہر بار اسے ناکامی کا

سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ ماریا کسی مشکل میں پڑ گئی ہے اور شاید اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اس خیال نے اس کے اندر اضطرابی کیفیت پیدا کر دی۔ تقریباً نو بجے طاہر شاہ کی مرسیڈیز وہاں رکی اور اس سے طاہر شاہ مائیکل کے ساتھ اتر کر اندر کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے اندر گئے، عمر آڑ سے نکل کر آگے بڑھا۔ وہ دونوں لفٹ میں اوپر جا چکے تھے۔ وہ سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ چوتھے فلور تک پہنچا تو طاہر شاہ مائیکل کے ہمراہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تھا۔ وہ لاک کھول رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے لاک کھولا، عمران کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے جیکٹ کی آڑ سے پستول نکال رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ان دونوں کا رنگ اڑ گیا۔

”اندر چلو۔“ عمر نے آہستہ سے کہا اور وہ بے چون و چرا کیے اندر آ گئے۔ اس کے اگلے حکم پر انہوں نے دونوں ہاتھ گردنوں پر رکھ لیے تھے۔

مائیکل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تم مجھے جانتے ہو؟“

مائیکل نے سر ہلایا۔ ”تم سرکاری ایجنٹ ہو۔“

”ہاں، میں ڈیوڈ کے لیے کام کرتا تھا جس سے تم ملتے تھے۔ میں اس کا ایجنٹ تھا لیکن تم اس سے کیوں ملتے تھے؟“ عمر کا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

”اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ مائیکل بولا۔

”پتا نہیں تم لوگ بیوقوف بن رہے ہو یا اصل میں مفاد کما رہے ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔“

”کون سی بات؟“ طاہر شاہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ماریا کہاں ہے؟“

”ہم نہیں جانتے۔“ طاہر شاہ کے بجائے مائیکل نے جواب دیا۔

عمر نے اچانک ہی مائیکل کے بازو پر گولی چلا دی۔ دھماکے کے ساتھ وہ کراہا اور اپنا بازو پکڑ لیا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ طاہر شاہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ عمر نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور اپنا سوال دہرایا۔ ”ماریا کہاں ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نہیں جانتا۔ وہ آخری بار مائیکل کے ساتھ پیرس گئی تھی۔ اس کے بعد...“

”شاہ، چپ رہو۔“ مائیکل غرایا اور اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے کوٹ سے کوئی چیز نکالنے کی کوشش کی۔ ریوالور کی جھلک دیکھتے ہی عمر نے فائر کیا۔ اس بار گولی مائیکل کے سینے میں لگی اور وہ گر کر ساکت ہو گیا۔ اس دوران میں طاہر شاہ اچانک اندر کی طرف بھاگا۔ عمر نے پیچھے سے اس پر فائر کیا، وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے پیروں کا نشانہ لیا لیکن بھاگنے کے دوران غالباً متوقع گولی سے بچنے کے لیے طاہر شاہ نیچے جھکا اور گولی اس کی پشت میں اتر گئی۔ عمر نے اس کے قریب آ کر دیکھا۔ گولی دل کے پاس لگی تھی اور طاہر دم توڑ رہا تھا۔ عمر نے اس سے پھر پوچھا۔

”ماریا کہاں ہے؟“

”ڈیوڈ... ڈیوڈ...“ طاہر شاہ نے انتہائی کوشش کے بعد کہا اور اچانک دم توڑ دیا۔ عمر گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے باہر آیا۔ فائرنگ کی آواز یقیناً آس پاس سنی گئی ہو گی اور پولیس کو کال کی جا چکی ہو گی۔ سڑک کی طرف سے نکلنے کے بجائے وہ عمارت کے پچھلے حصے سے باہر آیا۔ یہاں سے اس کی کار کچھ ہی دور موجود تھی۔ جب وہ اس جگہ سے نکل رہا تھا تو پولیس سائرن کی آواز گونجنے لگی تھی۔ وہ رات کے وقت لندن کی سڑکوں پر بھٹک رہا تھا اور اتنے بڑے شہر میں اس کے پاس ایک بھی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ سکون سے رات گزار سکتا۔ اگر وہ کار میں سو جاتا تو اس کا امکان تھا کہ پولیس اسے جگاتی اور اگر مشکوک سمجھا جاتا تو وہ اسے گرفتار بھی کر سکتی تھی۔ بالآخر اس نے کسی موٹیل میں قیام کا فیصلہ کیا۔ پکاڈلی میں اسے ایک چھوٹے سے موٹیل میں جگہ مل گئی۔ اس نے سفر کے دوران ہی ایک جگہ سے سینڈوچز اور کافی لے کر کار میں کھا لیے تھے اس لیے صبح تک گزارہ ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی حالات ایسے تھے کہ باقاعدہ کھانے کا خیال کہاں آتا۔

ماریا کا سیل فون بند جانے اور پھر طاہر شاہ اور مائیکل کا اس بارے میں مشکوک انداز بتا رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے قبضے میں آچکی تھی اور پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ تھی یا نہیں۔ جب تک وہ ساتھ تھی، عمر اس کے بارے میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا لیکن اب وہ دور تھی تو وہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی عورت اسے اچھی لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ماریا بھی اس کے لیے اپنے دل میں ایسے ہی جذبات رکھتی تھی لیکن وہ ایک نہیں ہو سکے تھے۔ اب اس کا امکان بھی کم رہ گیا تھا۔ اس کے دامن پر نصف درجن افراد کا خون آچکا تھا۔ ماریا بھی قاتل تھی۔ اگر وہ اس ملک کے قانون سے بچ کر فرار بھی ہو جاتے، تب بھی وہ کہیں سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔ ماریا کی واپسی کا امکان بھی بہت کم تھا۔ اس نے صبح پانچ بجے کا الارم لگایا اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر

اسے نیند نہیں آئی۔ الارم بجا تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کا سر درد سے بوجھل تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ گرم پانی سے غسل کر کے طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ اتنی صبح کچن سے کچھ ملنا محال تھا اس لیے وہ تیار ہو کر نیچے آیا اور کاؤنٹر کے ساتھ موجود کافی مشین سے اپنے لیے کافی نکال کر باہر آ گیا۔ ادائیگی وہ رات کو کر چکا تھا۔

کافی پی کر اس کی سستی دور ہو گئی اور وہ کار اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ لندن کے ایک پوش علاقے کی طرف تھا۔ یہاں اس نے کار حسبِ معمول ایک عقبی گلی میں چھوڑی اور پیدل آگے روانہ ہوا۔ چند منٹ بعد وہ ایک عمارت کی پارکنگ میں تھا۔ صبح کے چھ بجے وہاں سناٹا تھا۔ لوگ سات اور آٹھ تک دفتروں کے لیے نکلنا شروع ہوتے تھے۔ اسکول جانے والے بچے لابی کے راستے عمارت سے باہر جاتے تھے۔ عمر پارکنگ کے ایک تاریک گوشے میں آ گیا جہاں سے وہ لفٹس والے حصے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اس نے پستول نکال کر چیک کیا۔ اس کے میگزین میں صرف ایک گولی تھی۔ اس نے اسے بدلنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ جس کام کے لیے آیا تھا، وہ ایک گولی سے بھی ہو سکتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے بھی سناٹا تھا، جب لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس سے ڈیوڈ باہر آیا۔ وہ اپنی گرے کار کی طرف بڑھا اور اسے ریموٹ سے اَن لاک کیا۔ اسی لمحے اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور عمر کو پستول بدست دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

”تم...“

”ہاں میں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ میں صرف ماریا کے بارے میں پوچھوں گا، وہ کہاں ہے؟“

”ہم نے اسے صبح طیارے میں بٹھا دیا ہے۔ وہ لبنان جا چکی ہے۔“ ڈیوڈ نے سکون سے کہا۔

”یہ بکواس ہے... وہ کہاں ہے؟“

”کیا یہ جاننے کے لیے پستول ضروری ہے؟“

”وہ کہاں ہے؟“

”یہ بہت پیچیدہ قسم کی بین الاقوامی سیاست ہے، اس میں جنگ بھی شامل ہو چکی ہے۔“ ڈیوڈ اس کا سوال نظر انداز کر کے یوں بولنے لگا جیسے کسی یونیورسٹی میں لیکچر دے رہا ہو۔ ”پہلے سیاست کے لیے جنگ ہوتی تھی اور اب جنگ کے لیے سیاست ہوتی ہے۔ آسان الفاظ میں ہم اسے ہتھیاروں کی تجارت کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اپنے قواعد اور اصول ہیں۔ اس میں کوئی دشمن اور دوست نہیں ہے، صرف اپنا مفاد اہم ہے۔ اس تاریک تجارت میں ہتھیاروں کے ساتھ آئل اور منشیات بھی شامل ہیں۔“

”میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟“

ڈیوڈ نے ایک بار پھر اس کا سوال نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جدید ریاست میں بھی عام آدمی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ صرف ایک ریاستی آلہ ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی کچھ عناصر ہیں جو ریاست سے زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں اور وہ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا مفاد ریاستوں اور قوموں کے تصادم میں ہے۔ وہ اس سے دولت کماتے ہیں۔ وہ خوف کی فضا پیدا کرتے ہیں کیونکہ خوف دولت کا دوسرا نام ہے۔ جب آپ لوگوں کو خوفزدہ کر لیتے ہیں تو ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کرا سکتے ہیں۔ نائن الیون سے لے کر سیون سیون تک سب نے خوف پیدا کیا اور آج دنیا ہماری مرضی پر چل رہی ہے۔“

”میں آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ ماریا کہاں ہے؟“

ڈیوڈ نے گہری سانس لی۔ ”عمر! تم نوجوان ہو۔ اچھے سپاہی ہو، تم ایک کارآمد آدمی ہو۔ تمہارے سامنے ایک طویل کیریئر ہے۔ ماریا معمولی درجے کی ایجنٹ تھی اور مستقبل میں اس کی کوئی قدر نہیں تھی۔ تمہیں معلوم ہے بیکار چیزوں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔“

عمر نے فائر کیا تو اس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ ماریا کے انجام کے بارے میں سنتے ہی اس کی انگلی نے خود بہ خود ٹریگر دبا دیا تھا۔ فائر ہوا اور ڈیوڈ کراہ کر جھکا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی دل میں اتر گئی تھی اور وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ عمر نے جھک کر اس کی گردن پر نبض چیک کی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس جلد یا بدیر جان جائے گی کہ کل سے ہونے والی ان وارداتوں کے پیچھے کون ہے۔ لندن پولیس انتہائی سائنٹیفک انداز میں کام کرتی تھی۔ وہ سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد لیتی اور پھر اس کی تلاش شروع ہو جاتی۔ وہ زیادہ دیر پولیس کی نظروں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ ماریا کی موت کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں ڈیوڈ سب سے ذمے دار آدمی تھا اور اس نے تصدیق کی تھی۔ کار میں بیٹھ کر عمر نے اسٹیئرنگ سے سر لگا لیا۔ اسے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

اس نے بچپن سے تنہا زندگی گزاری تھی۔ اس کا باپ زیادہ تر دکان میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے پاس عمر کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ دوست بنانے والی عمر کو پہنچا جب بھی لوگوں سے گھلنے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ صرف وہی لوگ اس کے دوست بنے جو خود اس کی طرف آئے تھے۔ جیسے فہد اور ڈینی اور اب یہ دونوں بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ماریا کی چند دن کی قربت نے اسے زندگی میں رنگینی کا احساس دلایا اور یہ احساس کچے رنگوں کی طرح اڑ گیا تھا۔ رونے سے اس کا دل ہلکا ہوا... وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ کیا خود کو پولیس کے حوالے کر دے؟ اس کے پاس بچنے کا کوئی آسرا باقی نہیں رہا تھا۔ اچانک اسے سعد کا خیال آیا۔ اس نے فہد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سعد کو ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ فہد اس دنیا میں نہیں رہا تھا لیکن اس سے کیا ہوا وعدہ عمر کے ذہن میں تھا۔ جب فہد زندہ تھا تب بھی سعد اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ وہ ہمہ وقت جیمز کے ٹھکانے پر پایا جاتا تھا۔ عمر اسے وہاں سے نکالنے جاتا تو اس کا مطلب ان لوگوں سے کھلی جنگ ہوتی۔ عمر اب مزید کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر اس نے کار اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اسے ایک ایسے فون بوتھ کی تلاش تھی جو ذرا الگ تھلگ ہو۔ بالآخر اسے ایک فون بوتھ مل گیا۔ اس نے سلاٹ میں سکے ڈالے اور پہلے انکوائری کا نمبر ملا کر اس عمارت کے فون نمبرز مانگے جس میں جیمز کا ٹھکانا تھا۔ وہاں منیجرز سے بات کرنے پر اسے جیمز کے فلورز کے نمبر مل گئے۔ یہ چار فون تھے۔ اس نے پہلا نمبر ملایا لیکن وہ بزی جا رہا تھا۔ دوسرے نمبر پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا، البتہ تیسرے نمبر پر کال ریسیو کی گئی اور بولنے والے نے سیاہ فام لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”مجھے جیمز سے بات کرنی ہے۔“

”نام بتاؤ۔“

اس نے سوچا اور نام بتا دیا۔ ”عمر... لیکن اسے کہنا کہ ایمرجنسی ہے اور بہتر ہے کہ وہ مجھ سے بات کر لے۔“

ایک منٹ بعد جیمز لائن پر تھا۔ ”کیا کہنا ہے؟“

”سعد کو اپنے گروہ سے نکال دو۔ میں فہد کا قتل بھول جاؤں گا۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”سب ممکن ہے۔ میں نے فہد سے وعدہ کیا تھا کہ سعد کو نارمل زندگی کی طرف واپس لے آؤں گا۔“

جیمز کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”فہد کے بارے میں جاننے کے بعد میری بھی یہی خواہش تھی لیکن سعد بہت آگے جا چکا ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ فہد کے قتل میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے؟“

”یہ درست ہے۔ اسے تمہارے دوست ڈینی اور اس کے بھائی رائز نے مارا ہے۔ سعد پاگل ہو رہا تھا اگر آج ان دونوں کی لاشیں نہ ملتیں تو وہ خود ان کی تلاش میں نکل جاتا۔“

عمر کو یقین نہیں آیا لیکن اس نے بحث سے گریز کیا۔ ”سعد کتنا ہی آگے جا چکا ہو، وہ ابھی بچہ ہے۔ تم اس کے آگے مجبور نہیں ہو۔“

”مجھے افسوس ہے، یہ ممکن نہیں ہے۔“ جیمز نے کہا۔ ”تم سعد کو بھول جاؤ۔ لندن پولیس تمہارے پیچھے لگ چکی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق اس نے گزشتہ دن ہونے والے پانچ افراد کے قتل سے تمہارا کنکشن تلاش کر لیا ہے۔ میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ، میں تمہیں پولیس اور قانون سے محفوظ رکھوں گا۔“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تب میں تم سے ہمدردی کر سکتا ہوں۔“ جیمز کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

”ہمدردی تم ان نادان لوگوں سے کرو جن کو بہکا کر موت کی طرف دھکیل رہے ہو۔“ عمر نے تلخی سے کہا۔

جواب میں جیمز نے کال کاٹ دی۔ عمر نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ اگرچہ اسے زیادہ امید نہیں تھی پھر بھی خیال تھا کہ شاید جیمز اس کی بات مان لے۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا۔ فون بوتھ کے نزدیک ایک کیفے سے اس نے ناشتا کیا۔ اس نے کل سے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اسے توانائی کی ضرورت تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد اس نے اپنی کار ایک ویران گلی میں روکی اور اتر کر ڈکی میں رکھے رائفل اور اس کے میگزینز کا پیڈ نکالا اور اسے کوٹ کے نیچے پہن لیا۔ اس میں پانچ میگزین لگے تھے جنہیں بہ آسانی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ یہ پیڈ اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے آسانی سے سعد تک نہیں پہنچنے دیا جائے گا اور وہ اس کے لیے تیار ہو کر جا رہا تھا۔

اسے امید تھی کہ جیمز کے آدمی اس کی کار سے ناواقف ہوں گے اس لیے وہ سیدھا عمارت کے پاس جا کر رکا تھا۔ اس وقت وہاں صرف ایک آدمی تھا۔ اس نے عمر کو دیکھتے ہی اپنا مشین پسٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن عمر پہلے ہی گولی چلا چکا تھا۔ اسے صرف رائفل کی نال کھڑکی سے نکالنی پڑی تھی۔ آدمی کے گرتے ہی وہ حرکت میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ فائر کی آواز اندر تک پہنچ گئی ہو گی اور کچھ دیر میں جیمز کے گرگے اس کا راستہ روکنے کے لیے حملہ کریں گے۔ اس

سے پہلے کہ وہ اس کا راستہ روکیں، وہ اندر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ دبے لیکن چست قدموں سے عمارت کے اندر داخل ہوا۔ وہ ہر طرف دیکھ رہا تھا اور رائفل کے ٹریگر پر اس کی انگلی پوری طرح تیار تھی۔

وہ راہداری سے اندر آیا اور ابھی درمیان میں تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو مسلح افراد سامنے آئے۔ عمر نے ایک بڑے گملے کی آڑ لیتے ہوئے ان پر برسٹ مارا۔ انہوں نے بھی گولیاں چلائیں لیکن وہ عمر سے دور رہیں اور وہ مارے گئے۔ عمر پوری طرح چوکس تھا اور کسی چیتے کی سی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اس کی حسِ سماعت پوری طرح کام کر رہی تھی۔ اس نے دوڑتے قدموں کی آواز سنتے ہی تیزی سے ایک ستون کے پیچھے پوزیشن لی اور جب آواز نزدیک آئی تو آڑ میں رہتے ہوئے آنے والوں کی طرف برسٹ مارا۔ ایک گرا اور باقی منتشر ہو کر اس پر گولیاں برسانے لگے۔ اس نے پستول اور خودکار رائفل کے شور سے اندازہ لگایا کہ اس پر فائر کرنے والے دو تھے۔ جیسے ہی رائفل والے نے اندھا دھند اپنا میگزین ختم کیا، عمر آڑ سے نکلا اور اس پر دو فائر کیے۔ وہ چیخ کر گرا۔

جب تک پستول والا اس کے خلاف جوابی کارروائی کرتا، وہ دوبارہ آڑ میں جا چکا تھا۔ اپنے دو ساتھی گرنے پر پستول والا زیادہ ہی بدحواس ہو رہا تھا۔ شاید وہ اتنا تجربے کار نہیں تھا۔ عمر کو آڑ میں جاتے دیکھ کر وہ فائر کرتا ہوا اس کی طرف آنے لگا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا، عمر نے نیچے بیٹھتے ہوئے اس پر برسٹ مارا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور پھر گر گیا۔ عمر آڑ سے نکلا اور اسے پھلانگ کر آگے آیا۔ اس کے باقی دو شکار بھی مر چکے تھے۔ یہ سب ملی جلی نسلوں کے لوگ تھے۔ تین سیاہ فام تھے، ایک سفید فام اور ایک ایشیائی تھا۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر افسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا جہاں جیمز رہتا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ یہاں بس یہی افراد تھے جبکہ ایک وقت میں یہاں درجنوں مسلح افراد موجود رہتے تھے۔ ممکن ہے اس کے لیے اصل ٹریپ یہاں بچھایا گیا ہو۔ اس نے سوچا اور محتاط ہو گیا۔

کسی ممکنہ مسلح کارروائی اور پولیس کے چھاپے میں مزاحمت کے لیے یہاں کمروں کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے راستے ایک دوسرے سے ہو کر ہی گزرتے تھے۔ وہ ایک ایک کمرے میں داخل ہوتا رہا۔ ایک کمرے میں صوفے کے پیچھے پوزیشن لیے ایک شخص نے اس پر فائر کیا۔ گولی عمر کی ران میں لگی اور گوشت پھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے جوابی فائر کیا اور وہ شخص صوفے کے پیچھے ڈھیر ہو گیا۔ عمر نے رومال نکال کر اپنے زخم پر باندھ لیا۔ ہڈی بچ گئی تھی اس لیے وہ ابھی تک حرکت کے قابل تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ پہلے کی طرح چستی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ سستی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس سے اگلا کمرا خالی تھا لیکن اس سے اگلے کمرے میں کچھ لوگ موجود تھے کیونکہ اس کی جھلک دیکھتے ہی اندر سے کم سے کم دو افراد نے فائرنگ کی تھی۔ عمر بروقت آڑ میں ہو گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

’’جیمز! بزدل... دوسروں کو کیوں مروا رہے ہو؟ خود سامنے آ کر میرا مقابلہ کرو۔ تمہارا ایک آدمی بھی مجھے روک نہیں سکا، سب مارے گئے۔‘‘

’’تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔‘‘ جیمز کی غراتی آواز آئی۔

’’میں زندہ جانے آیا بھی نہیں ہوں۔‘‘ اس نے اپنی رائفل کا میگزین تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں صرف سعد کی خاطر آیا ہوں۔ اگر تم اسے چھوڑ دو تو میں خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔‘‘

’’سعد کو بھول جاؤ۔ وہ اپنی زندگی کا اہم ترین کام کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔‘‘ جیمز نے کہا تو عمر چونک گیا۔

’’کیا مطلب؟... جیمز! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟‘‘

’’ہم سیون سیون کا اعادہ کرنے جا رہے ہیں۔‘‘ جیمز عجیب سے لہجے میں بولا۔ عمر کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

’’کیا تم سعد کو استعمال کر رہے ہو؟‘‘

’’اس نے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔‘‘

’’بکواس مت کرو۔‘‘ عمر کا خون کھولنے لگا۔ ’’تم نے ایک معصوم بچے کا برین واش کیا اور اب اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہو اور کہتے ہو کہ وہ رضاکارانہ یہ کام کر رہا ہے۔‘‘

’’یہ سچ ہے، تم چاہو تو سعد سے بھی پوچھ سکتے ہو۔‘‘

’’مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ عمر نے کہا اور اچانک اس کمرے کی طرف ایک برسٹ مارا۔ لیکن ہوشیار جیمز دروازے کے سامنے نہیں تھا۔ اس نے قہقہہ مارا۔

’’تم مجھے نہیں مار سکتے اور نہ ہونے والے واقعے کو روک سکتے ہو۔‘‘

’’سعد! تم یہاں ہو؟‘‘ عمر نے چیخ کر پوچھا۔

’’ہاں، میں یہاں ہوں۔‘‘ سعد کی آواز آئی۔

’’تمہیں اپنا بھائی یاد نہیں ہے؟ اس کی خواہش تھی کہ تم ایک اچھے انسان اور اچھے مسلمان بنو۔‘‘

سعد بے تاثر لہجے میں بولا۔ ’’میں اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننے جا رہا ہوں۔‘‘

’’نہیں، تم بے گناہ انسانوں کو ہلاک کرنے جا رہے ہو اور اچھا مسلمان کسی بے گناہ کو نہیں مارتا۔ وہ فہد کی طرح اپنی جان دے دیتا ہے لیکن کسی کی جان نہیں لیتا۔ وہ اسلام پر عمل کرتا ہے، اسے جیمز کی طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتا۔‘‘

’’سعد! اس کی بات مت سنو۔‘‘ جیمز نے کہا۔ ’’تم ایک عظیم مقصد کے لیے اپنی جان دینے جا رہے ہو۔ یہ سب اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ ان کی حکومت اور سپاہی افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کو قتل کرتے رہے، اب ان کو اس کا حساب دینا ہوگا۔‘‘

’’جیمز! تم ایک معصوم بچے کو استعمال کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اسلام میں تو دشمن کے بچوں کو بھی مارنے یا ان کو نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ چاہے وہ میدانِ جنگ میں کیوں نہ ہوں اور تم اپنے ہی بچوں کو یوں قربان کر رہے ہو۔‘‘

’’سعد! اس کی بات مت سنو۔‘‘ جیمز تیز لہجے میں بولا۔ ’’تم تیاری کرو۔‘‘

عمر نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پیش قدمی کی کوشش کی جب جائز سعد سے بات کر رہا تھا لیکن اس کا ساتھی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے سامنے آتے ہی عمر پر فائر کیا اور گولی اس کے بائیں پہلو میں اتر گئی۔ وہ تیز رفتاری کی وجہ سے لڑکھڑاتا ہوا گرا اور رول کرتا ہوا ایک صوفے کی آڑ میں آ گیا۔ جیمز کا آدمی سمجھا کہ وہ مارا گیا اور وہ دروازے کی آڑ سے نکل آیا۔ عمر کی رائفل نے شعلہ اگلا اور وہ الٹ کر واپس جا گرا۔ اسی لمحے عقب سے فائر ہوا اور گولی عمر کے دائیں شانے میں اتر گئی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یہ بارنی تھا جو خاموشی سے آیا اور اس نے عمر کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے عمر کی رائفل پاؤں کی ٹھوکر سے دور پھینک دی اور پستول تان لیا۔ وہ سمجھا کہ بارنی اسے شوٹ کرنے جا رہا ہے مگر وہ ساکت کھڑا رہا۔ چند لمحے بعد جیمز اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے عمر کو دیکھا اور سعد کو آواز دی۔

’’آ کر دیکھو اس سورما کو۔‘‘

سعد سامنے آیا تو عمر لرز گیا... دبلے پتلے سعد نے اُوپر تلے کوئی بہت بڑی چیز باندھ رکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی جسیم آدمی ہو جس کا سر بہت چھوٹا ہو۔ جیمز یوں فخر سے تنا کھڑا ہوا تھا جیسے سعد اس کی کوئی ایجاد ہو۔ اور یہ سچ بھی تھا، ایک معصوم بچے کو ایک خودکش حملہ آور میں تبدیل کرنا اسی کا کام تھا۔ اس نے عمر سے کہا۔ ’’دیکھا تم نے... یہ اور ایسے ہی دو جانباز آج ان کافروں کو یاد دلائیں گے کہ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔‘‘

عمر کو لگ رہا تھا کہ اس کی جان نکل رہی ہے۔ گولی شاید دل کے پاس لگی تھی۔ وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ ’’تم ایک قانون کی غلط تشریح کر رہے ہو... خون کا بدلہ قاتل سے لیا جاتا ہے۔‘‘

’’یہ سب قاتل ہیں... مسلمانوں کے قاتل ہیں۔‘‘ جیمز غرایا۔

’’یہ جن لوگوں کو جا کر ماریں گے... ان میں اکثر عام لوگ ہوں گے... اور کیا انہیں معلوم ہوگا... کہ مرنے والا کون ہے... بم تو کسی کا مذہب اور قومیت نہیں دیکھتا... ہو سکتا ہے اس حملے میں مسلمان بھی مارے جائیں... ان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟‘‘

’’ایسا تو ہوتا ہے۔‘‘ جیمز نے بے پروائی سے کہا۔

’’سعد اپنے بھائی کا بدلا بھی لے گا۔ اسے ڈینی اور رائز نے قتل کیا تھا۔‘‘

’’میں نے ان دونوں کو مار کر... فہد کا بدلا لے لیا ہے۔ اب یہ کس سے بدلا لے گا؟‘‘

سعد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’تم نے ان دونوں کو مارا ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ عمر نے سر ہلایا۔ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ جس جگہ گرا ہوا تھا، وہ جگہ خون سے تر ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی۔ اگر سعد کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ خود کو فرشتۂ اجل کے سپرد کر دیتا لیکن اس وقت وہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اس نے جیمز سے کہا۔ ’’سنو، تمہارا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے؟‘‘

جیمز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’تم کیسے جانتے ہو؟‘‘

’’گزشتہ چند دن میں میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ جانا ہے۔ تمہارا یہ بھائی کہاں ہے؟‘‘

’’اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘ جیمز غرایا۔

عمر نے طنز کیا۔ ’’جیمز! تم نے اسے کیوں استعمال نہیں کیا؟ اسے خودکش بمبار کیوں نہیں بنایا؟‘‘

جیمز بوکھلا گیا۔ ’’وہ... وہ ابھی پڑھ رہا ہے۔‘‘

’’ہاں، بارہ تیرہ سال کی عمر پڑھنے والی ہوتی ہے۔‘‘ عمر ڈوبتے لہجے میں بولا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے حواس

جواب نہ دے جائیں اور وہ بے ہوش ہو جائے۔ وہ اس سے پہلے اپنی بات کر لینا چاہتا تھا۔ ”سعد بھی تو بارہ... سال کا ہے... اسے بھی کسی اسکول میں... ہونا چاہیے تھا... جیسے تمہارا بھائی سوبو... ایک اسکول میں پڑھ رہا ہے۔“

سعد اب عجیب نظروں سے جیمز کو دیکھ رہا تھا۔ جیمز نے ان نظروں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”سعد! ۔ کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ تمہیں بہکا رہا ہے۔“

”غلط... میں اسے تمہارے بہکاوے سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ عمر نے جوش سے کہا۔ ”تم نے اسے بہکایا اور اسے ایک ایسے کام پر اکسایا جس میں اس کی زندگی چلی جائے گی۔ اسلام میں ایمان کے بعد جان سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت نہیں ہے۔ اگر معاملہ دوسرے کی جان کا ہو تو اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے خود کش حملہ غلط نہیں ہے لیکن عام انسانوں پر حملہ بالکل جائز نہیں ہے۔ اگر تمہارے خیال میں یہ اتنا ہی اچھا فعل ہے تو تم نے اپنے بھائی سے کام کیوں نہیں لیا؟ تم نے خود یہ کام کیوں نہیں کیا؟... نہیں جیمز! تم ایک بزدل آدمی ہو جو میرے خوف سے یہاں چھپا بیٹھا تھا اور اپنے آدمیوں کو مرنے کے لیے باہر بھیج رہا تھا۔ سعد! کیا تم ایک بزدل شخص کے کہنے پر ایک غلط کام کرو گے جسے تمہارے بھائی نے کبھی درست نہیں سمجھا اور اس نے بہادری سے جان دے دی ہے؟“

مارے جوش کے عمر سنبھل گیا تھا۔ اس کی بات سن کر سعد کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے۔ جیمز نے محسوس کیا کہ عمر اپنے مقصد میں کسی قدر کامیاب رہا تھا۔ اس نے دہاڑ کر بارنی کو حکم دیا۔ ”شوٹ کر دو اسے۔“

بارنی کا پستول والا ہاتھ جھک گیا تھا اور وہ بھی ان کی باتیں سننے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے پستول اٹھایا لیکن اس کا رخ جیمز کی طرف تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔ ”بارنی! یہ کیا کر رہے ہو؟“

”باس! کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟“ بارنی نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”تمہارا بھائی اسکول میں پڑھ رہا ہے؟“

”یہ ٹھیک ہے لیکن اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”کیا تم بھی اس کی باتوں میں آ گئے ہو؟“

”ہاں... اور کیا اس نے جھوٹ کہا ہے؟“ بارنی نے الزام دینے والے انداز میں کہا اور سعد سے بولا۔ ”جیکٹ اتار دو اور یہاں سے جاؤ۔“

”نہیں۔“ جیمز اچھل پڑا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”جیمز! تم ایک مجرم تھے اور پھر تم نے مذہب بدل لیا۔ لیکن تمہاری فطرت اور کردار نہیں بدلا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری آنکھ بہت دیر سے کھلی اور اب مجھے اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔“

سعد جلدی جلدی جیکٹ اتار رہا تھا۔ یہ خاصی بھاری بھرکم جیکٹ تھی اور اگر اس میں موجود بارودی مواد استعمال کیا جاتا تو اس سے بہت بڑے پیمانے پر تباہی پھیل سکتی تھی۔ اس نے بارنی سے کہا۔ ”ربی اور علی...“

”ان کو چھوڑو۔“ بارنی نے کہا۔ ”باہر جاؤ۔ پولیس آنے والی ہوگی، اسے سب بتا دینا۔“

”پولیس؟“ جیمز نے تلخی سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے یہاں جو ہو رہا ہے، وہ صرف میری مرضی سے ہو رہا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ بارنی چونکا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”یہ سازش ہے۔ اس میں صرف جیمز جیسے لوگ ہی نہیں، یہاں کے بعض ادارے بھی ملوث ہیں۔ ان کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو... بدنام کرنا اور دنیا پر اپنی بالادستی قائم رکھنا ہے۔“

بارنی مشتعل ہونے لگا۔ ”اور تم ان کے ساتھ ملے ہوئے ہو؟“

جیمز خاموش تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سعد باہر چلا گیا۔ عمر اب نیم غشی میں تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ کیا ہوا لیکن وہ چونکا تو جیمز اور بارنی آپس میں گتھم گتھا تھے۔ جیمز نے اس پر حملہ کیا تھا پھر لگاتار دو فائر ہوئے اور جیمز کراہ کر بارنی سے الگ ہو گیا۔ بارنی کھڑا ہوا اور اس نے جیمز کو ایک گولی اور ماری۔ وہ تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ بارنی نے اس پر تھوک دیا۔ عمر نے آہستہ سے کہا۔ ”بارنی! باقی دو بچوں کی خودکش جیکٹ بھی اتروا دو۔“

بارنی اس کے پاس آیا اور اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ ”مجھے ساری عمر افسوس رہے گا، میں ایک بزدل شخص کی غلامی کرتا رہا۔“

”لیکن اب تم نے اسے مار کر اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ وقت کم ہے، پولیس کے آنے سے پہلے ان کی جیکٹس اتروا دو۔“

بارنی سر ہلاتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عمر کے ذہن پر چھاتی دھند بڑھ رہی تھی لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس نے ایک غلط کام ہونے سے روک دیا۔ اسی احساس کے ساتھ اس نے آخری سانس لی۔